Dentonic
POWDER
آجکل ڈنٹونک کا بول بالا ہے

پی آئی اے کی ایگزیکٹیو کلاس "سوہنی"

کی سہولت اب ایئر بس اے ۳۰۰، بوئنگ ۷۴۷، اور بوئنگ ۷۰۷

کی بین الاقوامی پروازوں پر بھی دستیاب ہے

PIA

پاکستان انٹرنیشنل

خرد دیکھے اگر دل کی نگہ سے
جہاں روشن ہے نورِ لَآ اِلٰہ سے
فقط اک گردشِ شام و سحر ہے
اگر دیکھیں فروغِ مہر و مہ سے!
اقبالؒ
PSO
پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ
PID (Islamabad)

100
NATIONAL INVESTMENT (UNIT) TRUST

Habib Bank Limited

نذر زدبی

جاری شدہ ـــــــ ۱۹۴۵ء

ٹیلیفون نمبر ـــــــ ۲۱۴۰۷۹

نمائندہ اعزازی ـــــ
ارشد نور

مدیر ـــــ
صہبا لکھنوی

قیمت نذر زدبی

سو روپے

زیر اہتمام

کراچی

رابسن روڈ نزد اردو بازار

تاریخی دعائیں

(بہ تقریب اجرائے "نذرِ زوبی" شمارۂ خاص)

راغب مرادآبادی

بے مثل دلنظیر اِن کی ہے اک اک خوبی
ہر نقش میں ہے دلکشی و محبوبی
اے خلدِ وطن! ہیں ترے فن کار عظیم
"حقّا، یکتا، غیور، آزر زوبی"

۱۹۸۹ء

محشر بدایونی

زوبی کے جواہرِ کاوش سے
تابندہ قلب و دماغ رہیں
زوبی کا فن چمکے دائم
"زوبی کے یہ نقش چراغ رہیں"

۱۹۸۹ء

نذر زوبی

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبالؒ)

سرورق : زوبی . سیلف پورٹریٹ

تذر زدبی

مجسمے

شخصیت و فن

پین ڈرائنگ

شخصیت و فن

رنگین تصاویر

شخصیت و فن

انتظاریہ

زوبی، حُسن اور خیر کا صورت گر

افکار، برِصغیر کے نامور مصوّر، مجسمہ ساز اور خطاط آزر زوبی کی سالگرہ کے موقع پر ان کی گراں مایہ خدمات کے اعتراف میں "نذرِ زوبی" نمبر پیش کر رہا ہے۔ بظاہر یہ ایک غیر اہم سا واقعہ نظر آتا ہے لیکن اگر ہم فنِ مصوّری اور ادب کے مابین گہرے رشتوں کے بارے میں اربابِ فنون کے روایتی سکوت کا جائزہ لیں تو یہ فخر و افتخار بھی "افکار" ہی کے حصے میں آیا ہے کہ وہ ایک ایسے مصوّر کی نصف صدی کی خدمات کا جائزہ لے جس نے ادب اور ادیبوں کے ساتھ فنِ مصوّری کے معنوی تعلق کو اس قدر خلوص یکسوئی اور تندہی کے ساتھ نبھایا ہے کہ آج اس برِصغیر میں شاید ہی کسی دوسرے ہم پلّہ مصوّر کا نام پیش کیا جا سکے جس نے "شعور" کراچی جیسے ادبی ماہنامہ کا اجرا کیا ہو۔ "شعور" "شعلۂ مستعجل بود و لے خوش درخشید" کے مصداق تھا لیکن اس جریدے نے ادب اور مصوّری کے مابین ایک "پل" کا کام دیا۔ ایک ایسے سماج میں جو فنون کے بارے میں اپنی تنگ نظری پر ادھار کھائے بیٹھا ہو اور جہاں فن کاروں کے یہاں احساسِ ناسپاسی افسوسناک حد تک معاشرتی رویے کا عمومی انعکاس بن چکا ہو۔ زوبی جیسے فن کاروں کا اپنے فن کی سعیٔ نامشکور میں منہمک رہنا کسی بغاوت سے کم نہیں ہے۔ قابلِ مبارکباد ہونی چاہئیں۔ ایسی تمام بغاوتیں جو ہماری زندگی میں حسن اور خیر کے تجریدی پیغام کی صورت گری میں مصروف ہیں کہ بالآخر کسی قوم کی زندگی۔ بلکہ اس کی بقا کا تمام تر دار و مدار ایسی بہت سی بغاوتوں کی ضرورت اور ان کے کامیاب وقوعوں پر ہے۔

جب زوبی نے پچاس سال قبل اپنے سفر کا آغاز کیا تو یہ کون جان سکتا تھا کہ قصور کے ایک متوسط خاندان کا چشم و چراغ، محمد عنایت اللہ مصوّری کے مختلف مکاتبِ فکر میں قسمت آزمائی کرتے کرتے مجسمہ سازی کی جانب متوجہ ہو جائے گا اور اس طرح کہ نقادانِ فن کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے گا کہ وہ بنیادی طور پر مصوّر ہے یا مجسمہ ساز۔ اس کشمکش و پیچ میں یہ حقیقت فراموش کر دی گئی کہ جب مصوّری اور مجسمہ سازی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں مصروف ہو جائیں تو پھر مجسمہ سازانہ مصوّری یا مصوّرانہ مجسمہ سازی کے لیے راستہ ہموار ہو جاتا ہے، اور وہ دن اور آج کا دن زوبی کی صاف اور سیدھی، حقیقت پسندانہ تصویروں کے ابھاروں میں مجسمہ سازی کی گولائیاں اور کرداروں کے اندرونِ ذات کی کیفیات اس کے منفرد رنگوں سے

اس خوبصورتی سے منعکس ہوتی دکھائی دیتی ہیں کہ بظاہر سادہ اور معمولی سے COMPOSITIONS بھی بنظر غائر غیر معمولی دکھائی دیتے ہیں۔

زوبی ہمارے دور کے ان مایۂ ناز مصوروں میں سے ہیں جنھوں نے مصورانہ بلکہ مجسمہ سازانہ اور سہ ابعادی خطاطی کی ابتدا کی۔ بعد کے آنے والے ان کی قائدانہ حیثیت سے پہلو تہی کر کے اپنے فن کو بے بنیاد بنانے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں زوبی کے فنکارانہ "دیوانہ پن" نے مصوری، خطاطی اور مجسمہ سازی کے میدانوں میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں "زوبیوں" کے لیے ان کی سنگلاخ راہوں کے کانٹے نکالے ہیں اور اس طرح وہ ذاتی شہرت کی بلندیاں سر کرنے کے بجائے اپنے متعدد شاگردوں کی شہرت کا پہلا حوالہ بن چکا ہے۔

زوبی ہماری قومی ثقافت کا اہم عکاس ہے اس کی تصویروں میں ملک کے سب سے بڑے صوبے کے کسان بھنگڑا ڈالتے اور دھمال ناچتے نظر آتے ہیں لیکن وہ ان دنوں ملک کے دیگر علاقوں کے رومان پرور کرداروں اور ماحول سے ایک ہمہ گیر ثقافتی موزائیک MOSAIC ترتیب دے رہا ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ خالصتاً سیاسی اور معاشی تصورات کو عناصر مصوری کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ زوبی کی "قومی یکجہتی" کے موضوع پر تصویروں کے تازہ ترین سلسلے میں پاکستان کا سربلند پرچم بھی بنیادی طور پر مصوری کا ایک عنصر (ELEMENT) کے طور پر آیا ہے۔ ایک ایسے دور میں جب وفاق کی اکائیوں میں "قوم پرستی" کا سیلاب آیا ہوا ہے زوبی وفاق کی سطح پر قوم پرست پاکستانی ہے اس کے یہاں قوم پرستی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسری قوموں کے باب میں تنگ نظری کا مظاہرہ کیا جائے وہ قوم پرستی کو بنیادی پہچان کے طور پر لیتا ہے اور دیگر لسانی اور ثقافتی وحدتوں کے لیے یکساں جمہوری حقوق کا طلبگار ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تصور تنگ نظر قوم پرستی کی نفی کرتا ہے۔ وہ ان مصوروں میں سے ہے جو ملک کے بارے میں ہمہ وقت سوچتا رہتا ہے اور شاید ہی کسی اور مصور نے اپنی مصوری کو ملک کے ساتھ اس درجہ شعوری طور پر وقف کیا ہے جتنا کہ زوبی نے۔ اس کا موضوعِ سخن عام پاکستانی ہے خواہ وہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے کسی علاقے سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ ہر اس پاکستانی کے ساتھ ہے جو اپنے ماحول سے جڑا ہوا ہے اور اس طرح ملک کی ہزاروں سالہ میراث سے بھی۔ یہی وہ میراث ہے جو نہ صرف تاریخ بلکہ جور دتے اور اس خطۂ ارضی میں انسان کے ارتقائی سفر کا دوسرا نام ہے۔

زوبی کے فن پر گفتگو ہو تو بات لامحالہ طور پر صورت گری اور بدصورت پر آ رکتی ہے زوبی کی تصویروں میں جا بجا خوبصورت چہرے ملتے ہیں یہ چہرے حسن اور خیر کی علامت ہیں۔ زوبی نے جس خوبصورتی کو عام کیا ہے اور اس کوشش میں بجا نے کیا کیا اعتراضات سہے ہیں، وہ اب ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی بدصورتی کے گرداب میں غنیمت "وقفے" بن چکے ہیں ان وقفوں کی فنکارانہ حیثیت کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جائے وہ ناقدینِ فن کا حق ہے لیکن میں ادب کے ایک قاری کی حیثیت سے اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ بعض فیصلوں کا حق ان کرداروں کو بھی دیا جائے جنھوں نے زوبی کے موقلم سے زندگی پائی ہے۔ یہ کردار آپس میں سرگوشیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ ان کا اثبات کرنے والے کو صحیح تناظر میں سمجھا جائے اور اس طرح موقلم کے ساتھ ساتھ اس کے خالق کا بھی اثبات کیا جائے جو زندگی کا بے محابا اثبات کرنا چاہتا ہے۔

زوبی تعارف اور تحسین کی حدود سے بہت دور جا چکا ہے۔ ناقدینِ فن اس خصوصی اشاعت کے مطالعے سے اندازہ لگائیں گے کہ وہ ہماری توجہ کا کہیں زیادہ مستحق ہے اور ویسے بھی اس کے بارے میں آخری فیصلہ ہم پر نہیں ہے بلکہ اس ملک کی تاریخ ثقافت پر ہے جو ہم اور آپ سب مل جل کر رقم کر رہے ہیں۔

محمد علی صدیقی
(مہمان مدیر)

شان الحق حقّی

یہ نذرِ زوبی

جس کا ہر نقش ہے آئینۂ حُسن و خوبی　　وہ قلمکار، وہ خلّاق ہے آزر زوبی

مو قلم اس کا رہا خونِ جگر سے سیراب　　انگلیاں اس کی رہیں اپنے لہو میں ڈوبی

خدمتِ فن بھی ہے خودسوزی و خودآزاری　　چاہیے جس کے لیے حوصلۂ ایّوبی

اس کے ہاتھوں سے جلا شہر میں اس فن کا چراغ　　رہِ پُرخار پہ ان قدموں نے کی جاروبی

جس نے ڈھائے ہیں تعصّب کے توہم کے صنم　　بت گری کی بھی اسی نام سے ہے منسوبی

فن پہ نازاں نہیں وہ یہ بھی ہے اک شانِ کمال　　جیسے خود اپنے کمالات سے ہو محجوبی

اس کے ہر ساختہ پیکر میں نظر آتی ہے　　دست و بازو سے سوا قلب و نظر کی خوبی

ساتھ بھی اس کو میسّر ہوا صغریٰ جیسا　　ذات خود جس کی ہے اک گلکدۂ محبوبی

کون ہے کس کا ہوا خواہ یہ اب تک نہ کھلا　　ایسی دیکھی ہی نہیں طالبی و مطلوبی

نازشِ فن بھی ہے اور وجہ وقارِ قومی

دیدہ و دست و دل و دانشِ آزر زوبی

○

محشر بدایونی

سکوتِ نقش میں معجز نما ہوں

میں نے یہ غزل کچھ ماہ قبل کہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہدیہ میں نے پہلے سے افکار کے زروبی نمبر کے لیے تیار کر رکھا ہو۔ ویسے یہ اشعار ہر سچے فن کار کی کیفیاتِ روح کے ترجمان ہیں۔ جناب صہبا کی فرمائش پر نذرِ زروبی کے لیے یہ متاعِ فکر بھی نذر ہے۔ یہ غزل دیرینہ رفیق اور عظیم فن کار جناب آزر زروبی سے گہری وابستگی کا نقش بھی ہے اور ان کی خدمت میں عقیدت و محبت کا ایک گلدستہ بھی۔

محشر

مجھے دیکھو، میں کُہسارِ بقا ہوں
سنو مجھ کو کہ میں زندہ صدا ہوں

صعوبت روح پر گزری ہے برسوں
حقیقت اب کُھلی مجھ پر، میں کیا ہوں

مرا ظاہر مرے باطن کا شاہد
تحمّل ہوں، یقیں ہوں، حوصلہ ہوں

مجھے پہچانو میری ہی نظر سے
میں خود آئینہ گر خود آئینہ ہوں

فضائے عصر کی رونق ہوں میں بھی
کہیں خوشبو کہیں موجِ صبا ہوں

میں فکر و فن کا سورج گرم رفتار
فروغِ عرصہ گاہِ ارتقا ہوں

مسلسل جل رہا ہوں خود سفر میں
زمانے کو اُجالا دے رہا ہوں

میں نقّاشِ خد و خالِ صداقت
سکوتِ نقش میں معجز نما ہوں

زوبی سے ایک گفتگو

شریکِ گفتگو

اکرام بریلوی ــ سحر انصاری ــ صہبا لکھنوی

مختصر حالات

خاندانی نام	عنایت اللہ
پیدائش	۲۸ اگست ۱۹۲۲ء
بہ مقام	قصور (پنجاب)

آذر زوبی کو بچپن سے ہی تصویر کشی کا شوق تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ شوق بڑھتا گیا۔ بالآخر میٹرک کے بعد انھوں نے لاہور کے مشہور نیشنل کالج آف آرٹس میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۴۳ء میں گریجوایشن کا ڈپلوما حاصل کیا ـــــ ۱۹۴۳-۵۰ء کے دوران زوبی فلمی دنیا سے بطور فلم آرٹ ڈائرکٹر وابستہ رہے۔ اس دوران انھوں نے مصوری، مجسمہ سازی اور خطاطی پر بھی خصوصی توجہ مبذول کی اور بے شمار کتابوں اور رسالوں کے سرورق بنائے ـــ ۱۹۵۰ء میں وہ مصوری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اٹلی کے دارالحکومت روم پہنچے اور ۱۹۵۴ء تک وہاں قیام کیا۔ اس قیام کے دوران انھوں نے نہ صرف یورپ کا وسیع پیمانے پر سفر کیا بلکہ مصوری کے اعلیٰ مرکزوں اور بلند پایہ مصوروں۔ مثلاً کیریکو اور ہنری مور وغیرہ سے بھی ذاتی ملاقات کی۔

ریڈیو روم سے وہ بطور اناؤنسر اور یونیورسٹی روم کی انسٹیٹیوٹ 'ازمیو' سے بطور اردو لکچرر انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ساتھ ہی مصوّری اور مجسّمہ سازی کے جدید تر رجحانات سے بھی استفادہ کیا جس سے ان کے فن میں نکھار، حُسن اور رچاؤ پیدا ہو گیا۔ اسی دوران انھوں نے تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل اردو سے اطالوی اور اطالوی سے اردو لغت تیار کی اور خود ہی اس کی کتابت کی جو تکمیل کے بعد میلان سے شائع ہوئی۔

۱۹۵۴ء ہی میں انھوں نے مشہور اکادمیہ دی بیلے آرتے' روم سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور پاکستان لوٹ آئے اور کراچی میں مقیم ہو گئے۔ یہاں انھوں نے آرٹس کونسل کراچی کے زیرِ اہتمام انسٹیٹیوٹ آف آرٹس اینڈ کرافٹس کی بنیاد رکھی اور بانی پرنسپل کی حیثیت سے سات سال تک اس ادارے میں مصوّری اور مجسمہ سازی کے شائقین کو درس دیا اور سیکڑوں طلبہ و طالبات کو فیض پہنچایا۔۔۔۔ زدبی کی شخصیت بڑی تہہ دار ہے۔ وہ بیک وقت اعلیٰ درجے کے مصوّر، نقّاش، مجسّمہ ساز، خطّاط اور خوب صورت ادبی رسالہ "شعور" کے (جو بدنصیبی سے زیادہ عرصے زندہ نہ رہ سکا) مدیر اور بہترین استاد ہیں۔ ان کا مشہور ادارہ اکیڈیمی آف اپلائڈ آرٹس آج بھی شہر کراچی میں نئی نسل کے لیے مثالی درس گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ زدبی نے

انھوں نے پاکستان کی جن ممتاز اور بلند پایہ شخصیتوں کے مجسّمے بنائے ہیں ان میں محترمہ فاطمہ جناح، بیگم لیاقت علی خاں، حسین امام، مجنوں گورکھپوری، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، جسٹس ایس اے رحمٰن، جی الانا، امتیاز علی تاج، منٹو، رئیس امروہوی، پروفیسر حسن عسکری، اشفاق احمد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق وہ اب تک بے شمار۔۔۔۔ پورٹریٹ تیار کر چکے ہیں۔

۔۔۔۔۔ صہبا لکھنوی

سحر انصاری: زدبی صاحب جیسا کہ آپ کے علم میں ہے صہبا صاحب "افکار" کا ایک نمبر آپ کے فن اور شخصیت پر مرتب کرنا چاہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس میں بہت سی باتیں دستاویزی نوعیت کی بھی ہوں گی اور یہ بات بھی پڑھنے والوں کے لیے اپنی جگہ بہت اہم ہوگی کہ آپ کی زبانی آپ کے فن کے بارے میں آپ کی زندگی کے بارے میں اور آپ کے فن کے تصوّر کے سلسلے میں سنیں۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ پہلا موقع نہیں کہ آپ سے اس طرح کی بات کی جا رہی ہے، بہت کچھ آپ کے بارے میں لکھا جا چکا ہے، لوگ جانتے ہیں، آپ کے فن کے قدردان ہیں اس کے اسلوب کو لوگ پہچانتے ہیں، لیکن زیادہ اچھا یہ ہوگا ہم تھوڑی سی (CHRONOLOGY) کو ذہن میں رکھتے ہوئے، کچھ آپ کے بارے میں ابتدا سے گفتگو کریں اور اس وقت جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ صہبا لکھنوی تشریف فرما ہیں اکرام بریلوی صاحب تشریف رکھتے ہیں اور یہاں آپ کے ادارے کی لیکچرر زیب النساء صاحبہ ہیں ہم کوشش کریں گے کہ سب مل کر آپ سے کچھ ایسی گفتگو کریں کہ جس حد تک بھی ممکن ہو، بات واضح ہو سکے۔

آذر زدبی: میں سب سے پہلے آپ سب احباب کا شکریہ ادا کروں اور صہبا صاحب کا خاص طور پر کہ یہ مجھے رسوا کرنے پر اڑے ہوئے ہیں

ن کی ضد ہے اب انھوں نے پروگرام بنا ہی لیا ہے کہ میرے بارے میں کچھ چھاپیں، معلوم نہیں کیا کچھ چھاپیں گے!

محمد انصاری: اسی لیے تو آج ہم حاضر ہوئے ہیں کہ آپ سے آپ کے بارے میں باتیں کریں۔ کم از کم آپ تو اپنے خلاف نہیں ہوں گے۔ ایک ایسی بھی ہو۔ صہبا صاحب نے زندگی میں اہلِ فن کی قدر دانی کی روایت قائم کی ہے۔

زوبی: بے شک، اس کی تو میں بھی قدر کرتا ہوں۔

صہبا لکھنوی: آپ یہ بتائیں کہ آپ کی ابتدائی زندگی کا آغاز کیسے ہوا؟

زوبی: یعنی آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ میں کیوں پیدا ہوا اور کہاں پیدا ہوا، میرا اس میں کوئی قصور نہیں کہ میں قصور شہر میں پیدا ہوا۔ میرے والدین وہاں تھے لہٰذا میں بھی وہیں ۲۸ اگست ۱۹۲۲ء کو عالمِ وجود میں آیا یا ورودِ مسعود ہوا، اور ابھی تک حاضر ہوں۔ والدین نے میرا نام عنایت اللہ رکھا۔ میرے نانا کریم اللہ تھے اور والد صاحب کا نام حفیظ اللہ تھا۔

صہبا لکھنوی: آپ کے والد کا شغل کیا تھا؟

زوبی: ہمارے والد صاحب سست گام تھے، انھوں نے زندگی میں کوئی کام نہیں کیا، بس عیش و آرام میں مگن رہے، یہ کھیل کود ہم نے ان سے سیکھا، ویسے وہ ٹھیکیدار تھے۔ بلڈنگیں وغیرہ بنواتے تھے۔

صہبا لکھنوی: ابتدائی تعلیم کا آغاز کہاں سے ہوا؟

زوبی: میٹرک تو میں نے ۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول قصور سے کیا اس کے بعد مجھے شوق ہوا دارئے، تصویریں وغیرہ بنانے کا، اس زمانے میں ہمارے ہاں قصور میں پہلوانوں کے دنگل وغیرہ ہوتے تھے ان کے پوسٹر وغیرہ میری نظر سے گزرتے تھے تو میں ان کو گہری نظر سے دیکھتا تھا کہ پتا نہیں کون ان کو بناتے ہوں گے۔۔۔ فرشتوں کے علاوہ ۔۔۔ یہ بہت تفصیل طلب باتیں ہیں۔ بہرحال یہ پتا چلا کہ لاہور میں ایک ایسا اسکول بھی ہے جہاں آرٹ کی تعلیم مل سکتی ہے اور ملتی ہے۔ پھر کوئی SOURCE بھاگ دوڑ کر کے پیدا کی، اب مجھے اجازت نہیں قصور سے باہر نکلنے کی، اس لیے کہ میں ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا، اور مجھے یہ تھا کہ میں کسی طرح سے آرٹ سیکھوں، کسی بھی طریقے سے اپنے شوق کی تکمیل کروں۔

سلام بریلوی: کیا آپ یونہی بے ارادہ لاہور کے لیے نکلے تھے اور جیب میں کچھ بھی نہیں تھا؟

زوبی: ہاں بے ارادہ نکلے تھے قصور سے لاہور کے لیے اور جیب میں کچھ نہیں تھا۔ ماں باپ کی کچھ اتنی مہربانی تھی کہ وہ ایک روپیہ روز جیب خرچ کے لیے دیا کرتے تھے کھانے پینے کے لیے، میں اپنے دوستوں کو ساتھ لے جاتا انھیں پوریاں کھلاتا، لسّی وغیرہ پلاتا تھا یہ سب باپ کے اکاؤنٹ میں ہوتا تھا۔ وہی ایک روپیہ لے کر میں گھر سے نکلا۔ اس زمانے میں قصور سے لاہور کے لیے لاری کا کرایہ چھ آنے ہوتا تھا سو وہ خرچ ہوئے باقی دس آنے میرے پاس بچے۔ اور پھر جو میں نے وہاں کہ ... کی حد میں جاتا ہوں یا خدا جانتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ایک پیسے کی روٹی کھانے اور رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی لیکن صاحب میں نے تہیہ کر لیا کہ اسکول آف آرٹ میں داخلہ لیں گے اور بھاگ دوڑ کر کے لیا، پرنسپل نے REJECT کر دیا کہ پیسے نہیں تھے۔ میں نے کہا کہ یہ میرا کام ہے، میں جو گول کر کے کاغذات کا بنڈل لے گیا تھا اس کو انھوں نے دیکھا، اس کے بعد کسی کو پیسے دیے اور کہا "یہ پاگل سا لڑکا ہے اس کو لے لو۔" دو روپے ہوتے تھے داخلے کے، اب میں دو روپے کہاں سے لاتا؟ بہرحال انھوں نے مجھے داخل کر لیا اور اب رہنے کی جگہ نہیں تھی میرے پاس۔ ریلوے اسٹیشن ہوتا تھا، سارا دن کام کرتا شام کو وہاں چلا جاتا اور دس آنے بھی ختم ہو گئے آہستہ آہستہ۔ پھر بھوکے رہتے، اور یہ بات

بھی کہ مانگوں گا نہیں، عزیز رشتے دار لاہور میں تھے مگر میں نے کہا کسی کے پاس جاؤں گا، نہ کچھ کسی سے مانگوں گا۔ پھر ریلوے اسٹیشن پر ایک دن ایک صاحب مل گئے، وہ ہمارے ساتھی تھے قصور کے۔ قصور میں یہ ہوتا تھا کہ میں بینجو بجاتا تھا اور اس کا COMPETITION ہوتا تھا ایک علاقے سے دوسرے علاقے کا، چھوٹے چھوٹے علاقوں میں، اور میں ان کی رہنمائی کرتا تھا، لہٰذا وہ مجھے مل گیا، اس کا نام نور محمد تھا اس نے کہا، کہو بھائی عنایت کیسے ہو؟ یہاں کب آئے۔ میں نے روداد سنا دی، کہنے لگے "تیرا ہمارا ٹھیک ہے" (جنگ کا زمانہ تھا) وہ لوگ کھلے پر ڈبے اور پتا نہیں کیا کچھ بنا رہے تھے۔ یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے۔ کہنے لگے، یہیں آجاؤ اور کھانا وانا کھاؤ، بھوکا بھی تھا، شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا اب کہاں جاؤ گے بس یہیں رہو، لہٰذا رہنے لگے۔ شام کو چھت پر بینجو بجایا، وہیں رہے، نہائے دھوئے، وہیں سے اسکول گئے پھر یہی معمول بن گیا، صبح کو ناشتہ کر کے اسکول جانا دوپہر کو آجانا۔ سارا دن ان کو میوزک MUSIC سنا کر محظوظ کرنا۔

سحر انصاری: اچھا یہ فرمائیے اس زمانے میں آپ کے ساتھی یا اساتذہ میں کوئی ایسے بھی اس وقت یا بعد میں ہوئے جنھوں نے آرٹ میں نمایاں حیثیت حاصل کی ہو یا آپ جن سے متاثر رہے ہوں۔ متاثر سے میری مراد یہ ہے کہ جیسے طالب علمی کی زندگی میں اکثر ہوتا ہے۔

زوبی: ہاں اس وقت ہمارے یہاں اسکول آف آرٹ میں ایسے کوئی نہیں تھے جو آج زندہ ہوں کم از کم پاکستان میں۔ انڈیا میں اگر ہوں تو اور بات ہے۔ وہاں میرے ایک ٹیچر تھے تربیدی ان کا نام تھا۔ وہ بہت اچھے آدمی تھے، میرے استاد تھے اور میں اب بھی ان کا احترام کرتا ہوں، ان کو سلام کرتا ہوں۔ وہ SCULPTURE میں ٹھیک ٹھاک تھے۔ کاریگر آدمی تھے۔ اس کے علاوہ پراشر ہوتے تھے جو ان کے سینئر تھے۔ لیکن یہ ہے کہ ان دونوں کا نام پاکستان میں نہیں ہے۔ بہرحال انڈیا میں ان کا کچھ ضرور ہوگا۔ اس زمانے میں اسکول کا جو معیار تھا وہ اتنا نہیں تھا۔ میں اس زمانے میں بھی محسوس کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہوں، وہ جس کو ایک بڑی INSTITUTE کہیے وہ بات نہیں ہے، لیکن میری قسمت کہ مجھے تربیدی اور پراشر جیسے ٹیچر ملے۔ پرنسپل گپتا تھے پھر ان کے جانے کے بعد محمد حسین آئے۔ وہ بھی ٹھیک ٹھاک تھے پاکستانی تھے اور بہت سے ٹیچر تھے۔ لیکن زیادہ تربیدی مجھے یاد آتے ہیں اور دل چاہتا ہے کہ ان سے ملوں۔ اس کے بعد کچھ اور آئے ہوں گے، میں وہاں کوئی چار سال رہا۔ محمد حسین اس زمانے میں پرنسپل تھے انھیں کے زمانے میں خواجہ دل محمد کے بھائی خواجہ نذر محمد بمبئی سے لاہور آئے اور "پنچولی آرٹ پکچر" جو فلم کی بڑی کمپنی تھی انھوں نے وہاں ایک تاریخی فلم شروع کی ———— ان کو ضرورت پڑی ایک ایسے سنگ تراش کی جو ان کے لیے مجسمہ وغیرہ بنا سکے۔ لہٰذا انھوں نے پرنسپل محمد حسین سے بات کی۔ انھوں نے میرا حوالہ دیا اور تعریف کی چنانچہ خواجہ صاحب نے مجھے منتخب کیا اور لے گئے۔ میں نے فلمی دنیا کے لیے پنچولی آرٹ پکچر میں کام شروع کیا اور انھوں نے مجھے -/75 روپے مہینے پر نوکر رکھ لیا، اس زمانے میں میرے لیے تو یہ بہت بڑی بات تھی، میں اس وقت سید مٹھا بازار میں سوا روپے ماہوار کے ایک کمرے میں رہتا تھا، کھانے کے لیے مشکل ہوتی تھی اور اس میں باتھ روم نہیں تھا اس کے لیے مجھے دو ڈھائی میل جانا پڑتا تھا۔ ساتھ میں مسجد تھی اس میں نہاتا تھا اور کھانے کے لیے سامنے تنور ہوتا تھا ایک پیسے کی روٹی کھاتا تھا۔ پچھتر روپے کی نوکری مل گئی تھی اس لیے ہم تو شہنشاہ ہوئے، اللہ کی مہربانی ہوگئی تھی اور ہم بہت خوش تھے۔ اس کے بعد ہم نے ایک سائیکل لے لی، وہاں تک یعنی سید مٹھا سے مسلم ٹاؤن تک پہنچنے کے لیے انتظام ہوگیا ورنہ بہت مشکل ہو جاتی۔ پھر TUITIONS بھی لینی شروع کر دیں اور ایک اور جگہ پر بھی ہوگیا وہاں پتھروں کے SCULPTURE بناتے ہوئے تو وہاں پارٹ ٹائم جوب شروع کر دی۔ وہاں سے پینتیس روپے

ملنے شروع ہوگئے۔ وہاں میں نے دیوی لال وغیرہ کا SCULPTURE بنایا جو اب بھی لاہور ـــــ میں نصب ہے اور اس کے بعد حالات ٹھیک ہوگئے تو گھر والوں سے ملاپ ہوگیا۔ پہلے الگ تھا۔

سحر انصاری: آپ یہ فرمائیں کہ آپ عنایت اللہ سے آذر زوبی کیسے بنے؟

زوبی: وہ ایک ایسی بات ہے کہ اشفاق احمد کو آپ جانتے ہوں گے، لیکن پہچانتے نہیں ہوں گے۔ پہچانتا میں ہوں بہرحال وہ میرا ساتھی تھا اور وہ فیروز پور سے لاہور آتا تھا اور میں فیروز پور جاتا تھا۔ کیسے جاتے تھے، کیا کرتے تھے یہ بہت لمبی چوڑی باتیں ہیں بہرحال۔ اس کے ساتھ بہت کچھ تھا، پھر PARTITION ہوگیا اور وہ یہیں آگیا پھر ہم دونوں اور قریب ہوگئے۔ پھر ہم کو یہ سودا تھا کہ کچھ کریں۔ پھر ہم نے رائل پارک میں (یہ اس زمانے میں نئی نئی آبادی تھی بڑی POSH آبادی تھی میکلوڈ روڈ کے ساتھ) ـــــ ہم نے جگہ لی اور دونوں نے مل ملا کر پیسے ویسے تو تھے نہیں۔ دونوں ننگے بھوکے، لیکن ہم نے بڑی لمبی چھلانگ لگائی۔ ڈیڑھ سو روپے مہینے کی دکان لی اور ہم نے اس میں ADVERTISERS, PUBLISHERS وغیرہ وغیرہ کی دکان کھولی۔ میں وہاں بیٹھ گیا منیجر کے طور پر۔ لوگ آنے لگے اس کا نام ہم نے اسٹوڈیو انٹرنیشنل ـــــ یا نیشنل اسٹوڈیو رکھنے کی بجائے اسٹوڈیو زوبی رکھا، بس یونہی صوتی لحاظ سے اور زوبی آسانی سے سمجھ میں آنے والا بے معنی سا لفظ ہے بنا رکھ لیا، پھر ہوا یوں کہ جو بھی آتا تو مجھے زوبی صاحب السلام علیکم کہتا اور میں وضاحت کرتا کہ ہم زوبی نہیں ہیں۔ اشفاق بھی کہتا کہ ہم زوبی نہیں ہیں۔ لیکن وہ کیا ہے کہ زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ لہٰذا ہم نے آہستہ آہستہ یہ کہنا چھوڑ دیا کہ ہم زوبی نہیں ہیں اور پھر میں جتنے بھی کمرشیل کرتا اس پر زوبی لکھتا اور باقی جو فائن آرٹ SO CALLED FINE ART پر آذر لکھتا تھا، نام عنایت اللہ تھا میں اپنے آپ کو آذر عنایت اللہ لکھتا تو اس کے بعد پھر یہ ـــــ زوبی ہوگیا اور پھر آہستہ آہستہ عنایت اللہ بیچ میں سے غائب ہوگئے اور یہ آذر زوبی ہوگئے۔ ممتاز مفتی جب بھی خط لکھتا آذر زوبی لکھتا اور لوگوں کے خط بھی آذر زوبی کے نام سے آنے لگے۔ چلو ٹھیک ہے کیا کریں کس کس کو سمجھائیں۔ وہ جو پنجابی میں کہتے ہیں "جے کوئی ہو جائے کملا تے سمجھا ـــــ اوہ نو ویہڑا"۔ تے جے ویہڑا ہی ہو جائے کملا تے سمجھادے کیہڑا" تو اب کس کس کو سمجھائیں کہ میں عنایت اللہ ہوں اچھا بھلا ٹھیک ٹھاک، صاف ستھرا آدمی۔ لیکن انھوں نے اس کو آذر زوبی بنا دیا اور آپ بھی آذر زوبی کو جانتے ہیں، عنایت اللہ کو نہیں جانتے ہیں۔

اکرام بریلوی: اب اس وقت کے جو معروف مصوّر تھے ان سے تعارف کرائیں، اس حلقے میں کس طرح سے پہنچے مثلاً اس وقت مشہور تھے استاد اللہ بخش، چغتائی وغیرہ

زوبی: ہاں اللہ بخش مرحوم تھے اور چغتائی مرحوم تھے۔ ان سے بہرحال یہ ہوا پارٹیشن سے پہلے پنچولی آرٹ پکچر کی فلم "شیریں فرہاد" بنی بڑی ٹھیک ٹھاک۔ کامیاب ہوئی اس میں ہم نے بہت کام دام کیا اور خواجہ نذر محمد نے بڑے ڈیزائن وغیرہ کیے۔

صہبا لکھنوی: کتنے سال وابستہ رہے پنچولی سے؟

زوبی: یہی کوئی دو تین سال اور اس کے بعد ہماری تنخواہ پچھتر سے دو سو پچاس روپے ہوگئی تھا اس زمانے میں یہ اچھی خاصی رقم تھی پھر پارٹیشن ہوگیا اور بہت ہنگامے شروع ہوگئے اور ہم نے جو اسٹوڈیو کھولا تھا وہ ختم ہوگیا۔ لاشیں ہی لاشیں دائیں بائیں ملتی تھیں۔ میں اور اشفاق CAMPS وغیرہ گئے اور پتہ نہیں کیا کچھ کیا پارٹیشن سے پہلے روپ کشوری نے وہاں جو آج کا شاہ نور اسٹوڈیو ہے کھولا۔ پیسے کافی لگائے اس کے باپ نے۔ انھوں نے اس زمانے میں ایک فلم بنانے کا اعلان کیا، پیسے کی کمی نہیں تھی اس کا نام تھا "نیلا

پہریت" اسی کے لیے انھوں نے اللہ بخش کو آرٹ ڈائرکٹر کے طور پر لیا اور اللہ بخش میرے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ یہ سب کچھ کرنا ہے۔ میں بھی وہاں چلا گیا اور میں نے وہاں اسسٹنٹ کے طور پر کام کیا۔ وہ بڑے آرٹسٹ تھے لیکن وہ بیچارے بہت ساری ٹیکنیکل چیزیں نہیں جانتے تھے۔ ہم اپنے آپ کو ماڈرن سمجھتے تھے تعلیم جو ملی تھی، لہٰذا سارے کام میرے سپرد تھے میں نے بہت ساری چیزیں تیار کرلیں یہ ۴۶-۱۹۴۵ء کی بات ہے اور ۱۹۴۷ء میں پارٹیشن ہو گیا، کشور بہن بیرون چلے گئے اور اسٹوڈیو خالی ہو گیا اور اس کے بعد سارا لوٹ پوٹ ہو گیا، ہمارا اسٹوڈیو زوبی بھی ختم ہو گیا۔ ہم اور اشفاق پھر بیکار ہو گئے۔ اس سے بیشتر ذرا ایک بات اور ہے کہ چغتائی صاحب اس زمانے میں خان بہادر تھے اور یہ ہوتا تھا کہ اگر کوئی سنٹرل انڈیا سے فلم بنانے کے لیے آتا تو سنٹرل انڈیا سے وہ شخص ملاکرتی تھی کوئی بھی وہاں سے جاکرکے آئے تو اس کو ایک لاکھ روپیہ لون مل جاتا تھا بغیر پرمٹ کے۔ چنانچہ چغتائی صاحب لے گئے اس کے بعد انھیں فنانسر مل گیا، اس نے کہا ہم پیسہ لگاتے ہیں لہٰذا انھوں نے فلم کا اعلان کر دیا۔ اسٹوڈیو کا نام "بت کدہ" اور فلم کا نام رکھا "بت تراش" اور اس کے بعد ان کی فلم کے اشتہار آتے تھے کہ حسین چہروں کی ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس میں انھوں نے مجھے منتخب کیا اور میرے پاس آئے چغتائی صاحب۔ میں پہلے ہی ان کو جانتا تھا گریٹ آرٹسٹ تھے لیکن میری ملاقات نہیں تھی وہ آئے اور کہا یہ آپ کریں گے، میں نے کہا ٹھیک ہے اور وہ چلے گئے۔ ادھر ایک NORTH اسٹوڈیو ہوتا تھا اس میں کاروبار شروع ہو گیا اللہ بخش کو بھی سینئر آرٹسٹ کے طور پر لے لیا گیا اور مجھے جونیئر آرٹسٹ کے طور پر، ۱۷-۱۸ دن کے بعد اسٹوڈیو میں ان کا بھائی عبدالرحیم آیا۔ اس نے پیسے وغیرہ دیے اور کہا کہ صاحب کا روبار بند ہو گیا، ہم نے کہا پتا نہیں کیا بات ہو گئی۔ ہم تو پیسے لے چکے ہے، اللہ بخش نے بھی لیے، وہ کہنے لگے یہ کیا ہو گیا بھئی، یہ تو ٹھیک نہیں ہوا۔ انھوں نے گڑبڑ کی ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے بھئی انھوں نے ایک لاکھ روپے لیے اور فنانسر سے کہا کہ وہ ختم ہو گئے۔ فنانسر نے کہا حساب دے دیں، کہنے لگے حساب وساب بعد میں ہوگا پہلے پیسے دیں، انھوں نے پیسے نہیں دیے۔ انھوں نے ختم کر دیا۔ پھر اس کے بعد ان میں آپس میں جھگڑے ہوئے چغتائی صاحب میرے گھر آئے، کہنے لگے بیٹے میں تمہارا کام پسند کرتا ہوں۔ میں نے کہا ہم سیدھے سادے آدمی ہیں۔ کورٹ، دوربٹ میں جانے کے عادی نہیں، صاحب ہم کو ایک مہینے کی تنخواہ دو، جو بھی ہو ٹھیک ٹھاک ہے۔

سحر انصاری: اچھا بڑا لطف آیا آپ کی اس گفتگو سے اس زمانے کے تین بڑے آرٹسٹ چغتائی صاحب، اللہ بخش صاحب اور آپ فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ یہ عجیب رخ ہے میرا خیال ہے یہ اور کہیں شاید نہ ملے۔

زوبی: مزے کی بات یہ ہے کہ چغتائی صاحب نے مجھے کنٹرول کرنے کے لیے کچھ اپنے کام دیے کہ اس کو آپ ڈرائنگ کر دیجیے اور میں کرتا رہا پارٹیشن کے بعد انھوں نے فلم بنائی جو "بت تراش" کے نام سے بنی لیکن بہر حال وہ جیسی بھی تھی کامیاب نہیں ہوئی اور میرا فلمی دنیا سے تعلق ختم ہوا۔

سحر انصاری: اب جیسے یہ دور تھا فلمی زندگی کے بعد آپ کا پسندیدہ میڈیم کون سا رہا آپ زیادہ تر پینٹنگ کرتے تھے یا SCULPTURE

زوبی: نہیں..... میرا SCULPTURE SETTING SQUARFLY وغیرہ کی بات تھی صرف آرٹ ڈائرکٹر کے طور پر وہ میری فیلڈ تھی اور دیکھی میں اس انداز سے کرتا تھا ایکٹنگ وغیرہ نہیں؛ پھر ساتھ میں ٹائٹل شروع کیے۔ مکتبۂ اردو، رشید برادران ساقی صاحب تھے ان کے بڑے بھائی نذیر چودھری صاحب تھے وہ آئے ایک دن اور کہنے لگے، بھئی زوبی یہ آپ ہمارا ٹائٹل بنا دو، میں نے

کہا بنادوں گا۔ ہمیں ٹائٹل کا کوئی تجربہ ہی نہیں تھا۔ ٹائٹل کبھی بنایا ہی نہیں تھا لیکن چونکہ فن سے واقف تھے۔ میں نے کہہ
بنادیں گے۔ وہ کہنے لگے یہ لو یہ ہے عصمت چغتائی کا ناول "ٹیڑھی لکیر" اس کا نام ہے۔ پڑھتے پڑھاتے تو تھے ہی بڑی خوشی ہوئی کہ عصمت
چغتائی کا ناول ہے اس طرح سب سے پہلا ٹائٹل ہم نے عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر" کا بنایا۔ اپنی استطاعت کے مطابق ہم نے بناد
TECHNIQUE میں SCULPTUR کے طور پر اور INTERIOR DESIGNER کے طور پہ لیکن کمرشیل کام کیا ہی نہ
نہ اس کی ٹریننگ تھی ہم نے بالکل فائنل کرکے دیا تو نذیر چودھری بڑا عش عش کرنے لگے، واہ واہ سبحان اللہ بڑی ٹیڑھی بھڑی لائ
اور لکیریں، میں بھی بڑا خوش تھا۔ اشفاق بھی بڑا خوش، نذیر لے گیا —— اس کے بعد آئے اور کہا کہ یہ کیسے بنے گا یہ تو کچھ او
انداز سے بنا ہوا ہے۔ آپ نے کیسے بنادیا، کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں نے کہا: میں نے تو بنا دیا اب یہ اس کی سمجھ کہ اس کی سمجھ میں
آئے یا اور بات ہے۔ کہنے لگے پریس والے نے کہا ہے کہ بلاک نہیں بنے گا، میں نے کہا نہیں کیوں نہیں بنے گا، میں نے کہا میں اس سے بات
کروں گا، ہم گئے کہ اس سے سارا پروسس سمجھا کہ صاحب یوں ہو تو یوں ہوتا ہے۔ ہم نے کہا جیسا آپ کہتے ہیں ہم ویسا کرتے ہیں۔ ہم نے
کو پھر ایک دو دن کے بعد جیسا اس نے کہا تھا ویسا کر دیا اور اس کے ہمیں پچیس روپے ملے اور میں اس زمانے میں سب سے مہنگا آرٹسٹ تھ

اکرام بریلوی: یہ تو زوبی آپ کا COMMERCIAL VENTURE ہے لیکن یہ بتلائیے کہ اس وقت کی مصوری میں آل پاکستا
آرٹسٹ ایسوسی ایشن ASSOCIATION وغیرہ بنے اس میں آپ کا کیا رول ROLE رہا اور چغتائی صاحب کا کیا رول تھا۔

زوبی: یہ بھی ایک تاریخی بات ہے اس لیے کہ اس زمانے میں بہت سارے آرٹسٹ تھے۔ لاہور، پنڈی، پشاور، کوئٹہ اور ڈھا
میں بھی تھے لیکن لاہور سنٹر تھا لہٰذا ہم صاحب۔ چغتائی صاحب آئے اور کہنے لگے ہمارے گھر پر میٹنگ ہے میں نے کہا چلیے ہم بھی چلتے،
وہاں خواجہ نذر محمد بھی تھے، بمبئی سے پانچ ہزار روپے ماہانہ پر آئے تھے اس زمانے میں مکان الگ، گاڑی الگ، بہت بڑی بات تھی۔
اللہ بخش بھی تھے اور بھی چھوٹے موٹے آرٹسٹ تھے یہ ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ بہرحال ان کے گھر میں وہاں یہ پلان کیا گیا کہ ایک آل پاکس
تس ایسوسی ایشن ہونی چاہیے، ہمیں پتا نہیں تھا کہ چغتائی صاحب کی کیا منشا ہے یا وہ کیا سوچ رکھتے ہیں۔ بہرحال ہم سب لو
نے ان سے کہا بالکل ٹھیک ہے بہت اچھی بات ہے آرٹسٹوں کی بھلائی کے لیے ہے۔ لہٰذا سب نے چغتائی صاحب کو پریسیڈ
بنایا اور نذر محمد کو ڈپٹی پریسیڈنٹ اور اللہ بخش کو خزانچی اور آذر زوبی کو جنرل سکریٹری بنا دیا، میں کافی ینگ YOUNG
اس زمانے میں میں نے بہت احتجاج کیا کہ میں ابھی اس ذمے داری کا اہل نہیں ہوں لیکن انھوں نے کہا کہ نہیں آپ ہی —— ا
اب اس کے بعد یہ ہوا کہ ایک میٹنگ دوسری میٹنگ، دو چار میٹنگوں کے بعد طے پایا کہ بھئی ایک آل پاکستان بنیاد پر KHIBITION
ہوا اور سب آرٹسٹ اس میں حصہ لیں اور اس کو INAUGRATE صدر پاکستان کریں، نمائش کا معیار اعلیٰ درجے کا ہو، چغ
صاحب نے کہا کہ صدر پاکستان سے میرے تعلقات ہیں۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ اس زمانے میں الحمرا آرٹ کونسل بن گئی تھی۔ پھر ایک میٹ
اسی لیے رکھی گئی کہ مجھے شک تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ چھوٹے آرٹسٹوں کا حق مارا جائے ان کی RECOGNITION نہ ہو، اس
میں بھی شامل تھا، میں اپنے آپ کو بڑا آرٹسٹ نہیں سمجھتا تھا لیکن تھوڑی بہت میری CONTRIBUTION تو تھی۔ میں نے یہ تج
پیش کی کہ بھئی MAN & MIN تصویروں کی CONRIBUTION طے کر لی جائے۔ چغتائی صاحب بڑے آرٹسٹ ہیں اس میں کو
شک نہیں۔ آج بھی ان کا نام ہے انھوں نے بڑا کام کیا۔ اسی طرح اللہ بخش، خواجہ نذر محمد اور دیگر تھے۔ یہ نہ ہو کہ ایک کمرہ چغتائی صا
کو دے دیا جائے ایک پورا کمرہ اللہ بخش وغیرہ کو۔ اسی طرح سب بڑوں کو ایک ایک کمرہ دے دیا جائے اور چھوٹے کمرے میں چھ

آرٹسٹوں کو سجا دیا جائے میری THEME یہ تھی کہ ایسوسی ایشن میں سب کے برابر حقوق ہوں۔ میں نے ان سے کہا MAXIMUM ہر آرٹسٹ پانچ تصویریں دے اور MINIMUM تین دے جن کے پاس نہیں ہیں تو وہ بنا لیں، وقت ہے۔ چغتائی صاحب نے اس کا برا مانا اور احتجاج کیا اور کہا کہ جتنا بھی آرٹسٹ دے اس کو لو، اگر کسی کی زیادہ ہیں، تو جتنی بھی ہوں۔ لیکن میری تجویز پسند کی گئی سب نے کہا ہاں صاحب ٹھیک ہے EXHIBITION طے ہوگئی۔ سب نے اپنی اپنی تصویریں، کسی نے تین کسی نے چار اور کسی نے پانچ بنانا شروع کر دیں اور بڑے زور شور سے مجھے بتاتے گئے۔ میں نے تین، میں نے چار۔ میں نے کہا ٹھیک ہے بڑی اچھی بات ہے۔ کرتے کرتے ایک وقت آیا کہ چغتائی صاحب کا ہرکارا آیا اس نے کہا ایسوسی ایشن توڑ دی گئی لہٰذا اب کوئی EXHIB, TION نہیں ہوگی۔ ہم ششدر رہ گئے۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے اور باقی جتنے آرٹسٹ تھے وہ بیچارے بہت زیادہ کشیدہ خاطر ہوئے اور کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سب میرے پاس جمع ہوئے اور کہا آپ کیسے اس کو مان گئے لہٰذا انھوں نے بہت ساری بے جا حرکات کیں۔ بہرحال میں نے ان کو سمجھایا۔ تھوڑے دنوں کے بعد پتا چلا کہ چغتائی صاحب نے اسی مقام پر ایک ون مین شو ONE . MAN SHOW کرایا جس کو ہیڈ آف دی اسٹیٹ خواجہ ناظم الدین نے INAUGRATE کیا اور وہ ساری مراعات، انھیں دیں جو آل پاکستان آرٹسٹ ایسوسی ایشن کو ملنی چاہیے تھیں۔ یہ تاریخی بات ہے۔ اس کے بعد میں آج تک کسی آرٹ یا آرٹسٹ ایسوسی ایشن کا ممبر نہیں بنا اس لیے کہ مجھے بڑا تلخ تجربہ ہوا اور بڑی تکلیف ہوئی تھی۔ میں نے کہا اگر میں کسی کے لیے کچھ کر نہیں سکتا تو خواہ مخواہ ان کے لیے باعث تکلیف کیوں بنوں۔

سحر انصاری: بیرونِ ملک جانے کا سلسلہ کب شروع ہوا؟

زوبی: ۱۹۵۰ء میں ایک وظیفہ آیا یعنی گورنمنٹ اسکالرشپ کا اناؤنس ہوا تو میں اس زمانے میں اوپن ایئر تھیٹر لاہور میں ہوتا تھا وہاں میرا اسٹوڈیو تھا، اب بھی ہے لارنس گارڈن میں، وہ بہرحال میرا اسٹوڈیو تھا، یہ الگ داستان ہے اس اسٹوڈیو میں آپ کے صہبا صاحب کے جو احباب ہیں لکھنے لکھانے والے منٹو، ممتاز مفتی، اشفاق، محمد حسن عسکری وغیرہ بہت سارے لوگ جو تھے وہاں آتے تھے میرے پاس بیٹھتے تھے جو کچھ میرے پاس ہوتا کھاتے پیتے بھی تھے یا نہیں بھی ہوتی تھیں۔ یہ اسٹوڈیو میں نے ۱۹۴۶ء میں کھولا تھا اور وہاں میں لوگوں کو بلاتا تھا۔ وہیں میں نے فیض، ندیم اور حفیظ ہوشیارپوری وغیرہ کا SCULPTURE بنایا۔ احسان دانش اور ممتاز مفتی کا مجسمہ بھی وہیں اسٹوڈیو میں بنایا۔ یہ مجسمے سب فری بناتا بلکہ ان لوگوں کو کھانا بھی کھلاتا، روزی کمانے کے لیے تو میں کمرشل کام کرتا تھا یعنی روز ایک ٹائٹل بناتا تھا اور ایک کا VISUAL بناتا تھا۔ وہاں ادیبوں کا سا ماحول بن گیا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ تھوڑی سی ادب کے ساتھ میری بے ادبی بھی شامل ہے۔ بہرحال نثر بھی اچھی لگتی ہے اور شعر بھی اچھا لگتا ہے۔ ہر چند کہ میں شعر نہیں کہتا لیکن کچھ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے۔ اور یہ ہے کہ مجھے سحر انصاری جیسے شاعر پسند ہیں اور یہ جو ہیں جنھوں نے لاوا لکھا ہے۔ یہ بھی پسند ہیں اور یہ صہبا صاحب جو آپ اور ہم جیسے لوگوں کی قدر کرتے ہیں اور یہ دیکھو کہ ہم زندہ ہیں مزے لے رہے ہیں۔ اب اٹلی جانے کا ماجرا یہ ہے کہ اس زمانے میں اٹلی کا ایک اسکالرشپ اناؤنس ہوا اخبار میں، میرے پاس اشفاق بھی آتا تھا بلکہ روزانہ صبح و شام یہیں میرے پاس رہتا تھا مفتی، منٹو اور دیگر سب کی مجلس رہتی صبح، دوپہر، شام اور اکثر راتوں کو بھی، کبھی وہیں سو جاتے تھے بس یونہی کچھ ٹھیک ٹھاک انداز میں کبھی نہیں سوتے تھے۔ بہت فرحاں ہوتا تھا وہاں اور کوئی SHARE کرنے والا تھا نہیں اور میں کسی سے کہتا بھی نہیں تھا بھئی دو روپے اس زمانے میں سرمستی پر صرف ہوتے تھے۔ جتنے پیسے کماتا تھا تھوڑے بہت گھر میں دیتا تھا باقی وہاں خرچ کرتا تھا پہلی خاتون [illegible] میں ہوئی یعنی پہلی غلطی ہوئی اس سے دو لڑکے تھے وقار اور دانش۔ خیر پھر یہ ہوا کہ گورنمنٹ کالج میں اردو کے پروفیسر

جی۔ ایم۔ اشرف تی ٹی۔ وی پہ اپنی بات کی میزبان سلمیٰ بیگ کے والد۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھتے تھے۔ ایک دن وہ میرے پاس اخبار کا تراشہ لے کر آئے اور کہا دیکھیا یہ اسکالرشپ آیا ہے تم جاؤ۔ میں نے کہا، میں کیسے جاؤں، میرے پاس تو پیسے ہی نہیں ہیں۔ کہنے لگے اسکالرشپ ہے۔ آنے جانے وغیرہ کے اخراجات ملیں گے۔ تفصیلات پڑھیں تو پتا چلا کہ سول سرجن سے صحت کا سرٹیفکیٹ لینا پڑے گا اور پتا نہیں کیا کیا تھا۔ میں نے کہا سب کچھ جو ہے اخباروں کی کٹنگ وغیرہ وہ تو ساری ہو جائیں گی لیکن سول سرجن کی فیس پچیس روپے، یہ کون دے گا۔ بولے ایسا کرو کہ چھٹی تو لکھ دو سول سروس کمیشن کو۔ انٹرویو کراچی میں ہونا تھا، کہنے لگے ان کو لکھو کہ میں صحت مند ہوں سر سے پاؤں تک بالکل ٹھیک۔ اگر آپ میرے کام کو سمجھیں تو ٹھیک، میں پچیس روپے WASTE نہیں کروں گا۔ انھوں نے لکھ دیا۔ چھٹی بھیج دی، پھر ہمیں کراچی سے بلاوا آ گیا۔ ہم پہلے کبھی کراچی آئے نہیں اور اس زمانے میں یہ روشنیوں کا شہر تھا اور آج کل اللہ معاف کرے اندھیروں کا شہر ہے بہرحال ایک دن ہم پبلک سروس کمیشن پہنچ گئے وہاں اس زمانے میں شاہد سہروردی، حسین شہید سہروردی کے بڑے بھائی، آرٹ کے بڑے دلدادہ، ماسکو وغیرہ میں بھی رہے تھے بڑے INTELLECTUAL آدمی تھے وہ۔ انھوں نے انٹرویو کیا، کوئی بہتر امیدوار تھے ایسٹ اور ویسٹ پاکستان سے انھوں نے مجھ سے الم غلم سوال کیے وہ ITALIAN MICHAEL ANGELO جو فرانس کے تھے۔ میں نے کہا جی نہیں، وہ فرانس کے نہیں اٹلی کے تھے۔ پھر انھوں نے کہا یہ لاؤ، وہ لاؤ، میں نے کہا یہی یہ ہے۔ فیصلہ آٹھ دن میں ہونا تھا۔ بہتر امیدواروں میں ۲۲-۲۵ نمبر پہ میرا بھی نام تھا بہتر کا پورا انٹرویو ہوا، اب جب اس کا رزلٹ آئے، میں بیٹھا ہوں تھکا ہوا۔ کہاں جاؤں۔ سنیما دیکھنے کا مجھے اتنا شوق نہیں تھا اور کوئی جاننے والا یا جاننے والی بھی نہیں جس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کر سکیں۔ میرے ذہن میں ایک FLASH آئی کہ میں کراچی آیا ہوں تو کیوں نہ فاطمہ جناح کا STATUE بنا لوں، اور پھر ٹھان لی، ضرور بنائیں گے۔ میں کبھی فاطمہ جناح سے ملا نہیں اور مجسمہ بنانے کے لیے میرے پاس کوئی سامان بھی نہیں تھا بھئی SKETCH تو پنسل یا چاقو لے کر بنا لیتے ہیں مجسمہ بنانے کے لیے سامان چاہیے، پھر بھی ہم پوچھتے پاچھتے فلیگ اسٹاف ہیلس پہنچ گئے۔ مونچھوں والے دربان نے کہا۔ آپ اندر نہیں جاسکتے۔ میں نے کہا فاطمہ جناح سے ملنا ہے۔ اس نے پوچھا APPOINTMENT ہے۔ میں نے کہا نہیں ہے۔ اس نے کہا تب تو جا ہی نہیں سکتے۔ میں نے منت کی پلیز مجھے ان سے ملا دو۔ وہ سامنے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ ملنے کے لیے اتنا کچھ ہوتا ہے۔ پروٹوکول کیا چیز ہوتی ہے۔ بہرحال میں نے کہا بھئی میں ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے پھر وہی کہا کہ آپ نے APPOINTMENT لی ہے۔ میں نے بھی وہی جواب دیا نہیں۔ کہنے لگا آپ ہیں کون؟ میں نے کہا میں لاہور سے آیا ہوں اور میرا یہ مدعا ہے، بولا یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے کہا میں بنانا چاہتا ہوں تو یہ کیسے نہیں ہو سکتا مختصر یہ کہ میں اس کو ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا آپ مجھے ان سے بات تو کرنے دیں۔ ان کو ٹیلی فون تو کریں۔ اتفاق کی بات کہ فاطمہ جناح خود اس کمرے میں آ گئیں، وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے السلام علیکم، میں لاہور سے آیا ہوں، آپ کا مجسمہ بنانا چاہتا ہوں کہنے لگیں WHAT DO YOU MEAN وہ بڑی کرخت انگریزی زبان بولتی تھیں۔ میں نے کہا I CAME FROM LAHORE TO DO YOUR SCULPTURE کہنے لگیں WHAT، میں نے کہا SCULPTURE، کہنے لگیں FOR WHAT میں نے کہا I CAN. EXPLAIN YOU IF YOU GIVE ME TIME کہنے لگیں ALRIGHT FLLOW ME۔ میں اندر چلا گیا۔ اندر جا کر وہ بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں WHAT DO YOU WANT میں نے کہا جی لاہور سے آیا ہوں اور مجھے آپ کا مجسمہ بنانا ہے۔ کہنے لگیں WH؟ میں نے کہا بات یہ ہے کہ میری زندگی کا مقصد ہے کہ میں قائد اعظم کا مرنے سے پہلے فل سائز SCULPTURE بنانا اس لیے کہ میں قائد اعظم

کا عاشق ہوں اور آپ کی ANATOMY قائد اعظم سے ملتی ہے میں پہلے آپ کی ANATOMY بناؤں گا پھر STUDY کروں گا
ان کا مجسمہ بناؤں گا۔ کہنے لگیں H WELL I DON"T KNOW WHO ARE YOU BUT DO IT.

HOW LONG WILL YOU TAKE AND HOW WOULD YOU DO?

میں نے کہا آپ میرے سامنے کھڑی ہوں گی اور میں آپ کو دیکھ کر مٹی سے بناؤں گا اور اس کے بعد مجسمہ تیار ہو جائے گا، پھر میں انشاءاللہ قائد اعظم کا بناؤں گا۔ کہنے لگیں ALLRIGHT - ALLRIGHT COME TOMMAROW AT-10 ۔ اب جناب انھوں نے مجھے دس بجے کا وقت دے دیا۔ میں نے کہا THANK YOU VERY MUCH باہر آگیا اور سوچنے لگا۔ آزر زوبی وہ مٹی کہاں ہے اور وہ ORMATURE کہاں ہے؟ پھر میں نے شام کو TOOLS - ORMATURE کا مشکل بندوبست کیا اور مٹی کے لیے بہت دور کمہار واڑہ گیا وہاں سے مٹی لا کر ہوٹل کے کمرے میں رکھی اور صبح پورے دس بجے پہنچ گیا۔ پورے دس بجے بیگم صاحبہ اوپر سے نیچے آئیں REVOLVING STOOL نہیں تھا جس پر ہم بناتے ہیں۔ میں نے وہیں سے ٹیبل لیا اور اس کے اوپر دوسرا ٹیبل رکھا یہ کچھ کر کرا کے مٹی لگائی۔ میں نے کہا پلیز اس پر آجائیں۔ وہ کہنے لگیں YOU HAVE COME میں نے کہا YES MADAM I HAVE THANK YOU COME۔ انھوں نے کہا شروع کریں۔ میرا یہ خاص طور پر ہے کہ جب SCULPTURE بناتا ہوں تو اپنے ماڈل کے ساتھ ہر قسم کی باتیں کرتا ہوں، یعنی مسلسل کرتا ہوں تاکہ اس کا صحیح طور پر جو EXPRESSION ہے وہ رہے اس لیے کہ ہم جو SCULPTURE بناتے ہیں وہ اس کا مستقل PERMANENT EXPRESSION ہوتا ہے۔ سیکنڈ کے FLASH کے اوپر جو PHOTOGRAPHY کرتے ہیں وہ نہیں ہوتا PERMANENT ہونا چاہیے۔ اگر میں اکرام بریلوی یا سحر انصاری کا مجسمہ بنا رہا ہوں تو وہ ایسا ہونا چاہیے کہ تین سال کا چھوٹا بچہ بھی دیکھے تو کہے کہ یہ سحر انصاری ہیں۔

میں نے ان کا مجسمہ بنانا شروع کر دیا پورا ایک گھنٹہ لگا بنانے میں۔ کہنے لگیں THANK YOU VERY MUCH اچھا اسی دوران بیگم صاحبہ نے کہا ZUBY YOU میں نے کہا جی، بولیں IT SMELLS میں نے کہا ہاں بالکل ٹھیک آرہی ہے مٹی کا بنا رہا تھا بو تو آنا تھا ہی۔ دوسرے دن یوڈی کولون کی بوتل لے کر گیا اس زمانے میں ۲۴ روپے کی تھی۔ پانی کی جگہ اس کا اسپرے کیا تاکہ بو نکل جائے۔ دوسرے دن جب میں نے کام شروع کیا تو کہنے لگیں OH ITS WELL میں نے کہا بیگم صاحبہ میرا تو کباڑا ہو گیا۔ خیر دو SITTINGS میں میں نے اسے پورا کیا۔

سحر انصاری: اچھا گفتگو کے دوران آپ نے ان سے کن کن موضوعات پر بات کی؟

زوبی: بہت سی باتیں ہیں مگر یہ سلسلہ موضوع سے الگ ہو جائے گا، بہرحال اتنا کہہ سکتا ہوں۔ دنیا بھر میں میں واحد مجسمہ ساز ہوں جس کے سامنے وہ AS A MODEL بیٹھی ہوں اور یہ بھی ہے کہ میں نے فاطمہ جناح کو بہت مشکل ماڈل پایا۔ ایسی ایسی باتیں کرتی تھیں کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ جلدی سارا کام کو ختم کروں اگر باتوں میں الجھ جاتا تو کام نہیں کر سکتا تھا تاہم باتیں سنتا بھی رہا اور کرتا بھی رہا اور اپنا کام بھی کیا۔ انھوں نے پوچھا اب کیا کرو گے۔ میں نے بتایا اس کو MOULD کروں گا۔ کاسٹ کروں گا۔ اس کو میں لے جاؤں گا پھر اس کو MOULD کیا کاسٹ کیا۔ انھوں نے کہا مجھے نہیں دو گے میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگیں کیوں۔ میں نے کہا۔

IF YOU PAY ME I WILL GIVE YOU

کہنے لگیں WHY SHOULD I PAY YOU I AM GIVING YOU MY SITTINGS میں نے کہا IF YOU ARE ASKING ME

FOR SITTING AS A MODEL I CON PAY YOU THE AMOUNT I PAY FOR THE MODEL
ـــــ وہ بہت ہنسیں۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ کراچی میں اس زمانے میں ایسی کافی SOCIAL GATHERINGS
میں جاتا تھا جہاں کہیں بھی وہ ملتیں پوچھتیں زوبی WHERE IS MY SCULPTURE سارے لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوتے تھے
انھوں نے مجھے یاد رکھا بڑی بات ہے۔ میں کہتا I HAVE GOT WITH ME WHY DON'T YOU GIVE IT TO ME
میں کہتا YOU PAY ME I WILL GIVE YOU انھوں نے آخری وقت تک مجھے پہچانا حالانکہ صرف دو SITTINGS ہوئی
تھیں اور دونوں ایک ایک گھنٹے کی، وہ ہمیشہ مجسمے کا مطالبہ کرتیں اور میں ہمیشہ پیسے طلب کرتا وہ بھی ہنستی تھیں اور میں بھی ہنستا تھا پھر
ایک ہفتے بعد انٹرویو ہوا اور میں SELECT ہو گیا۔ کہا گیا اپنا پاسپورٹ بناؤ۔ میں اس کام کے لیے لاہور گیا اور پاسپورٹ کے لیے
APPLY کر دیا۔ بڑی بھاگ دوڑ کرنا پڑی جو کچھ بھی تھا وہ سارا کرا کے چھٹی مل گئی اور ستمبر ۱۹۵۰ء میں، میں چلا گیا ـــــ میرے
پاس پیسے کہاں ہوتے تھے جو کماتے تھے کھا پی جاتے تھے کچھ بیوی بچوں کے لیے ہوتا تھا باقی یار دوستوں کے ساتھ کھا پی جاتے تھے۔
بمشکل جو پیسے جمع کیے وہ آٹھ پونڈ ہوئے اور ہم نکل کھڑے ہوئے کراچی پہنچ گئے اور D.I.G کے آفس گیا اس کا جنرل منیجر ملا۔ کہا
HELLO MR ZUBE میں نے کہا YES SIR کہنے لگا۔

I HAVE SEEN YOUR POSSPORT YOU GOT ONLY £ 8

میں نے کہا IT IS ENOUGH اس نے کہا YOU MEAN ITS ENOUGH TO TAKE YOU SEE
THOUSOND POUNDS ALONG WITH AND SO ON

میں نے کہا جو کچھ بھی میرے پاس میں لیے جا رہا ہوں، مجھے جانے دیں بس لے جائیں۔ پھر وہاں جا کر بہت سے لطیفے ہوئے۔
ایرپورٹ پر جو ملتے ہیں کہ صاحب کون سے ہوٹل میں۔ ہم نے کہا کہیں بھی لے چلو۔ ہمیں پتا ہی نہیں تھا۔ وہاں پہنچے تو ڈیڑھ پاؤنڈ روز
کا کرایہ اور ہمارے پاس کل آٹھ پاؤنڈ تھے اور دوپہر کے کھانے کا وقت تھا بھوک لگی ہوئی تھی وہاں پر لوگ SPAGHETH: وغیرہ
کھا رہے تھے ہمارے پاس بیرا آیا اور ITALIAN میں کچھ کہا ہمیں ITALIAN آتی نہیں تھی اس نے WINE کی بوتل
سامنے لا کر رکھ دی آپ یہ لیجیے اور اس کے بعد آرڈر دیجیے۔ انگریزی بیرے کو نہیں آتی تھی اور ہم ITALIAN نہیں جانتے تھے
لہٰذا سوچا اردو بولیں اور ہم نے اردو میں اس کو ساری باتیں سمجھانے کی کوشش کی جو کچھ وہ لایا کھایا پیا، میں نے کہا پانی لاؤ۔ اس
نے کہا SHE SHIE NAI وہاں سے جا کر وہ روٹی کا ٹکڑا لے آیا۔ بعد میں میں نے ایک کتاب خریدی ENGLISH TO ITALIAN
ITALIAN TO ENGLISH تو اس میں میں نے دیکھا کہ بریڈ کو پانی کہتے ہیں اس طرح کے وہاں کافی لطیفے رہے۔ میں تقریباً
وہاں چار سال رہا اور ITALIAN آ گئی، میں وہاں ITALIAN پڑھتا بھی رہا داخلہ لے کر۔ اسکالرشپ جو دیا تھا وہ سارا
ہو گیا۔ اس کے بعد وہاں رہنے سہنے لگے۔ وہاں باؤسانی سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی اور باؤسانی نے مضمون بھی لکھے۔ پھر اس کے بعد وہاں
یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ وہاں مجھے ملتے تھے 35000 لیرا اور وہاں اس سے پورا نہیں ہوتا تھا۔ پھر اس کے بعد ایک اور جگہ ڈھونڈی
وہاں 25000/- لیرے کا خرچہ تھا ـــــ پھر آہستہ آہستہ میں ماحول سے مانوس ہو گیا بہت ساری چیزیں تو پھر یہ ہوا کہ کچھ کیا جائے
بنانا میں آرٹس کے اسکالرشپ پر گیا تھا وہاں ایک ایسٹ پاکستان کے اسکالرشپ پر آیا ہوا تھا اس کا نام شہزادہ نظام الدین تھا اور
POLITICAL SCIENCE پر آیا ہوا تھا۔ وہ بیچارہ شہزادہ تھا ایک دن کہنے لگا "اے جوبی، اے جوبی۔ جوبی اس کا ترجمہ

کردو۔ میں نے کہا کردوں گا انگلش سے اردو میں۔ وہ کر دیا اور وہ لے گیا۔ تین دن بعد پھر آگیا اور کہنے لگا اے بھائی جوبی۔ اے بھائی جوبی اس کا ترجمہ کردو۔ میں نے کہا ایک دفعہ کیا دو دفعہ کیا تم کرتے کیا ہو؟ کہنے لگا کیا بتاؤں ——— میں نے پوچھا کتنا پیسہ ملتا ہے یہ تو تم گڑبڑ کرتے ہو۔ اچھا اتنے عرصے میں اس نے مجھے نہیں بتایا۔ بہرحال مجھے ——— اس کے بعد باڈ ساتی مل گئے کہنے لگے تمہیں پیسے کی ضرورت ہے تو تم ایسا کرو کہ میں تمہیں وہاں لگوا دیتا ہوں۔ میں نے کہا ہاں ٹھیک ہے۔ اردو پڑھانے پر لگا دیا۔ اس نے UNIVERSTY ISMEO کی بماچ ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے ITALIAN ریڈیو پر ترجمہ، ریڈیو ڈائری کرائی اور اس پر خبریں پڑھنے کو دیں۔ ترجمہ کرکے اور ہفتے میں دو دو دفعہ کوئی SOCIAL یا اسی قسم کے مضامین کرنے ہیں۔ میں نے دیکھا تو وہی مضمون تھا جو بھائی شہزادہ نظام الدین لائے تھے۔ بہرحال میں نے اس سے نہیں کہا۔ اس کے بعد مجھے وہ کام مل گیا پھر ریل پیل ہوگئی پیسے ہی پیسے ہوگئے اور مزے آگئے۔ روز میں صبح سے شام تک COMPAIRING پر جاتا اور دوپہر میں ترجمہ کرتا۔ اس کے بعد میری TRAINING مکمل ہوگئی۔ سب کام دھام سیکھ لیا۔ وہاں تعلیم کا طریقہ تو ایک ہی ہے دنیا بھر میں آپ کہیں بھی چلے جائیں۔

سحر انصاری: وہاں آپ نے مصوری پر ٹیکنک کے لحاظ سے کیا کچھ سیکھا اور کیا فرق پایا؟

زوبی: یہاں جو میں نے سیکھا ہوا تھا اور اس کے بعد جو میں نے مجسمے وغیرہ بنائے تھے وہ ساتھ لے گیا تھا وہاں جو دیکھتا تھا مجھ سے کہتا تھا کہ ہمیں ASSIST کردیں۔ میں نے کہا ارے آپ تو اتنا جانتے ہیں تو ہم کیا سکھائیں۔ وہاں میرا اتنا کام دیکھ کر وہ لوگ حیران ہوتے تھے کہ یہ اتنا کام کرچکا ہے اب اس کے بعد کیا سیکھے گا۔

سحر انصاری: مثلاً آپ کا شروع کا کام دیکھا اور اب بھی آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس میں آپ کی انفرادیت نمایاں ہے تو کیا آپ وہاں کے مصوروں کے کام سے بھی متاثر ہوئے۔

زوبی: DEFINITELY بڑے آرٹسٹوں کے وہاں میں نے کام دیکھے اور ان سے بہت متاثر ہوا۔ اس زمانے میں بھی اور آج بھی ہوں۔ اس زمانے میں زیادہ تھا۔ وجہ یہ ہے کہ میری عمر اتنی پختہ نہیں تھی میں اٹھائیس سال کا تھا اس زمانے میں۔ وہاں گیا تو میرے لیے ہر وہ چیز جو میرے سامنے آتی تھی وہ ایک عجوبہ ہوتی تھی اور اب جو ہے زندگی کے اس پختہ دور میں میں گزر رہا ہوں تو اب یہ ہے کہ چیزوں کی پرکھ میری سمجھ میں آگئی ہے۔ وہ تجربہ بھی اس میں شامل ہے اور آج کا اور اس کے بعد کا بھی شامل ہے۔

سحر انصاری: تو یہی اصل میں تھا کہ ہمارے یہاں خاص طور پر جو ایک فیشن یا جدیدیت کو عام طور پر جو لوگ لاتے ہیں تو وہ اسی صورت میں کہ صاحب اسٹائل ہو ABSTRACTION ہو۔ کام کا ایسا کوئی نیاپن ہو تو یہ سب آپ نے کیا لیکن اس کے بعد اور اب موجودہ آپ کا رجحان کئی برس سے REALISM کی طرف ہے تو یہ جو اس طرف آپ آئے ہیں تو یہ ایک دراصل بہت ہی VITAL پوائنٹ ہے جس کے بارے میں میں چاہ رہا تھا کہ آپ بتائیں؟

زوبی: ہر چیز حالانکہ ہمارے یہاں کے SOCALLED جاننے والے اس کو پسند نہیں کرتے۔ وہ میرے REALISTIC WORK کو پسند نہیں کرتے اچھا وجہ یہ ہے کہ ان پر کمینٹ کرنے کے لیے ان کے پاس کلام نہیں ہے اور پینٹنگ ہو کچھ صحیح سے الگ ہوتا کہ انھیں کہنے کا موقع ملے۔

صہبا لکھنوی: ایک بات آپ نے پچھلے انٹرویو میں جو اتفاق سے نہیں آسکا اچھی کہی تھی کہ میں صحت مند جسم بناتا ہوں۔ تو پھر اس سلسلے میں آپ کا موجودہ رجحان کیا ہے؟

زوبی : اگر ہم REALESTIC کرتے ہیں تو اس کو صحیح معنی میں REALTSTIC ہونا چاہیے اور اگر اس کو STERILIZ کر رہے ہیں یا اس میں کچھ EXAGGERATION کر رہے ہیں یا کسی انداز سے حقیقت سے الگ کر رہے ہیں، پھر جتنا چاہیں کریں پھر تو کوئی حرج نہیں، میرا شروع سے یہ انداز رہا ہے کہ میں نے FIGURE کو بھی کیا ہے تو زیادہ نہیں کیا اتنا نہیں کہ وہ کلام سے گالی بن جائے یعنی کچھ اس کو ایسا ہونا چاہیے کہ قابل قبول ہو اور اس میں کچھ جمالیاتی عنصر ہو دیکھنے والے کو بھلی لگے، ایسا نہ ہو کہ وہ بھاری ہو جائے۔ اس کا میں قائل نہیں۔ اب بہرحال یہاں بہت سارے آرٹسٹ ہیں جنھوں نے کمال بھی پیدا کیے نام بھی پیدا کیے۔

سحر انصاری: ایک اور شعبہ بہت اہم ہے آپ کا خطاطی۔ اس میں کئی نام آتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ہماری نئی نسل یا ایسے لوگ جن کو آرٹ یا فن خطاطی کی مصورانہ صورت حال سے زیادہ شغف نہیں ہے تو ان کو، وہ تقدیم و تاخیر کو تو نہیں جانتے لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس میں ابتدا کس نے کی۔

زوبی : ہاں یہ ایک ریکارڈ میں آنے والی بات ہے یہ ۱۹۴۱-۴۲ء کی بات ہے جب میں نے لاہور میں خطاطی پر کام کیا یعنی اس زمانے میں یہ تھا ہی نہیں۔ میں نے سوچا اس میں کمال پیدا کروں۔

سحر انصاری: اچھا خطاطی کے جو مروجہ، مقررہ اصول تھے ان سے آپ نے ہٹ کر کام کیا؟

زوبی : جی ہاں اس سے ہٹ کر اس میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ ہٹنے سے مراد یہ نہیں کہ بالکل ہٹ گئے نہیں منحرف ہو کر یا کافر کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کے کچھ اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے اضافے کی کوشش کی ہے۔ اس کو ایک MONDMENT کی حیثیت سے ہم نے کیا —— اور اس کو بہرحال کرتے رہے اور اس زمانے میں یعنی ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۲ء تک یہ خط زوبی کہلاتا تھا۔ میں لاہور میں بیٹھ کر مجھے یاد ہے کہ میں نے ہزاروں کی تعداد میں رسالوں اور کتابوں کے ٹائٹل بنائے۔ بنگلور سے اس زمانے میں ایک رسالہ نکلتا تھا "نیا دور" میں نے لاہور میں بیٹھ کر اس کا ٹائٹل بنایا۔ لکھنؤ، دہلی، بمبئی سے۔ جو میرے پاس آتے میں بناتا تھا اور لاہور کے تو میں بناتا ہی تھا ہزاروں کتابیں پشاور کا سنگ میل، کوئٹہ وغیرہ کے سارے ہی، چٹان، نقوش وغیرہ اور نقوش کا سب سے پہلا ٹائٹل میرا تھا۔ دوسرا، چھٹا اور سارے میرے تھے اس زمانے میں تو اس میں آپ دیکھیے میں نے کیسے لائنز اور نقطے اور ساری باتیں وغیرہ

صہبا لکھنوی: وہاں سے آپ کی واپسی کب ہوئی تھی، اب آپ ذرا یادوں کو سمیٹیے۔

زوبی : ہاں یہ ہوتا تھا کہ اشفاق کے ساتھ ہمارا وعدہ ہوتا تھا لاہور کی سڑکوں پر کھڑے ہو کر رات کو اندھیروں میں ہم باتیں کرتے۔ اس نے کہا کہ تم پہلے کہیں باہر چلے گئے تو مجھے بلانا اور میں اگر باہر چلا گیا تو تمھیں بلاؤں گا، بہرحال میں پہلے چلا گیا اور اس کے بعد روز اس کا خط آ جاتا۔ میں بھی اس کو روز خط لکھتا، اپنے گھر والوں کو نہیں لکھتا لیکن اس کو لکھتا تھا وہ تقاضا کرتا کہ بلا لو مجھے میرے مولا بلا لو مدینے مجھے وغیرہ

پھر میں نے اس کے لیے یہ کیا کہ میں وہاں ریڈیو میں ملازم تھا اور بھی جہاں جہاں کام کرتا تھا وہ سارے میں نے چھوڑے اس کے لیے۔ وہاں —— SEASON TO SEASON، CONTACT ہوتا تھا سال کا، میں نے کہا میں کام نہیں کرتا کسی اور کو بلا لیں۔ انھوں نے EMBASSY کو لکھا۔ انھوں نے لکھا ہمارے پاس کوئی آدمی ایسا نہیں ہے جو پڑھائے بھی اور اس کے ساتھ ترجمہ بھی کرے تو جب وہ وہاں سے ناکام ہو گئے تو پھر میرے پاس آئے کہا کہ تم CONTINUE کرو، میں نے کہا نہیں جی میں نہیں کروں گا۔ میں نے انھیں اشفاق کا ADDRESS دیا اور کہا اس کو لکھیں یہ آ جائے گا۔ پھر اشفاق کو میں نے خط لکھ دیا کہ دیکھو جو بھی وہ

لکھیں فوراً مجھے لکھا کہ وہ کیا کہتے ہیں کتنے پیسے دے رہے ہیں کیا کچھ کر رہے ہیں۔ اس کو DIRECT میں نے لکھا کہ تم اتنے پیسے مانگنا۔ آنے جانے اور ساری سہولتیں انھوں نے مانیں میں نے منوائیں۔ میں بیٹھا۔ یا میں نے کہا ان کو بلاؤ، وہ صحیح بندہ ہے پروفیسر ہے، ریڈیو پر کام کرتا ہے اس سے بہتر آدمی نہیں ملے گا۔ چنانچہ ایک دن اس کو میں نے، دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر RECEIVE کیا اور اپنا سارا کاروبار اس کے لیے چھوڑ دیا اور اس کے بعد تین مہینے میں ایسی بات ہوئی کہ میں نے اپنا گھر اس کو دیا اور جہاں میں کھاتا تھا وہ سارا حدود اربعہ یہ اور وہ سب اس کے سپرد کیا، یہ احسان وحسان سارا ختم ہوا اور اس کے بعد مجھے فوری طور پر واپس آنا پڑا اس لیے کہ اشفاق بدل گئے۔ اس کے بعد ہم نے کوئی نو دس سال آپس میں بات نہیں کی پھر وہ پاکستان آگئے۔ اس زمانے میں شادی نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھا، ساتھ بیٹھتے تھے، کھاتے پیتے تھے اس کے بعد پھر شادی ہوئی۔

اکرام بریلوی: اچھا زدبی صاحب دوسری شادی آپ نے کس مصلحت کے تحت کی اور اس سے آپ کے آرٹ پر کیا فرق پڑا؟

زدبی: کیوں بھئی شادی سے آرٹ کا کیا تعلق۔ شادی سے تو بچے پیدا ہوتے ہیں۔

صہبا لکھنوی: اچھا تو پھر آپ لاہور آگئے اس کے بعد کیا ہوا؟

زدبی: لاہور آگئے پھر اس کے بعد وہاں مال روڈ پر اسٹوڈیو کھولا، وہاں کاروبار ٹھیک ٹھاک تھا۔ پھر اس کے بعد جی۔ ایم۔ اسعد پروفیسر تھے گورنمنٹ کالج میں تو وہ ایک بار ڈرامہ لے کر یہاں آئے اور کہنے لگے کہ چلو یار زدبی اب یہاں پہنچے دسمبر ۱۹۵۰ء میں پھر یہاں آئے تو ڈرامے وغیرہ ہوتے رہے میرے پاس پیسے خوب تھے اور ہم خوب عیش کرتے تھے۔ جوا کھیلتے تھے شام کو، اور میرے پاس سارے پیسے خرچ ہو رہے تھے۔ میں ایسا تو آدمی تھا۔ اسعد کبھی پیسے خرچ کرتا ہی نہیں تھا۔ جب پیسے سارے خرچ ہو گئے تو میں چپ ہو کر بیٹھ گیا۔ آخری مرتبہ میں نے کہا کہ سارے پیسے خرچ ہو گئے۔ میں نے اسعد سے کہا کہ کھانا کہاں سے کھائیں گے۔ اس نے فوراً فون کیا تو کوئی مدراسی کرامت علی ڈی۔ایس۔پی تھا۔ کہا میں یہاں ہوں۔ اس نے کہا آجاؤ۔ وہ کہنے لگا کہ میں تو جا رہا ہوں بھائی کھانے کے لیے اور چھوڑ کر چلا گیا۔

خیر میں اپنے ہوٹل میں گیا۔ اس کے بعد بھوکا ایک دن، دو دن کھانا نہیں کھایا کہ پیسا کون دے گا۔ پھر ریلیو اسٹریٹ پر ایک شام ایسے ہی گھوم رہا تھا کوئی پانچ بجے مجھے وہاں ریڈیو پاکستان کے دو صاحبان ملے "السلام علیکم زدبی صاحب کیسے مزاج ہیں؟" میں نے کہا بھائی میں ٹھیک ہوں۔ "بولے آپ کا انٹرویو لیں گے۔" میں نے کہا میں تو کل جا رہا ہوں۔ کہنے لگے ابھی چلیں اور وہ مجھے لے گئے۔ انھوں نے مجھے پیسٹری اور چار پیش کی۔ میں نے کھایا پیا۔ اس کے بعد انھوں نے انٹرویو کیا اور اس کے بعد پچیس روپے دیے۔ میں بڑا خوش، اب مجھے کیش پیسے چاہئیں کیوں کہ انھوں نے چیک دیا تھا۔ اب میں ایک صاحب کے پاس چیک لے کر پہنچا۔ نادر آرٹسٹ کے ہاں، ان سے کہا بھائی یہ پچیس روپے کا چیک ریڈیو پاکستان کا ہے اس کے پیسے دے دو۔ اس نے بہرحال نہیں کہ دیا۔ اچھا وہ مجھے پہلے پیسے کی ضرورت پڑی تھی تو اس نے نادر سے کہا تھا اس نے پینتیس روپے کا چیک دیا تھا۔ تو مجھے پیسے کی ضرورت تھی میں وہاں اندر سے گزرا تو یونس سعید کی وہاں جوتوں کی دکان تھی اس نے مجھے دیکھا اور کہا زدبی صاحب، میں اندر چلا گیا اس نے کھانا وانا اور چائے پلائی میں نے کہا یہ چیک ہے اس کے پیسے دے دو، اس نے پیسے دے دیے اور کہا ضرورت ہے، چیک رکھو، پیسے لے لو، میں نے کہا نہیں یہ لے لو۔ اور وہ میں نے اسے دے دیا۔ اس کے بعد پانچویں دن کافی ہاؤس میں بیٹھا ہوا تھا۔ یونس سعید آیا کہنے لگا۔ بھائی یہ چیک لے لو، میں بہت شرمندہ ہوا۔ اس کے بعد بہرحال میں نے اس کو پیسے دے دیے۔ اچھا ریڈیو پر اسی دن یا دوسرے دن انٹرویو براڈکاسٹ کر دیا گیا۔ دوسرے دن فاروق ہوٹل پر تین آدمی آئے زدبی صاحب۔ زدبی صاحب میں فلاں پبلشر ہوں، میں فلاں پبلشر ہوں، ہمیں ٹائٹل بنا دیں۔ آپ یہاں کراچی میں ہوتے ہیں۔ میں نے کہا بھائی نہ میرے

اکرام، سحر، صہبا

پاس پنسل ہے نہ ربڑ ہے نہ برش، میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کہنے لگے صاحب آپ کچھ بھی کریں میرے پاس یہ دس ٹائٹل ہیں۔ کسی نے کہا یہ آٹھ ہیں۔ ہمیں پتا ہے آپ پچیس روپے لیتے ہیں ہم آپ کو پچاس روپے دیں گے اور یہ لیجیے پانچ سو روپے، آپ سامان لے لیجیے اور اب پانچ سو روپے مل گئے کیش۔

میں نے فوراً وسکی کی بوتل منگوائی۔ اس کے بعد میں نے کام شروع کر دیا۔ ایک دو دن، آٹھ دن، اس کے بعد اور آگئے یہ کر دیں وہ کر دیں، پہلے سینما کا مالک آگیا "یہ میرا اس کا ڈیزائن کر دو"، پھر اس کے بعد کمشنر انگریز ہوتا تھا۔ میں ۱۹۵۵ء میں لاہور سے، پھر اتنا کام مل گیا کہ لاہور جا ہی نہیں سکا۔ پھر اتنا پیسا ہو گیا کہ میں کیا کروں اتنے پیسے کا، پھر میں نے سوچا ایسا کروں کہ مشین چلے اور پیسہ آتا رہے میں نے کہا پریس لگاؤں، اور پریس لگایا، بلڈنگ کے مالک جو تھے وہ ہماری بیوی کے باپ تھے۔ انھوں نے ہماری مدد کی۔ انھوں نے کہا آپ یہ لے لیں کرایے پر، پھر شادی بعد میں ہوئی ۱۹۵۸ء میں۔

سحر انصاری: اچھا پھر "شعور" نکالنے کی طرف آپ نے توجہ کی؟

زوبی: ہاں وہ ہم نے شعور نکالا جو بکتا تھا کم، بٹتا زیادہ تھا۔ بہت تعریف ہوتی تھی مجتبیٰ صاحب بھی تھے۔

صہبا صاحب: ہم بھی پریس دیکھنے گئے تھے مجتبیٰ کے ساتھ۔

زوبی: اس کے بعد یہ ہوا کہ شعور کی ضرورت نہیں رہی، کافی ہو گیا تھا لہٰذا بند کرنا پڑا اس کو اس لیے کہ میں جب پریس میں بیٹھتا تھا تو پریس چلتا تھا اور منافع ہوتا تھا اور جب میں ذرا چھٹی پر لاہور چلا جاتا تو خسارا ہو جاتا۔

صہبا لکھنوی: اچھا یہ ادارہ کب قائم ہوا؟

زوبی: میں نے ۱۹۶۰ء میں کیا پھر اس کے بعد آرٹس کونسل میں یہ سارا سینٹر یونیورسٹی آف آرٹ کی لیب جو ہے میں نے ESTABLISH کی او فرسٹ بنیں اور FOUNDER OF THAT یعنی ARTS COUNCIL میں پہلے ہم نے کلاسیں شروع کی تھیں پھر چار پانچ سال کے بعد ہم نے اس کو INSTITUTE کے طور پر شروع کیا پھر وہاں دھاندلی شروع ہو گئی اور POLITICS ہونے لگی اور علی امام جس نے منتیں کی تھیں کہ مجھے رکھ لو اور میں نے اسے ASSISTANT کے طور پر رکھ لیا۔ پھر اس نے شروع کر دیا کہ میں یہ ہوں وہ ہوں۔ پھر میں نے چھوڑ دیا، اب یہ ہے کہ میرا نام بھی نہیں آتا FOUNDER PRINCIPAL کے طور پر۔

اکرام بریلوی: اچھا زوبی صاحب یہ جو آپ نے اتنا لمبا چوڑا سفر پورا کیا ہے تو آپ پاکستان یا ہندوستان یا باہر امریکہ یا روم میں کسی مصور سے متاثر ہوئے؟

زوبی: میں ایک بات بتاؤں کہ میں صرف مصور ہی نہیں ہوں اور نہ صرف SCULPTURE ہوں مصور جو ہیں وہ ایک طرح کی مصوری کرتے ہیں SCULPTURE جو ہیں وہ صرف ایک طرز کے مجسمے بناتے ہیں۔ مجھ میں بہت سی علتیں ہیں میں PORTRAIT بھی کرتا ہوں آپ نے میرا بنایا PORTRAIT دیکھا۔ اب جہاں تک اگر میں یہ کہوں کہ اس فیلڈ میں کس کا شاگرد ہوں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ OKISTER GEORGS میرا روحانی گرو ہے اور اگر یہ دیکھیں میں جو مجسمے بناتا ہوں یا SCULPTURE جیسے یہ ایم آئی ارشد کا تو میں JACOB کا شاگرد ہوں۔ میں اس سے کبھی نہیں ملا لیکن ایک روحانی تعلق ہے۔

السیندرو پوسانی

زوبی روحانی نظریۂ فن کا نقیب

میں آذر زوبی سے پہلی بار ۱۹۵۱ء میں روم میں ملا۔ یہ ملاقات علامہ اقبال کی شہرۂ آفاق تصنیف "جاوید نامہ" کے اطالوی ایڈیشن کی طباعت کے مراحل میں ہوئی۔ میں اس کتاب کا مترجم تھا۔ میں کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو کتاب کے سرورق پر علامہ اقبال کی تصویر بنا سکے۔ میرے خیال میں اس تصویر کو تعریفی و توصیفی قسم کی کوئی تخلیق نہ ہونا چاہیے تھا۔ اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ یہ تصویر کسی فرد کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ آذر زوبی کی تصویر میری نظر والے سے گذرنے والی جملہ تصاویر میں اعلیٰ ترین تصویر تھی۔

آذر زوبی سے میرا دوسرا تخلیقی نوعیت کا تعلق روم میں اس کی تصاویر کی نمائش کے وقت قائم ہوا۔ انھوں نے درخواست کی کہ میں اس واقعہ کی مناسبت سے ان کی تصویروں پر کچھ اشعار رقم کروں۔ مجھے یہ مطالبہ ابتدا کچھ عجیب سا لگا لیکن جب میں نے ان کے ابتدائی دلوں کے اسٹائل کی آئینہ دار تصاویر دیکھیں جن سے آپ میں سے بعض حضرات شاید واقف بھی ہوں تو پھر مجھے اس کی درخواست قبول کرتے ہی بنی۔ میں نے زوبی کی تصاویر میں روحانی (INSPIRATION) محسوس کیا تھا جیسا کہ میں نے بار ہا تحریر کیا ہے، میرا خیال ہے کہ ایک موجد اور اس کا بیلا اور پھر تریا LANDSCAPE

یہ انجیل کے تصورِ فن کی بازیافت معلوم ہوتا ہے۔ اوپر خلا ہے، دنیا بظاہر بے جان سا cosmos ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم پر گھومتی رہتی ہے (میں ان زمانے میں زوبی کی تصاویر کو واقعتاً اسی انداز میں دیکھ پاتا تھا)

اور اب یہ مختصر سی تحریر زوبی کے ساتھ میری تیسری ملاقات ہے (اللہ اُسے آخری ملاقات نہ بنائے) اب اس کا فن پہلے کے مقابلے میں کم تجریدی ہے، لیکن ان تصویروں میں بھی ابتدائی دور کے زوبی کی پرچھائیں موجود ہے۔ شاید اب اس کی تصویر پہلے کی طرح محض ہیئت Form نہیں ہے بلکہ وہ روحانی تحریک کی حامل نہیں ہیں بلکہ ان میں مواد بھی ہے۔ میں نقادِ فن نہیں ہوں، لیکن میں اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس کی تصاویر میں جو بات سب سے زیادہ پسند ہے وہ ان کی stained circular ہیئت ہے جس کا ایک رخ Infinite کی جانب جھکتا ہے یہ بھی ایک قسم کی Asymmetry ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ زوبی نے اپنی تصاویر کے لیے "شکوہ" کو بنیاد بنایا ہے یہ محض اتفاقی امر نہیں ہے "شکوہ" اقبال کی انتہائی جرات مند نظم ہے اور بعض افراد نے اس نظم کی وجہ سے اقبال پر کفر کے فتاوی بھی لگائے لیکن یہ نظم درحقیقت خالصتاً مذہبی نظم ہے اس نظم کی مذہبیت بے پناہ گہرائی میں اتری ہوئی ہے۔

میرے پیارے دوستو ہمیں اسلام اور اسلام پرستی میں خطِ امتیاز کھینچنا پڑے گا اسلام نہ صرف ایک مذہب بلکہ ہے بلکہ یہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی ہے اور اسلام پرستی کیا ہے سیدھی سادھی بت پرستی۔ اقبال مردِ مومن تھا وہ اسلام پرست نہ تھا۔ "شکوہ" میرے دعویٰ کا منہ بولتا ثبوت ہے یہ ایک ایسی نظم ہے جسے صرف ایک مسلمان ایک مومن ہی لکھ سکتا تھا۔ ایک اسلام پرست نہیں۔

اگرچہ خدا مجسم وجود personal entity ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بقول غالب "سرحدِ ادراک سے پرے ہے" تو اس صورتِ حال سے دو نتائج برآمد ہو سکتے ہیں کہ وہ (الف) ایک ناقابلِ ادراک وجود ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہم خدا کو مادی معبود کے طور پر تسلیم کرتے ہیں وہ ایک بت بن کر رہ جاتا ہے ہمارے "قبلے" بھی بتوں ہی کی مانند ہیں تمام مذہبی رسوم بھی۔

(ب) ہم بحیثیت ایک وجود کے، جو خودی کی دولت سے سرشار ہے ہم کلی طور پر اور Pantheistically طور پر اس کے ساتھ Identify ہوتے ہیں۔

لیکن ہم اس کے ساتھ ایک [illegible] Dialogue شروع کرتے ہیں کچھ شوخ چشمی بھی کر سکتے ہیں اور وہ صرف اس لیے کہ اگر وہ صرف ایک شخص ہے تو وہ ایک ایسا شخص ہے جو ہر Transcendent سے ماورا ہے اور اگر ہم اسے ناراض کرنا بھی چاہیں تو ناراض نہیں کر سکتے اللہ نے انسان کی ذات پر زبردست اور بے پایاں اعتماد کیا ہے اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اس اعتماد کے سزاوار نہیں خدا کے ساتھ مکالمہ کا سب سے گہرا عمل Action ہوتا ہے۔

اقبال کا شکوہ اپنا جواب خود ہی دے دیتا ہے خدا نے انسان کو اس لیے Abandon کر دیا ہے کہ انسان نے بارہا خدا کے اعتماد کو دھچکا پہنچایا ہے اور پھر وہ خدا کے عقیدہ کے مضمرات پر پورے نہیں اتر پاتے۔ یہ درست ہے کہ مسلمانوں نے بت پرستی کو چکنا چور کر دیا ہے انفس و آفاق کے بتوں کو توڑا ہے صرف پتھر کے بتوں ہی کو نہیں مسلمانوں (بلکہ تمام مذہبی افراد) کو اس خطرے سے خبردار رہنا چاہیے کہ کہیں اپنے مذہب کے Ideal کو ایک بت کی شکل نہ دیدیں مذہب ایک Ideal نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو "عشق" اور "دل" سے پھوٹتا ہے۔

لیکن ہمیں آفند زوبی کی جانب پلٹنا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ زوبی نے اپنی تصاویر میں اقبال کی نظم "شکوہ" کے متعدد قنوطی Aspects کے بہت شاندار مطالعے پیش کیے ہیں اور اپنی محبوب Form کے اندر رہتے ہوئے زوبی کی تخلیقات کیا ہیں؛ (خواہ وہ کھلے کھلے منقبض وجود یا پیر طوسا کی لمبی ٹہنیوں کا آسمان کی طرف سفر ہو) زوبی نے دکھایا ہے کہ اس دنیا میں بھی بہتر مستقبل کی امید موجود ہے۔

میں ایک دفعہ پھر عرض کرتا چلوں کہ میں مصوری کا نقاد نہیں ہوں میں صرف اقبال کا اور اس کے فلسفۂ مذہب کا ایک ادنیٰ طالب علم

ہوں مجھے توقع ہے کہ آذر مجھے معاف کردیں گے میں اس موقع پر آذر سے معافی کا طلب گار ہوں کہ میں ان سے زیادہ اقبال کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں۔

لیکن میرا خیال ہے کہ زوبی اور ان کے علاوہ وہ دیگر فنکار جو زوبی کے روحانی نظریۂ فن پر یقین رکھتے ہیں یہی وہ "بلبلیں" ہیں جن کے بارے میں اقبال نے اپنی نظم "شکوہ" میں اس طرح خطاب کیا ہے۔

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا سازِ چمن
اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن
ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینہ میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

میری توقع اور دُعا یہ ہے کہ آذر کی (یہ) تصاویر نقادانِ فن کی تحریروں میں "فن برائے فن" کا شکار ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ یہ تصاویر پیغام بر ثابت ہوں اس مائل بہ حرکت فلسفے کا جو عام انسانوں کے لیے مستقبل کی علامت بن کر آتا ہے اور جسے بجا طور پر خدا تعالیٰ کا "باغ" کہا گیا ہے۔

آذر زوبی کے وجود میں وہ بچہ زندہ ہے جو مٹی سے بنا اور مٹی سے کھیل کر زندگی کا راستہ پا لیتا ہے۔ آذر مجھے بنا رہے تھے اور میں ان کے چہرے پر بدلتے ہوئے رنگ پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بجلیاں سی کوندر ہی تھیں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے میں وہ نہیں ہوں جیسے آذر نے بنایا ہے۔ کتنی مشکل ہے خود کی پہچان۔ کاش یہ ملاقات اور پہلے ہو گئی ہوتی۔ خیر کوئی بات نہیں ابھی تو نہ جانے کتنے جنم پار کرنے ہوں گے کسی موڑ پر تو پھر ملیں گے۔

۱۱/ اپریل ۱۹۸۵ء ———— عصمت چغتائی

آزرزو

بسم اللہ

آزرز

بسم الله
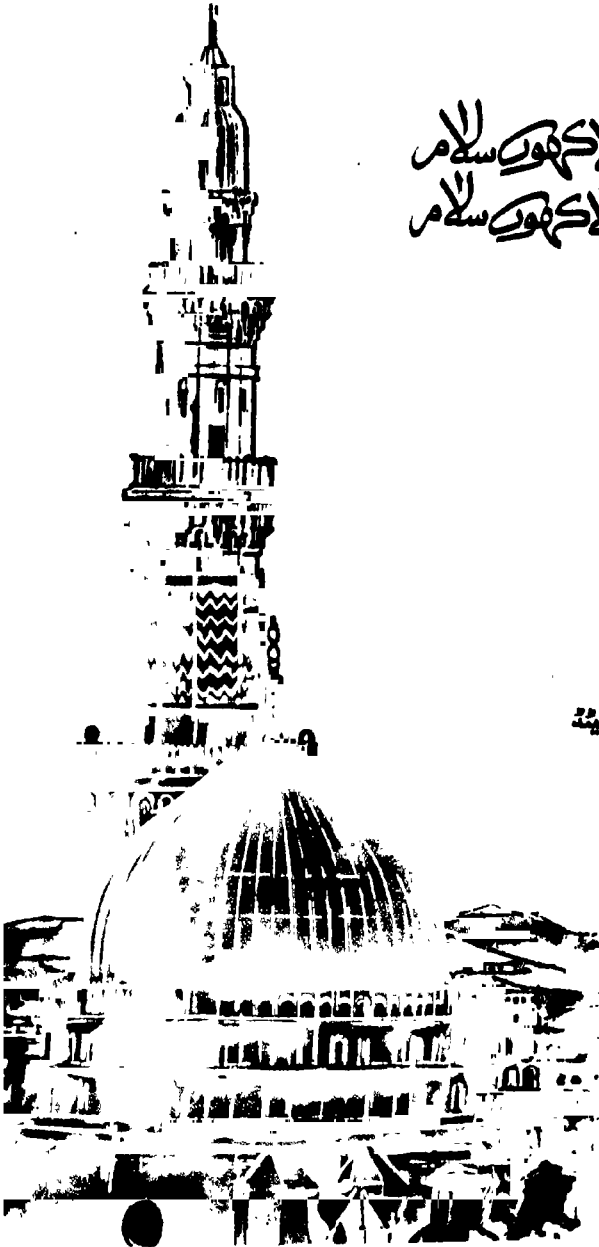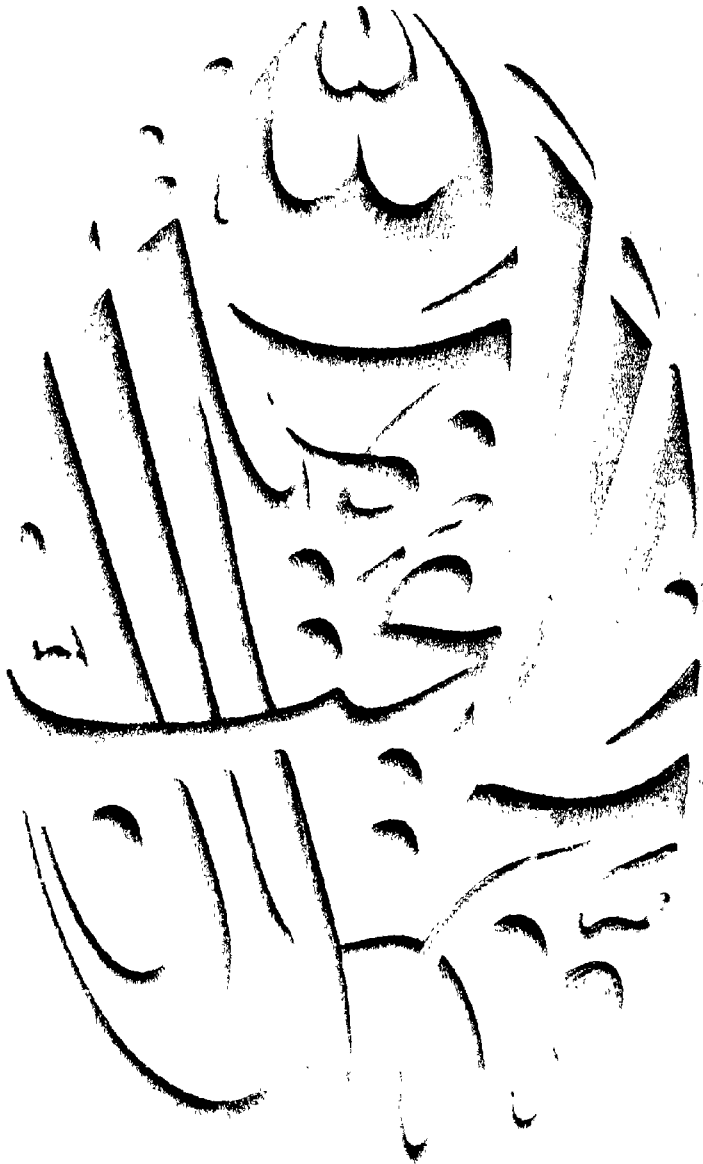
سعادت حسن منٹو
محمد حسن عسکری

پاکستان کا ایک فن کار

کہا جاتا ہے کہ فی الحال پاکستان میں فنونِ لطیفہ کے لیے ماحول سازگار نہیں ہے، خصوصاً مصوری اور مجسمہ سازی کے لیے نہ حکومت فن کاروں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، نہ عام لوگوں کو اس قسم کی سرگرمیوں سے دلچسپی ہے۔ فن کاروں اور ان کے معدودے چند قدردانوں کی یہ شکایت بالکل بجا ہے۔ حقیقت ہے کہ حکومت، یا چند خوش ذوق سرپرست یا پورا معاشرہ فن کار کی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ تخلیق کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اگر فن کار کو قدردانی میسر ہو تو اسے تحریک ہوتی ہے کہ اپنے ناآسودہ نفسیاتی میلانات کو ارتفاع دینے کے لیے فن کی طرف رجوع کرے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ فن کوئی منڈی کا مال نہیں ہے کہ اگر بازار میں کھپت نہ ہو تو پیداوار رک پڑی ہے۔ فن کار کے دل میں اپنے فن کا اتنا تو احترام ضرور ہونا چاہیے کہ وہ ایک حد تک دوسروں کی قدردانی سے بے نیاز ہو۔ اس کے لیے اپنی تخلیقی کاوش کسی نہ کسی حد تک تو بجائے خود قابلِ قدر ہونی چاہیے۔ دراصل ہمارے یہاں فن پر اس قسم کے یقین کی کمی ہے۔ جب لوگوں کے سامنے کوئی چیز قدر کرنے کے لیے ہوگی ہی نہیں تو وہ قدر کس کی کریں گے؟ اگر فنکاروں کو اپنے فن پر تخلیق یقین

ہو تو وہ ماحول کو کچھ نہ کچھ تو سازگار بنا ہی سکتے ہیں۔ اگر ان کی سرگرمیاں جاری رہیں تو کم سے کم لوگوں کو اُن کا وجود تو تسلیم کرنا ہی پڑے۔ لیکن پاکستان میں فن کاروں نے فن سے ایسے شغف کا مظاہرہ بہت ہی قلیل مقدار میں کیا ہے۔ مشکل سے چار پانچ ایسے مصور ہوں گے جنھوں نے ماحول کی شکایت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی سرگرمیاں بھی پوری تندہی سے جاری رکھیں۔ اور مجسمہ سازی کے بارے میں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ پاکستان میں اس فن کا وجود بھی ہے یا نہیں، بہرصورت اس معاملے میں لاہور کے عنایت اللہ آذر صاحب کی کوشش ضرور قابل تحسین ہیں کہ انھوں نے ماحول کی ناقدردانی سے بددل ہو کے بیٹھ رہنے کے بجائے اپنا کام جاری رکھا، بلکہ اپنے فن کو ترقی دینے کی بھی فکر کی۔

جہاں تک ماحول کا سوال ہے وہ آذر صاحب کو ہمیشہ ناسازگار ملا —— اور فن کار کو عموماً ملتا ہے۔ مصوری سیکھنے کے لیے انھیں اپنے والدین کی مرضی کے خلاف گھر چھوڑ کر لاہور آنا پڑا، چنانچہ فنی تعلیم کے دوران میں اپنے تمام اخراجات کا انتظام بھی انھیں خود ہی کرنا پڑا۔ انھیں اصل شوق تو مجسمہ سازی ہی کا تھا۔ مگر اسے ہمارے ملک میں ابھی تک پیشہ نہیں بنایا جا سکتا۔ لہٰذا تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے "زدبل" کے نام سے تجارتی کام شروع کر دیا، اور ساتھ ہی ساتھ گھر پر مجسمہ سازی کی مشق کرتے رہے۔ اب ایک مصیبت پیش آئی کہ محلے والوں نے جو انھیں "بت" بناتے دیکھا تو پہلے تو انھیں سمجھایا کہ یہ حرکت چھوڑ دو اور جب وہ نہ مانے تو دھمکیاں دینی شروع کر دیں آخر آذر صاحب کو ایسا محلہ تلاش کرنا پڑا جہاں کسے را با کسے کار نہ باشد۔

اب تک تو وہ قائدِاعظم یا گاندھی جی وغیرہ کے مجسمے بنا کر مشق کرتے رہے تھے یا پھر کوئی بھولا بھٹکا گاہک آ گیا تو اس کی شکل کو لیپ پوت کر کے ذرا خوبصورت سا بنا دیا اور اس کا جی خوش کر دیا۔ نئے مکان میں پہنچ کے انھیں ایک بڑی انوکھی بات سوجھی۔ وہ یہ کہ اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے مجسمے بنائے جائیں۔ یہ بات بھی آذر صاحب کے خلوص نیت پر دلالت کرتی ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے ایک ایسے طبقے کو نوازا جسے ملک کے سماجی نظام میں شایان شان مقام حاصل نہیں ہے۔ مگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں بھی آذر صاحب کو طرح طرح کی رقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اول تو یہی کہ فی الحال خرچ بھی خرچ ہے۔ کسی قسم کا مالی فائدہ نہیں پھر ادیبوں کو مجسمہ بنوانے پر آمادہ کرنے میں بھی انھیں خاصی پریشانی اٹھانی پڑی۔ شروع شروع میں تو کسی نے ان کی بات کو درخورِ اعتنا ہی سمجھا۔ کسی نے منظور بھی کیا تو اسٹوڈیو پہنچنے میں ڈھیل کی۔ اور آذر صاحب کو ہفتوں انتظار کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے ہار نہیں مانی، اور آخر بھاگ دوڑ کر کے دس بارہ مجسمے اب تک مکمل کر ہی لیے۔ ابھی چالیس پچاس مجسمے اور بنانے ہیں۔

آذر صاحب مصوری بھی کرتے ہیں اور مجسمہ سازی بھی لیکن دونوں میں ان کا انداز الگ الگ ہے۔ مصوری میں تو اُن کا رنگ تخیلی ہے، بلکہ تخیلی سے بھی زیادہ جذباتی۔ یہ چیز ان کے موضوع اور طریقہ کار دونوں میں جھلکتی ہے۔ ان کے موضوع کی نوعیت عموماً رومانی ہوتی ہے، خواہ بنیادی جذبہ کسی قسم کا بھی ہو، انتخار یا اہتزاز یا احتجاج۔ لیکن مجسمہ سازی میں ان کا رجحان حقیقت پسندی کی طرف ہے۔ تعلیم کے دوران میں انھوں نے تخیلی قسم کے مجسمے بنائے ہوں تو بنائے ہوں فی الحال تو وہ ایجاد کے بجائے مشاہدے کی طرف راغب ہیں۔ اب انھوں نے ایسے مجسمے بنانے بالکل چھوڑ دیے ہیں جو مجسمہ بنوانے والے کو خوش آئند معلوم ہوں۔ دراصل اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کیونکہ پیسے خرچ کر کے مجسمہ بنوانے والے ہمارے ملک میں ہیں ہی کہاں۔ مگر آذر صاحب نقل مطابق اصل کے بھی قائل نہیں ہیں کہ اصل آدمی اور مجسمے میں نقطے کا بھی فرق نہ رہے۔ ساتھ ہی انھیں شبیہ سازی کا جدید ترین انداز بھی قبول نہیں جس میں آدمی کی شکل پہچانی بھی نہیں جاتی۔ ان کی رائے میں ایسے مجسموں کو شبیہ کہنا ہی غلط ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات کو آذر صاحب کا یہ خیال درست نہ معلوم ہو، اور وہ کہیں کہ ہم شبیہ سازی میں بھی حقیقت کی نقل نہیں بلکہ نئی حقیقت کی تخلیق چاہتے ہیں جس میں موضوع، فنکار اور ناظر سب کی ہستیاں گھل مل جائیں۔ بہرحال آذر صاحب فنکار ہیں، ان کا ایک

طریقہ کار ہے جس کے انتخاب میں وہ آزاد ہیں، اور اس انتخاب اور ترجیح کا اثر ان کے نظریات پر بھی پڑنا ہی چاہیے۔ غرض نہ تو انھیں یہ پسند ہے کہ فنکار اصل ہئیت کا غلام ہو کے رہ جائے، نہ ہی یہ پسند ہے کہ وہ بالکل آزاد ہو۔ آذر صاحب اعتدال چاہتے ہیں۔ مجسمہ سازی میں ان کا آدرش یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اصل آدمی کا کردار نمایاں کیا جائے۔ اگر کردار کی وضاحت کے لیے اصل سے تھوڑا بہت انحراف کرنا پڑے تو وہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن اتنا انحراف روا نہیں رکھتے کہ اصل میں اور مجسمے میں کوئی مماثلت ہی باقی نہ رہے۔ وہ آدمی کی ہئیت کو بھی گرفت میں لانا چاہتے ہیں، مگر خارجی ہئیت کو کھو کر نہیں۔ مختصر یہ کہ ان کے نزدیک شبیہ سازی کا اعلیٰ ترین وصف کردار نگاری ہے۔ اس بات میں وہ روداں اور اپسٹائن کی شبیہوں کو مثالی نمونہ سمجھتے ہیں۔ مگر ہو سکتا ہے کہ روداں کا "بالزاک" ان کے لیے قابلِ قبول نہ ہو۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی مجسمہ سازی کے اگلے دور میں آذر صاحب کو نئی راہیں ڈھونڈنی پڑیں۔

چونکہ ابھی تو آذر صاحب کے فن کا ابتدائی دور ہے، اس لیے ان کے متعلق کوئی لمبے چوڑے دعوے تو نہیں کیے جا سکتے۔ مگر انھوں نے ادیبوں اور شاعروں کے جو دس بارہ مجسمے بنائے ہیں انھیں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کا فن بتدریج نشوونما پا رہا ہے، اور فنی کامیابی کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے اس کی شرائط پوری کرنے کی اہلیت اُن میں بڑھتی جا رہی ہے۔ چنانچہ ان میں سے جو مجسمے انھوں نے شروع میں بنائے ہیں ان میں اتنی معنویت نہیں ہے جتنی بعد والے مجسموں میں ہے۔ اُن کا آدرش کردار نگاری ہے، اور اس چیز میں انھیں سب سے زیادہ کامیابی حفیظ صاحب کی شبیہ میں حاصل ہوئی ہے۔ اس مجسمے کے بالوں میں، ہونٹوں، ٹھوڑی، ناک میں، اور ان سب سے زیادہ اس مجسمے کے مجموعی تصور اور "نشست" میں ذاتی طور سے حفیظ کی شخصیت ہی نہیں بلکہ ایک حد تک ان کی شاعری بھی اتر آئی ہے۔ اس کے بعد پھر ممتاز مفتی صاحب، امتیاز تاج صاحب کی شبیہیں آتی ہیں۔ ان میں مجموعی تصور اتنا کامیاب نہیں، مگر تفصیلات کے ذریعے مجسمہ ساز نے کردار تک پہنچنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ یہ کوشش کم و بیش سب مجسموں میں ملتی ہے۔ لیکن ان مجسموں میں ایک ذرا سی یہ کمی ضرور ہے کہ عام طور سے ان میں ادیب کی تخلیق کی ہوئی دنیا نہیں ملتی۔ ادیبوں کے مجسموں میں اس عنصر کی موجودگی ایک حد تک لازمی تھی۔ ادیب کے مجسمے کو خالی ایک شخص کا مجسمہ نہیں، بلکہ شخصیت اور تصنیف دونوں کا مجسمہ ہونا چاہیے۔ مگر یہ ایسی کمی ہے جو تجربے اور مشق سے پوری ہو سکتی ہے۔ ابھی تک آذر کے سامنے پوری عمر پڑی ہے۔ اپنا کام اسی تندہی اور خلوص سے جاری رکھیں گے تو نئی چیزیں سمجھ میں آئیں گی جن کی مدد سے اُن کا فن ا[illegible] تہ دار بن سکے گا۔ فی الحال تو یہی بہت غنیمت ہے کہ ماحول کی سازگاری کا انتظار کرنے کے بجائے وہ اپنے تخلیقی کام میں لگے ہوئے ہیں، اور اسی طرح اپنی کوششوں سے ماحول کو سازگار بنا رہے ہیں۔ ہمارے ملک کا تہذیبی مستقبل ایسے ہی نوجوانوں کی ہمت سے روشن ہو سکتا ہے جو قدر کے لالچ سے نہیں بلکہ تخلیق اور تجربے کو بذاتِ خود قابلِ قدر سمجھ کر فنونِ لطیفہ کی خدمت کریں۔

آرٹ تصویر سے بھی آگے ہوتا ہے اور زدبی صاحب انھیں بلندیوں کی طرف گامزن ہیں، خدا کرے ان کا یہ سفر جاری ہے۔

۱۳ر نومبر ۱۹۵۲ء ———— احسان دانش

قرۃ العین حیدر

اشاریت کی نئی سمتیں اور زوبی

زوبی متعدد ذرائع اظہار کے تجربات سے گذرے ہیں۔ اُن کی تخلیق خواہ روغنی ہو، یا قلم یا روشنائی سے ہو، یا زرد کاغذ پر اور رنگین پنسل سے، ہر ایک میں ایک ہی خصوصیت نمایاں ہے۔ یعنی لکیریں انتہائی نازک اور سبک مجل ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک لکیر تو پتھریلی چٹانوں کی یاد دلاتی ہے۔ یہ نرم تو نہیں البتہ ان سے کسی حد تک مجسمہ سازی کی سختی کا احساس ہوتا ہے۔

اگر کوئی زوبی کی تصاویر کو دیکھے تو اس کا تاثر یہی ہوگا کہ فنکار نے اپنی ایک مخصوص دنیا کو بیرونی حقیقت کی دنیا سے جدا کرکے تخلیق کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ دنیا انتہائی عجیب و غریب ہے جہاں انوکھی اشکال، اداس افسردہ و مضمحل عورتیں آباد ہیں جو بے چہرہ اور غیر متحرک ہیں اور جن کا وجود صرف خوابوں میں ہو اکرتا ہے۔ اس خواب میں ایک فرد خود کو ایسے خلاء میں جو تنگ ہوتا جاتا ہے مقید محسوس کرتا ہے۔ ایسی فضا روحانی منظر پیش کرتی ہے لیکن جذبات سے عاری۔ البتہ اس میں ولیم بلیک کی شاعرانہ اشاریت اور ایک طرح کی رمزیت کا لمس ضرور ملتا ہے۔ یہ کلاہ پوش خواتین جو زدہ در گردہ استادہ یا فرش نشین اور غیر متحرک ہیں وقت کی باہوں میں اسیر ہوگئی ہیں —— تاہم وہ جو —— نہیں موجوں اور رغاروں، شکلوں،

قرۃ العین حیدر   نذرِ زوبی   اشاریت کی نئی سمتیں اور زوبی

ہیئت اور خواب آلود صورتوں کی تکرار ہے جن کو خوابوں یا خیالوں میں پرو دیا گیا یا پتھروں کی طرح تراشا گیا ہے۔ مجسمہ سازی کی یہ صفت زوبی کی بیشتر تخلیقات میں نمایاں ہے۔ ان کی تصاویر کی اشکال نمک کا ستون معلوم ہوتی ہیں جنہوں نے مڑ کر دیکھا اور پتھروں میں تبدیل ہو گئیں۔

زوبی کی مستقل محویت نقاب پوش اشکال میں موجود ہے جو اظہار کی اس کوشش میں مصروف ہے کہ ان کو زمین پر پایہ زنجیر اتار لیا گیا ہے۔ اس کی اشکال، بے برگ و گیاہ اور بے رنگ منظر اور جھکے ہوئے محبوس آسمان کا ایک حصہ ہیں۔ زوبی نے جن کھلی ہوئی جگہوں کی تصویر بنائی ہے، ان میں آزادی کا اشارہ تک نہیں۔ اشجار یا پتوں کی کثرت یا ان کی نرمی و گداختگی اس بے سایہ آسیب زدہ زمین پر بے محل اور نامناسب لگیں گے۔ غالباً یہ ہر انسان کی باطنی دنیا کا خاص مقام ہے اور چونکہ یہ اشکال اس دنیا میں جڑ پکڑ چکی ہیں اور جو نہیں ہیں اس لیے ان میں ابتدائی دنیا کی چٹانوں جیسی طاقت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ تخلیق کی عارفانہ عبادت کا ایک جزو ہے۔ ان تصویروں کی اشکال میں جو خلقت نظر آتی ہے ان کو کسی اور پس منظر میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر انہوں نے اس اسلوب میں کسی اور حقیقت پسندانہ موضوعات کو پیش کرنے کی کوشش کی تو ان کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔ ان کی اشاریت کا طرز مصنوعی انسان کی اس سرزمین کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اشاریت کو لکیروں کی غیر معمولی کفایت شعاری، غیر جذباتی تلخ اور بے لوچ انداز میں تصویر کے قالب میں ڈھالا ہے۔

ان کا سیاہ و سفید رنگ، عارفانہ اور بعد الطبیعاتی تجربے کو اس مخصوص قسم کے اظہار کے لیے انتہائی مناسب ہے۔ اس کے علاوہ یہ مخصوص اظہار رنگ کے کمپوزیشن سے کہیں زیادہ مؤثر بھی ہے۔ حسب توقع انہوں نے تجریدی موضوعات مثلاً وقت، امید، آدم اور حوا، تخلیق، زندگی، انسانی رشتہ وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ یہ ساری تمثیلیں اس کی اس سنسان سرزمین کے لیے بہت موزوں ہیں جہاں روشنی مدھم ہے۔

ان کے اسلوب میں انفرادیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ بیک زبان پکار اٹھتے ہیں کہ یہ تصاویر زوبی ہی کی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ کسی فنکار کے بارے میں یہ خیال اس کی اہمیت کا عکاس ہے۔

ان کی تصاویر سے یہ بات نمایاں ہے کہ وہ بنیادی طور پر مجسمہ ساز ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی بیشتر تصاویر اسلوب اور جدت پسندی کی شاہکار ہیں (ان کی تصویر بعنوان "ماں اور بچہ" جدید روایت کی بھرپور شناخت ہے) انہوں نے پاکستان کے معروف دانشوروں کی شبیہ کو بھی پلاسٹر میں ڈھالنے کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ غالباً اس ملک میں زوبی ان تجربہ کار اور مشاق مجسمہ تراشوں میں سے ایک ہیں جو اس میدان میں فعال نظر آتے ہیں۔ افسوس کہ اکثر فنکاروں نے اس میدان میں کام کرنے سے غفلت برتی ہے۔   (۱۶ رمارچ ۱۹۵۸ء) ••

{ کراچی میں آذر زوبی کی تصاویر اور مجسموں کی یہ پہلی یک نفری نمائش ہے۔ نمائش میں جو تصاویر رکھی گئی ہیں ان میں آبی رنگ سے لے کر کانسی کی دھات تک کو مختلف اسلوب اور ذریعہ اظہار میں پیش کیا گیا ہے }

(AWAKENING) یہ تصویر ایک زندہ جاوید واقعے کی زندہ جاوید یادگار ہے۔
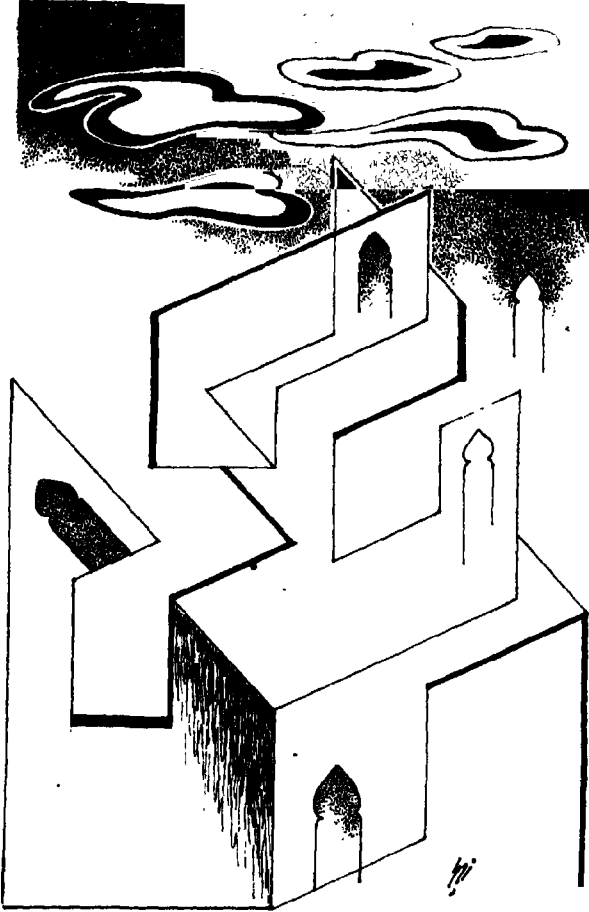
۱۶ رجولائی ۱۹۶۷ء ______________ فضل احمد کریم فضلی

جی۔ الانہ

— ترجمہ —

احمد امام

آزر زوبی
ایک مُصوّر
ایک ترجمان

قدیم یونان کی شان وشوکت، جاہ وحشمت، شاہانہ عظمت وجلالت اور رفعت کا تعلق، حکمرانوں کی وسیع وعریض مقبوضات بلند وبالا در وبام، پرشکوہ محراب ذی شان ایوان، دوامی شہرت اور عظمت رفتہ کی حامل ہے ۔ شان وشوکت اور عظمت میں غرابت رہ جاتی اگر اس کے لافانی دانش ور دمفکر اور شاعر نابینا ہومر وہاں پیدا نہ ہوتا۔ ہومر جو تمام عمر نان شبینہ کا محتاج رہا، لیکن موت نے جب اسے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تو وہ امر ہوگیا۔ حکومتوں کے عروج وزوال کے ہاتھوں قلعے اور دوسرے نشانات خاک میں مل جاتے ہیں، لیکن شاعر کا گیت، اس کے نغمات وقت کے تند وتیز دھاروں سے دھل کر امر لمحات میں داخل ہوجاتے ہیں۔ شیلی نے ہومر کے انسانی طرز فکر اور معمولات کو مد نظر رکھ کر اسی بناء پر کہا "یہ انسانی طرز عمل اور انداز فکر دنیا کا تسلیم شدہ قانون ہے"۔ محبت کی انگلیاں شاعر کے دل کے تاروں کو چھوتی ہیں تو اس سے پرسکون روح کو مرتعش کردینے والا نغمہ بیدار ہوتا ہے اور اس افتراق کو مٹا دیتا ہے جو چاہنے اور چاہے جانے والے پیدا کرتے ہیں۔

انسان کے گرد شاعری موجود ہے۔صرف یہ کہ اس خاموش شاعری کو سننے کے لیے قدرت سماعت چاہیے۔انسان کو اس کا ادراک ہو اور احساس ہو۔پرندے جو صبح کے وقت چہچہاتے ہیں، وہ شاعری کی مثال ہیں۔بادِ صبا کا نوشگفتہ پھولوں سے سلام و کلام ایک مکمل شاعری ہے یہی وہ لمحہ ہے جب شاعر کا دل نغمگی سے بھر جاتا ہے۔وہ امنگوں کی کشتی نغمگی کے سمندر میں ڈال دیتا ہے۔وہ صبح نوجو شاعر کے دل کے تاروں کو چھیڑتی اور بیدار کرتی ہے۔اس منظرنامے کی روشنی میں شاعر دنیا کا نظارہ کرنے لگتا ہے۔

حقیقی شاعر اپنی قوم، اپنے ملک کی تاریخی ابتری اور ناسازگار حالات سے آگاہ ہوتے ہوئے اپنے افکار کے اظہار کے گرد کوئی ہالہ نہیں بنا سکتا۔ان حالات میں خود کو ملک کے حالات سے آزاد اور علیٰحدہ نہیں رکھ سکتا۔اس کی سوچ، اس کی فکر اس کے خیال پر حقائق اور حالات کا اثر انداز ہونا از بس ضروری ہے۔شاعر توان چڑیوں کے مانند ہے جو زمانۂ قدیم سے اب تک پہاڑیوں کے اوپر، باغات کے گرد، اور کھلی فضا میں آسمان کے تلے امید و مسرت اور آزادی کی علامت بن کر اپنے پروں کو پھیلائے پھڑپھڑاتی اڑتی رہتی ہیں۔

شاعر پابہ زنجیر اور پابند سلاسل تو ہو سکتا ہے۔مگر اس کی سوچ پر نہ تو پہرے لگائے جا سکتے ہیں اور نہ اس کے پرواز فکر کو روکا جا سکتا ہے۔غالب کی زبان میں۔

نالہ پابند نے نہیں ہے
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

شاعر ذاتی غرض و غایت، شخصی بغض و عناد، تنازعات و نظریات سے بالاتر ہو کر انسان کے لیے سوچتا ہے۔سازگار ماحول خوشگوار اور آزاد فضا ہموار کرتا ہے۔مساوات و اخوت اور بین الاقوامی افہام و تفہیم کو اپنے افکار میں سموتا ہے۔انسان کی فلاح کے بارے میں سوچتا ہے۔اور اپنے کلام میں انسانیت کے فروغ کا علم بلند کرتا ہے۔غصب شدہ انسانی حقوق کے خلاف آواز بلند کر کے انسان کے حقوق کا طلب گار ہوتا ہے۔یہی فکر ہمارے قومی شاعر اقبال کی ہے۔یہی پیغام ان کی شاعری کی روح ہے۔اقبال کی زندگی دو مختلف خصوصیات کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ایک تو یہ کہ وہ ایک عظیم سیاسی مفکر تھے۔دوسرے عالمی شاعر ایسی خلاقانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔سیاسی مفکر کے ساتھ ساتھ ایک فعال سیاسی رہنما تھے شاعری کے تسکین آمیز اور کیف پرور خیالات ہمیشہ انکی حمایت اور تالیف قلب کا باعث بنے رہے جس کے ذریعہ وہ اپنے دلی جذبات کا اظہار برملا کرتے تھے۔اپنے کلام سے وہ عوام کو ان کے حالات جذبات اور احساسات کے عین مطابق پیغام دیتے رہے۔اقبال نے مکمل طور پر حالات سے متاثر ہو کر یہ باور کر لیا تھا کہ غیر ملکی (برطانوی) حکومت نے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواب آور گولیاں دے کر آسودہ حالی میں مبتلا کر دیا ہے اور مسلمانان ہند اپنے ناگفتہ بہ حالات پر صبر و شکر کے ساتھ کسی طور زندگی گذارنے پر مجبور تھے۔ان حالات سے متاثر ہو کر اقبال نے کہا۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اقبال نے انھیں باور کرایا کہ

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات

اقبال نے اپنی شاعری سے اپنے پرعزم سیاسی نظریات سے، فلسفیانہ تجاویز سے اور دانشمندانہ رہنمائی و رہبری سے لوگوں کے

دلوں میں گھر بنالیا' ان کے دلوں کو گرمایا اور خواب غفلت سے بیدار کیا۔

مطلوب الحسن سید نے اقبال کی نظم "شکوہ" کے کچھ حصّوں کا انگریزی میں نہایت کامیاب اور خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ اپنے اندر بے پناہ اثر لیے ہوئے ہے۔ وہ ترجمہ کیا ہے۔ افکار اقبال کی روح کے قریب سے قریب تر ہے۔ آزادی سے متعلق اقبال کے خیالات کی بھرپور عکاسی اس ترجمے سے ہوتی ہے۔ اقبال کے نزدیک آزادی ہر زاویہ نگاہ سے کائناتی اور کثیر المقاصد اور کثیر الجہت اندازِ فکر کی حامل ہے۔ ان کی نظر میں آزادی صرف طبعی دنیا تک محدود نہیں۔

اقبال کے نزدیک آزادی کائناتی اور شش جہت ہے۔ جس کا تعلق صرف مادی دنیا سے نہیں، بلکہ یہ تعلق لافانی ہے۔ آزادی ان کے نزدیک لامتناہی للکار ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ پستی کے خلاف ایک ڈھال بھی ہے۔ آزادی ایک فرد کو عظمت کی یاد دلاتی ہے اقبال کے نزدیک آزادی ایک آئینہ ہے۔ اقبال کے نزدیک حریت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں صرف فرد واحد کی صورت نظر نہیں آتی بلکہ کل کائنات کی تلاش و جستجو بھی ہے جو انسان کو اس کی کاملیت تک پہونچاتی ہے۔ اقبال کے نزدیک آزادی کا مفہوم انسان کی حاکمیت ہے۔ آزادی انسان کے اندر کی آواز ہے۔ دلائل و براہین اور منطق سے دور بہت دور

باغ میں چٹکتی ہوئی کلیاں' کھلا ہوا گلاب جو اپنے جلو میں ایک پاؤں پر رقص کرتی ہوئی رقاصہ کا سماں پیش کر رہا ہو' ایسا دل فریب منظر مختلف ذہنوں پر مختلف نقش چھوڑے گا۔ ایک عام انسان کے دل و دماغ کے گوشے میں اس منظر سے کوئی خاص تاثر نہیں ابھرے گا۔ وہ اسے دیکھ کر نظر انداز کرتے ہوئے گذر جائے گا۔ اس کے برعکس ایک شاعر کا تاثر بہر نوع اس سے بے حد مختلف ہوگا۔ کائنات کے اس آئینے میں شاعر کو گلاب کی تصویر قدرت کی خدائی اور عظمت کے طور پر نظر آئے گی۔ آفاق میں پھولوں کی پنکھڑیوں کا ارتعاش پرسکوت اور خاموش فضا میں نغمگی اور موسیقی بکھیر دے گا۔

عت
یہ نور یہ حسن اور زاویہ نگاہ کو سمجھنے کا شعور عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ صرف وہ حساس ذہن' پرکار نگاہ اور قوت سماعت' بصیرت و بشارت رکھنے والا شاعر ہی اس کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے جو ایک حقیقی شاعر کا طرہ اور طرۂ امتیاز ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ شاعر کا گیت ہر ایک پر یکساں اثر اور نقش نہیں چھوڑتا۔ مختلف طبیعتوں کے مالک انسانوں پر اثرات بھی اُس کے مزاج اور طبیعت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان مختلف النوع طبیعت کا مالک ہے۔ کچھ لوگ لفظوں کا پیغام سمجھ جاتے ہیں۔ لیکن اس کی روحانی وسعتوں اور رفعتوں تک نہیں پہونچ سکتے۔ ایک بڑی تعداد لوگوں کی ایسی بھی ہے جو اس کے صوفیانہ اور روحانی اسرار و رموز پر غور کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔

اس کے برخلاف ایک خلاق مصور جو رنگوں اور لکیروں کی مدد سے تصویر اور خیالات کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ شاعر کے دل میں جھانکنے کا ایک منفرد انداز رکھتا ہے۔ اس کے پیغام کو روشناس کرانے کا ایک جداگانہ طرز اختیار کرتا ہے۔ اس کی دو مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اول عمر خیام' کے لافانی رباعیات جسے ایران کے مسلم الثبوت مصوروں نے رنگوں اور لکیروں کی مدد سے اجاگر کر کے زندہ جاوید بنا دیا۔ یہ زندہ جاوید حقیقت ایرانی ثقافت کا ایک قدیم سرمایہ ہے۔ مصوروں نے خوبصورت لکیروں' جاذب نظر رنگوں اور بھرپور سچائی کے ساتھ شاعر کے جذبات و احساسات کی عکاسی کی ہے۔

ہمارے یہاں عظیم مصور عبدالرحمٰن چغتائی نے غالب کے چیدہ چیدہ اشعار کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے چغتائی ہی کی طرح آذر زوبی بھی ایک نوجوان ہمہ گیر مصور ہے جس نے ان لافانی مصوروں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اقبال کے کلام کو اپنی تخلیقی عمل اور پرکار برش کی مدد سے اس کے شاعرانہ جذبات کو لکیروں سے ابھار کر رنگوں سے مزین کر کے حسن کے قلب میں سمو دیا ہے۔ آذر زوبی بیک وقت

پاکستان کا اچھا مصور، سنگ تراش، مجسمہ ساز اور بہترین خطاطوں میں سے ایک خطاط ہے۔ مصوری اس کی رُوح، اس کی دنیا، اس کی کائنات اور طبیعت کا خاصا ہے۔ وہ پاکستان کے چند ایک خوش نصیب مصوروں میں سے ہے جس نے روم جاکر مصوری کی تعلیم باقاعدہ حاصل کی اور حُسن کی دیوی کے اس عظیم دربار میں اپنے فن کی تکمیل کے لیے دنیا بھر سے آئے ہوئے مصوروں کے ہمراہ تکمیل فن کے ساتھ ساتھ نذرانہ عقیدت پیش کیا۔

آذر زوبی ذہانت و ذکاوت کا نایاب ترین مجموعہ ہے۔ آذر زوبی نے اقبال کے کلام، پیام، افکار اور روحانی خیالات کے سربستہ اور نہفتہ رموز و اسرار اور مضمرات کو سمجھا اور شاعر کی روح کی گہرائیوں میں اتر کر ڈوب کر جھانک کر اس کے اشعار کے ایک ایک پہلو کو رنگوں اور لکیروں کی مدد سے اُجاگر اور نمایاں کیا۔ اقبال کی عظیم بیانیہ نظم "شکوہ" کے اندر چھپے ہوئے پیغام جو اللہ کے آگے انسانوں کی بے بسی کو ظاہر کرتا ہے۔ آذر زوبی نے اسے طبعی طور پر اُجاگر کر کے دکھایا ہے۔ پنسل کے نشانات سُر کے زیر و بم اور سُر کے سفر کی طرح مدھم پڑتے پڑتے آفاقی حدود اور خلاء میں معدوم ہو جاتے ہیں اور کہیں اپنے برُش کے گہرے نقوش سے نغمگی، جزبیاتی تاثر اور وجدان کا کام لیا ہے۔ یہ کیفیات شاعر کے لازوال اور لافانی خیالات کے منظر میں انسان کی روح کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ آذر زوبی کے نقش و نگار میں گہرائی ہے۔ گیرائی ہے، پذیرائی ہے، رعنائی ہے، تناسب ہے، قلبی لگاؤ ہے، اسرار ہے، صوفیانہ رموز ہے۔ طبعی طور پر اقبال کے کلام کو آذر زوبی کی روح نے پرکھا اور سمجھا ہے۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آج کے ترقی یافتہ انسان کی روح کا بسیرا کل تک ایک فرشتہ صفت معصوم بچے میں تھا۔

بچپن میں اقبال کا "شکوہ" پڑھنے کے بعد آذر زوبی کے معصوم ذہن نے جو تاثر لیا ہوگا اور جو نقش قبول کیا ہوگا وہ آج کے پختہ تجربہ کار خلاق مصور کے تصورات و تاثرات سے بہت مختلف ہوگا۔ خیالات اور تاثرات کے کارواں میں عملی پختگی اور طبعی تجربات بھی دھیرے دھیرے در آئے ہوں گے اور شامل تاثرات ہوتے گئے۔ سب سے اہم اور ضروری چیز یہ ہے کہ انسان شاعر کی طرح طبعی تجربات کی روشنی میں اپنی روح کی گہرائیوں کو سننے، پہچانے، چنانچہ آذر زوبی نے بھی اپنے خیالات کو اس تخلیقی عمل میں اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیا۔ اقبال کے شکوہ کے اسرار و رموز کو جاننے اور سمجھنے کے لیے انتھک محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہے تاکہ شاعر کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر اس کا عرفان حاصل کر سکے اور ان کے چھپے ہوئے پیغامات کو واضح طور پر پوری پاکیزگی اور طہارت کے ساتھ جاذب نظر رنگوں اور لکیروں کے ذریعے صفحۂ قرطاس پر منقش کر سکے۔

اس طرح زوبی نے اپنی ہمہ گیریت خلاقانہ عمل، اور تخلیقی صلاحیت کے ذریعے اقبال کی بیانیہ نظم "شکوہ" کو پُرشکوہ بنا دیا ہے۔

جس کی بنا پر اب کوئی آذر زوبی سے شکوہ نہیں کر سکتا کہ اُس نے اقبال کو نہیں سمجھا۔ مختصراً آذر زوبی کی لکیر اور رنگ سے مزین تمام عظیم بیانیہ نظم "شکوہ" کی عکاسی ان بڑی بڑی ضخیم کتابوں سے بدرجہا بہتر اور عمدہ ہے جو اس عظیم قومی شاعر کے سلسلے میں لکھی جا رہی ہیں، اب تک لکھی گئی ہیں۔

آذر زوبی کی درسگاہِ فن آج کل کے دشتِ ثقافت میں شاداب نخلستان کے مانند ہے جہاں ہر سال حُسن و خوبی کے طالب و طالبات شائستہ نگاہ اور مستفید فن بن کر نکلتے ہیں۔ ان کی یہ کاوش جس قدر مقبول ہے اس سے زیادہ مستحسن ہے۔

ع اللہ کرے زورِ ہنر اور زیادہ

۲۶ جنوری ۱۹۸۴ء ——— فیض احمد فیض

ممتاز مفتی

آذر زوبی

اشفاق نے کہا اس سے ملو یہ آذر زوبی ہے پاکستان کا جانا پہچانا مصوّر ۔

میرے سامنے گٹھے ہوئے جسم چھوٹے قد کا آدمی کھڑا تھا عمر کچھ زیادہ نہ تھی ۔ چہرے پر مڈیا کر کی چھاپ لگی ہوئی تھی ۔ دیکھنے میں اس قدر مستعد نظر آتا تھا جیسے کسی فرم کا نائب ایگزیکٹو ہو ۔ چہرے پر سنجیدگی کا واضح غبار تھا ۔ ہونٹوں پر ایک شگفتہ، تازہ، ہر دم تیار مسکراہٹ تھی جیسے اسٹریٹ واکرز میں ہوتی ہے ۔

اسے دیکھ کر میں بہت مایوس ہوا ۔ کیا جانے پہچانے مصور اس چوکھٹے کے مالک ہوتے ہیں ۔ پہلے اپنا چوکھٹہ تو ٹھیک کرے اور پھر نام آذر زوبی ۔ بالکل ہی بدیشی قسم کا ۔

یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے جب ہم تازہ تازہ دیس سے نکالے جانے کے بعد لاہور میں آ مقیم ہوئے تھے ۔ نوکری ملتی نہ تھی ۔ باورچی خانے میں چولہا ٹھنڈا پڑا تھا ۔ صرف پاکستان کے بن جانے کے نشے پر گزارہ کر رہے تھے ۔ کام کاج تھا نہیں لنڈورے پھرتے تھے

اتنی عقل نہ تھی کہ ری ہیلیبیشن کے دفتر کے چکر لگاتے۔

انہی دنوں اشفاق سے کیمپ میں ملاقات ہوئی تھی تھا تو پٹھان لیکن دیکھنے میں کشمیری نظر آتا تھا۔ اب اشفاق کے دوستوں تک نوبت آ پہنچی تھی۔

ان دنوں اشفاق، کورا اشفاق تھا۔ نہ ریڈیو نہ ٹی وی نہ ادب ا ———— خود فین تھا ———— ۵۰·

بڑا زندہ دل ساتھی تھا۔ ہر وقت مسرت کی پھوار نکلتی تھی جو گرد و پیش کو بھگو دیتی تھی۔ شہرت کتنی ظالم چیز ہے جو کلفی جما دیتی ہے۔

زوبی کی آمد سے ہماری تگڑی بن گئی۔ اشفاق کی پھوار میں مستی آ گئی۔ زوبی کے جوہر کھلے۔

زوبی کی آمد سے پہلے ہم روز اشفاق کے گھر میں ملا کرتے تھے۔ اشفاق کا گھر روایتی پٹھان کا گھر تھا۔ بڑے خان کے پاؤں کی آہٹ سن کر اس وسیع و عریض فیملی پلاننگ سے بے نیاز گھر پر سناٹا چھا جاتا تھا۔ بڑے خان کی مرضی کے بغیر وہاں پتہ نہیں ہلتا تھا۔ وہاں اشفاق کی پھوار کمیٹی کا نلکا بن کر رہ جاتی تھی۔

زوبی کی آمد پر ہمیں ہلڑ مچانے کے لیے ایک وسیع و عریض جگہ مل گئی جہاں کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ کسی بلی کا خوف نہ تھا سوچ ہے ناچے۔ ان دنوں لاہور کے حاکم نے اوپن ایئر تھیٹر جو لارنس باغ میں واقع ہے زوبی کو دے رکھا تھا۔ زوبی وہاں تصویریں بنایا کرتا تھا اشفاق ہلڑ مچاتا۔ میں واحد ناظر سامع۔

وہاں جا کر پتہ چلا کہ زوبی کے دو چہرے ہیں۔ ایک سنجیدہ۔ بدرنگ۔ حاکمانہ۔ اکتایا ہوا۔ نکتہ چین۔ دوسرا مسکراہٹ بھرا۔ رنگدار چلبلا۔ جگت بھرا۔ شرارت سے بھرپور۔ ایڈونچر زدہ۔ پہلا چہرہ بنیادی تھا۔ دوسرا اگرچہ ویک اینڈ چہرہ تھا لیکن بھرپور اظہار سے عاری۔ چق پیچھے کھڑی دوشیزہ کی طرح جھلک دکھاتا پھر چھپ جاتا۔ کبھی حنائی انگلی ابھرتی۔ کبھی کالی آنکھ۔ کبھی متبسم ہونٹ۔ کبھی رنگ دار پلا۔ کبھی اڑتی لٹ۔

آج بھی زوبی کی شخصیت کا ناک نقشہ وہی ہے۔ پھیکا پھیلا ہوا اداس گرے آسمان جس پر کبھی کبھی تارے ٹمٹما جاتے ہیں۔ یہ چمکا۔ وہ چمکا۔ ادھر پھلجھڑی چلی۔ ادھر مہتابی شوں سے نکل گئی۔ دور سے دیکھو تو وہ ایک سیانا بیانا۔ ضرورت سے زیادہ ٹھہرا ہوا۔ اکتایا ہوا۔ دو اور دو چار قسم کا فرد ہے۔ قریب جا کر گھونگھٹ اتار دو تو متبسم۔ رنگیلا۔ شریر۔

اوپن ایئر تھیٹر میں پہنچا تو زوبی کے متعلق ایک اور بھید کھلا۔ اتنا حیران ہوا کہ بالکل ہی فیوز ہو کر رہ گیا۔

ان دنوں میں جنسیات کا طالب علم تھا اور اس موضوع پر خود کو بڑا پاٹے خان سمجھتا تھا۔ جنس کی بات چھڑ جاتی تو میرا ہاتھ اُن جانے میں مونچھ مروڑنے لگتا۔ گرد و پیش کے حاضرین کبڑے ہو جاتے۔ گلیور ابھرتا ابھرے جاتا لیکن اوپن ایئر تھیٹر میں زوبی کو دیکھ کر گلیور کا غبارہ پھٹ گیا۔ چھیچھڑا باقی رہ گیا۔

اوپن ایئر تھیٹر میں بیگمات محترمائیں اور کالج کی لڑکیاں اکثر آیا کرتی تھیں وہ سب زوبی کی فین کی حیثیت سے آتیں اور اس کے بنائے ہوئے مجسمے اور نقوش دیکھتی رہتیں۔

ان آنے جانے والیوں کی طرف زوبی کچھ زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا وہ اپنے کام میں مصروف رہتا۔ ان کی باتوں کے جواب میں کبھی کبھی دبی آواز میں ادھورا سا کاٹ دار جملہ چلا دیتا اور ہلکی سی ادھوری مسکراہٹ جھلکاتا۔ گویا ایک ساعت کے لیے بوتل کھلتی بلبلا اٹھتے اور پھر مطلع سکوت آلود ہو جاتا۔

مجھے اس بات پر بڑا غصہ آتا تھا۔ رہا اوت کا اوت گھر آئی دلکشی کی یہ بے قدری۔ کچھ توجہ دے آنکھ لشکائے نگاہ گرمائے۔ بھس میں چنگاری چھوڑے۔ بھانبھڑ لگے۔ اسے تاپے۔ ظالم اپنے اردگرد ٹھنڈ پھیلائے بیٹھا رہتا ہے۔ تخ۔ احمق کہیں کا۔ معصور کم کم نظر آتا ہے پہلوان زیادہ ۔۔

پھر ایک روز میری عقل پر پڑا ہوا پردہ اٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ہر آنے والی خود کو چینی کی پلیٹ میں ڈالے دیوتا کی بھینٹ کرنے آتی ہے اور درگاہ پر خود کا چڑھاوا چڑھا کر خوشی خوشی گھر لوٹ جاتی ہے اور دیوتا مہاراج یوں من مست بیٹھے رہتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ یہ طریقۂ واردات میرے لیے بالکل انوکھا تھا۔۔

اس انکشاف پر مجھے ازسرِ نو غصہ آنے لگا۔ ساری بات میرے پلے پلی جوڑے ہوئے علم کے منافی تھی۔ گاڑھے پسینے کے کمائے ہوئے میرے سارے جنسیات کے اصول صابن کے بلبلوں کی طرح جھاگ بن کر رہ گئے۔ اس گھٹے ہوئے پہلوانی جسم بے کشش سیڈیا کر شکل کے فرد میں وہ کیا گیدڑ سنگھی ہے کہ محترمائیں خود کو تھالی میں پروس کر ہتھیلی پر سجا کر اتنی دور سے چل کر یہاں آتی ہیں۔۔

یہ معما حل نہ کر سکا ۔۔ آج تک نہیں کر سکا۔

پھر۔ جب میں نے زوبی کے گھر آنا جانا شروع کیا تو الٹا یہ معما اور بھی پیچیدہ ہو گیا۔۔

بیڈن روڈ پر زوبی کا گھر ایک عام سا گھر تھا۔ باہر بیٹھک تھی۔ اندر پتہ نہیں کیا کیا تھا۔ بیٹھک کو اس نے اسٹوڈیو بنا رکھا تھا۔ دیواروں پر زوبی کے بنے ہوئے عمل آویزاں تھے۔ ایک طرف اس کا ورکنگ ڈیسک تھا۔

اس کے گھر میں اکثر نوجوان لڑکیاں مہمان بن کر آیا کرتی تھیں اور وہاں قیام کرتیں ۔

جب کبھی کوئی لڑکی یا محترمہ مہمان بن کر گھر آتی تو گھر کی جملہ خواتین بڑی توجہ اور اہتمام سے ایسی صورت حال پیدا کرتیں کہ مہمان خود کو تھالی میں پروس کر دیوتا کی بھینٹ کیے بغیر واپس نہ جا سکے ۔۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ والدہ اور بیوی دونوں ہی اس حسن اہتمام میں شامل ہوتیں۔ اس کھیل میں سب سے زیادہ بے تعلق اور بے نیاز خود دیوتا ہوتا۔

گھر میں زوبی واقعی مندر کا دیوتا سمان مانا جاتا تھا وہ گھر میں کم بولتا۔ طنز کا ایک ہلکا پتھر چلا کر چپ ہو جاتا۔ پھر گھر کے تالاب میں لہریں چلتیں۔ چلتی رہتیں ۔

محفل میں بھی وہ کم بولتا۔ سنجیدگی کا پس منظر چھائے رہتا جس میں کبھی کبھار ایک پھلجھڑی سی شوں کر کے چل جاتی ۔۔

زوبی میں مزاح کی بڑی صلاحیت ہے اس کے چھوٹے ادھورے مختصر جملوں میں بلا کی شگفتگی ہے۔ کبھی کبھار وہ طنز کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں لیکن اُن کی دھار میں کاٹ کی نسبت شگفتگی زیادہ ہوتی ہے۔

سنجیدگی اور خاموشی زوبی کے ہاتھ کا بہت بڑا ہتھیار ہیں اس کی بے نیازی اور سوداٹ ان کی دھار کو مزید تیز کر دیتے ہیں۔ زوبی ایک ایسی کلی ہے جو چٹک کر پھر سے بند ہو جاتی ہے۔ یہ تنک بخشی اس کی کشش کو قائم رکھتے ہیں۔ چاہے وہ آپ کا کتنا پرانا دوست بھی کیوں نہ ہو یہ تعلق سیری پیدا نہیں کرتا تشنگی قائم رہتی ہے ۔۔

مزاح کے علاوہ وہ کڑوی سے کڑوی تلخ سے تلخ بات یوں بے جھجک کہہ دیتا ہے جیسے شربت کا گھونٹ پی رہا ہو۔ سچی بات کہنے سے نہیں چوکتا۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سخت بے لحاظ آدمی ہو۔

زوبی کے ساتھ رہ کر جلد ہی احساس ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت میں ایک شوّر تھوتھنی اٹھائے بیٹھا ہے اگرچہ کبھی کبھار تھوتھنی باہر نکالتا ہے لیکن وہ ہر وقت باہر نکلنے کے لیے مستعد رہتا ہے۔

مثلاً ان دنوں زوبی کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ وہ گھر بیٹھ کر کمرشل کام کرتا تھا۔ اسے کہیں جا کر کام مانگنا گوارا نہ تھا۔ چولھا ٹھنڈا ہونے کے امکانات بڑھتے جاتے۔ گھر والے گھبرا جاتے لیکن وہ اطمینان سے بیٹھا رہتا۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

کوئی گاہک کمرشل کام لے کر آتا تو وہ اسے خاص توجہ نہ دیتا۔ آؤ بھگت نہ کرتا۔ ٹھنڈا سا ہاتھ ملا کر بٹھا دیتا اپنے کام میں مصروف ہو کر بے پروائی سے پوچھتا کہو۔

ان دنوں بازار میں کمرشل آرٹسٹ کتاب کا سرورق بنانے کے پچیس روپے لیتے تھے لیکن زوبی نے پینسٹھ روپے ریٹ مقرر کر رکھا تھا جس میں سے وہ ایک روپیہ کم کرنے پر تیار نہ ہوتا۔ وہ سودا بازی کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ اس کا انداز کچھ ایسا ہوتا کہ کام دینا ہے تو دے جاؤ نہیں تو جاؤ۔ یہاں بیٹھے میرا منہ کیوں دیکھ رہے ہو۔

ایک دن مجھے علم تھا کہ گھر میں دھول اڑ رہی ہے۔ جب اس نے اسکیچ کے پینسٹھ روپے بتائے اور کہا پینسٹھ ہی ہوں گے۔ بنواؤ یا نہ بنواؤ اور گاہک اٹھ کر چلا گیا تو میں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گیا۔

میں نے کہا۔ کوئی عقل کی بات کر۔

کیوں — میں نے بے عقلی کی بات کی ہے کیا؟

تو نے گاہک کو لوٹا دیا ہے۔

نہ — میں نے تو نہیں لوٹایا۔

یہ کیا دوکان داری کا اصول ہے۔

اچھا — میں کیا دوکان دار ہوں؟

تو نہیں کیا۔

میں نے خود کو کبھی دوکان دار نہیں سمجھا۔

کیا سمجھتے ہو۔

بھئی میں آرٹسٹ ہوں۔

بازار میں آرٹسٹ سرورق کے پچیس روپے لیتے ہیں۔

بسم اللہ پڑے لیں۔ مجھے کوئی آبجکشن نہیں۔

تو اپنے ریٹ کم کیوں نہیں کرتا!

نہ مفتی فکسڈ ریٹ۔

پتہ ہے گھر میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔

اچھا — چوہا مار دوا منگوا لیں گے۔

چوہے مار کہاں سے منگوائے گا گھر میں آٹا نہیں۔ روٹی کیسے پکے گی۔ کھائے گا کیا؟

مجھے اس بات پر بڑا غصہ آتا تھا۔ رہا دت کا ادت گھر آئی لکشمی کی یہ بے قدری۔ کچھ تو جہ دے' آنکھ لشکائے نگاہ گرمائے۔ بھس میں چنگاری چھوڑے۔ بھانبھڑ لگے۔ اسے تاپے۔ ظالم اپنے اردگرد ٹھنڈ پھیلائے بیٹھا رہتا ہے۔ ہُنہ۔ احمق کہیں کا۔ معبور کم کم نظر آتا ہے پہلوان زیادہ۔

پھر ایک روز میری عقل پر پڑا ہوا پردہ اٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ہر آنے والی خود کو چینی کی پلیٹ میں ڈالے دیوتا کی بھینٹ کرنے آتی ہے اور درگاہ پر خود کا چڑھاوا چڑھا کر خوشی خوشی گھر لوٹ جاتی ہے اور دیوتا مہاراج یوں من مست بیٹھے رہتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ یہ طریقۂ واردات میرے لیے بالکل انوکھا تھا۔

اس انکشاف پر مجھے از سر نو غصہ آنے لگا۔ ساری بات میرے پلی پلی جوڑے ہوئے علم کے منافی تھی۔ گاڑھے پسینے کے کمائے ہوئے میرے سارے جنسیات کے اصول صابن کے بلبلوں کی طرح جھاگ بن کر رہ گئے۔ اس گھٹے ہوئے پہلوانی جسم بے کشش میڈیا کر شکل کے فرد میں وہ کیا گیدڑ سنگھی ہے کہ محترمائیں خود کو تھالی میں پروس کر ہتھیلی پر سجا کر اتنی دور سے چل کر یہاں آتی ہیں۔

یہ معما حل نہ کر سکا — آج تک نہیں کر سکا۔

پھر۔ جب میں نے زوبی کے گھر آنا جانا شروع کیا تو الٹا یہ معما اور بھی پیچیدہ ہو گیا۔

بیڈن روڈ پر زوبی کا گھر ایک عام سا گھر تھا۔ باہر بیٹھک تھی۔ اندر پتہ نہیں کیا کیا تھا۔ بیٹھک کو اس نے اسٹوڈیو بنا رکھا تھا۔ دیواروں پر زوبی کے بنے ہوئے عمل آویزاں تھے۔ ایک طرف اس کا ورکنگ ڈیسک تھا۔

اس کے گھر میں اکثر نوجوان لڑکیاں مہمان بن کر آیا کرتی تھیں اور وہاں قیام کرتیں۔

جب بھی کوئی لڑکی یا محترمہ مہمان بن کر گھر آتی تو گھر کی جملہ خواتین بڑی توجہ اور اہتمام سے ایسی صورت حال پیدا کرتیں کہ مہمان خود کو تھالی میں پروس کر دیوتا کی بھینٹ کیے بغیر واپس نہ جا سکے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ والدہ اور بیوی دونوں ہی اس حسن اہتمام میں شامل ہوتیں۔ اس کھیل میں سب سے زیادہ بے تعلق اور بے نیاز خود دیوتا ہوتا۔

گھر میں زوبی واقعی مندر کا دیوتا سماں مانا جاتا تھا وہ گھر میں کم بولتا۔ طنز کا ایک ہلکا پتھر چلا کر چپ ہو جاتا۔ پھر گھر کے تالاب میں لہریں چلتیں۔ چلتی رہتیں۔

محفل میں بھی وہ کم بولتا۔ سنجیدگی کا پس منظر چھائے رہتا جس میں کبھی کبھار ایک پھلجھڑی سی شوں کر کے چل جاتی۔

زوبی میں مزاح کی بڑی صلاحیت ہے اس کے چھوٹے ادھورے مختصر جملوں میں بلا کی شگفتگی ہے۔ کبھی کبھار وہ طنز کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں لیکن اُن کی دھار میں کاٹ کی نسبت شگفتگی زیادہ ہوتی ہے۔

سنجیدگی اور خاموشی زوبی کے ہاتھ کا بہت بڑا ہتھیار ہیں اس کی بے نیازی اور سود اٹ ان کی دھار کو مزید تیز کر دیتے ہیں۔ زوبی ایک ایسی کلی ہے جو چٹک کر پھر سے بند ہو جاتی ہے۔ یہ تنک بخشی اس کی کشش کو قائم رکھتے ہیں۔ چاہے وہ آپ کا کتنا پرانا دوست بھی کیوں نہ ہو یہ تعلق سیری پیدا نہیں کرتا تشنگی قائم رہتی ہے۔

مزاح کے علاوہ وہ کڑوی سے کڑوی تلخ سے تلخ بات یوں بے جھجک کہہ دیتا ہے جیسے شربت کا گھونٹ پی رہا ہو۔ سچی بات کہنے سے نہیں چوکتا۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سخت بد لحاظ آدمی ہو۔

زوبی کے ساتھ رہ کر جلد ہی احساس ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت میں ایک شوریدہ تمکنت اٹھائے بیٹھا ہے اگرچہ کبھی کبھار تمکنت باہر نکالتا ہے لیکن وہ ہر وقت باہر نکلنے کے لیے مستعد رہتا ہے۔

مثلاً ان دنوں زوبی کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ وہ گھر بیٹھ کر کمرشل کام کرتا تھا۔ اسے کہیں جا کر کام مانگنا گوارا نہ تھا۔ چولہا ٹھنڈا ہونے کے امکانات بڑھتے جاتے۔ گھروالے گھبرا جاتے لیکن وہ اطمینان سے بیٹھا رہتا۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

کوئی گاہک کمرشل کام لے کر آتا تو وہ اسے خاص توجہ نہ دیتا۔ آؤ بھگت نہ کرتا۔ ٹھنڈا سا ہاتھ ملا کر بٹھا دیتا اپنے کام میں مصروف ہو کر بے پروائی سے پوچھتا کہو۔

ان دنوں بازار میں کمرشل آرٹسٹ کتاب کا سرورق بنانے کے پچیس روپے لیتے تھے لیکن زوبی نے پینسٹھ روپے ریٹ مقرر کر رکھا تھا جس میں سے وہ ایک روپیہ کم کرنے پر تیار نہ ہوتا۔ وہ سودا بازی کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ اس کا انداز کچھ ایسا ہوتا کہ کام دینا ہے تو دے جاؤ نہیں تو جاؤ۔ یہاں بیٹھے میرا منہ کیوں دیکھ رہے ہو۔

ایک دن مجھے علم تھا کہ گھر میں دھول اڑ رہی ہے۔ جب اس نے اسکیچ کے پینسٹھ روپے بتائے اور کہا پینسٹھ ہی ہوں گے۔ بنواؤ یا نہ بنواؤ اور گاہک اٹھ کر چلا گیا تو میں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گیا۔

میں نے کہا۔ کوئی عقل کی بات کر۔

کیوں — میں نے بے عقلی کی بات کی ہے کیا؟

تو نے گاہک کو لوٹا دیا ہے۔

نہ — میں نے تو نہیں لوٹایا۔

یہ کیا دوکان داری کا اصول ہے۔

اچھا — میں کیا دوکان دار ہوں؟ —

تو نہیں کیا —

میں نے خود کو کبھی دوکان دار نہیں سمجھا۔

کیا سمجھتے ہو —

بھئی میں آرٹسٹ ہوں —

بازار میں آرٹسٹ سرورق کے پچیس روپے لیتے ہیں —

بسم اللہ بڑے لیں۔ مجھے کوئی آبجکشن نہیں —

تو اپنے ریٹ کم کیوں نہیں کرتا!

نہ مفتی فکسڈ ریٹ —

پتہ ہے گھر میں چوہے دوڑ رہے ہیں —

اچھا — چوہا مار دوا منگوا لیں گے —

چوہے مار کہاں سے منگوائے گا گھر میں آٹا نہیں۔ روٹی کیسے پکے گی۔ کھائے گا کیا؟

اچھا۔ تو نہیں کھائیں گے۔
پاگل ۔بھوکا رہے گا کیا !
کوئی نئی بات نہیں۔ مجھے عادت ہے۔
کیا مطلب !
زندگی میں کئی کئی دن بھوکا رہا ہوں
لیکن تیرے گھروالے۔ بچے۔
وہ میرے بچے ہیں۔ میرے۔
آپ زدہی سے کبھی بحث نہیں کرسکتے۔ وہ جوش میں نہیں آتا غصے میں نہیں آتا۔ ٹھنڈے ادھورے جملوں سے آپ کے ولیلی وار کو بے اثر کردیتا ہے۔
مثلاً اوپن ایئر تھیٹر سے پردسی تھالی کی بھینٹ دینے کے بعد جب محترمہ رخصت ہوجاتی تو میں پوچھتا۔
یار یہ تو بڑی بانکی تھی۔
اچھا۔ بانکی تھی کیا ؟
بڑا کڑاکا تھا اس میں۔
کڑاکا　اور کیا تھا !
ہاٹ اینڈ اسموکنگ تھی
اچھا۔
تجھے پتہ نہیں چلا۔
نہیں۔
تو جلا نہیں۔
نہیں۔
کیسی لگی تجھے۔
بس عورت تھی۔
کوئی خاص تاثر۔
اونہوں۔ عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔
تجھے کبھی کسی کی لگن نہیں لگتی۔
اونہوں۔
کچھ نہیں ہوتا۔
بس آتی ہیں چلی جاتی ہیں۔

کچھ پیچھے چھوڑ جاتی ہیں کیا!

ہاں۔ اک بُو سی چھوڑ جاتی ہیں۔

تیرا مطلب ہے خوشبو۔

نہیں بُو۔ تلخ سی۔

پھر اوپن ایر میں ایک لڑکی آئی۔ اس کے ہاتھ خالی تھے۔ نہ تھالی۔ نہ بھینٹ۔ نہ آرتی نہ پھول۔ دیوتا چونکا۔ یہ کیسی پجارن تھی۔ جو ہمارا ایمان کر گئی۔ وہ کرودھ میں آگیا۔ اپنے سنگھاسن سے اُترا۔ ترکش اٹھا کر سارے تیر آزما دیکھے۔ پھر بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا تو سارا کلف اُتر گیا نیچے سے انسان نکل آیا۔ بے چارہ بے بس انسان منتوں پر اُتر آیا۔ آہ و زاری کی۔ سیس نوایا۔ سب بے کار۔ اس پر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا اور دیر تک اپنے ٹکڑے چنتا رہا۔

اس پر مجھے اتنی خوشی ہوئی جیسے انتقام پایۂ تکمیل پہنچ گیا ہو۔ پتہ نہیں کیوں جب بھی کوئی بت ٹوٹے تو مجھے اَن جانی خوشی محسوس ہوتی ہے۔

مجھ میں نقد و نظر کا خانہ سرے سے خالی ہے۔ زوبی کے عمل دیکھتا رہتا۔ چند ایک نقوش نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ جب بھی اس کے کسی عمل نے مجھے متاثر کیا تو میری توجہ عمل سے ہٹ کر اس بات پر مرکوز ہو جاتی کہ یا اللہ اس پہلوان نما میٹرا کر نظر آنے والے شخص میں اتنی گہرائی کہاں سے آئی۔ اتنی اَن جانی دانش۔ اتنی انٹوشن۔

حسیات کی بنا پر میں اپنے دوستوں کی نسبت بڑا بدقسمت آدمی ہوں۔ اشفاق احمد میری نسبت زیادہ سنتا ہے۔ زوبی زیادہ دیکھتا ہے۔ بانو قدسیہ زیادہ محسوس کرتی ہے۔ احمد بشیر میں میری نسبت بہت زیادہ ذہنی چمک ہے۔ میرا بیٹا عکسی میری نسبت زیادہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے، اور قدرت اللہ شہاب وہ تو ہم سب سے زیادہ دیکھتا اور زیادہ سنتا ہے۔

جب میں نے زوبی کے عمل "ماں" کو دیکھا تو تڑپ کر رہ گیا۔ وہ کوکھ ہی کوکھ تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ساری دنیا اس کوکھ میں یوں سما گئی تھی جیسے اَن زائیدہ بچہ ہو۔ میں حیران ہوتا تھا کہ مصور کا ایک اَن پڑھ پہلوان نما الھڑ لڑکا اتنی عظیم حقیقت کو چند لکیروں میں کہہ دے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ لیکن بات میرے سامنے دھری تھی۔

اوپن ایئر تھیٹر میں پھر زوبی نے ہمارے بت بنانے شروع کر دیے۔ سب سے پہلے اس نے میرے کہنے پر فیاض محمود کا بت بنایا۔ فیاض محمود میرا گرائیں تھا۔ بٹالے کا رہنے والا تھا وکیلوں کے خاندان سے تھا جس کی سب عزت کرتے تھے۔ پھر کالج میں ہم اکٹھے کریسنٹ ہاسٹل میں رہتے تھے۔ اس کے بعد ہم نے مل کر ایک لاج کرائے پر لے لیا۔ فیاض محمود بہت پڑھا لکھا تھا، میں اَن پڑھ تھا۔ میرا مطالعے کا شوق فیاض کی وجہ سے ہوا۔ اُس نے دیا جلایا۔

اس دور میں فیاض نے بڑے اعلےٰ افسانے لکھے پھر وہ ایئر فورس میں چلا گیا۔

پارٹیشن کے بعد فیاض ہمارا افسر بن گیا۔

زوبی نے جب اس کا مجسمہ بنایا تو میں حیران رہ گیا۔

یہ کیا بنا دیا تو نے۔

مجسمہ۔ وہ بولا۔

بھئی یہ عالم آدمی ہے۔ ادیب ہے۔ نقاد ہے تو نے خالی خولی افسر بنا دیا۔
میں نے تو تیرا لحاظ کیا ہے وہ بولا ورنہ یہ تو پتھر ہے۔
وہ کیوں؟۔
بھئی تیرا افسر جو ہے اس لیے ورنہ بالکل پتھرا دیتا۔
دوست بھی ہے نا۔
اونہوں دوست کسی کا نہیں۔
تجھے کیسے پتہ ہے۔
چہرے پر لکھا ہے۔
کیا لکھا ہے۔
وہ تو خود بت ہے اس کا بت کیا بناتا میں۔
بکواس کرتا ہے میں جانتا ہوں۔
اونہوں تو نہیں جانتا۔ وہ ہنسا۔
عجب احمق ہے میں فیاض کے ساتھ ایک گھر میں کوئی ایک سال رہا ہوں۔
تو رہا ہے اس کے ساتھ۔ وہ نہیں رہا تیرے ساتھ۔
بھائی وہ میرا گرائیں ہے۔
اسے پتہ ہے کیا۔
کہا ہے۔
کہ تو اس کا گرائیں ہے۔
بک نہیں۔
اسے نہیں پتہ۔ میری جان۔
بھئی وہ بڑے پائے کا ادیب ہے۔ فن کار ہے۔
شاید ہو کبھی۔ اب نہیں۔
عجب احمق ہے تو۔
ہوں۔۔۔ سیانا دیکھتا ہے۔ احمق کو دکھتا ہے۔
زوبی نے اشفاق کا بت بنایا تو میں نے شور مچا دیا۔
یہ کیا بنا دیا تو نے جیسے بالٹی اوندھی پڑی ہو۔
اچھا وہ بولا بالٹی سیدھی پڑی ہے کیا۔
لیکن بالٹی کیوں؟۔

بھئی سکیچر نہیں ہے۔

چہرے کی ساری لکیریں نیچے گرادیں تو نے۔

میں نے نہیں گرائیں گری ہوئی تھیں۔

بھئی اشفاق تو باغ و بہار آدمی ہے۔

ہاں ہے تو۔

تو نے اسے دکھی بنادیا۔

اچھا دکھی بنادیا۔

دیکھو۔چپ سوچ زدہ متفکر دکھی۔

ہاں یار۔ وہ بولا لیکن مجھے تو ایسے ہی دکھا جیسے دکھا ویسے بنادیا میں نے اپنے پلے سے کچھ نہیں لگایا۔

اشفاق احمد کے ساتھ چند ماہ رہنے سہنے کے بعد یہ جان کر میں حیران رہ گیا کہ اس کی باغ و بہاریت تو ایک پردہ ہے بہروپ ہے۔بنیادی طور پر وہ چپ ہے۔سوچ کا مارا ہوا ہے۔دکھی ہے۔

زوبی نے میرا بت بنایا۔تو میں پھر چلایا۔لو یہ کیا بنادیا تو نے۔یار مجھ میں شر ضرور ہے پر اتنا گاڑھا تو نہیں۔

اچھا زوبی بولا۔اگر چہرے پر نہیں تو لازماً اندر ہوگا۔

آج اس بات کو چونتیس سال ہو چکے ہیں جوں جوں ماہ و سال گزرتے جاتے ہیں۔میرا چہرہ ہو بہو زوبی کے بنائے ہوئے بسٹ کے عین مطابق ہوتا جا رہا ہے۔اسے دیکھ دیکھ کر میں حیران ہوتا ہوں یا اللہ کیا یہ شخص بت تراش ہونے کے علاوہ پیش گو بھی ہے۔

پھر حالات نے دفعتاً پلٹا کھایا اور زوبی کو اٹلی کا اسکالرشپ مل گیا۔

زوبی کے حالات ایسے تھے کہ وہ پاکستان کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔چونکہ لواحقین کی ایک بھاری گٹھری اس کے سر پر دھری تھی جن کا بوجھ اٹھانا واحد اسی کی ذمہ داری تھی۔

لیکن اس نے سوچے بغیر محسوس کیے بغیر اس گٹھری کو دھڑام سے زمین پر پھینکا اور اٹلی چلا گیا۔

ایسا سوواٹ رویہ صرف آرٹسٹ ہی روا رکھ سکتا ہے۔اس لحاظ سے زوبی پیدائشی آرٹسٹ ہے۔اپنے فن کی تکمیل میں بسا اوقات اس نے سوواٹ رویہ اختیار کیا۔اپنوں کو بے دردی سے قربان کر دیا۔خود کو قربان کر دیا۔اپنے آرام آسائش کو بھینٹ چڑھا دیا۔خود کو بھوک ننگ کے حوالے کر دیا۔بے خانماں ہوا۔در در کی خاک چھانی۔

زوبی کی کہانی بڑی عبرت ناک کہانی ہے۔

قصور میں حافظوں کے خاندان میں ایک لڑکا عنایت اللہ تھا۔طبیعت میں تجسس کا بھانبڑ لگا ہوا تھا۔کان زیادہ سنتا تھا۔ سُر متاثر کرتی تھی۔آنکھ لکیریں دیکھتی تھی۔انگلیوں میں لکیریں کھینچنے کا شوق تھا۔مشینوں کو دیکھ کر رُک جاتا۔یہ کیسے چلتی ہیں۔چیزیں بنانے کا خبط تھا۔اکھاڑے میں زور کرتا۔جماعت میں لکیریں کھینچتا رہتا۔تصویریں دیکھتا رہتا۔اسکول میں ٹاٹ پر تصویر بناتا۔تختی پر املا لکھنے کی بجائے تصویر بنانے لگتا۔کئی بار تختی اس کی کمر پہ ٹوٹی۔ماسٹر کہتا۔سالا کافر ہے تصویریں بناتا ہے۔

دسویں پاس کرنے کے بعد ٹھس ہو کر رہ گیا۔آگے پڑھنے کی صورت نہ تھی۔کیا کروں۔خالی تصویریں دیکھنے اور بنانے میں وقت

کہاں کٹتا ہے۔ سُر کی حس نے بینجو سیکھنے پر مجبور کیا۔ لیکن یہ بھی تو کافی نہ تھا۔

قصور کے جانے پہچانے طبیب اور ڈاکٹر بشیر احمد کی محفل میں جا نکلا۔ ڈاکٹر کے ہاں بڑے بڑے عالم، شاعر، ادیب اور مصور آتے تھے۔ وہاں بیٹھ ان کی باتیں سنتا۔ سنے جاتا۔ سُنے جاتا۔

ڈاکٹر نے کہا تو جو روز بلاناغہ آتا ہے تو ساتھ میرا ہاتھ بھی بٹا دیا کر۔ ڈاکٹر کا کمپاؤنڈر بن گیا۔ نگاہ بوتلوں پر رہتی کان محفل پر۔ جب بھی مریضوں کی بھیڑ چھٹتی تو نسخوں پر لکیریں کھینچنے لگتا۔

تصوریں بڑی بڑی کشتیاں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے پوسٹر لگتے تھے۔ انھیں دیکھتا رہتا۔ ان کی نقل اڑاتا۔ بڑے سے بڑے کاغذ خریدتا۔ تصویریں بناتا۔ ڈاکٹر صاحب واحد مبصر تھے۔ وہ حوصلہ بڑھاتے۔ شام کو اکھاڑے سے فارغ ہو کر گھر جاتا تو بینجو اٹھا لیتا۔

اتفاق سے اسکول میں ڈرائنگ ماسٹر کی آسامی خالی ہوئی۔ ہیڈ ماسٹر نے ڈاکٹر سے برسبیل تذکرہ بات کی۔ ڈاکٹر نے عنایت اللہ کی بنی ہوئی ڈرائنگ سامنے پھیلا دی۔ ہیڈ ماسٹر نے پندرہ[15] روپے ماہوار پر عارضی نوکر رکھ لیا۔

پہلے زوبی کو صرف تصویروں کی نقل اتارنے کا شوق تھا۔ اسکول میں ڈرائنگ ماسٹر بن کر اس کی توجہ ماڈل پر منعطف ہو گئی۔ پھر نسبتوں کا شعور ہوا۔ اسکیل کا احساس جاگا۔ زاویے اُبھرے اور بالآخر انسانی جسم اور اعضا کی طرف توجہ منعطف ہو گئی۔ لیکن یہ عیاشی چند ماہ کے بعد ختم ہو گئی۔ ایک ٹرینڈ جے وی ڈرائنگ ماسٹر اسکول میں آ گیا۔ عنایت اللہ کی چھٹی ہو گئی۔

اس وقت اس کے ذہن میں جے وی کرنے کا جنون جاگا اس کے خیال میں جے وی سے بڑھ کر اور کوئی اعزاز نہ تھا۔ غم غلط کرنے کے لیے بنجو کا سہارا لیا۔ اتنا ریاض کیا کہ قصور میں بنجو بجانے کے مقابلے میں اوّل رہا۔ پھر سارے علاقے میں بہترین بینجو پلیر مانا گیا۔

ایک دن اتفاقاً چڑیا گھر میں ایک سکھ بندر بنا رہا تھا لیکن بنتا نہ تھا۔ عنایت نے سکھ کو بندر کا اسکیچ بنا دیا۔ سکھ سے پوچھا کہ تم نے کہاں سے سیکھا۔ وہ بولا اسکول سے۔ عنایت حیران ہوا کیا ایسے اسکول بھی ہوتے ہیں جہاں ڈرائنگ سکھائی جاتی ہے۔ سکھ نے لاہور میں اسکول آف آرٹس کا پتہ دیا۔

پھر یہ جنون سوار ہوا کہ لاہور جا کر اسکول میں ڈرائنگ کرنا سیکھے۔ ماں کی منتیں کیں مجھے لاہور جانے دو۔ ماں نے اجازت نہ دی۔

تنگ آ کر ایک روز اپنی ساری تصاویر اور بنجو اٹھا کر چپ چاپ گھر سے نکل آیا۔ جیب میں صرف ایک روپیہ تھا۔ چھ آنے میں لاہور کا ٹکٹ خریدا۔ دس آنے سنبھال کر رکھ لیے کام آئیں گے۔ لاہور پہنچ کر سیدھا اسکول آف آرٹس میں پہنچا۔ پرنسپل سے ملنے کی درخواست کی۔

تین دن پرنسپل کے در پر بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ کب بلائے۔ رات ریلوے اسٹیشن پر پڑ رہتا۔ روٹی نہ کھاتا کہ جیب کے پیسے ختم نہ ہو جائیں۔

چوتھے دن پرنسپل کے کمرے کی چق اٹھا کر اندر چلا گیا۔ پرنسپل گپتا غصے سے بھنّا گیا چپراسی کو آواز دی۔ تھرو دس بائے آؤٹ۔ عنایت نے بغل سے اپنی تصویریں کھول کر میز پر پھیلا دیں۔ پرنسپل نے انھیں دیکھا اور نرم پڑ گیا۔ بولا دو روپے نکالو اور فارم بھر دو۔ عنایت نے دس آنے نکال کر میز پر رکھ دیے۔ بس یہی ہے۔ گپتا نے اپنی جیب سے دو روپے ادا کر دیے۔ داخلے کے لیے امتحان ہوا عنایت پاس ہو گیا داخل ہو گیا۔ داخلہ تو مل گیا مگر لاہور میں رہنے کو کوئی جگہ نہ تھی۔ سارا دن اسکول میں گزارتا۔ رات ریلوے پلیٹ فارم پر ایک پیسے کی ایک روٹی خرید کر کھا لیتا۔ حوائج کے لیے لیٹرین میں منہ جاتا۔ اسٹیشن کا بھنگی پیسے مانگتا تھا لہٰذا مسجد کا رخ کرتا۔ نہانے اور کپڑے دھونے کے لیے کنواں ڈھونڈتا۔

دس آنے ختم ہو گئے۔ فاقے آنے لگے۔ دو دن بھوک سے نڈھال پھرتا رہا پھر اتفاقاً قصور کے لوہاروں کا ایک لڑکا مل گیا جو کبھی اُس کا ساتھی تھا۔ بنجو کا شوقین تھا وہ اپنے ساتھ اپنے کارخانے میں لے گیا۔ بنجو سنا۔ روٹی کھلائی۔ عنایت کی جان میں جان آئی۔ پھر چند ایک مہینے وہیں

کارخانے میں پڑا رہا بنجو سناتا۔ روٹی مل جاتی وہیں پڑ کر سو رہتا۔

پہلے سال اچھے نمبروں پر پاس ہوا تو وظیفہ مل گیا ساتھ ہی ایک ٹیوشن مل گئی۔

پھر لوہاری منڈی میں عنایت اور تین ہندو ساتھیوں کو پانچ روپے ماہوار پر ایک کمرہ مل گیا وہاں رہنے لگا۔ وہاں کوئی ہاتھ نہ تھا اور وہاں ڈرائنگ کا کام کرنے کی جگہ نہ تھی بہت تنگ ہوا۔ اتفاق سے قصور کا ایک کلرک اپنے گھر مٹھا میں لے گیا جہاں وہ اپنی رہائش کے لیے ایک روپیہ چار آنے کرایہ ادا کرتا رہا۔ وظیفہ تو کافی تھا لیکن دقت یہ تھی کہ باقاعدہ ملتا نہ تھا۔ روٹی کے لیے پیسے نہ ہوتے۔ اتفاق سے محلے کے تندور والا بنجو سننے کا شوقین نکلا اس طرح سے بات بن گئی۔ اسے بنجو سناتا کھانے کو روٹی اور دال مل جاتی۔

وظیفہ موصول ہوا تو امارت کے ڈھیر لگ گئے۔ نوّے روپے کا سائیکل خرید لیا۔ ایک چارپائی خریدی۔ سوٹ کیس خریدا۔ مونچھ پر تاؤ دیا اور گاڑی میں بیٹھ کر پہلی مرتبہ قصور جا پہنچا۔ والدین اسے دیکھ کر خوشی سے بے حال ہو گئے۔

انھیں دنوں پہلی مرتبہ اشفاق سے ملاقات ہوئی۔

اشفاق بولا میاں عنایت اللہ اور تو سب ٹھیک ہے پر تیرا نام غلط ہے۔ یہ آرٹسٹ کا نام نہیں۔

اچھا۔ عنایت گھبرا کر بولا تو پھر کیا کریں۔

اشفاق نے کہا نام بدل لو۔

وہ کیسے بدلیں۔ کبھی نام بھی بدلے ہیں۔

ان دنوں اشفاق ابھی اشفاق احمد نہ بنا تھا۔ نہ ادیب تھا نہ براڈ کاسٹر۔ اور ٹی وی کا تو ابھی وجود ہی نہ تھا۔ لیکن اگرچہ وہ باہر نہیں نکلا تھا پر اندر ہی اندر تو تھا۔ اشفاق لغت لے کر بیٹھ گیا۔ ورق گردانی کرنے کے بعد وہ خوشی سے چلایا۔ مل گیا مل گیا۔

کیا مل گیا عنایت نے پوچھا۔

تیرا نام مل گیا۔

کیا ملا؟

آج سے تو آذر ہے۔

آذر ـــ وہ کیا ہوتا ہے۔

وہ ایک بت گر تھا۔

یعنی بت بنانے والا؟

بالکل۔

اس روز سے عنایت اللہ عنایت آذر بن گیا۔

پھر جب اس نے کمرشل کام شروع کیا تو پھر سے مشکل پڑ گئی۔ آذر نے کہا۔ یار اشفاق آذر اپنی چیزیں بیچے گا نہیں۔

کیوں؟ اشفاق نے پوچھا۔

آذر تو اپنے لیے نقش بناتا ہے بیچنے کے لیے نہیں۔

اشفاق بولا تو ٹھیک ہے آذر اپنے لیے تصویر بنائے۔ زدبی بیچنے کے لیے بنائے۔

یوں عنایت اللہ آذر زوبی بن گیا۔

آذر زوبی ایک خود ساختہ فرد ہے۔ اس نے زندگی میں اپنا راستہ خود بنایا ہے کسی کا سہارا نہیں لیا۔ وہ سہارا لینے کا قائل نہیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ سہارا دینے کا بھی قائل نہیں۔

اسی وجہ سے جب اسے اٹلی سے بلاوا آیا تو اس نے کنبے کی گٹھری کو دھڑام سے نیچے پھینکا اور اٹلی چلا گیا۔

اس پر ہمارے دل زوبی کے خلاف غبارے اٹ گئے۔ اتنا خود پرست اتنا بے حس۔ ہم یہ بھول گئے کہ وہ ایک آرٹسٹ ہے۔ ایک ٹیڑھی لکیر جسے سیدھا کیا جائے تو ٹوٹ جاتی ہے۔

اس کے جانے کے بعد اس کا گھر تنکا تنکا ہو کر بکھر گیا۔ ۱۹۵۱ء میں میرا تبادلہ کراچی ہو گیا۔

کراچی میں ایک دن ہمارے دفتر کے سامنے ایک نئی نویلی کار رکی۔ اندر سے وہی پرانا ۱۹۴۶ء کا زوبی برآمد ہوا۔ ارے تو میں چلایا۔

ہاں میں۔ وہ بولا۔

تو کہاں ؟۔

میں کراچی میں۔

اور یہ گاڑی۔

ہاں یہ گاڑی۔

کہاں سے آئی!

اللہ نے دی۔

تو اللہ کو مانتا ہے۔

مجبوراً۔

کیوں ؟۔

وہ دیتا جو ہے۔

تو رہتا کہاں ہے ؟۔

بنگلہ ہے۔ پریس ہے۔ مصور رسالہ ہے "شعور"۔

ارے اتنا کچھ۔

ہاں اس سے بھی زیادہ۔ سب اُس نے دیا ہے۔

پر تو ویسا کا ویسا ہی ہے۔

ہاں میں ویسا کا ویسا ہی ہوں۔

میں نہیں مانتا۔ تو جھوٹ بولتا ہے۔

چل میں تجھے دکھاؤں۔

دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

کراچی صدر کے مرکز میں اس کا پریس تھا۔ بہت وسیع۔ مشینیں۔ نوکر چاکر۔ اوپر رہائشی مکان۔ اپنے مصور پرچے شعور کے کئی ایک شمارے اس نے میرے سامنے ڈھیر کر دیے۔ پرچے میں انفرادیت کے انبار لگے ہوئے تھے۔

کہاں آرٹسٹ کہاں پریس اور ادبی پرچہ۔ میں نے کہا ان کا کیا میل ہے ؟

ہے۔ وہ بولا

کیا ؟

وہ بھی لکیریں یہ بھی لکیریں۔

سب کچھ بدل گیا۔ میں نے کہا

ہاں۔ وہ بولا سب کچھ بدل گیا۔ لیکن لکیریں نہیں بدلیں۔ نہیں بدلیں گی۔

اب بھی تصویریں بناتا ہے کیا ؟

ہاں۔ وہ بولا اور مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں اس کی بنی ہوئی تصویریں ٹنگی ہوئی ہیں اس کے اسکیچز دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ پختگی نفاست، انفرادیت۔

ابے او نصور کے ان پڑھ پہلوان یہ باتیں تجھے کیسے سوجھتی ہیں۔ میں نے پوچھا۔

کون سی باتیں۔

یہ گھوڑا مرد اور نازک حسینہ۔ یہ بال جال میں اسیر دنیا۔ یہ میاں کی "گبھی" پوشیدہ ماں۔

پتہ نہیں۔ وہ بولا۔

اتنی بڑی سچائیاں۔

اچھا — یہ سچائیاں ہیں کیا ؟

تجھے نہیں پتہ۔

نہیں۔ وہ بولا۔

پھر بناتا کیسے ہے ؟

جو دکھتا ہے بنا دیتا ہوں۔

دکھتا کیسے ہے۔

پتہ نہیں کیسے۔ بس دکھتا ہے۔

ایک روز جب میں دفتر جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ سیڑھیوں میں آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔

میں چونکا تو یہاں۔

بولا۔ ہاں تجھ سے ایک کام ہے۔

کیا ؟

میرے ساتھ چل۔

ہم دونوں کار میں بیٹھ گئے۔

میں نے کہا چلتا تو ہوں پر کام کیا ہے۔ بتا!

بولا بنانے کا نہیں۔

وہ مجھے ہوا بندر سے پرے بیچ پر لے گیا۔ گاڑی سے نکل کر ہم پیدل چلتے رہے۔ آخر وہ سمندر کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

بولا بیٹھ جا۔

میں بھی بیٹھ گیا۔

بولا۔ سمندر میں یہ دو چھوٹے چھوٹے جزیرے نظر آتے ہیں تجھے۔

میں نے کہا کون سے؟

بولا۔ ایک وہ دور کالا کالا ابھرا ابھرا اور ایک یہ سامنے والا۔ دیکھے۔

ہاں دیکھے۔

جب سمندری جہاز آتا ہے تو ان دونوں ابھری چٹانوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ اس نے کہا۔

پھر۔

میرا جی چاہتا ہے قائداعظم کا مجسمہ بناؤں۔ ایک ٹانگ اس چٹان پر ہو دوسری اس چٹان پر۔ جہاز قائد کی ٹانگوں تلے سے گزریں۔

اتنا بڑا بت۔

ہاں اتنا بڑا۔

کیسے بنائے گا۔

مجھے بنا ہوا نظر آتا ہے۔ وہاں قائد کا سر ہوگا اس پر کالی ٹوپی ہوگی۔ نیچے کالی اچکن ہوگی اور اس کے نیچے سفید شلوار اور جہاز نیچے سے گزریں گے۔ تجھے نظر آتا ہے۔

اونہوں۔

مجھے آتا ہے۔

میں آدھی آدھی رات کو گاڑی میں بیٹھ کر اسے دیکھنے آجاتا ہوں۔ یہاں بیٹھا رہتا ہوں بیٹھا رہتا ہوں۔ کئی کئی دن نیند نہیں آتی۔ پریس سے اٹھ کر یہاں آ بیٹھتا ہوں۔ یہ میرا آخری کام ہے۔ پتہ نہیں کتنے سال لگیں۔ لیکن وہ مجھے نظر آتا ہے۔ وہ کھڑا ہے۔ سیدھا۔ باوقار۔ عظیم۔

دیر تک ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

زوبی قائد کو دیکھتا رہا میں آذر کو دیکھتا رہا۔

احمق نہ دیکھ خواب۔ میں نے کہا۔

وہ چونکا۔ اور کیا دیکھوں۔

پھر اور دیکھ۔

اور کچھ دیکھنے کو ہے کیا ؟

بہت کچھ۔

میرے پاس تو نہیں اور کچھ نہیں۔

یہاں تجھے کون بُت بنانے دے گا۔

بت۔ بت تو بنا ہوا ہے پہلے سے ہی بنا ہوا ہے۔

پھر تو کیا بنائے گا۔؟

میں ذہنوں سے نکال کر پتھر کی شکل دے دوں گا۔

وہ ہمارا قائد ہے۔ باپ ہے اس نے ہمیں ایک پناہ گاہ دی ہے۔ جھوٹ ہے کیا۔

سچ ہے۔

بت تو اسے بنا دیا۔

کس نے۔

اللہ نے۔ ہم اسے کبھی بھول سکتے ہیں کیا !

نہیں۔ کبھی نہیں۔

میں تو اُس بت کو صرف جسم دے دوں گا۔

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

میں خاموش ہو گیا۔

وہ بھی خاموش ہو گیا۔

دور سورج ڈوب رہا تھا۔

اس کی کرنوں نے تیرتے بادلوں کو آگ لگا دی۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا بادل کا ایک ٹکڑا ان دونوں پتھروں پر آ معلق ہوا۔

وہ دیکھ وہ دیکھ۔ زوبی بولا۔

کیا ؟

وہ قائد آ کھڑا ہوا ہے عین اسی مقام پر۔ بالکل ایسے جیسے مجھے نظر آتا ہے دیکھ۔ دیکھ۔ کتنا عزم ہے کتنا وقار ہے۔ کتنی خودداری ہے۔

زبردست —— اصلی !

۶ جولائی ۱۹۶۷ء —————— پیر علی محمد راشدی
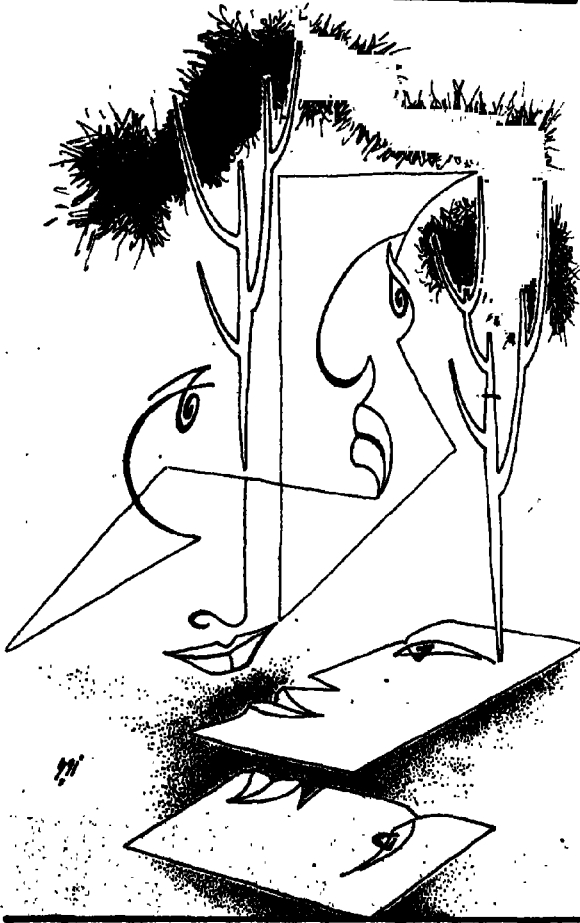
پروفیسر مجتبیٰ حسین

آزر زوبی

چوبیس، پچیس برس اُدھر کی بات ہے۔ سن یاد نہیں۔ مدنی، صادقین، یہ خاکسار اور کچھ دیگر حضرات کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ آزر زوبی کافی ہاؤس میں نظر آئے۔ ان کے ساتھ غالباً سجاد اختر تھے۔ زوبی سیدھے اس میز کی طرف آئے جہاں ہم لوگ تھے۔ کرسی پر بیٹھتے ہی بغیر کسی تمہید کے انھوں نے مجھ سے کہا کہ رسالہ "شعور" کی ادارت سنبھال لوں۔ لہجے میں پیش کش کا انداز نہیں تھا، بلکہ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ طے شدہ ہے اور میرے واسطے کسی عذر کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے انھیں دیکھا۔ وہ مسکرائے "تو کل سے آپ شعور کے دفتر آجائیے۔ دیکھا تو ہوگا آپ نے۔ وہیں جہاں میں رہتا ہوں۔"

زوبی اس وقت صدر میں ایمپریس مارکیٹ کے پاس ایک بڑے سے مکان میں رہتے تھے جو کراچی کے پرانے مکانوں کی طرح کچھ لکڑی، کچھ سیمنٹ کا بنا ہوا تھا۔ اسی مکان میں ان کا نگار خانہ اور چھاپے خانہ تھا۔

میں نے ذرا توقف کیا۔ زوبی بولے —— "تو پھر طے ہے" —— بڑی خود اعتمادی کا لہجہ تھا۔

"میں کل آپ کے دفتر آجاؤں گا، پھر بات ہوگی۔" کافی پی گئی۔ پھر وہ اٹھے۔ ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔ یہ بہت عجیب سا انداز تھا۔ تاجرانہ تھا ——— نہ دوستانہ ——— تحکمانہ بھی نہیں تھا ——— بس عجیب تھا۔

زدبی کو اس سے پہلے میں نے دیکھا تھا، مگر ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ جس میں زدبی ذرا دیر کے لیے آئے، شعور کی ادارت کی بات کی اور پھر چلے گئے۔ گویا سب بات طے ہوچکی ہے اور میں شعور کا مدیر بن چکا ہوں۔

دوسرے دن میں ماہنامہ شعور کے دفتر گیا۔ زدبی آئے۔ ہاتھ ملایا۔ مسکرائے اور بولے ادارت کا معاوضہ کیا ہوگا؟ میں نے کہا کچھ بھی نہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ آپ میرے کام میں دخیل نہ ہوں۔ شعور کی تزئین آپ کے ذمے اور مضامین کی فراہمی میرے ذمے۔ کہنے لگے ٹھیک ہے۔ میں نے کہا کہ پالیسی میری ہوگی اور ہفتے میں صرف ایک بار آؤں گا۔ بولے آپ جانیں ——— شعور کو چلانا آپ کا کام ہے۔"

میں اٹھا۔ انھوں نے پھر ہاتھ ملایا۔ زدبی کم سخن ہیں۔ کام کی باتیں کرتے ہیں۔ جو کچھ کہنا ہوتا ہے۔ برملا کہہ دیتے ہیں۔ جو انھیں نہیں یا کم جانتا ہے۔ وہ انھیں کاروباری آدمی سمجھتا ہے، مگر جس نے ان کے ہاتھ ملانے کے انداز کو محسوس کیا ہے، اس نے زدبی کو پالیا ہے۔ زدبی کی انگلیوں میں گرمجوشی ہے، قربت ہے اور شاعری ہے۔ یہ توانا شخصیت کی توانا انگلیاں ہیں جنھوں نے نقاشی بھی کی ہے اور مجسمہ سازی بھی۔

زدبی کے نگارخانے میں چلے جائیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ اس جگہ آگئے ہیں جہاں محنت حسن ہے اور حسن محنت ہے ہر نقش ملکی ثقافت کا امین ہے ——— سیاہ رنگ وصال کی اندھیری راتوں کی داستان سناتا ہے ——— صباحت کھیتوں کی صبح بن کر نمودار ہوتی ہے ——— زدبی کی انگلیاں تخلیقی تسلسل کا نغمہ ہیں ——— ماں اور بچہ ——— کینوس کے نقوش، کہیں رباعی میں، کہیں غزل میں اور کسی میورال کی صورت میں طویل نظم ——— !

یہ انگلیاں مجسمہ ساز بھی ہیں۔ آپ کو زدبی کے نگارخانے میں کچھ شاعر اور ادیب کے "بسٹ" ملیں گے۔ ان کے خد و خال کو اتنے فنکارانہ طور پر ابھارا گیا ہے کہ باطن ظاہر بن گیا ہے اور ظاہر باطن۔

زدبی کے ہر کام میں سلیقہ، نفاست اور "رنگینی" ہے۔

"شعور" اپنی وضع کا ایک ہی ماہنامہ تھا۔ ٹائپ میں چھپتا رہا۔ مگر ہر ورق "کتب گل فروش" تھا۔ مضامین شعور کے صفحات پر کچھ اور نکھر آتے تھے۔ غزلیں اور نظمیں مہک اٹھتی تھیں۔ لکھنے والوں کے اسکیچ، صنزار بابی کے نقوش، زدبی کے موقلم کی گل فشانی نے شعور کو ایک نادر تحفہ بنادیا تھا۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے۔ میں بغیر کسی پس و پیش کے عرض کر سکتا ہوں کہ شعور میں عصر حاضر کے ممتاز لکھنے والوں کے علاوہ بعض ایسے مضمون نگار اور شعرا کی تخلیقات بھی شائع ہوئیں جو اس دور کے کسی رسالے میں شاید ہی چھپی ہوں مثلاً یگانہ پر ممتاز حسین جونپوری مرحوم کا مضمون یا اجتبیٰ رضوی کا کلام یا یگانہ کی ایسی غیر مطبوعہ غزلیں جو اس سے پہلے کہیں اور شائع نہیں ہوئی تھیں۔

افسوس کہ یہ رسالہ چند در چند وجوہ کی بنا پر زیادہ چل نہیں سکا اور اسے بند کرنا پڑا۔ ایسے خوبصورت رسالے کو بند ہونا ہی تھا۔ بند ہوا۔

لیکن زدبی سے تعلقات کی جو نوعیت تھی وہ آج بھی ہے۔ وہ پہلے ہی دن سے دوست تھے اور آج بھی ہیں۔ جب بھی ملتا

ول دوست اور دوستی پر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ وہ کس پائے کے مصوّر اور مجسمہ ساز ہیں، میں اس بارے میں کچھ کہنے کا
ل نہیں ہوں۔ البتہ ایک بات مزید عرض کرنا چاہتا ہوں۔

زوبی نے اپنے کو مصوّر ثابت کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کے بال ضرورت سے زیادہ بڑھے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کی گردن
ا فن کارانہ بے دماغی کا خم نہیں ہے۔ آنکھوں میں "خواب" بسانے" کی کوئی کوشش نہیں پائی جاتی۔ گفتگو "اخفائے راز" قسم
نہیں کرتے۔ شخصیت کو "ایب نارمل" بنانے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ عام آدمیوں کی طرح ملتے ہیں۔ بات کرتے ہیں باعمل
ی ہیں۔ مگر جب آپ ان کے نگار خانے میں داخل ہوں تو یہ عام آدمی —— یہ آذر زوبی سرزمین پاکستان کی روح کا مظہر
جاتا ہے۔

اس نوع کے مقامات پر انسانیت ہمہ اطراف ہونے والے ایٹمی دھماکوں سے بچنے کے لیے اپنا تحفظ چاہے گی۔ میری خواہش ہے کہ زوبی خود بھی پتھر کا ہوتا —— اس طرح وہ جدوجہد کے بغیر زندہ رہ سکتا تھا۔

۱۸ فروری ۱۹۵۴ء —————— قدرت اللہ شہاب

O

آج فیض صاحب کے ہمراہ زوبی صاحب کے آرائش اسٹوڈیو میں آنے اور یہاں کی طالبات کے کام اور زوبی صاحب کی بنائی ہوئی تصویروں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پین ڈرائنگ (PEN-DRAWING) میں زوبی صاحب کا کوئی ہم سر پاکستان میں مشکل ہی سے ملے گا۔ اب انھوں نے بہت سے موضوعات کو اپنے موئے قلم کا جولاں گاہ بنا لیا ہے۔ ان کا اسٹوڈیو اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۴ء —————— ممتاز حسین

میرزا ادیب

آذر بُت تراش
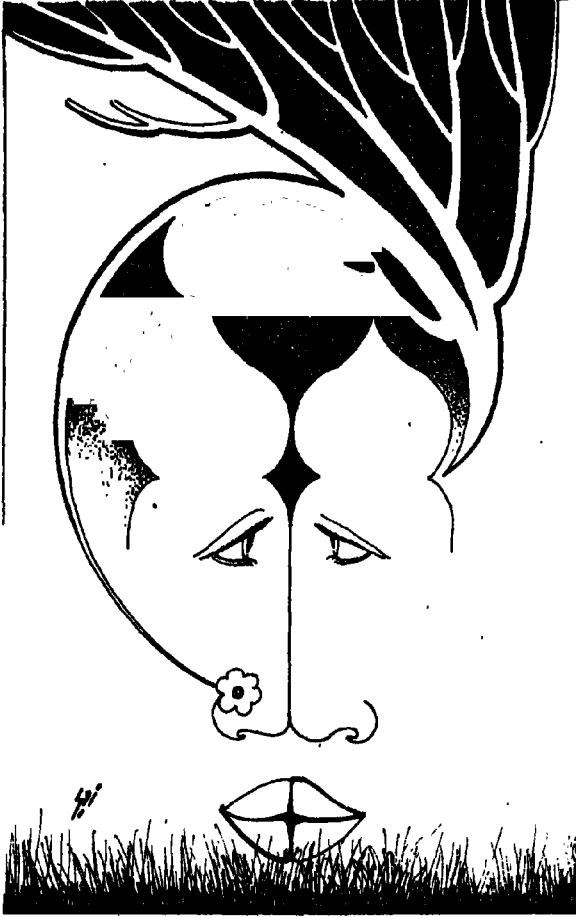
قدیم لاہور کی جو نشانیاں گلی کوچوں، بازاروں اور سڑکوں کی صورت میں اب تک زندہ ہیں ان میں ایک بازار سید مٹھا بھی ہے۔ بڑا پرانا بازار ہے۔ خاصا طویل اور بارونق بھی۔ قیام پاکستان سے بیشتر یہاں "نکو شاہ" کی پوریاں، نمکین لڈو اور بعض مٹھائیاں دور دور تک مشہور تھیں، شروع میں اردو کا ایک معروف ماہنامہ "عالمگیر" بھی اسی بازار کی ایک گلی سے نکلتا تھا۔ بعد میں تحصیل بازار سے نکلنے لگا۔ اس سید مٹھا بازار کے ایک حصے سے وہ لمبی اور گنجان آباد گلی اپنی آخری حد ختم کر دیتی ہے جسے بھابھڑیاں دی تھڑیاں "کہتے تھے۔ اس گلی میں زیادہ غیر مسلم لوگ رہتے تھے، لیکن آخری حد پر جو بازار سید مٹھا سے مدغم ہو جاتی تھی مسلمان گھرانے آباد بھی تھے۔ یہیں ایک گلی خالص مسلمانوں کی تھی جو اس زمانے میں کوچہ ملتیا" کے نام سے جانی پہچانی جاتی تھی۔ اس گلی کے سامنے چند دکانیں تھیں جو اب بھی ہیں۔ وہ گلی جو میت گلی کہلاتی تھی اور آج بھی اس کا یہی نام ہے اس گلی سے متصل ایک چھوٹی سی دکان کے اندر ایک نوجوان جس کے چہرے سے غربت کے اثرات مترشح تھے، میلے کچیلے کپڑے پہنے صبح سے لے کر شام تک بیٹھا رہتا تھا۔

نذر زیدی

آذر بت تراش

اس دوکان کی ساری کائنات کچھ تصویروں اور دو تین مجسموں کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ البتہ رنگوں کے ڈبے اور طرح طرح کے برش بھی
آجاتے تھے۔ لگتا تھا یہ نوجوان اپنے گردوپیش کے ماحول سے یکسر بے نیاز ہے۔ لوگ اس کے سامنے سے گذرتے تھے، اسے گھور کر دیکھتے تھے، ان میں سے
چند لمحوں کے لیے رک بھی جاتا تھا مگر وہ برابر اپنے کام میں مگن رہتا تھا۔ البتہ جب کبھی دو چار لڑکے اس کے قریب آکھڑے ہوتے تھے تو وہ ان کی طرف
پھیر کر اپنے چہرے پر ایک مصنوعی سی مسکراہٹ لا کر ذرا گردن ہلا دیتا تھا اور یہ عمل چند لمحوں میں ختم ہو جاتا تھا۔ کوئی شریر لڑکا آم کی گٹھلی مکان کے اندر
ٹک کر بھاگ جاتا تھا تو ایک لمحے کے لیے تکدر اور بیزاری کی کیفیت اس کی آنکھوں میں آجاتی تھی۔ بس نہ تو وہ غصے سے بھاگتے ہوئے لڑکے کو
دیکھتا تھا اور نہ گٹھلی اٹھا کر باہر پھینکتا تھا۔

میں نے جب بھی اسے دیکھا تھا عام طور پر کوئی نہ کوئی مجسمہ بناتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ پینٹنگ بھی کرتا تھا مگر بہت کم زیادہ تر مجسمے
بناتا رہتا تھا۔ اس کے ارگرد ہر وقت تین چار مجسمے پڑے رہتے تھے اور ایک مجسمے پر وہ کام کرتا رہتا تھا۔

اس کے دائیں جانب گندھی ہوئی مٹی اور ایک جگ پانی اور لوہے کے کچھ چھوٹے چھوٹے اوزار دکھائی دیتے رہتے تھے۔ میں کسی
زار کا نام اور اس کی مخصوص کارکردگی سے واقف نہیں تھا اور آج بھی نہیں ہوں۔

ظاہر ہے یہ نوجوان ایک مجسمہ ساز تھا اور آج   مگر نہیں   ابھی نہیں۔ مجھے اس کے حوالے سے اس زمانے کے ایک دو واقعات
ان کرنا ہے جن کے نقوش میرے ذہن میں مدہم پڑ گئے ہیں۔

پہلے واقعے کا مرکزی کردار تو یہی نوجوان مجسمہ ساز ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ مرکزی کردار ہونے کے باوجود یہ اس واقعے سے بالکل
پر متاثر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تو اپنے مقام پر بے نیازی کے عالم میں کھڑا رہا اور واقعہ اس کے اردگرد ایک دائرہ بنا کر حرکت کرتا رہا۔ تفصیل بتاتا ہوں۔

گلابی جاڑے کی ایک دوپہر تھی۔ دن اتوار کا تھا۔ میرا دفتر بند تھا۔ میری بیوی اپنے میکے میں تھی اور مجھے دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے وہیں جانا
تھا میرے سسرال والوں کا گھر گھنٹی بازار میں ہے اور میں محلہ ستھاں میں رہتا تھا۔ سسرال کے ہاں جانے کے لیے راستہ دہی تھا یعنی مجھے بھابڑیاں کی
ہٹریاں سے ہو کر گذرنا پڑتا تھا۔

اپنے سسرال کے گھر میں نے کبھی کبھی ایک بوڑھی عورت کو دیکھا تھا۔ اتنی بوڑھی بھی نہیں تھی۔ صحت بہت اچھی تھی۔ چہرہ سرخ و سفید تھا۔
دبال کھچڑی ہو گئے تھے۔ اس دوپہر بھی وہ وہاں بیٹھی تھی اور میری بیوی سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔

میں اس کا اصلی نام نہیں بتاؤں گا کیونکہ میں اس کا اصلی نام بھول چکا ہوں مجھ لیجیے اس کا نام اماں مہرون تھا۔ میں اس کے بارے میں صرف
جانتا تھا کہ وہ محلہ ستھاں ہی میں کہیں رہتی تھی۔ میرے سسرال میں اس کا آنا جانا تھا۔ اچار بڑے شوق سے کھاتی تھی۔ وہاں اسے اچار بھی مل جاتا
۔ شیخوپورہ سے اس کے بیٹے کا خط آتا تھا تو یہ خط بھی وہ میرے سسر صاحب سے پڑھوا کر سنتی تھی۔

ہم نے کھانا کھا لیا تو وہ میرے سسر سے مخاطب ہو کر بولی۔

"مرزا جی کچھ پتہ ہے کیا ہو رہا ہے؟"

"خدا خیر کرے کیا ہو رہا ہے" میرے سسر نے پانی پی کر گلاس الگ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اسلام میں بت بنانا جائز ہے؟"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ اسلام میں بت بنانا حرام ہے"

"تو بت بنانے..."

میرزا ادیب — نذر زوبی — آذر بُت تراش
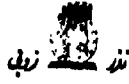
"کون بت بناتا ہے؟"

"وہی جو بناتا ہے"

میرے سُسر صاحب کی آنکھوں میں مسکراہٹ کی چمک دَر آئی۔ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے تھے مگر انجانے بن کر پوچھنے لگے۔

"آخر کون بناتا ہے"؟

"اللہ میں مرجاؤں ـــ آپ جانتے ہی نہیں ـــ کوچہ ماشکیاں کے سامنے 'میت والی گلی کے باہر ـــ دیکھا نہیں اُسے" اماں مہراں نے ایک ہی سانس میں سارے الفاظ کہہ دیئے۔

"اچھا ـــ تو تم کہتی ہو وہ بت بناتا ہے ـــ وہ تو مجسمے بناتا ہے"

"کیا بناتا ہے؟" اماں مہراں کو کیا خبر کہ مجسمہ کیا ہوتا ہے۔

سُسر صاحب اسے کیسے سمجھاتے کہ یہ کیا چیز ہوتی ہے ـــ کچھ غور کرکے بولے۔ "وہ مٹی سے آدمی بناتا ہے۔ جیسے تصویر ہوتی ہے نا۔ بس سمجھ لو وہ مٹی سے تصویر بناتا ہے۔"

اماں مہراں نے فقرے کے دوسرے حصے کا تو کوئی خیال نہ کیا۔ پہلا فقرہ سمجھ گئی۔ اور کہنے لگی۔ "مٹی سے آدمی بناتا ہے ـــ توبہ توبہ۔ خدائی کام کرتا ہے۔ کبھی نہیں بخشا جائے گا۔ دیکھ لینا۔

سُسر صاحب بولے۔ "یہ تو اس کا اللہ کے ساتھ معاملہ ہے۔ بخشے یا نہ بخشے ـــ"

"یہ بت کن کے بناتا ہے"۔ ؟

"لوگوں کے۔ ہو سکتا ہے تمہارا بھی بنا دے"

اماں مہراں یوں تڑپ اٹھی جیسے اسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ "میرا بت بنائے گا۔ میں اس کے ہاتھ نہ توڑ ڈالوں ـــ اب سمجھی۔ میں آتی جاتی ہوں تو مجھے یوں یوں کیوں دیکھتا ہے"

"یوں یوں کیا؟"

"یوں یوں ـــ کیا بتاؤں۔"

"غور سے دیکھتا ہوگا ـــ تمہارا وہ ـــ بُت جو بناتا ہے۔"

یہ مکالمہ وقفے وقفے سے جاری رہا اور صرف میرے سُسر صاحب اور اماں مہراں کے درمیان ہی جاری رہا۔ گھر کے باقی لوگ ان کی باتوں سے لطف اٹھاتے رہے

تیسرے چوتھے روز میں سُسرال پہنچا تو عجیب قسم کی کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ اماں مہراں نے یہ خبر ہر طرف نشر کر دی ہے کہ وہ بت بنانے والا اُس کا بت بنانے والا ہے۔

میری موجودگی ہی میں ایک عورت نے وہاں آ کر بتایا ہے اماں مہراں بت بنانے والے کو بڑی بددعائیں دے رہی تھی۔۔

عجیب اتفاق یہ ہوا کہ اس وقت اماں مہراں بھی آگئی۔

سب سے پہلے تو اس نے ایک سیاہ کی رنگ چادر کرسی کے بازو پر رکھ کر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور بولی۔ "اللہ اس مصیبت کو دور کرے۔

"کونسی مصیبت" میری ساس جانتی تھیں کہ اماں مہراں کی مُراد کس مصیبت سے ہے۔ مگر انھوں نے لطف لینے کے لیے یہ سوال کر دیا۔

"وہی مصیبت ـــ اور کونسی مصیبت۔ جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ منہ سر چھپا کر آنا پڑتا ہے"

تو اماں مہراں اس سیاہ چادر سے منہ سر چھپا کر بت بنانے والے کے سامنے سے گذر رہی تھی ـــ یہ بات سمجھ کر سب کے سب ہنس پڑے

"اب ہنس لو۔ دیکھنا میں کیا کرتی ہوں" اماں مہراں نے اس ہنسی کو اپنی توہین پر محمول کیا۔

"کیا کرو گی اماں" میری بیوی نے پوچھا۔

اماں مہراں نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں لہرایا۔

"بلا رہی ہوں اسے ـــ اپنے سراج کو۔ ہڈی پسلی ایک کر دے گا اس کی"۔

میں انجانے خوف سے کانپ سا گیا!

اماں مہراں کے بیٹے سراج دین کو میں نے اس وقت کئی بار دیکھا تھا جب وہ ابھی لاہور ہی میں تھا شیخوپورہ نہیں گیا تھا۔ دوہرے جسم کا آدمی تھا۔ پلا پلایا پہلوان۔ اگر یہ بائیں ہاتھ سے بھی گھونسہ مارتا تو بت بنانے والا خود بت بن جاتا۔

اماں مہراں نے بیٹے کو بلانے کا کیا اہتمام کیا تھا۔ سارے گھر میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا لیکن اماں مہراں کے چہرے کے تاثرات واضح طور پر بتا رہے تھے کہ وہ اس معاملے میں بڑی سنجیدہ ہے اور کچھ نہ کچھ کر کے ہی رہے گی۔

پھر کئی دن بیت گئے

میں مجسمہ ساز کی دوکان کے سامنے سے کم و بیش ہر روز گذرتا تھا اور اسے بدستور بڑے اطمینان کے ساتھ کام کرتے ہوئے پاتا تھا۔ دل میں سوچتا تھا کیا اسے ابھی تک یہ خبر نہیں ملی کہ اماں مہراں اس کے سخت خلاف ہو گئی ہے اور کوئی سخت قسم کا اقدام کرنے والی ہے۔

اس کی مطمئن حالت سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کوئی خبر نہیں ہے اور اگر ہو گئی ہے تو ـــ عجیب آدمی ہے خطرے میں گھرا ہوا ہے اور اس سے بے نیاز ہے۔

وہ ایک صبح تھی ـــ نہ جانے کس دن کی۔ سلطان حلوائی کا بیٹا دودھ دینے آیا تو اس نے بتایا "سراجا آ گیا ہے"

"کب؟" میں نے سانس روک کر پوچھا۔

"پتا نہیں جی۔ میں نے اسے اماں مہراں کے دروازے پر دیکھا ہے"۔

میں ناشتے کا بھی انتظار نہ کر سکا فوراً گلی بازار پہنچا میرے سسر صاحب ابھی مسجد سے واپس نہیں آئے تھے۔

مسجد میں پہنچا اور فوراً انہیں خطرے کی اطلاع دی۔

"گھبرانے کی بات نہیں۔ سراج دین سب سے پہلے مجھ سے ملے گا"

"اور اگر وہ سیدھا دوکان پر جا پہنچا تو ـــ" میں نے کہا۔

وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں اماں مہراں کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔

مجسمہ ساز کی دوکان کے آگے سے گذرے وہ دوکان کی صفائی کر رہا تھا۔ ڈسٹر اس کے ہاتھ میں تھا۔

معلوم ہوا سراج دین رات کو آیا تھا۔ میرے سسر صاحب کو دروازے پر دیکھ کر بولا۔

"چچا جی! آپ نے کیوں تکلیف کی"۔

"بیٹھو! تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے"

اماں مہراں ہمیں کمرے کے اندر لے گئی۔

"تمھیں کیا بتایا ہے تمھاری ماں نے" انھوں نے چارپائی پر بیٹھتے ہی سراج دین سے پوچھا

"بتانا کیا تھا چاچی جی! ــــ میں تو اس کی دونوں باہیں توڑ دوں گا۔ میری ماں کا بت بنا سکتا ہے بے شرم، بے حیا ــــ"

سراج دین کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی تھی۔

"بیٹے اب ذرا میری بات سنو؟" انھوں نے بڑی ملائمت سے کہا۔

"جی فرمایئے"

"وہ تو ــــ" وہ مسکرانے لگے۔ میں نے یونہی کہہ دیا تھا کہ تمھاری ماں کا مجسمہ بنائے گا۔ وہ بڑے لوگوں کے مجسمے بناتا ہے۔ بادشاہوں کے، شاعروں کے عام لوگوں کے مجسمے نہیں بناتا اور انھیں بیچ دیتا ہے۔

"توبے بے کا وہ ــــ کیا مجسمہ ــــ"

"مجسمہ" میں نے اسے صحیح لفظ بتایا۔

"بے بے کا کیوں بناتا ہے"

"بالکل نہیں بنائے گا" اُسے تمھاری ماں کا مجسمہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے ــــ اسے بھلا کون خریدے گا!"

آخر بڑی مشکل سے اسے یہ بات سمجھائی۔ اور یہ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

اگر اس صبح مجھے سراج دین کے آنے کی اطلاع نہ ملتی اور میں اپنے سسر صاحب کو مسجد سے اماں مہراں کے گھر نہ لے جاتا ــــ یا سراج ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں چلا جاتا تو ــــ

واپسی پر ہم نے دیکھا کہ وہ دوکان کے کنارے بیٹھا ایک مجسمے کی نوک پلک درست کر رہا تھا۔

یہ واقعہ اپنی جگہ درست ہے۔ ممکن ہے میں نے اس میں کہیں کہیں نمک مرچ لگا دیا ہو ــــ جزئیات میں قدرے تبدیلی کر دی ہو ــــ مگر اس کی واقعیت، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں درست اور صحیح ہے۔

اس واقعے کو گذرے ہوئے سالہا سال گذر چکے ہیں اور کوچہ ماشکیاں کے سامنے ایک چھوٹی سی دوکان میں اپنے کیریر کی ابتدا کرنے والا گمنام مجسمہ ساز آج بین الاقوامی شہرت یافتہ آرٹسٹ کے طور پر پہچانا جاتا ہے جو کراچی میں رہتا ہے اور جسے لوگ آذر زوبی کہتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا تھا کہ اسے یہ واقعہ بتا دوں مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ میں نے اس وقت بھی جب ہماری علیک سلیک ہوگئی تھی۔ اور ہم ایک دوسرے کی خیر خیریت بھی دریافت کر لیا کرتے تھے ــــ میں نے اس سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔

ممکن ہے کسی نے اسے بتا دیا ہو ــــ لیکن اس پر ذرہ برابر اثر بھی نہیں ہوا تھا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے اس کا علم نہ ہوا ہو۔ کیونکہ اس کے رویے سے واضح ہوتا تھا کہ وہ کسی سے بھی تعلقات قائم کرنے کا آرزومند نہیں ہے۔ بچوں سے ذرا مانوس تھا مگر یہ بھی وقتی طور پر۔ صرف اپنے کام سے غرض رکھتا تھا اس کے سوا سے دنیا کے کسی معاملے سے دلچسپی نہیں تھی۔ یہ بات میں اس بنا پر کہتا ہوں کہ یہ میرا اپنا مشاہدہ ہے میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ کسی نے بھی یہ واقعہ نہیں بتایا ہوگا ــــ لیکن اماں مہراں نے اس بات کو بڑی ہوا دی

تھی۔ آنے جانے والے لوگ جب اس کی دوکان کے سامنے سے گذرتے ہوں گے تو اسے ضرور گھور گھور کر دیکھتے ہوں گے۔ ان گھورتی نظروں سے اس نے اندازہ نہیں لگایا ہوگا کہ وہ کسی غیر معمولی واقعے میں ملوث ہو چکا ہے۔ اس نے خطرے کی بو لازماً سونگھ لی ہوگی۔ پھر ــــــ؟ اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ کیوں نہیں دی تھی؟؟

اب میں ایک خاص سوال کی طرف آتا ہوں۔

سوال یہ ہے کہ اس واقعے کا آذر زوبی کی ذات اور فن سے کیا تعلق ہے۔ بظاہر اس نے نہ تو اس کی زندگی پر اثر ڈالا ہے اور نہ فن پر۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کی کوئی اہمیت بنتی ہی نہیں!

یہ درست ہے تجزیہ کریں تو یہی حقیقت سامنے آتی ہے مگر میں اس کو ـــــ یعنی اس واقعے کو اہمیت دیتا ہوں۔ میرے نقطۂ نظر سے اس کی اپنی ایک واضح اہمیت ہے اور اگر مجھے اس اہمیت کا احساس نہ ہوتا تو میں اسے لکھتا ہی کیوں۔ کیا ضرورت پڑی تھی کہ ایک ایسا حادثہ آذر زوبی کے بے شمار عقیدت مندوں اور مداحوں کو بتا دوں جس نے اس کی ذات اور تخلیقی رویئے پر کوئی اثر ہی نہیں ڈالا۔

میں عرض کروں گا کہ غیر شعوری طور پر میں منتظر رہا کہ کب موقع ملے اور میں یہ واقعہ لکھوں۔ دلیل یہ ہے کہ جب میرے عزیز اور محترم بھائی مہا لکھنوی نے لکھا کہ آذر زوبی پر "افکار" کا خاص نمبر شائع کرنے کا ارادہ ہے ـــــ تم ان کے پرانے دوستوں میں شامل ہو ـــ کچھ لکھو" ـــ اور میں نے یہ الفاظ پڑھتے ہی ارادہ کر لیا کہ یہ واقعہ ضرور لکھوں گا ـــ گویا اس تحریک کا منتظر بیٹھا تھا ـــ جیسے ہی تحریک ہوئی میں نے لکھنے کا ارادہ کر لیا۔

میں نے ابھی تک اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ میرے زاویہ نگاہ سے اس روداد کی اہمیت کیا ہے۔

جواباً کہوں گا کہ کوئی واقعہ بھی بظاہر کتنا معمولی ہو انسانی زندگی پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ڈالتا ہے ـــ اس سے کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور واضح ہوتی ہے اس چیز کو ذہن میں رکھ کر اس پر غور کرتے ہیں

اگر آذر زوبی گھورتے ہوئے چہروں سے گھبرا جاتا اور فوری ردعمل کا اظہار کرتا تو وہ اس لگن کو زندہ رکھنے میں کامیاب نہ ہوتا جو اسے اپنے فن کے ساتھ تھی۔ لگن کا مفہوم تو یہی ہے کہ فنکار ہر حالت میں ایثار اور استقامت کا ثبوت دے اور آذر زوبی نے یہ ثبوت دیا تھا۔ جبھی تو وہ آج ایک عظیم آرٹسٹ کے طور پر پاکستان ہی میں نہیں پاکستان کے باہر بھی عزت و احترام کا مستحق سمجھا جاتا ہے! اس واقعے کے پس منظر میں آذر زوبی کی اپنے فن سے بے پناہ لگن کا اظہار ہوتا ہے اور یہی اس کی اہمیت ہے۔

آذر زوبی کا ایک اور واقعہ مجھے یاد ہے۔

جس زمانے میں آذر زوبی تیزی سے شہرت کی بلندیوں میں پرواز کر رہا تھا ـــــ وہ اٹلی گیا۔ واپس آیا تو غالباً آئینہ ادب کے مالک شیخ عبدالسلام نے اسے اس ہوٹل میں استقبالیہ دیا جو چیرنگ کراس پر واقع تھا اور جس کا نام میٹرو تھا۔

بہت سے علم دوست دوستوں اور دانش وروں کو دعوت دی گئی تھی۔ ہوٹل میں کافی ہجوم تھا۔ میں بھی حاضر تھا۔ چائے نوشی سے پہلے اٹلی پلٹ آرٹسٹ سے کہا گیا کہ وہ اپنے سفر کے تاثرات، مشاہدات اور اٹلی کی نمائش گاہوں نے جو تصورات اسے دیئے ہیں وہ بیان کرے۔

سب حاضرین کو توقع تھی کہ وہ ایک لمبی چوڑی تقریر کرے گا اور وہ سب کچھ اگل دے گا جو سفر اطالیہ نے اسے دیا ہے۔ مگر یہ دیکھ کر ہم سب کو بڑی حیرت ہوئی کہ مصور خاموش کھڑا ہے اور اس کے ہاتھ میں اٹلی کے کسی میوزیم کی تصویر نظر آرہی ہے۔ گویا بزبان خاموشی کہہ رہا ہے۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ یہ تصویر دیکھ لو۔

بعض تو حیرت کے عالم میں اسے تکتے رہے اور بعض ایک دوسرے سے چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

آذر بت تراش — نذر زوبی — میرزا ادیب

شیخ صاحب نے کہا ۔

"آذر صاحب! آپ فن مصوری کے گھر سے لوٹے ہیں۔ ہمیں اپنے تاثرات بتائیے"

مگر آرٹسٹ بدستور خاموش رہا —— اور چائے نوشی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

زبان بندی کے معاملے میں آذر زوبی مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کے بہت قریب ہے ۔

فیض احمد فیض کا مجموعہ کلام چھپا تو ناشر نے لاہور کے متعدد اہل علم کو کتاب کی رونمائی کی تقریب میں دعوت دی۔ صدارت کے لیے فیض کے پرانے دوست جناب چغتائی سے کہا گیا۔ وہ کرسی صدارت پر تشریف فرما ہو گئے ۔

خیال ہے کہ اس زمانے میں فیض مرحوم اسیر زنداں تھے ۔

احمد ندیم قاسمی اور ظہیر کاشمیری نے فیض کی نظمیں کتاب سے پڑھ کر سنائیں۔ ہمیں صدر محترم سے توقع تھی کہ وہ فیض کے بارے میں بہت کچھ بتائیں گے ۔ لیکن وہ صرف ایک فقرہ کہہ کر خاموش ہو گئے ۔ اور وہ فقرہ یہ تھا "اس تقریب میں دوستوں نے حصہ لیا اور خود فیض نے بھی حصہ لیا"

آرٹسٹ بولنے میں بڑا "شائی" (SHY) ہوتا ہے ۔ مجھے معلوم نہیں اب زوبی کی کیا کیفیت ہے ۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ وہ آج بھی بڑا کم آمیز، کم گو در عزلت گزینی کو پسند کرنے والا آدمی ہے ۔ اخباروں میں شاذ و نادر ہی اس کا ذکر اذکار ہوتا ہے ۔ اپنے کام ہی میں مگن رہتا ہے ۔

آرٹسٹ زوبی کے فن پر گفتگو کرنا ان لمحوں میں میرے پیش نظر نہیں ہے ۔ یہ ذمے داری آرٹ کے ناقد کی ہے میں تو محض ایک عام آدمی ہوں جسے انگریزی میں LAYMAN کہتے ہیں ۔ بہرحال ایک عام آدمی بھی آذر زوبی کی تصویریں دیکھ کر کوئی نہ کوئی رائے قائم کر سکتا ہے ۔ میرے پاس آذر زوبی کی چالیس Pen drawings کا مرقع پڑا ہے اور یہ تحریر لکھنے سے پہلے میں نے ان تصویروں کو تیسری مرتبہ دیکھا ہے اور ایک ایک تصویر بس دیکھتا ہی رہ گیا ہوں۔

ان تصویروں نے مجھے جو تاثر دیا ہے —— چاہتا تھا کہ اس کا صرف ایک جملے میں احاطہ کر لوں اور یہ جملہ اس تحریر کے آخر میں لکھ دوں ۔

یہ جملہ کیا ہو —— میں نے بار بار اس پر غور کیا ۔ یہ مشکل حل نہیں ہوتی تھی ۔

چند لمحے بیشتر اس مرقع کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ یکایک خود زوبی نے ہی میری مشکل دور کر دی ۔

زوبی نے ثمین خان صاحب کو اپنی ایک پینٹنگ "بیداری" ۔ ۶ ستمبر ۱۹۹۶ء کو پیش کرتے ہوئے اس پر جو الفاظ لکھے ہیں وہ یہ ہیں ۔

قلم اور موقلم —— مو کا فرق —— ۔ اصل میں دونوں ایک ہیں

محترم ثمین خان کی نذر

گر قبول افتد

آذر زوبی

قلم اور موقلم — اصل میں دونوں ایک ہیں — اس فقرے نے مجھے "بشارت" دے دی ۔ اور وہ بشارت یہ ہے ۔ آذر زوبی ایک شاعر ہے، واقعی مجھے آذر زوبی اپنی تصویروں میں ایک شاعر بھی نظر آتا ہے اور اس کی ہر تصویر ایک مرصع غزل ہے ۔

میں زوبی کے فن پر ایک طویل و بسیط مقالہ لکھوں تو بھی اس کا ماحصل یہی ہوگا ۔

زوبی کا آرٹ اس کی شاعری ہے —— اس کی شاعری اس کا آرٹ ہے ۔

ایک بات اور کہوں گا ۔

وہ شعری بلندیوں پر بعید ترین افق پر پہنچ کر بھی اس سرزمین سے اپنا تعلق استوار رکھتا ہے جو اس کی اپنی سرزمین ہے —— جو سرزمین پاکستان ہے۔ وہ اوّل و آخر پاکستانی ہے اور یہی اس کا بنیادی تشخص ہے !

اشفاق احمد

زوبی میرا دوست

زوبی ـــــ میرا دوست نہ بھی ہوتا تو بھی میں اس کو ایک بڑا فن کار ہی سمجھتا۔ حالانکہ میرے سمجھنے اور نہ سمجھنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ پھر بھی اس کو اصرار ہے کہ میں چار گواہوں کے سامنے اس امر کا اعلان کروں کہ زوبی ایک عظیم آدمی، ایک عظیم فن کار اور ایک عظیم تخلیقی قوت ہے۔ یہ بالکل زوبی کا بچپنا ہے ورنہ آپ خود دلیل آفتاب کے طور پر اس کے مرقعات کا جائزہ لے چکے ہیں۔

اب جب کہ ہم زندگی کے اس دور میں پہنچ چکے ہیں جہاں سے بس ایک جست کی کسر رہ جاتی ہے تو کچھ پرانی باتیں کہہ دینے اور کر دینے میں کوئی مضایقہ نہیں۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے اور زوبی نے عہد کیا تھا کہ ہم اپنی اپنی لائن میں بڑے آدمی بننے اور شمالی ہندوستان کے WHO'S WHO میں داخل ہونے کے لیے سر توڑ کوشش کریں گے اور اگر نیا ملک پاکستان بن گیا تو اس کے دونوں حصوں کے معروف لوگوں کی صف اول یا زیادہ سے زیادہ صف دوم میں اپنا اپنا مقام ضرور حاصل کریں گے۔ میں تو خیر نوکریوں اور ملازمتوں کی ذلتوں میں لتھڑتا رہا۔ اس لیے اس معاہدے کو پورے طور سمجھ نہ سکا۔ لیکن زوبی نے اپنے زور عمل سے اور اپنی دن رات کی محنت سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ شمشیر زن جس میدان کو

فتح کرنے کا تہیہ کرتا ہے اس کو فتح کر کے چھوڑتا ہے ــــــــ ۔

اصل میں اگر ہم دونوں کو بچپن میں ایسی کتابیں پڑھنے کے لیے نہ دی جاتیں، جن میں اولوالعزم لوگوں کے قصے، بہادر لوگوں کی داستانیں اور غریب بچوں کے ترقی کی منازل طے کرنے کی روایتیں نہ ہوتیں تو ہم بھی ایسی وارمات نہ کرتے اور خلقِ خدا ہمارے بوجھ سے محفوظ رہتی۔ لیکن ہمارے بزرگوں نے ہمیں قصے بھی ایسے سنائے تھے اور کتابیں بھی ایسی لے کر دی تھیں کہ ہم نے سوائے ترقی کرنے، اپنی راہیں خود سنوارنے اور اونچے ستاروں پر کمند ڈالنے کے اور کچھ سوچا ہی نہیں۔ نہ اپنے اردگرد سے محبت کی نہ انسان کو انسان سمجھا، نہ الفت کے دربار کی دربانی کی نہ عجز، دنیاز کے مزے لوٹے۔ ہم تو خیر اچھے رہے۔ لیکن ہمارے اردگرد ہم سے کتنے خون ہو گئے اور کیسے کیسے معصوم قتل ہو گئے، اس کا ہمیں علم نہیں۔ پھر ہم ایسے نظامِ تعلیم کے سکہ بند پھوڑے تھے، جو علم عطا نہیں کرتا مینڈھے تیار کرتا ہے۔ یہ نظامِ تعلیم ہمارے ملک میں ہی نہیں، سارے عالم اور پورے کرۂ ارض پر جاری ہے۔ یہ خوبصورت اور معصوم اور شریف اور فرشتہ صفت بچوں کو مقابلے پر اکساتا ہے اور ان میں مقابلے بازی کی روح پیدا کرتا ہے اور کمپی ٹیشن کے زہر کے ٹیکے دیتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اگر فرسٹ آؤ گے تو یہ انعام ملے گا، سیکنڈ آؤ گے تو یہ انعام دیا جائے گا، سارے اسکول میں اول رہو گے تو وظیفہ ملے گا۔ باہر کے ملکوں کی سیر ملے گی اور بہت سے انعام ملیں گے، چنانچہ وہ معصوم اور فرشتہ پھوڑا اس انعام اور اس خصوصی برتاؤ کے شوق میں بڑیں مارنے والا ایسا بھیڑو بن جاتا ہے کہ سب اس کے قریب آنے سے گھبراتے ہیں اور کنی کتراتے ہیں۔ علم کے باڑوں سے جنھیں ہم درس گاہیں اور دانش گاہیں کہتے ہیں ایسے ڈھڈیکل چھترے اور مینڈھے برآمد ہوتے ہیں جنھوں نے چودہ پندرہ سال کی مدت میں آگے بڑھنے کے لیے تاک کے ٹکڑے مارنے کا فن بطریقِ احسن سیکھ لیا ہوتا ہے۔ پھر وہ زندگی کی جو راہ بھی اختیار کرتے ہیں، جس شعبے کو بھی اپناتے ہیں، اپنے اردگرد کے لوگوں کو ٹکریں مار مار کر گراتے جاتے ہیں، زخمی کرتے جاتے ہیں اور راہ خالی بنا بنا کر ترقی کی منزلیں طے کرتے جاتے ہیں۔ درس گاہیں اور دانش گاہیں خوبصورت، شریف النفس اور قابلِ رشک انسان پیدا نہیں کرتیں، بلکہ مقابلہ باز، تیغ زن پیدا کرتی ہیں۔ ہمارے یار عزیز قیوم قریشی صاحب نے بھی ایک طویل دو یف بارٹہ کھول رکھا ہے۔ وہ بھی زمانے کے قاعدے کے مطابق اول، دوم، سوم اور وظیفہ خور اس کو قرار دیتے ہیں جو اپنی انا کو پالتا ہے اور دوسروں کو معمولی گھٹیا تھرڈ ڈویژنا بنانے میں زور لگاتا ہے۔ دنیائے علم کے نزدیک لایق، شریف، قابلِ تقلید اور مثالی طالب علم وہ ہے جو یہ جانتا ہے کہ بابر نے کون سے سن میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا، یا خطِ سرطان اور خطِ جدی کے درمیان کونسی دنیا آباد ہے یا لوہے کو لوہا کاٹتا ہے کے محاورے کا کیا مطلب ہے؟ ــــ دوسرا طالب علم خواہ کتنا ہی شریف، کیسا ہی اچھا شہری، کتنا ہی اچھا پاکستانی، کیسا ہی اعلیٰ مسلمان، کیسا ہی مثالی بیٹا اور بھائی کیوں نہ ہو، مقابلہ باز اور زور آور اور (competitive) اسپرٹ سے رچے ہوئے کے سامنے ڈفر، بے کار اور نالائق کہلاتا ہے ــــــ ہم دونوں بھی چونکہ نالائق کہلوانا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے ہم نے بھی دائیں بائیں خوب تیغ آزمائی کی اور جو ہماری راہ میں آیا اس کو روندتے ہوئے، کاٹتے ہوئے اونچی منزل کی طرف روانہ ہو گئے اور الحمدللہ کافی اونچے ہو گئے۔ ہمارے کچھ ساتھی competitive spirit کے سہارے سی۔ ایس۔ ایس میں کامیاب ہو کر بیورو کریٹ ہو گئے، جو یہ اسپرٹ دو آتشہ رکھتے تھے وہ سیاست کے میدان میں چلے گئے اور امیر وزیر ہو گئے ــــــ عجیب بات ہے کہ مخلوقِ خدا کے خدمت گذاروں کے علاوہ اور جو کوئی بھی کسی اونچے مقام پر فائز ہوتا ہے یا عظیم ہوتا ہے یا گریٹ ہوتا ہے۔ اس کی آستین پر کئی معصوموں کے قتل کا خون ہوتا ہے باوجود اس کے کہ وہ اپنے آپ کو بہت ہی ارفع انسان سمجھا کرتا ہے ۔

زوبی بڑے غضب کا مصور ہے۔ اپنی شہرت اور ناموری کے لیے اس نے جو تصویریں، جو مرقعے اور جو مجسمے بنائے ہیں وہ آپ نے دیکھے ہیں، انھیں پسند کیا ہے، ان کی داد دی ہے۔ ان سے مسحور ہوئے ہیں، لیکن اس کی وہ تصویریں جو اس نے اپنی معصومیت کے دور میں

بنائی تھیں وہ آپ کی نظر سے نہیں گذریں۔ شکوے کو آپ نے بہت قریب سے دیکھا ہے لیکن یہ زوبی نہیں ہے۔ اس کا اصل وہ رنگ دار مرقعے ہیں جو وہ شہرت، ناموری، جہاد مسلسل، کوشش پیہم اور تجویز اور پلاننگ کی سیڑھی سے اُتر کر بناتا ہے اور کسی کو دکھاتا نہیں۔ کہا کرتا ہے یہ میری عبادت ہے اور عبادت کسی کو دکھا کر نہیں کیا کرتے۔ عبادت ترقی کے لیے سرخ رو ہونے کے لیے کی جاتی ہے۔ مجھے لوگوں کی نظروں میں معتدر رہنے دو۔ خبردار جو کسی اور سے اس کا ذکر کیا۔ بھاگ جاؤ ———

یہ آئل کلر کے مربع جو کھٹے ہیں۔ دو فٹ بائی دو فٹ۔ خطاطی نہیں ہے۔ کتابت بھی نہیں۔ بس رنگ ہیں۔ گھلے ملے۔ کھلے کھلے، ملے جلے، اور یوں لگتا ہے جیسے لکھا ہو۔ النبی الامیؐ۔ افضالت ذکرت۔ یا مزمل۔ یٰسین۔ کن۔ فیکون۔ میں کہتا ہوں یہ بھی لوگوں کو دکھاؤ کہتا ہے ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔

زوبی کمال کا آدمی ہے۔ مجھے معلوم ہے ایک دن یہ چپکے سے شہرت، ناموری اور ترقی کے زینے سے نیچے اُتر کر پھر تھرڈ ڈویژن مخلوق خدا میں مل جائے گا اور میں اپنی انا کی ٹیس پر اسی طرح بیٹھا رہ جاؤں گا جیسے چھوٹی بلی درخت پر چڑھ تو جاتی ہے۔ لیکن پھر اس سے نیچے نہیں اُترا جاتا۔ وہیں ایک بڑے سے ڈالے پر پڑی پڑی سوکھ جاتی ہے۔

کاش ۱۹۴۳ء میں جب ہم نے سید مٹھا کی ایک تنگ گلی میں یہ معاہدہ کیا تھا کہ ہم اپنی قوم اور اپنے بزرگوں کا نام روشن کرنے کے لیے ترقی کریں گے اور جو ہماری راہ میں آئے گا اسے روندتے جائیں گے تو اے کاش اس وقت ساتھ ہی یہ معاہدہ بھی کر لیا ہوتا کہ جب ہم واپس اپنی تھرڈ ڈویژن قوم میں جائیں گے اور اپنے بچھڑے ہوئے ٹکڑوں سے ملیں گے تو اکٹھے جائیں گے اور ہم میں سے کوئی ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا — لیکن اس وقت اپنے زعم میں اور اپنے خوش آئند مستقبل کی لگن میں ہم ایسا معاہدہ کرنا بھول گئے — اچھا زوبی! —

(تصاویر "شکوہ" کی تقریب رونمائی منعقدہ لاہور میں پڑھا گیا)

●●

میرے خیال میں زوبی ایک فن کار ہے، انسان دوست ہے اور ایک اچھا دوست ہے۔ اس کی تصاویر زندگی کی عمیق گہرائیوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ تصویریں اس امر کی نشان دہی کرتی ہیں کہ زوبی نے فن کی لازوال خدمت کی ہے۔

۲۵ راگست ۱۹۵۰ء ——— ناصر کاظمی

محمد علی صدیقی

آذر زوبی ایک دبستان ایک عہد

آذر زوبی ایک عہد کا نام ہے ایک ایسے عہد کا جب مصوری غزل کی طرح اعضاء کی شاعری سے عبارت تھی۔ وہ نصف صدی سے پنجاب کی حسین و جمیل دوشیزاؤں پر اپنے انداز میں شعر کہہ رہا ہے۔ ایک ایسے دور میں جب علاقے کے علاقے بے نام سی عمومیت کے بہاؤ میں اپنا مخصوص رنگ کھو رہے ہیں' زوبی آج بھی عبدالرحمن چغتائی کی کفایت سطری کے رد عمل میں اپنی کینوسوں پر خوبصورت جسم ابھارتا ہے۔ اس کا مدعا غالباً صرف یہ ہے کہ حسن گریزی سکہ رائج الوقت سہی، لیکن انسانی جذبات میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ آذر زوبی کا طاقتور تحت الشعور ہی اس کی وہ قوت تخیل ہے جو متشکل میں ظہور چاہتی ہے۔ زوبی نے پنجاب کے مخصوص مدرسۂ تصویر سازی میں آنکھیں کھولیں۔ عبدالرحمن چغتائی، اللہ بخش، سردار سوہن سنگھ جیسے پینٹر مصور اور امرتا شیرگل جیسی ہم عصر کے دور سے گزرتے ہوئے اب وہ زندگی کے ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہوا ہے جہاں اس کی تصویریں اس کی قوت متخیلہ کے احترام میں کینوس سے اتر آتی ہیں اور بھنگڑا ڈال دیتی ہیں۔ وہ شہر میں بیٹھا ہوا کھلیانوں کے خواب اور سہاگ کا سماں باندھتا ہے

اور اپنی متخیلہ کی دوشیزاؤں کے رقص بےخودی میں دیوانہ وار شامل ہو جاتا ہے۔ اس کی تصویریں جوان ہیں، سرکش ہیں، باغی ہیں۔ وہ خود کو موسموں کی سحر طرازیوں کے سپرد کر دیتی ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ کیا اب حقیقت صرف متخیلہ میں زندہ ہے۔ زوبی کے یہاں متخیلہ عام زندگی سے زیادہ زندہ ہے۔ قوت متخیلہ سے عاری لوگ روزمرہ کی زندگی کے معمولات میں اس قدر گھر چکے ہیں کہ وہ فطرت میں موجود تزئین کاری سے حظ اٹھانے کے قابل بھی نہیں رہ پاتے۔ زوبی اپنی تصویروں میں وہی سب کچھ تخلیق کرنا چاہتا ہے جو آہستہ آہستہ پس پشت جا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ لیکن مسلسل ــ وقت کی طرح جو کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا ہے۔ زوبی نے بھی پیچھے مڑ کر دیکھنا ترک کر دیا ہے۔ اسے غالباً علم بھی نہیں ہے کہ وہ تیس چالیس سال پہلے پوری طرح "فوکس" میں تھا اور اب "فوکس" سے باہر ہے۔ وجہ ساری یہی ہے، وہ رائج الوقت اجنبی مصوری کو بچپنے سے تشبیہ دیتا ہے۔ آخر اس مصوری کے پرچارکوں کو آذر زوبی کیوں بھلے لگتے۔ زوبی کے پنجے اپنی مٹی میں پوری طرح جمے ہوئے ہیں وہ پنجاب کے دیہات کے حسن بیزار اور حسن خیز ماحول کی تخلیق کرنے کی دھن میں گرفتار رہتا ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے حسن مطلق اور بدصورتی انسان کی اپنی تخلیق ہو۔ اس کی تصویریں دور حاضر کی تصویروں میں جاری و ساری بدصورتی کے خلاف صدائے احتجاج ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ "بدصورتی" کا ارتعاش یا تکرار یا استرداد حسن کے خلاف ایک شعوری کوشش ہی ہو سکتی ہے، فن نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زوبی ابھی تک حقیقت پسندی یا پھر کلی طور پر تجدید کا قائل ہے چونکہ تجرید خیر اعلیٰ کے تصور کی طرح حسن اعلیٰ کی اس اعلیٰ مجازی تشکیل سے عبارت ہے جس سے ایک فنکار کے یہاں سپردگی اور عبودیت کی نعمت غیر مترقبہ کے لیے نہایت درجہ کی تشنگی کا احساس ملتا ہے یہ وہی احساس ہے جو حقیقت پسندگی میں مجازی حسن کی تخلیق سے بھی برابر کا حظ حاصل کرتا ہے حقیقت پسندی اور تجرید بھی زوبی کے فن کے اہم رخ ہیں جنھیں وہ ہمہ وقت اجالتا رہتا ہے۔ زوبی نے اپنی فنی استقامت کو حقیقت پسندی اور تجرید کے دو انتہائی مشکل رویوں میں دیکھا ہے اس کے یہاں تاثراتی تیکنک کے لیے بھی گنجائشیں نکلتی ہیں لیکن وہ بھی حقیقت پسندی کے قریب ہیں اور اقلیدسی شکلوں کے دیدہ زیب ــــ Mosaics میں گندھی ہوئی ہیں۔

زوبی کی چالیس سال کی مساعی کے اولین دور میں حقیقت پسندی پر زور ملتا ہے اس کی تصویروں سے ہم کلام ہونے کو دل چاہتا ہے اس کی تصویروں سے پہلا رشتہ مسرت اور انبساط کا بنتا ہے ناظرین اس کی تصویروں کو دیکھتے چلے جاتے ہیں اور پھر وہ خود کو دور گذشتہ کی یادیں تازہ کرنے پر مجبور پاتے ہیں۔ سن اور سال کا فرق تھوڑی دیر کے لیے پس پشت چلا جاتا ہے حسین یادوں کے لاؤ لشکر تیز ہواؤں کے ساتھ خیمے تانے ہوئے آگے بڑھتے ہیں کہ شاید کہیں پڑاؤ کی ضرورت پیش آئے۔ زوبی کا صرف یہی ایک ایسا وصف ہے جس کے بل بوتے پر انھوں نے مغربی مصوری کے درجنوں "حملوں" کا دیوانہ وار مقابلہ کیا ہے زوبی کے متعدد ہم سن اور ہم عمر و کم عمر اس درجہ شتابی کے ساتھ مطابقت کی دوڑ میں شامل ہوئے ہیں کہ وہ ایک سیدھی سادی حقیقت بھی فراموش کر گئے کہ وہ جن تحریکوں کا تتبع اور تعاقب کر رہے ہیں وہ مغرب کے داخلی سماجی و معاشی بحران کی آئینہ دار ہیں۔ وہ مشرق کے لیے محض مدرسانہ اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ تحریکیں نشاۃ الثانیہ تحریک اصلاح اور صنعتی انقلاب سے جنم لینے والے تضادات کا لازمی نتیجہ ہیں جس کی وجہ سے حقیقت پسندی کے بعد فطرت پسندی، کیوب ازم، تاثراتی، مابعد تاثراتی ایجزم اور نجانے کتنے Expressions، اکثریت کے لیے سنسنی اور بہت کم کے لیے ناگزیر تیکنک کے طور پر ضروری ہو چکے ہیں لیکن نوآبادیاتی نظام نے جہاں ہزاروں سال پرانی تہذیبوں کو تہی دامن کیا وہیں ان کی جمالیاتی اقدار کو بھی مغربی جمالیاتی اقدار کے تابع یا ان کی تریج بنا چھوڑا۔ شاعری، ادب، موسیقی، ڈرامہ، فلم اور فن تعمیر

میں بھی کچھ ہوا رہ گئی؟ جمہوریت تو وہ نظام Fait accompli کے طور پر وارد ناقابل تقلید شعبہ بن کر سامنے آئی آخر ہم قرون وسطیٰ کے بادشاہی اور استبدادی نظام کی تقلید کیوں کرتے؟ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ہم جدید جمہوری نظام کی حد تک کسب فیض کرنے میں فخر محسوس کرتے کہ یہ بہرحال comonsense اور consensus کی جدید شکل کے تقاضوں پر پورا اترتا ہے لیکن ہوا یہ کہ ایک طرف ہم پر استبداد کی پیروی مسلط کی گئی اور دوسری طرف مغربی بوطیقہ کا فلسفۂ آزادی مطلق۔ دونوں کی چولیں آخر کس طرح فٹ بیٹھتیں۔ استبداد کی پیروی نے روح مسخ کی اور مغربی بوطیقہ کی حد درجہ انانیت پسند اور انفرادی نقطۂ نظر نے دانش وروں اور عوام کے مابین وہ مغائرت اور نفاق پیدا کر دیا کہ مغرب کے مادر پدر آزاد معاشرے کے دلدادگان اپنے من پسند مغربی "ہیروز" کی تقلید کرنے والے شاعروں، ادیبوں، مصوروں، سنگتراشوں، موسیقاروں اور ماہرین تعمیر کی طرز پر پاکستانی پکاسو، پاکستانی موسیاں، پاکستانی ہنری مور، پاکستانی ایلیٹ اور پاکستانی اسٹون کی پیدائش کا مطالبہ کرنے لگے مطالبہ اس قدر شدید تھا اور اس مطالبہ کے پس پشت مغربی ذرائع ابلاغ کا دباؤ اس قدر شدید ہونے لگا تھا کہ ہمارے دارلحکومت اور بڑے شہروں کی حاکم اشرافیہ نے مغربی مصوری کے نمونے اور ان کے بارے میں تنقید پر اس صفائی سے ہاتھ صاف کیا کہ ہم پبلک کے بے حد اصرار پر نہیں بلکہ خود اپنے اصرار پر مغربی کلچر کے بے دریغ خراج گذار بنتے چلے گئے۔ میں ذاتی طور پر تیزی سے سکڑتی ہوئی دنیا میں ثقافتی لین دین کا حامی ہوں لیکن قوموں کا جدا جدا قومی دماغ اور قومی پہچان بھی ہوتی ہے انگلستان اور فرانس مغربی تہذیب کی تبیح کے ہی دانے ہیں لیکن کیا مجال کہ آپ فرانس جا کر اسے انگلستان سمجھ بیٹھیں اور انگریزی زبان کو فرانسیسی گردانتے لگیں آخر وہ کیا بات ہے کہ جو بے پناہ مماثلتوں کے باوجود بھی ان دونوں ممالک کے مابین اس درجہ اختلافی ہے کہ ان دونوں ممالک کی ثقافت کی پہچان بن گئی ہے۔ ہم زوبی کے فن کے ذریعہ مماثلتوں میں اختلاف کے ثقافتی جوہر تک پہنچتے ہیں۔ ہم زوبی کی وساطت سے "پہچان" اور "اتحاد" اور مماثلت واختلافات کی تہہ تک پہنچتے ہیں زوبی سے زیادہ ہمارا کون سا مصور غرب زدگی کا شکار ہو سکتا تھا جس شخص نے روم کی مشہور زمانہ درسگاہ اسمیو (ISME 5) میں چار سال تک اطالوی شاگردوں کو سنگ تراشی اور مصوری کی تعلیم دی ہو۔ جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہو جس کی سنگ تراشی کی تعریف میں موجودہ دور کا سب سے بڑا سنگتراش ہنری مور Henry More رطب اللسان رہا ہو اپنی مٹی اور تہذیبی پہچان کے لیے اس قدر سرگرداں کیوں ہو کہ وہ گذشتہ ۳۲ سال سے ہزاروں نوجوان مصور اور مصورات کی صرف اس وجہ سے ذہنی تربیت کر رہا ہے کہ کہیں مغربی ثقافت کی یلغار میں ہماری پہچان ختم ہو کر نہ رہ جائے۔ پہچان تیزی سے مدہم ہوتی ہوئی پہچان! لیکن زوبی اپنے موقف پر قائم ہے آج بھی اس کا مطمح نظر وہی ہے جو اس کے دور شباب کا طرۂ امتیاز تھا۔

"فنون" قومی دماغ کی تشکیل کے ساتھ صورت گری بھی کرتے ہیں یہ مانگے تانگے کے نظریات پر نہیں چلتے بلکہ مانگے تانگے کے نظریات کے سامنے اپنے تہذیبی جوہر کی پہچان بن جاتے ہیں۔ سیاست اور معاشیات کے میدان میں علیحدہ پہچان کا رجحان پیدا ہو جائے تو ملک تقسیم ہو جایا کرتے ہیں علیحدہ شناخت کے احساس ہی نے پاکستان کو جنم دیا تھا کیا یہ احساس اس قدر فرو مایہ ہے کہ پہلے ہندوستان کی غالب آبادی کی ثقافت کے مدمقابل اپنی شناخت پر اصرار کرے اور پھر مغربی ثقافت کی نذر ہو جائے تو پھر بقول زوبی "پہچان" کے پہلے دور میں داخل ہونے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ کیوں نہ اس طغیانی کا انتظار کیا گیا جو مغربی ثقافت کے روپ میں اس درجہ غلبہ پانے والی تھی کہ وہ زوبی جیسے قوم پرست مصور اور دیگر دانشوروں کو منظر سے ہٹانے پر تلی ہوئی ہے۔ اصل معاملہ مغربی ثقافت کے باب میں اپنی کھڑکیاں بند کرنے کا نہیں ہے۔ مغربی سائنس وٹیکنالوجی سے اکتساب صرف مغرب ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ لیکن سائنس اپنی تمام تر آفاقیت کے باوجود ثقافتی

کمالات میں کم تر یا پس ماندہ سماجوں کی ثقافتی پہچان کے باب میں غیر جانب دار ہے ۔ یہ پس ماندہ سماجوں کے شکست خوردہ رہنما اور دانش ور حضرات ہی ہیں جو سائنسی و تیکنکی میدان میں مغرب سے اکتساب کے لیے اپنی ثقافتی اور روحانی اقدار کا نیلام بھی ضروری سمجھتے ہیں بعض سماجوں میں یہ کام اس درجہ آگے بڑھ چکا ہے کہ ان حضرات کے لیے زندگی گذارنے کا صرف ایک ہی ذریعہ رہ گیا ہے کہ وہ مغرب کی نقالی کریں ۔

زوبی نے مصوری کی دنیا میں اپنے ہم عصروں کے ساتھ اس شکست خوردگی کے خلاف نبرد آزما ہونے کے عزم صمیم کا اعلان کر رکھا ہے ۔ آپ اس کے اسٹوڈیو سے یوم آزادی کی نسبت سے تیار کیے جانے والے طغرے اور تہنیتی پیغامات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ دیگر مصوروں سے کس درجہ مختلف ہے ۔ ۱۴ اگست ۱۹۸۲ء کے موقع پر جاری شدہ ایک خوبصورت تہنیت نامے میں اس نے خلیل جبران کی وساطت سے ابنائے وطن پر واضح کیا تھا کہ وہ جس ذہنی خلفشار میں گرفتار ہیں وہ قومی تشکیل کے اہم کام میں بہت بڑی رکاوٹ ہے آپ بھی اس پیغام پر نظر دوڑائیے اور دیکھئے کہ زوبی قومی سیاست کی پریشان خیالی پر کس انداز میں تاسف کرتے ہیں ۔

میرے دوستو اور میرے ہم سفرو ۔

- اُس قوم پر ترس کھاؤ جو عقائد سے پُر اور مذہب سے خالی ہو ۔
- اُس قوم پر ترس کھاؤ جو اپنا خود ساختہ کپڑا نہیں پہنتی ۔

وہ اس اناج کی روٹی کھاتی ہے جو اس کے کھیتوں میں پیدا نہیں ہوتا ۔

اور وہ ان بیلوں کی شراب پیتی ہے جو اس کے باغیچوں میں نہیں اگتیں ۔

- اُس قوم پر ترس کھاؤ جو زبردست کو ہیرو اور چمکیلے لباس زیب تن کئے ہوئے فاتح کو فیاض گردانتی ہے ۔
- اُس قوم پر ترس کھاؤ جو نالوں کی آہ و زاری کے علاوہ سکوت اختیار کیئے ہوئے ہو ۔
- اُس قوم پر بھی جو اپنے تباہ حال کھنڈرات پر فخر و مباہات کا اظہار کرتی ہے اور اس قوم پر بھی جو اس وقت تک علم بغاوت بلند نہیں کرتی جب تک اس کی گردن تلوار اور گردن کش بلاک کے درمیان نہیں ہوتی ۔
- اُس قوم پر ترس کھاؤ جس کا سیاستدان لومڑی کی طرح ہو اور جس کا فلسفی محض ایک مداری ہو اور جس کا فن پیوند کاری اور نقالی پر مبنی ہو ۔
- اُس قوم پر ترس کھاؤ جس کے دانا عمر کے دباؤ میں گونگے ہو چکے ہوں ۔
- اور اس قوم پر بھی جس کے مردان راہِ ،تاہنوز، پالنے میں جھول رہے ہیں ۔

ظاہر ہے کہ خلیل جبران کے خیالات سے مطابقت گہرے روحانی اور جمالیاتی شعور کے احساس ہی سے ممکن ہو سکتی ہے ۔ زوبی نے شروع ہی سے اپنے فن کو تہذیبی اقدار کا ترجمان بنانے کی کوشش کی ہے ۔ اس نے ماحول کی سرد مہری کی پرواہ کیے بغیر اپنا مشن جاری رکھا ہے ۔ محمد حسن عسکری اور سعادت حسن منٹو نے زوبی کے مجسموں کے بارے میں دو ماہی "اردو ادب" شمارہ ۲ کی ادارتی تحریر میں یہی خیال ظاہر کیا تھا کہ زوبی نے "ماحول کی قدردانی سے بددل ہو کر بیٹھ رہنے کے بجائے اپنا کام جاری رکھا، بلکہ اپنے فن کو ترقی دینے کی بھی فکر کی" اور آج ۳۵ سال بعد بھی زوبی اپنے مشن پر گامزن ہے ۔ ماحول کی سرد مہری اب بھی شباب پر ہے لیکن ہار ماننے والا وہ نہیں ہے ۔

تہذیبی شعور سے مالامال دانشوروں نے زوبی کے بارے میں شروع ہی سے یہ رائے قائم کر رکھی ہے کہ وہ ہماری ثقافت کے جوہر تابدار کا شارح اور امین ہے۔ آپ اگر قومی تاریخ کے کسی بھی اہم موقع پر زوبی کے فن سے یہ سوال کریں کہ وہ اس منزل سے کس طرح عہدہ برا ہوا ہے تو اس میں آپ کے جذبۂ قوم پرستی کی تسکین کا خاطرخواہ سامان ملے گا۔ بعض دوسرے فنکاروں نے بھی اس انداز میں سوچا ہے اور انھیں سوچنا چاہیے تھا لیکن زوبی نے یہ سارا کام ایک قومی مشن کے مطابق کیا ہے جو آج بھی جاری ہے۔

ع "وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے"۔ زوبی بلاشک وشبہ فی زمانہ ہمارا قومی مصور ہے وہ ہماری قوم کے حسن و جمال کا نبّاض ہے۔ وہ صرف حسین رخ پر نظر رکھتا ہے چونکہ اس کے خیال میں بدصورتی پر صرف اسی وقت قابو پایا جاسکتا ہے جب حُسن و جمال کو اجاگر کیا جائے۔ احساس تناسب ہی حسن کی بالیدگی اور فکر کی تابندگی کا دوسرا نام ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ اس کے خیال میں عجیب الخلقت اور کریہہ المنظر روحوں سے اٹا پڑا ہے۔ اس وقت پاکستان کی مصوری کے بیشتر نام نہاد ناموں نے [illegible] تکنیک اور موضوعات میں پناہ ڈھونڈ رکھی ہے۔ شاید صرف اس لیے کہ ان کا ذہن گریزاں اور مطلق حسن سے حد درجہ بیدار ہوچکے ہیں۔ یہ روحانی بانجھ پن اور فنی فرسودگی کی روح فرسا صورت حال ہے۔

آذر زوبی نے اپنی اس دنیا میں آباد رہنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے سہارے وہ شعوری طور پر سرسوں کے کھیتوں میں لہلہاتی سرمست دوشیزاؤں کے رقص میں حرکت اور تال محسوس کرتا ہے جب وہ اپنی تصویروں کی جانب آپ کی توجہ منعطف کر کے ناظرین کی آنکھوں کی جانب دیکھتا ہے تو اُسے صرف ایک ہی تاثر سے غرض ہوتی ہے۔ کیا ناظرین کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی ہے؟ اور تصویروں ہی پر کیا موقوف سنگ تراشی ہو یا خطاطی calligraphy وہ حُسن، حرکت اور لمس کا مصور ہے فن، زوبی کے لیے خلاقی کا عمل ہے۔ یہ عمل نیابت ہے۔ یہ عمل صرف اسی صورت میں بامعنی ہے جب ناظر تھوڑی دیر کے لیے تخلیق کے اعلیٰ عمل اور اس عمل کے نتیجے میں سرمستی اور سرخوشی سے ہم کنار ہوسکے۔

ہر وہ شخص زوبی کے فن کا گرویدہ ہوگا جو غزل، منی ایچر تصویر، جہانگیر کے مقبرہ کی پچی کاری، تاج محل کی سادگی اور پرکاری اور کمپیوٹر سسٹم کی حیرت انگیز "رفتار" کے لیے گوشۂ رعایت رکھتا ہے۔ میں بھی اس کی ان بظاہر مختلف خوبیوں کو ایک ہی تسبیح میں پرونا چاہتا ہوں میں حسن کو خیر اعلیٰ تسلیم کرتا ہوں۔ حسن کی بنیادی قدر یہ ہے کہ وہ میری تہذیب کی جمالیاتی اقدار پر پورا اترے۔ چلئے اگر وہ پورا نہ اتر سکے تو اس کے ساتھ کم از کم زاویہ معاندنہ بنائے۔ میں متوازی ترقی کا قائل ہوں تاکہ مغرب کے ساتھ ساتھ مشرق بھی زندہ رہ سکے ان دو متوازی "پٹڑیوں" پر صرف وہی "انجن" چل سکتا ہے جس کی ڈرائیونگ سیٹ میں مشرق اور مغرب کے ساتھ یکساں طور پر انصاف کرنے والا ڈرائیور موجود ہو۔ مجھے زوبی کی شخصیت میں مشرق اور مغرب کچھ اس طرح یکجا نظر آتے ہیں کہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو قبول کرنے کی مجبوری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ زوبی کے یہاں جو سنجوگ ہے وہ ایک ایسے سوئمبر سے مشابہ ہے جہاں مشرق اور مغرب شوق وصال سے لبریز بار دوستی کے گلدستے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ میں کیا کروں کہ مجھے بہت سے دانشوروں کا مشرق اتنا ہی ناقابل قبول لگتا ہے جتنا کہ بعض حضرات کا مغرب لوگ کہتے ہیں کہ یہ مجموعہ بڑا ضروری ہے۔

مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ مجھے مشرق پر فخر ہے لیکن مجھے مشرق کی ہمہ جہتی پسپائی پر اظہار ندامت بھی ہے گذشتہ پانچ چھ سو سال کی مسلسل پسپائی نے ہمیں اس قدر ڈھیٹ بنا کر رکھ دیا ہے کہ ہم ٹھوس حقائق کی زبان میں گفتگو کے بھی متحمل نہیں ہو پا رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ مصوری اور خطاطی کے میدان میں بیشتر ایسے فنکاروں کی عملداری ہے جو مشرق کی روح سے اس درجہ ناواقف ہیں کہ وہ مغربی [illegible] اور مغربی تکنیک کے دام میں بری طرح گرفتار ہیں اگر یہ صورت حال پیدا ہوجائے تو پھر فن بذات خود تشنج کی کیفیت

کا آئینہ دار بن کر رہ جاتا ہے یعنی فن ایک مرض کے (symptoms) کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ہمارے بعض فنکار مستثنیات میں سے ہیں لیکن ان دنوں مصوری اور خطاطی اور paintings کی نمائشوں میں ایسی تصاویر کی بھرمار ملتی ہے جو حیرت ناک حد تک مبادی فن سے عدم واقفیت کا اشتہار ہوتی ہیں ظاہر ہے کہ فنون کے مبادی سے دوری بالآخر ایک ایسے ماحول کی دین ہوتی ہے جہاں ہنر بے توقیر ہو جاتا ہے۔ یہ وہ خطرناک دور ہوتا ہے جب فن طاقتور جہلا کی آہ اور واہ پہ دیوانہ وار رقص کرنے لگتا ہے۔ اور ہنرمند صحیح معنوں میں خلاق فنکار اپنے وجود کے بارے میں شک کرنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے آپ سے یہ سوال شروع کر دیتے ہیں کہ آیا وہ اپنے دور کے نااہل فنکاروں کے باب میں بہت زیادہ سخت گیر یا تنگ نظر تو نہیں؟ یہ سوال بھی صرف انہی اذہان میں سر اٹھا سکتا ہے جو فن کے بارے میں اپنے نظریہ کے علاوہ کسی اور نظریہ کی موجودگی کے متلاشی نہیں تو کم از کم قائل ضرور ہوں۔ دوسرے نظریات کی موجودگی اور ان کے لیے احترام کا جذبہ بذات خود بڑا خوش آئند ہے یہ وہ جذبہ ہے جس سے انسان کے قلب و نظر میں کشادگی کا احساس جاگزیں ہوتا ہے اور اس کے ذہن میں حسن و جمال کے مظاہر کے لیے ان گنت خلانے تخلیق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ فن کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کے بارے میں اس قدر کچھ لکھا اور سوچا گیا ہے لیکن یہ Plurality of views ہی کا نظریہ ہے جس کی وجہ سے یہ سوال ہر نسل اور زمانہ میں "جوابات" طلب کرتا رہے گا۔ حقیقی فن سوالات پر اصرار نہیں کرتا بلکہ جوابات فراہم کرتا ہے اور فن شناس فنکار کے جواب سے اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوال کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے آذر زدبی اور اس کے فن کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ میرے سامنے زدبی نے اپنے فن کا اندرون اور بیرون غرض کہ بہت کچھ سامنے رکھا ہے۔ ہرچند کہ زدبی صد درجہ کم آمیز ہے لیکن میری خوش قسمتی ہے کہ میں زدبی کو یار کہنے والے چند اشخاص کی فہرست میں شامل ہوں۔ ہم دونوں کے درمیان بیس سال کی بے تکلف ملاقاتوں کا رشتہ ہے۔ میں نے اس مدت میں اسے پوری لگن کے ساتھ کبھی مصوری، کبھی مجسمہ سازی اور کبھی خطاطی کے عمل میں یکسر کھوئے ہوئے دیکھا ہے اور کبھی اپنے اسکول آف ڈیکور کی کلاسیز میں چاق و چوبند استاد کی طرح اپنے شاگردوں سے حسن تناسب کی شان میں اس قدر دلنشین انداز کی گفتگو کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ جیسے وہ اس لمحہ صرف ایک اچھا استاد ہو اور بس۔ مشکل یہ ہے کہ زدبی نے فنوں کی جملہ شاخوں کو اس قدر محبت کے ساتھ برتا ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی تصویروں کی خوبصورت دوشیزاؤں سے دور ہٹ کر کھڑا ہونا نہیں چاہتا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جسم کے ایک ایک رنگ کے بہت قریب اور اپنے مطالعہ کی جزرسی کی داد چاہتا ہے اگر اس کی طویل ترین pen-drawing کو فرش یا دیوار پر پھیلا کر دیکھا جائے تو اس ڈرائنگ کی تفصیلات میں بھی وہ تمام التزامات ہیں جو Miniature Painting کا خاصہ ہوتے ہیں۔ یہ وہ مشرق ہے جو زدبی کے یہاں محفوظ ہے یہ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کے یہاں بھی محفوظ ہے لیکن انھوں نے تعامیل سے واضح اعراض کے باوجود تفصیلات کا التساب پیدا کرنے کی سعی کی ہے جب کہ زدبی نے تفصیلات میں بذات خود حسن تلاش کیا ہے۔ رنگوں، سطروں اور خد و خال کے حسن سے لطف اندوز ہونے کی اہلیت سے عاری زمانہ کا خاصہ ہے کہ اپنے دور کی بے شناختگی پر متاسف نظر آنے کی بجائے اس پر نازاں ہے یہ تاثراتی فن کا اسقاط Miscarriage ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ بے ہنر فنکاروں کے لیے یہ مجبوری یہ فارسی بنفسہٖ آرٹ کا درجہ حاصل کر لیتی ہے شاید ہی کوئی ایسی بدصورتی ہو جس نے اب تک آرٹ کے نام پر ترویج نہ چاہی ہو اور وہ بعض نادرہ سرپرستان، آرٹ کے لیے چند دنوں، ہفتوں اور مہینوں کے لیے خوبصورتی قرار نہ پا چکی ہو۔ بھلا کرے اس دور کی سوفسطائی طرز وکالت کا جس نے بدصورتی کو حسن کا درجہ دے دیا ہے لیکن ان معاشروں کے مفکرین سے کس طرح شکایت کی جائے جو مغرب کی محیر العقول مادی

اور معاشی ترقی دیکھ کے حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن خود کار معاشروں کے ادب اور فنون پر داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے ہیں اس رویے کی واضح مثال وہ خاموشی بسا اوقات لاتعلقی بلکہ معاندانہ روش ہے جو زوبی کے سلسلہ میں کار فرما ہے۔ زوبی کا قصور یہ نہیں ہے کہ وہ مغرب سے نابلد ہے۔ مغرب اس کی روح میں سالہا سال تک براجمان رہا ہے۔ اس نے مغرب کو اپنے سینہ پر سانس لیتے محسوس کیا ہے۔ وہ ایک سے زیادہ مغربی زبانوں میں عبور رکھتا ہے وہ حقیقت پسندی، تاثریت، مابعد تاثریت اور تجرید کی جملہ منازل سے گذرتے ہوئے خود سے یہ سوال کرتا رہا کہ "زوبی، تمہاری تخلیقات میں مشرق کی وہ تندرست فکر کہاں ہیں جو زندگی کا اثبات کرتی ہے۔" غالباً "یہی وجہ ہے کہ زوبی کے اولین مداحین میں اس وقت کے مغرب پرست محمد حسن عسکری بھی تھے شاید اُن کے اندر کا مشرق پرست اس وقت تک منطقوں کی ناگزیر "تقسیم" کا اس درجہ قائل نہ ہو سکا تھا کہ وہ زوبی کے فن پر "جذباتیت، پھوہڑپن یا غیر آرٹ کی پھبتیاں کسنے کی خواہش میں گرفتار ہوتے۔ وہ آخری وقت تک زوبی کے فن کے معترف رہے زوبی اُن کے "تہذیبی قلعہ" کا اہم اور ضروری پاسبان تھا۔ زوبی عسکری صاحب سے قدرے اختلاف کے باوجود مشرق کی روحانی اور فکری گہرائیوں میں راسخ ہے۔ وہ مغرب کو محض گمراہیوں کی پوٹلی نہیں سمجھتا۔ وہ مغرب کی کورانہ تقلید کا قائل نہیں ہے زوبی اور عسکری کے درمیان یہی فرق ہے یہ اور بات ہے کہ جیت، تا ہنوز، نہ عسکری کے حصہ میں آئی ہے نہ زوبی کے۔

زوبی کے فن کے بارے میں سعادت حسن منٹو نے بھی بڑے پتہ کی بات کہی تھی "زوبی اپنی canvases میں کوٹ کوٹ کر سرکش جوانی بھر دیتا ہے اور اس طرح وہ علم سے عمل کا رشتہ جوڑ دیتا ہے۔" منٹو ہی کیا پاکستان کا شاید ہی کوئی صف اول کا ادیب اور نقاد ہو جس نے زوبی کے فن میں ایک جیتی جاگتی تہذیب کی شناخت اور خوشبو محسوس نہ کی ہو۔ اس کی تصویروں میں دیہی پنجاب کے رقصاں نوجوان " امرتا پریتم " کے پنجاب کے المیہ کی وجہ تسمیہ ہیں۔ جب قدرت مہربان ہو اور جسم سنگار رہے مار رہے ہوں تو پھر بسنتی رُت کی اہمیت اجاگر ہو جاتی ہے۔ لیکن زوبی نے مشرق کے مابعد الطبعی تجرید کی روح میں اتر کر محسوس کیا ہے کہ جو ہے وہ بڑا سہانا ہے اور جو ہو سکتا ہے وہ بھی کم اہم نہیں۔ زوبی کی تصویروں کی خوبی ہی یہ ہے کہ وہ ہم پر اپنی ذات کے لاشعور یا تحت الشعور کے بعض ایسے گوشے منور کر دیتی ہیں کہ ہم دفعتاً اس سفر کی اہمیت کا اندازہ کر پاتے ہیں جو وقت سے عبارت ہے۔ زوبی وقت کی سادگی اور اسرار پچایئوں کا فنکار ہے۔

زوبی کے یہاں مناظر فطرت کی عکاسی کی کامیاب کوششیں ملتی ہیں وہ قومی اہمیت کے مواقع پر بھی اپنے موئے قلم کو جنبش دیتے ہیں ہر چند کہ زوبی کی تربیت مغرب میں ہوئی ہے لیکن وہ اس روایت کے بھی امین ہیں جو برصغیر کے مختلف مکاتب فکر کی دین ہے۔ مناظر فطرت کی عکاسی خالصتاً مغربی وصف نہیں ہے مکتب اصفہان کی مصوری کا طرہ امتیاز بھی یہی تھا کہ وہ قومی زندگی کے مظاہر پر زور دے۔ اس مکتب فکر کا ایک مشہور نمائندہ مصور رضا عباسی تھا جو انسانی کشمکش کی عکاسی میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اس مکتب فکر کی پیروی اٹھارویں صدی تک ہوتی رہی لیکن برصغیر میں انسانی زندگی کی تفہیم کی مبسوط کوششیں باقاعدہ طور پر مغربی اثرات کے تحت شروع ہوئیں۔ خود ایران میں بھی شاہ عباس کی کوشش یہ تھی کہ ایرانی مصور یورپ کے فنون سے استفادہ کریں زوبی کی تصاویر، ناد انستہ طور پر یورپی، ایرانی اور ہندی اثرات کا حسین امتزاج ہیں جس طرح جہانگیر کے مقبرہ میں پچہ کاری کا کام چہل ستون (اصفہان) کی یاد دلاتا ہے۔ اس طرح زوبی کا فن رضا عباسی کے فن کی یاد دلاتا ہے لیکن رضا عباسی اور زوبی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مماثلت ضروری اور تفریق بہت اہم ہے یہ روایتوں کے سلسلے ہیں جو خاموشی سے جاری ہیں۔ صفوی دور کے اصفہان اور آج کے کراچی کے مابین قربتوں کی ایک مثال زوبی بھی ہے۔

محمد علی صدیقی

نذر زوبی

آذر زوبی۔ ایک دبستان ایک عہد

اب میں زوبی کی مجسمہ سازی کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا زوبی پاکستان میں مجسمہ سازی کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

زوبی کے فن مجسمہ سازی کی روایت پراچین ہند کی روایت سے جڑی ہوتی ہے لیکن مجسمہ سازی کے Material میں یکسر تبدیلی کے باعث زوبی اپنے dimension کے چہرہ شناس کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں ویسے بھی سنگتراشی کے فن میں concave ment سے عہدہ برا ہونا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ زوبی کے بعض پیتل کے مجسموں سے ہویدا ہوتا ہے کہ وہ بدن کے مختلف اعضا کی موزونیت پر اس طرح زور دیتے ہیں جیسے کہ احساس تناسب ایک غنائیہ نظم کا لازمی حصہ ہو وہ پلاسٹر کے ذریعے mould کرتے ہیں۔ زوبی نے اپنے مجسموں میں Space کے لیے بڑی مہارت کے ساتھ گنجائش نکالی ہیں انہوں نے مشرق سے مجسموں کے اعضا کے مابین Space کا احساس تناسب اور مغرب سے matter کا احساس تناسب کچھ اس انداز میں اخذ کیا ہے کہ اگر ہمارے یہاں مجسمہ سازی کے ساتھ صرف اس قدر رعایت برتی جا سکے کہ اسے محض ایک فن تصور کر لیا جائے اور مجسمہ اور عقیدہ کو باہم حریف نہ تصور کیا جائے تو ہمارے یہاں اس میدان میں بھی بہت کچھ کام کیا جا سکتا ہے۔ زوبی اپنے مجسموں میں Exaggeration پر انحصار کیے بغیر بہت سے زاویہ ہائے نگاہ فراہم کر دیتے ہیں کہ دیکھنے والا مجسمہ کی ہشت پہلو تہوں میں سے کسی نہ کسی تہہ پر رک جائے اور پھر تادیر رکا رہے۔

اب میں زوبی کے فن خطاطی کی طرف آتا ہوں زوبی نے اس زمانہ میں خطاطی سے شغف کا مظاہرہ کیا جب بعض اہم مصوروں نے حروف ابجد میں کائنات گیر نظام کی جستجو کا دھیان بھی نہ دیا تھا۔ زوبی عالم اسلام میں سہ ابعادی Three Dimensional خطاطی کے موجد ہیں اور وہ اپنی جنبش قلم سے اسماء کے تمام concepts اور قرآنی آیات کی کچھ اس طرح تشریح کرتے ہیں کہ ان کا کینوس جمالیات سے زیادہ مابعدالطبیعی اسرار و رموز کی عقیدہ کشائی کرنے لگتا ہے۔ خطاطی روحانی کائنات کا تجریدی اظہار ہے اور اس میں فنی باریکیوں سے زیادہ اس عشق کی تلاش کی جاتی ہے جو روحانی زندگی کی بنیاد ہے۔

زوبی ہر لحاظ سے ایک منفرد فنکار ہے وہ اپنی تخلیقات میں جہاں ازلی اور ابدی رشتوں پر نگاہ رکھتا ہے وہاں وہ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے بقول ہمہ وقت ایک بچہ بننے کی کوشش میں سرگرداں دکھائی دیتا ہے جہاں وہ فیشن ایبل مفروضات کو خیرباد کہنے کی جسارت کا مظاہرہ کرتا ہے وہاں وہ ذہنی شعور کو سرمایۂ شعور سے آزاد بھی نہیں ہونے دیتا۔ اس کے یہاں فن موضوعیت یا دیوانگی کا دوسرا نام نہیں ہے۔ جمال پرستوں کا دعوی رہا ہے کہ انسانی معاشرہ پر آرٹ کی حکمرانی کے ذریعہ بدصورتی اور ظلم کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے شاید اس دعوی کے پس پشت یہ جذبہ کارفرما رہا ہو کہ انسان حسن اور جمال کی پرستش کے بارے میں بہت فیاض رہا ہے بعض حضرات کے لیے آرٹ بذات خود ایک مذہب ہے لیکن زوبی ان فنکاروں میں سے ہیں جن کا فن انسانی فطرت کے جذباتی پہلو کی نمائندگی کرتے ہوئے بھی مستقل بالذات حقیقت کا متلاشی ہے۔ زوبی حسن کو صداقت تسلیم کرتے ہوئے بھی اسے نظریۂ حیات ہی کے تابع سمجھتا ہے اس معاملہ میں زوبی۔ سی۔ ایم جوڈ کے طرفدار ہیں۔ جوڈ کہتے ہیں:

"زندگی خواہ غیر عقلی انتشار ہو تو بھی ادبی تحریروں کا منضبط اور معقول ہونا قرین قیاس ہوتا ہے کیونکہ ادبیات کا کام ہی زندگی کی ترجمانی کر کے اسے بامعنی و مربوط بنانا ہے یہ مقصد زندگی کے فساد و انتشار کی عکاسی کرنے سے حاصل نہیں ہوتا اگر ایک اہل قلم زندگی میں مجھ سے زیادہ کوچ نہیں لگا سکتا تو مجھے اس کی تحریر سے کیا فائدہ ہوگا۔ زندگی کے انتشار میں ضبط و نظم پیدا کرنے، اس کی ظاہری لغویت کو بامعنی بنانے اور اس کے معنی کو قابل فہم بنانے کے لیے ایک مصنف کو عقل و خرد سے رجوع کرنا پڑے گا کہ عقل و خرد ہی ہمارے تمدن کے فروغ کا باعث ہوتی ہے اور اس نے انسان کو وحشت اور بربریت کی سطح سے بلند کیا ہے۔"

(جوڈ)

زوبی کی تصاویر میں فساد اور انتشار کی بجائے حسن وجمال کا نظم وضبط ملتا ہے ۔ زوبی کی calligraphic Paintings میں ایک حقیقت بار بار اجاگر ہوتی ہے یہ صفات کمال کی حقیقی ماہیت، بقول زوبی، کبھی بھی نہیں جا سکتی ۔ زوبی کے مطابق یہ صرف اس طرح ممکن ہے کہ ہم تمثیل قیاسات کے ذریعے سے اور ان صفات کے اثرات سے جو ہستی میں ظہور کرتے ہیں صفات کمال کی حقیقی ماہیت تک جزوی رسائی حاصل کریں ۔

زوبی کی تصاویر کی رمزیت خوبصورت، دلنشیں اور تہہ دار ہوتی ہے وہ حقیقت کی نیابت اصرار پسند نہیں کرتی لیکن صرف قیاس کی مدد سے کچھ اشارے ضرور کرتی ہے رنگوں کی زبان میں زوبی ایک ہی صفت کے سکونی اور حرکی پہلوؤں کی جانب نشاندہی کرتے ہیں اور بحیثیت ایک تہہ دار فنکار دلدادگان فن پر گہرا تاثر مرتب کرتے ہیں کہ فن کے ذریعہ نہ صرف انفرادی بلکہ قومی جمالیاتی نظام کا بھی تحفظ کیا جا سکتا ہے ۔ زوبی نے عمر بھر جن آدرشوں سے رومانی طرز مصوری اختیار کیا ہے اُس مکتب فکر کا اختصاصی پہلو بھی یہ ہے کہ وہ "اب اور یہاں" "میں" "کل" کی تلاش جاری رکھے ۔ یہ تلاش اُس وقت تک جاری رہیگی جب تک زندگی باقی ہے ۔ زندگی کے ساتھ جاری وساری فن تہذیبی عمل سے مماثل ہے اور یہی وجہ ہے کہ محمد حسن عسکری سے لیکر اب تک شاید ہی کوئی ایسا بڑا ادیب اور نقاد ہو جس نے زوبی کی روح پرور مصوری کی دلآفرینی کی گواہی نہ دی ہو ۔

●

پتھر، رنگوں اور مٹی میں شاعری ۔ مجھے زوبی کی تخلیقات سے اپنے خالق کی انگلیوں اور آنکھوں کی تعریف میں نغمہ ریز دکھائی دیتی ہیں ۔ کاش میں بھی ان سب کے ساتھ شریک ہو سکتا ۔

۱۱ مارچ ۱۹۵۰ء ———————— یوسف ظفر

O

فن کے ذریعے عرفان حقیقت ۔ یہ ہے وہ رمز جو مجھے زوبی میں نظر آیا اس کی ایک اپنی دنیا ہے ۔ بہت شاندار، منفرد اور دلکش

۲۷ جولائی ۱۹۵۰ء ———————— اے ۔ آر ۔ شبلی

بانو قدسیہ

زوبی اور شکوہ در شکوہ

شاعر پر کئی کیفیتیں نازل ہوتی رہتی ہیں اس لیے وہ ایک دور میں ناسک دوسرے دور میں توحید پرست تیسرے دور میں کمیونسٹ ہو کر بھی صوفی ہلہے۔ جذبات کے اعتبار سے اس کے اندر کھچڑی پکتی ہے۔ لیکن لوگ عموماً اسے صرف اس خوشبو سے پہچانتے ہیں جو پکنے کے مختلف مقامات پر اس کے کلام ہ آتی رہتی ہے۔

پیغمبری سے شاعر اس لیے پیچھے رہ جاتا ہے کہ شاعر کا عمل عموماً اس کے آئیڈیل کا شاہد نہیں ہوتا۔ لیکن ضرورت کے اعتبار سے پیغمبر اور شاعر لوں کو ایک خاص نوعیت کے تابعین درکار ہوتے ہیں۔ پیغمبر کو ایسے عارفین کی آرزو ہوتی ہے جو اس کا پیغام دور دراز کے مقامات تک پہنچا سکیں۔ اعر کو ایسے فن کار کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے کلام کو موسیقی کے قریب لا سکے۔ ایسے آرٹسٹ کی خواہش ہوتی جو اس کے تمام جذبوں کو صفحۂ قرطاس بدی کرسکے۔ جو نزاکتیں الفاظ میں چھپی رہتی ہیں ان پر سے نقاب اٹھا کر دکھا سکے کہ جہاں الفاظ کی قوت ختم ہو جاتی ہے، وہاں آرٹسٹ کا برش، پن، ے اس کی تکنیک، اس کا احساسِ جمال معنی کی سرحد کو منقطع نہیں ہونے دیتا اور یوں الفاظ تصویر میں ڈھل کر ایک نئی حقیقت میں بدل جاتے ہیں۔

اگر زوبی جانتے کہ ان کے پیشے سے خلق کو "شکوہ" کے صحیح مطلب سمجھ میں آنے کا احتمال ہے۔ تو غالباً وہ ان تصویروں کو بنانے کا قصد ہی نہ کرتے کیوں کہ آرٹسٹ اپنے خیالات نشر کرنے میں فراخ دل اور کسی دوسرے کے نظریات کی تشریح کے معاملے میں تھوڑا واقع ہوتا ہے۔ لیکن یوں احساس ہوتا ہے کہ زوبی نے شکوہ پڑھتے ہوئے کسی لمحے اس بات کا عرفان حاصل کیا ہے گویا یہ بھی ان کے دل میں تھا ـــــ

اقبال کو اس کی آگاہی بے چین رکھتی تھی ـــ مثبت و منفی قوتوں کا اتصال، مشرق کی بے مائیگی میں اس کا قرینہ، مغرب کی جہاں سوز ترقی میں اس کی جہالت، فلسفے کا خیرہ کن حسن اور اس حسن میں برف کا دل، اقبال گویا ہر وقت تضاد کی صلیب پر وقت بسر کرتے تھے ـــــ

زوبی کو دیکھنے پر لگتا ہے گویا وہ انتشار سے ناآشنا ہے لیکن وہ تصویر دیکھیے جہاں آتش کوہ ایران ویران پڑا ہے یا اُس تصویر پر نگاہ ڈالیے جس میں غیر کو اس جہاں میں حور پھل پیش کر رہی ہے ـــــ سہمے ہوئے بتوں پر ایک نظر ڈالیے۔ یہ تمام تصویریں اس تضاد کو روشن کر دیں گی جو ایک بڑا آرٹسٹ ولین بناتے وقت پیش نظر رکھتا ہے۔ ولین اگر تمام تر قابل نفرت ہو، جہنمی ہو تو شاعر، ادیب آرٹسٹ چھوٹے قد کا رہ جاتا ہے۔ لیکن زوبی کی طرح اگر ولین کو دیکھ کر نفرت کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا رحم، تھوڑی سی رقت بھی طاری ہو جائے تو سہمے ہوئے بت جنم لیتے ہیں۔ لوٹتے ہوئے آتش کدے سے دھواں اٹھتا ہے اور ولین حور و قصور کے باوجود ترس کے قابل شخصیت بن جاتی ہے اور وہ سارا تذبذب، حیرانی اور چپ کی کیفیت ابھرتی ہے جس نے اقبال کی شاعری میں جگہ جگہ ابلیس کو نئے نئے زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انسان کے اندر رہنے والے ابلیس کی ایسی ہی کئی جھلکیاں زوبی کو بھی نظر آتی رہتی ہیں وہ اپنے ہیرو کو اسی لیے بے داغ نہیں دکھاتا کہ لطافت بے کثافت جلوہ فرما ہو نہیں سکتی۔ سارے شکوے کی تصویریں دیکھیے اس میں مسلمان پر نظر ڈالیے۔ اُس کا کندھا عموماً ایسے ننگا ہے جیسے احرام بندھا ہو۔ لیکن اس کے چہرے پر وہ طمانیت نہیں جو ہم مومن کے چہرے پر دیکھنا چاہیں گے۔ ـــــ

اس چہرے میں وہ جھلاہٹ موجود ہے جو شکوے کی جان ہے اس میں وہ ابلیسیت موجود ہے جو شکوے کا باعث بنی، اس میں جگہ جگہ وہ مظلومیت ملتی ہے جس کی وجہ سے شکوہ پڑھتے ہوئے رقت طاری ہو جاتی ہے اور ہر مسلمان محسوس کرتا ہے کہ اللہ نے اُس سے ناانصافی کی ہے ـــــ زوبی نے مرکزی کردار کے حوالے سے، اسی کردار کے کرب کی ایما سے، اور اس کرب میں چھپی ہوئی بے چینی کی رمزیت سے سارا ماحول تخلیق کیا ہے ـــــ زوبی کا دشت، اس کی تلوار، بکھرے ہوئے درخت، بُت، درختوں کی گم صم کیفیت، تصویروں، پتھروں، انسانوں کی ساری زبان ایک ہے ـــ شکوے کی زبان!

ـــــ زوبی تین حکایتوں میں بند ہے ـــــ آدم و حوا کی کہانی

ـــــ ماں بچے کا ایڈیپس کامپلیکس

اور ـــ بن باس کی کتھا

وہ جب کبھی تصویر بناتا ہے، اس کی تصویر میں جب بھی مرد اور عورت موجود ہوتے ہیں تو یہ دونوں باغ بہشت میں موجود ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی وارفتگی میں ماں اور بچے کی طرح پرورش کا عنصر غالب ہوتا ہے لیکن ہر وصل کی تصویر میں ہمیشہ بن باس چھپا ہوتا ہے۔ گو تصویر کا وقت ابدی ہوتا ہے اور وہ لمحے کو مقید کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ لیکن زوبی کی تصویر دیکھ کر شبہ گذرتا رہا ہے کہ ابھی یہ ماں بچہ باغ بہشت سے رخصت ہو کر الگ الگ بن باس کو چل دیں گے

شکوے کی پہلی تصویر کو دیکھیے ـــــ یہ وہ مقام ہے جہاں آدم موجود ہے، حوا بیٹھی ہے ـــــ گلے کا آغاز ہے بن باس پہلی دستک سنائی دے رہی ہے۔

بانو قدسیہ — نذر زوبی — زوبی اور شکوہ در شکوہ

یوں لگتا ہے ——————

اقبال کو بھی اس دیس نکالے کا خوف کچھ کم نہ تھا —— اور وہ بہشت سے نکلنے کے واقعے سے اس قدر خائف نہ تھے جس قدر جانتے تھے کہ اب اگر جانا ہوا تو ہم کہاں جائیں گے ؟ —— —— ——

زوبی کی تصویریں بھی اسی خوف سے لرزاں ہیں اور اسی خوف سے اُن میں اتنی Static Electricity موجود ہے ——

(تصاویر "شکوہ" کی تقریب رونمائی منعقدہ لاہور میں پڑھا گیا)

دائروں کی اس کائنات میں کوئی دائرے کی وسعت کو بیان نہیں کر سکتا۔ جب بھی کسی دائرے کی وسعت بیان کی جاتی ہے تو کوئی اور دائرہ اس کا احاطہ کر لیتا ہے۔ دائروں کے اس سمندر میں ہر شے اپنے دائرے کی اسیر ہے۔ بعض ان دائروں کی معراج تک پہنچ جاتے ہیں اور بعض منزل کی صحیح سمت نہ چلنے پر، دوسرے دائروں میں الجھ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ جو ختم ہو جاتے ہیں وہ بھی ایک دائرہ ہیں اور بعض لوگ اپنے گرد اتنے دائرے لگا لیتے ہیں کہ وہ سمجھ میں نہیں آتے۔ جو سمجھ میں نہیں آتے وہ بھی ایک دائرہ ہیں۔ جناب آذر زوبی کے گرد بھی اتنے دائرے ہیں کہ ان کو سمجھنا اتنا آسان نہیں۔ جناب آذر زوبی کیسے مصوّر ہیں یہ کہنا میرے لیے اتنا ہی مشکل ہے جیسے کسی بچّے سے کہا جائے کہ وہ ہوائی جہاز اڑائے تو یہ ناممکن ہے! اسی طرح دائرے کی وسعت بیان کرنا میرے بس میں نہیں۔ دائرے معیار کے مطابق بن جاتے ہیں۔ کوئی شخص "بندی" لکھی ہوئی دیکھتا ہے، اسے وہ لکھائی اچھی بھی معلوم ہوتی ہے مگر وہ اسے پڑھ نہیں سکتا۔ لکھائی کو بغیر پڑھے پسند کرنا، یہ بھی ایک دائرہ ہے۔ اور اسی لکھائی کو دوسرے شخص کا دیکھنا جو اسے پڑھ بھی سکتا ہے اس کا پسند کرنا، یہ بھی ایک دائرہ ہے۔ مصوّری بھی ایک زبان ہے۔ ایک لکھائی ہے جسے دیکھ کر پسند کرنا اور بات ہے اور اس کی معنویت کو سمجھ کر پسند کرنا کچھ اور بات ہے۔ زوبی صاحب کی پینٹنگز قومی امنگوں کی ترجمان، رنگوں کے امتزاج اور متحرک خاکوں کے ساتھ کچھ کہتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کو اچھا یا برا کہنا، یہ اپنی سمجھ کا دائرہ ہے۔ جناب آذر زوبی کے بنائے ہوئے قومی دانشوروں کے مجسّمے دانشوروں کی عظمت بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آذر زوبی صاحب مصوّر ہیں، مجسمہ ساز، ڈیزائنر، آرکیٹیکٹ، دانشور اور پروفیسر بھی ہیں۔ یہ سب دائرے ہیں۔ ان دائروں میں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ زوبی صاحب ایک کنویں کے مانند ہیں جو پیاسا ہوتا ہے۔ وہ کنویں پر آتا ہے اور سیراب ہو کر چلا جاتا ہے۔ کائنات جسم اور روح سے عبارت ہے اور یہ جسم اور روح کا کھیل ازل سے جاری ہے۔ جسم اور روح کا یہ دائرہ آج تک سمٹ کر نکتہ نہیں بن سکا۔

۸ اگست ۱۹۸۸ء —————— فرہنگ قمر

محترمہ فاطمہ جناح

نذرِ زوبی

نذرِ زوبی

محمد حسن عسکری
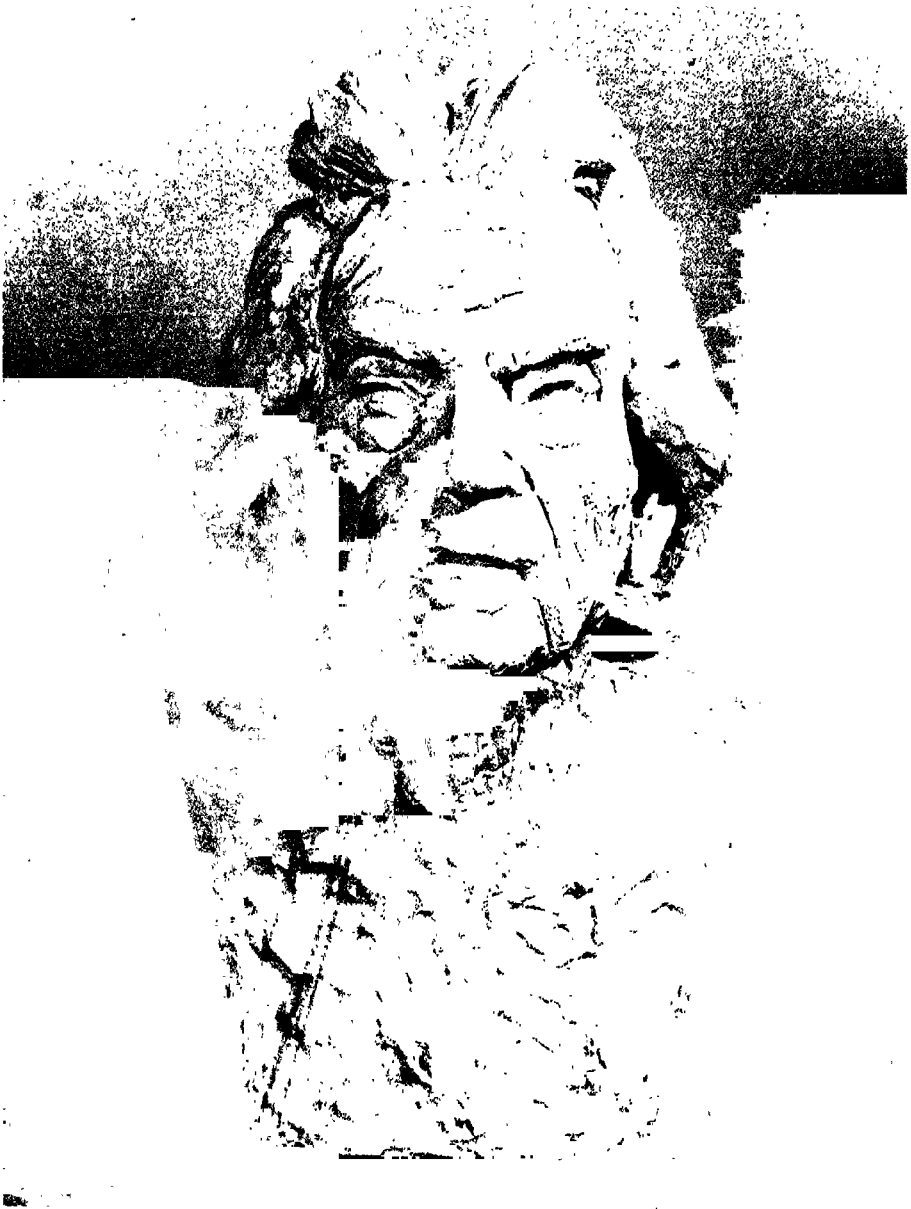
انور عنایت اللہ

زوبی ایک خالق ایک مخلوق

برسوں کے بعد صدر جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے دنیا ہی بدلی نظر آئی۔ لوہری بازار کے اس علاقے سے گزرا جہاں پچھلے سال بموں کے دھماکوں نے بہت سے معصوم انسانوں کو بے دردی سے قتل کیا تھا تو پتہ چلا تخریب کاری کے اس گھناؤنے جرم کے اثرات اب تک باقی ہیں۔ پھر میں ایمپریس مارکیٹ کی طرف گیا تو خدا کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی تاریخی عمارت جوں کی توں کھڑی ہوئی ہے اور اپنی شان اور شوکت سے اس دور کی یاد دلاتی ہے جب انگریز حاکم ، برصغیر کے اکثر چھوٹے بڑے شہروں میں مشرقی اور مغربی فنِ تعمیر کے دلکش امتزاج سے ایسے ہی مارکیٹ تعمیر کرواتے تھے۔ کراچی میں اس دور کی کبھی اور بہت سی تاریخی عمارتیں تھیں۔ اب ان کی اکثریت غائب ہو چکی ہے کیونکہ ہم ماضی کی تمام یادگار کو بلا وجہ بے دردی سے مٹا دینے پر تُل گئے ہیں۔ ایمپریس مارکیٹ کی عمارت خدا جانے کس کی غفلت کی وجہ سے اب تک محفوظ ہے۔

ایمپریس مارکیٹ کا جائزہ لینے کے بعد زیب النساء اسٹریٹ کی طرف چلا تو کراچی کی وہ ان گنت شامیں یاد آگئیں جب غالب جوان تھا۔ میونسپل دواخانے سے قریب، جہانگیر پارک کی پشت پر ایک گلی ہے۔ اسی گلی میں کبھی ایک پریس تھا۔ اب اس کے آس پاس کی دکانوں کی شکل کچھ اتنی بدل گئی ہے کہ پتہ نہیں وہ پریس وہاں موجود ہے یا نہیں۔ مجھے تو اس گلی کو دیکھکر اپنی وہ بہت سی شامیں یاد آگئیں جو اُس پریس میں گذری تھیں۔ اگر وہ پریس وہاں ہو بھی تو مجھے اب اتنے برسوں کے بعد اس سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ میری دلچسپی کا مرکز تو اب اپنی ظاہری شکل اور وضع قطع بدلے سنیٹرل ہوٹل کی پہلی منزل پر ایک جدید انداز کا آرٹ اسکول کھولے بیٹھا ٹھاٹھ کر رہا ہے۔

اُس زمانے کے آذر زوبی اور آج کے زوبی میں مجھے بہت فرق نظر آتا ہے۔ اُس وقت وہ جوان تھا، وزن بھی قدرے کم تھا، کراچی میں نوواردتھا، دولت کی ریل پیل ایسی نہیں تھی جو آج ہے۔ پھر بھی اس کا دل دوستوں کے لیے اتنا ہی غنی تھا جتنا کہ آج ہے۔ ان باتوں کو اب پینتیس چھتیس سال گذر گئے ہیں۔ اس لیے انھیں اپنے ذہن کے مختلف گوشوں سے برآمد کرنے کے لئے ضروری ہے کہ میں اپنے حجرے کی خاموشی میں پناہ لوں آنکھیں بند کرلوں اور ذہن پر زور ڈال کر اُن متحرک تصاویر کو کاغذ پر منتقل کرنے کی کوشش کروں جن کا مرکزی کردار لاہور سے ہجرت کرکے کراچی آنے والا وہ منفرد مصّور ہے جس کی ذہانت اور ہنر کا ثبوت لاہور سے شائع ہونے والے صف اول کے ادبی رسالے اور ادبی کتابوں کے ذریعے ہم تک پہنچ چکا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مصّوری کی اعلیٰ تربیت کے لیے زوبی نے کئی سال اٹلی اور یورپ کے کئی ملکوں میں گذارے ہیں۔ اس نے لاہور کیوں چھوڑا اور کراچی کو کیوں مسکن بنایا یہ ایک راز ہے جو سوائے خدا اور زوبی کے اور کوئی نہیں جانتا۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ قسمت اسے کراچی کیا لائی ہمیشہ کے لیے اس عروس البلاد کا شہری بنا دیا۔ یہیں سے اس نے دوسری شادی کی، یہیں اپنے کام سے اپنی شہرت کو چار چاند لگائے، یہیں اس نے دن رات کی محنت، ذہانت اور لگن سے مادی طور پر اتنی ترقی کی کہ بعض لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ زوبی بڑا مصور اور سنگ تراش ہے یا ایک کامیاب کاروباری۔ میں اسے تاجر نہیں کہوں گا کیونکہ جس انداز سے وہ فنون لطیفہ سے متعلق اپنا تربیتی ادارہ چلاتا ہے وہ کسی بھی عام تاجر کے بس کی بات نہیں۔

جس زمانے کی باتیں میں کر رہا ہوں اس وقت میں ریڈیو پاکستان، کراچی میں پروڈیوسر تھا اور زوبی کا تقریباً ہم عمر۔ ایک شام میں گھر پہنچا تو دیکھا ہمارے ڈرائینگ روم میں ایک صاحب تشریف فرما ہیں۔ ان کے ساتھ ایک چھوٹا سا خوش شکل گول مٹول سا بچہ بھی ہے اور ایک کم عمر نوجوان بھی۔ تعارف ہوتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مہمان مشہور مصورآذر زوبی ہیں، لاہور سے تشریف لائے ہیں اور ہمارے ایک عزیز دوست کی سفارش پر ہمارے ہی گھر چند ہفتے بطور مہمان ٹھہریں گے۔ چونکہ ان کا اصلی نام بھی عنایت اللہ ہے اس لئے اپنے نام کی لاج کی خاطر عنایت کرنی ہی پڑتی ہے۔ بچے کا نام قلیل ہے۔ اگر اس کا نام خلیل نہ بھی ہوتا تو اس کا ہمارے یہاں یقیناً گرمجوشی سے استقبال ہوتا کیوں کہ اول تو وہ بڑا ہی پیارا بچہ ہے اور دوئم یہ کہ ہمارے خاندان میں بچیاں ہی بچیاں ہیں۔ لڑکوں کی بڑی کمی ہے۔ اس لیے خلیل ایک نادر تحفہ ہے۔ دوسرے نوجوان کا نام سعید ہے

یہ سیدھا سادا ہے اور اس کے چہرے کی سراسیمگی سے لگتا ہے پہلی بار اس نے ایک بڑے شہر کا رخ کیا ہے!

میں زوبی کے فن کے تمام محاسن سے اچھی طرح واقف ہوں۔ لیکن اس کے لیے میرا نام نیا ہے کیونکہ میری وہ تحریریں بھی اس نے نہیں پڑھیں جو ان رسالوں میں شایع ہوئیں جن کے سرورق اس کے فن کا دلکش نمونہ ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد اس دن فنون لطیفہ، مصوری، موسیقی اور پھر ادب کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو لگتا ہے کہ ہم دونوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ ہماری دوستی کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ اگلے چند ہفتے زوبی نے کہاں اور کیسے گزارے۔ میں علی الصباح ریڈیو پاکستان کا رُخ کرتا تو اکثر رات گئے لوٹتا۔ میں نے سُنا کہ وہ بھی صبح کے ناشتے کے بعد کہیں چلا جاتا ہے تو مغرب کے بعد واپس آتا ہے۔ اکثر ہماری ملاقات رات کے کھانے پر ہوتی۔ اس دوران اس نے لارنس روڈ پر ایک کمرہ کرائے پر لیا اور اپنے بیٹے خلیل اور چچا زاد یا ماموں زاد بھائی سعید کو وہاں منتقل کر دیا۔

پھر مزید کئی ہفتوں کے بعد اس نے مجھے اطلاع دی کہ اس کا رابطہ ایک ایسے پریس سے ہو گیا ہے جو یوں تو اچھا خاصا ہے لیکن ماہرانہ عدم توجہی کی وجہ سے گھاٹے پر چل رہا ہے۔ اس پر اگر محنت کی جائے تو یہ سودا فائدے کا بھی ہو سکتا ہے، مالی طور پر بھی اور ذہنی آسودگی کے لیے بھی۔ مجھے معلوم ہے زوبی میری ہی طرح قلاش ہے۔ اس لیے پریس خریدنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ میرے خیالات کی تہہ تک فوراً پہنچ جاتا ہے اور کہتا ہے ـــــ "یعنی خریدنا کس بندے کو ہے؟ وہاں تو ملازمت کرنی ہوگی، اُس پریس کے کل پرزوں کو ٹھیک کر کے اس لائق کرنا ہوگا کہ اس پر حسین سے حسین تر چیزیں شایع ہوں، اس کی شہرت پھیلے اور اس کے مالکوں کو فائدہ ہو۔ ہم وہاں ملازمت ضرور کریں گے لیکن عام ملازموں سے مختلف انداز میں، کیوں کہ پریس کا مالک بھی بہت مختلف ہے اور اس کا رویّہ بھی منفرد۔"

جب اس کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں تو وہ مجھے سمجھاتا ہے ـــ "یہ پریس ایک ایسی خاتون کی ملکیت ہے جو خود ایک مشہور مصوّرہ اور سنگ تراش ہیں۔ بت تراش میں نہیں کہوں گا کیوں کہ مسلمان ہوں اور ہمارا کام تو بُت شکنی ہے ـــــ خاتون کا تعلق کراچی کے چند بڑے امیر خاندانوں سے ہے۔ انھوں نے پریس تو بس یوں ہی خدا جانے کس دھن میں کھول لیا تھا۔ اُسے کبھی اہمیت نہیں دی۔ انھوں نے ازراہ کرم مجھے ملازم نہیں بلکہ ایک طرح کے حصہ دار کی صورت میں ان سے تعاون کرنے کی پیشکش کی ہے۔ اگر یہ اسکیم کامیاب ہو گئی تو دیکھنا میں کیسی کیسی حسین کتابیں یہاں سے شایع کرتا ہوں۔ میں برسہا برس سے ایک شاندار ادبی رسالہ نکالنے کے بھی خواب دیکھتا رہا ہوں ـــــ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی ایسا رسالہ نکالوں گا جس کی مثال اردو میں نہیں ملے گی، جسے ادب اور فنون لطیفہ کے رسیا قیامت تک یاد رکھیں گے۔"

وہ خوشی میں ایسی ہی جذباتی باتیں کرنے لگتا ہے۔ اپنے اور بہت سے خوابوں کا ذکر کرتا ہے ـــ ایسے خواب جن کی تکمیل ہمارے معاشرے میں صرف اس لیے نہیں ہوتی کہ خواب دیکھنے والے اکثر مفلس ہوتے ہیں اور یہ تو صرف اس وقت پورے ہوتے ہیں۔ جب جیب میں روپے کھنکتے ہوتے ہوں، اثر و رسوخ

ہو اور تعاون کے لیے قابل اعتماد پُرخلوص دوستوں کی عنایات شامل ہوں۔

اگلی تصویر جو میرے ذہن میں ابھرتی ہے وہ اس زوبی کی ہے جس نے چند ہی مہینوں کی محنت کے بعد اُس پریس کے قالب میں نئی روح پھونک دی ہے۔ اب وہ روزانہ صبح سے رات گئے تک پریس کے ایک کمرے میں بیٹھکر فن طباعت کو حسین سے حسین تر بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ میں اب شام کو بلاناغہ براڈکاسٹنگ ہاوس سے آزاد ہوکر گھر جانے سے پہلے اس کے پاس جاتا ہوں۔ ہمارا ایک دوست بھی وہاں اکثر شامیں گذارتا ہے۔ یہ ایک اچھا پُرگو نوجوان شاعر، عبدالعزیز خالد ہے۔ اس کا چپراسی ہمیں دیکھتے ہی پڑوس کے کسی ایرانی یا شاید ملا باری کے ہوٹل سے گلاسوں میں گرم گرم چائے لے آتا ہے۔ ہم چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے دنیا کے ہر موضوع پر کھل کر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ اکثر خواب بھی دیکھا کرتے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ شاید اس زندگی میں ہمیں اپنے خوابوں کی تعبیر کبھی نہ ملے ہمیں یہ معلوم نہیں کہ زوبی کو آہستہ آہستہ اپنے خوابوں کی تعبیر ملنے لگی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے یہ مناظر اور زیادہ حسین ہوجاتے ہیں۔ اب نہ صرف زوبی کے کپڑوں اور وضع قطع میں بھی بڑی نفاست آگئی ہے۔ بلکہ دوستوں کو چائے پلانے کے انداز میں بھی یہی فرق آگیا ہے۔ اب چائے گلاسوں میں نہیں بلکہ پیالیوں میں آتی ہے۔ اکثر اچھے بسکٹ یا کیک پیسٹری سے بھی میری اور خالد کی خاطر تواضع ہونے لگی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ زوبی کی گاڑی بڑی آب وتاب سے چلنے لگی ہے۔

اسی زمانے میں زوبی نے عبدالعزیز خالد کے کلام کا ایک مجموعہ شایع کیا۔ خالد اردو اور فارسی کے علاوہ عربی کے بھی عالم ہیں۔ اپنی شاعری میں مشکل الفاظ، مشکل ترکیبیں اور مشکل تر علامات اور تلمیحات استعمال کرنا انھیں بہت بھاتا ہے۔ بعض نقادوں کے رد عمل نے انھیں ادب کا ایک ضدی بچہ بنا دیا ہے اور وہ صرف اپنے ہی مشکل پسند انداز میں شاعری کرتے ہیں۔ چونکہ وہ میرے علاوہ زوبی کے بھی بڑے عزیز اور پُرخلوص دوست ہیں، اس لیے زوبی ان کا مجموعہ اتنا حسین شایع کرتے ہیں کہ اس کی مثال بڑی مشکل سے ملے گی۔ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد وہ ایک ایسا ہی خوبصورت ادبی رسالہ نکالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں کہ ایک عجیب واقعہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے وقتی طور پر زوبی اور عبدالعزیز خالد کے درمیان غلط فہمی پیدا ہوجاتی ہے اور کچھ عرصے تک خالد کا پریس آنا جانا بند ہوجاتا ہے۔ لیکن دونوں اتنے صاف دل اور خوش اخلاق ہیں کہ ہماری کوششوں سے صلح صفائی ہوجاتی ہے اور شام کی چائے اسی طرح پابندی سے پی جانے لگتی ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے رنجش کے اس واقعے میں زوبی بے قصور تھا۔ فساد کی جڑ وہ خط تھا جو ریڈیو پاکستان کے اس زمانے کے ڈائریکٹر محمود نظامی نے زوبی کو لکھا تھا۔ یہ خالد کے مجموعے کے بارے میں تھا۔ اس زمانے میں وہ یا لاہور میں یا راولپنڈی میں اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ اشاعت کے بعد زوبی نے مجموعے کے نسخے ریڈیو پاکستان کے تمام ڈائریکٹروں کو تبصرے کے لیے بھجوائے تھے کئی اسٹیشنوں سے تبصرہ نشر ہوگیا لیکن اُس شہر سے نہیں جہاں محمود نظامی ڈائریکٹر تھے۔ خالد کے تقاضے پر زوبی نے انھیں کئی خط لکھے تو اس کے جواب میں وہ تاریخی خط آیا۔

جس نے خالدؔ اور زوبیؔ کے تعلقات کو متاثر کیا۔

محمود نظامی مرحوم کی بڑی ہی دلچسپ شخصیت تھی۔ وہ اتنے ہر دل عزیز اور بذلہ سنج تھے کہ ان کی محفل میں ایک بار شرکت کے بعد وہاں سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا۔ فنونِ لطیفہ، ادب، سیاست، روزمرہ زندگی ـــــ غرض کہ دنیا کے ہر موضوع پر اُن کی گفتگو سننے کے لائق ہوتی۔ صاف گو اور بے باک وہ اس قدر تھے کہ ہمارے ڈائریکٹر جنرل سید ذوالفقار علی بخاری تک ان پر جملے کسنے سے کتراتے تھے کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ اگر نظامی نے جوابی فقرہ کس دیا تو سب کی موجودگی میں بڑی سُبکی ہوگی۔ نظامی ہر وقت خوش رہتے اور عزیز اقارب اور دوستوں کے علاوہ اپنے ماتحتوں کو بھی ہمیشہ اپنی بذلہ سنجی سے خوش رکھتے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ ان کی بذلہ سنجی ہی تھی جس نے دو دوستوں کے درمیان غلط فہمی پیدا کردی۔

ہوا یہ کہ زوبیؔ نے جب یکے بعد دیگرے کئی خط لکھ کر شکایت کی کہ خالدؔ کی کتاب پر اب تک تبصرہ کیوں نشر نہیں ہوا تو محمود نظامی مرحوم نے جو جواب لکھا وہ کچھ اس انداز کا تھا:

میاں زوبیؔ ـــــ کوشش تو بہت کی لیکن افسوس کہ اب تک کامیابی نہیں ہوئی۔ کیا بتاؤں، اسی قابلِ قدر و دلکش کتاب کی وجہ سے میں اب تک تین تبصرہ نگار کھو چکا ہوں۔ دو حضرات نے تو مطالعے کے بعد نہ صرف اپنی کم علمی کی وجہ سے تبصرہ کرنے سے انکار کردیا بلکہ ریڈیو پاکستان کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ تیسرے تک غالباً اس تصنیف کی شہرت پہنچ چکی تھی۔ اسے اپنے دفتر میں یہ کتاب دور سے دکھائی تو وہ بغیر میری درخواست سنے یا کتاب کھول کر دیکھے بغیر، کھڑکی سے چھلانگ لگا کر غائب ہوگیا۔ اب تو میں اس مؤقر کتاب کی وجہ سے اپنے تین اہم تبصرہ نگاروں کی شکلوں کے لیے بھی ترس گیا ہوں!"

نظامی مرحوم نے تفریح لینے کے لیے یہ زیادتی کی تھی لیکن زوبی نے بے خیالی میں بڑی زیادتی کی۔ ایک دن میری موجودگی میں جب خالدؔ نے تبصرے کے سلسلے میں ایک بار پھر شکایت کی تو زوبیؔ نے بڑی معصومیت سے نظامی صاحب کا وہ خط خالدؔ کو پڑھنے کے لیے دے دیا اس کا جو نتیجہ نکلا اس کا ذکر کر ہی چکا ہوں۔

یہ واقعات ایسے ہیں جو جب بھی مجھے یاد آتے ہیں تو زوبیؔ کے عروج کے وہ ابتدائی دن روشن کر جاتے ہیں جنھوں نے اس کی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے شعورؔ نکلا۔ اس کا ہر شمارہ مواد کے علاوہ تزئین کی رو سے بھی بے حد دلکش ہوتا۔ افسوس کہ اس حسین رسالے کے صرف چند ہی شمارے شائع ہوئے کیوں کہ زوبیؔ کی مصروفیات میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ پھر ایک دن پتہ چلا کہ اس نے اپنی ہم پیشہ، مشہور مصورہ اور سنگ تراش خاتون، صغرا ربابیؔ سے شادی کرلی۔ میں ان کے خاندان سے بخوبی واقف تھا۔ ان کی چھوٹی بہن انیسؔ مرزا کسی زمانے میں ریڈیو پاکستان سے انگریزی میں خبریں پڑھا کرتی تھیں، جن کی ذہانت کی کبھی پنجاب یونیورسٹی میں دھوم تھی۔ وہ آج کل اسلام آباد میں مقیم ہیں اور ڈان کی نامہ نگار ہیں۔ زوبیؔ کی اس شادی سے مجھے خوشی ہوئی کیوں کہ اس کی وجہ سے نہ صرف زوبیؔ کو کراچی میں مستقل طور پر رہنے کا موقع مل گیا بلکہ اپنی تمام فنی صلاحیتوں کو کھل کر، آزادی

سے ملا۔ لکھنے کا بھی موقع ملا۔ اسی ابتدا کی انتہا، ان کا "اسکول آف ڈیکور" (School of Decora)
ہے جس کے ذریعے وہ فنونِ لطیفہ کے میدان میں گرانقدار خدمات انجام دے رہے، جس کی حیثیت ایک
آرٹ میوزیم کی سی ہے۔

اب تو ان واقعات کو بھی تیس بتیس سال گذر گئے۔ زدبی کو اب خدا کے فضل سے زندگی کی تمام آسائشیں
حاصل ہیں۔ پچھلے چند برسوں سے انہوں نے ایک نہایت ماڈرن، مختصر سی داڑھی رکھ لی ہے جس کی وجہ سے
ان کی شخصیت اور زیادہ پر اسرار ہو گئی ہے۔ وہ ظاہری طور پر بہت بدل گئے ہیں لیکن باطنی طور پر آج کے زدبی
اور اس زدبی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے جس سے پہلی بار میری ملاقات اپنے ہی گھر میں ہوتی تھی۔ اس کے
میوزیم نما دفتر میں اب بھی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ جب بھی میں وہاں جاتا ہوں، وہ اسی محبت، خلوص اور گرمجوشی
سے ملتے ہیں جو ان کی ابتدائی زندگی کا خاصہ تھیں۔ اب بھی چائے کا اسی طرح دور چلتا ہے۔ اب بھی اسی طرح فنونِ لطیفہ
سے لے کر ادب کے تمام پہلوؤں اور ملکی اور غیر ملکی سیاست پر گفتگو ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ان کی ذہین شاگردوں میں
سے زیب النساء جیسی اچھی مصورہ بھی ہماری گفتگو میں شریک ہوتی ہے تو زدبی انھیں بھی اس زمانے کے بہت
سے دلچسپ واقعات سناتے ہیں جب ہم جوان تھے، بے فکرے تھے، غمِ دوراں سے زیادہ ہمیں غمِ جاناں کی فکر ہوا
کرتی تھی، وہ شعور جیسا حسین ترین رسالہ شایع کیا کرتے تھے، میرے افسانے اور ڈرامے شایع کیا کرتے تھے اور
ہم اکثر ان خوابوں کی بھی باتیں کیا کرتے تھے جو ہر عمر اور ہر دور میں تخلیق کار دیکھا کرتے ہیں، ایسے دلکش خواب
جن کی تعبیر خدا کے فضل و کرم سے اب انھیں بھی مل گئی ہے اور مجھے بھی۔ اب رہی ہمارے ذہنوں کی بے چینی اور
اضطراب ــــ تو اس سے بھلا کسی بھی ادیب یا مصور کو کہاں چھٹکارہ ملتا ہے، یہ تو ساری زندگی کا روگ ہے
یہ ختم ہوا تو سمجھیے تخلیقی کام کرنے کی آنچ، صلاحیت، سب کچھ ختم ہو گئی۔ مر گئے۔

زدبی کے خلوص کا یہ عالم ہے کہ جب میرے افسانوں کے تازہ مجموعے کی اشاعت کا مرحلہ آیا تو انھوں نے
بغیر میرے کہے بڑی محبت، محنت اور لگن سے اس کا دلکش سرورق بنا کر میرے حوالے کیا، جس کے لیے میں ان کا
ممنون ہوں۔ میرے دوستوں کا حلقہ وسیع ہے۔ اس حلقے میں زدبی ایک روشن ستارہ ہے جس کی روشنی وقت
کی رفتار کے ساتھ ساتھ تیز تر ہوتی جارہی ہے اور وقت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آج کے نفسا نفسی کے دور میں
جب قریبی رشتے داروں تک کا خون تیزی سے سفید ہو رہا ہے، وہ واقعی میرا بے غرض دوست ہے، جس کا
فن اب بھی عروج پر ہے اور جس کی باتوں میں اب بھی گلوں کی خوشبو ہے اور جس کے رویے میں آج
بھی وہی خلوص ہے جو ہماری دوستی کی بنیاد بنا تھا اور جسے ظالم وقت نے اب تک دھندلایا نہیں۔ ▲

میں نے زدبی کے اسٹوڈیو میں زندگی کی جھلک بھی دیکھی اور اپنے حسین
ترین تصوّرات اور خیالات کا عکس بھی۔

۱۱؍اپریل ۱۹۵۰ء ـــــــــــــــــ خاطر غزنوی

ڈاکٹر احسان رشید

ایک خط ایک اعتراف

۲۰ ستمبر ۱۹۸۳ء

صہبا صاحب مکرم و محترم۔ سلام مسنون

آپ کا عنایت نامہ مورخہ یکم مارچ ۱۹۸۳ء مجھے مل گیا تھا۔ جواب میں اتنی تاخیر ہوئی، اس کے لیے عذرخواہ اور معذرت طلب ہوں۔ معلوم نہیں میرا یہ جواب اب بھی بروقت ہو گا یا نہیں؟ وقت گذر جانے کے بعد جواب دیا جائے تو اس کی تو کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی! موجودہ جواب تو ضمیر کی سرزنش سے بچنے کی ایک ناتمام کوشش ہے اور بس!

مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ "نذر زیدی" مرتب فرما رہے ہیں۔ ماضی میں افکار نے جو خصوصی شمارے شائع کیے، ان کو ادبی اور تہذیبی حلقوں میں بڑی مقبولیت اور وقعت حاصل ہوئی۔ مجھے یقین ہے "نذر زیدی" کو بھی یکساں شہرت اور اہمیت حاصل ہو گی اس لیے کہ موضوع اور کیفیت کے اعتبار سے زیدی صاحب پاکستانی تہذیب و شائستگی کا ایک گراں مایہ سرمایہ ہیں۔ اس ارمغان خاص میں آپ نے مضامین، مقالات اور تاثرات سب ہی کے لیے گنجائش رکھی ہے۔ مضمون

ڈاکٹر احسان رشید — نذر زدبی — ایک خط، ایک اعتراف

اور مقالہ لکھنے کا میں اہل نہیں کہ آرٹ اور ادب کے میدان میں مبتدی کا درجہ رکھتا ہوں۔ جہاں تک تاثرات کا تعلق ہے ان کے اظہار میں عوام اور خواص دونوں کو معاشرے نے آزادی دے رکھی ہے جس کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کی فرمائش پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، آپ کو یہ کوشش پسند آئے گی تو انکار کے صفحات میں جگہ پائے گی، نہ پسند آئے تو نذر آتش کر دیجئے گا۔ میں بہر صورت خورسند ہونگا۔

زدبی صاحب کے نام اور کام سے عرصہ دراز سے آشنا ہوں، ملاقات کا شرف گذشتہ سال ایک مشترک دوست ڈاکٹر اسمعیل سعد کے ہاں دعوت میں حاصل ہوا۔ میرے ذہن میں آرٹسٹ کی جو خیالی تصویر تھی اور وہ خاص مثالی تھی زدبی صاحب کو ویسا ہی پایا۔ بحیثیت انسان وہ ایک انتہائی مہذب، ملنسار اور ہنس مکھ شخصیت کے مالک ہیں۔ گفتگو وہ بہت اچھی کرتے ہیں، اتنی اچھی کہ آپ اپنے سوچے سمجھے خیالات اور عزائم کے باوجود جوان کی فکر سے ہم آہنگ نہ ہوں، ان کے ہم خیال بن جانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ شخصیت کے اس سحر اور گفتگو کے اس اعجاز کا مجھے اس وقت احساس ہوا جب یہ ملاقات انجام پذیر ہوئی۔ ایک ایسی صورت حال میں جسے ایک ایسے طربیے کی ملی جلی کیفیت سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ ایسے کی غمازی میری صورت کرتی تھی اور طربیے کا اظہار زدبی صاحب کی صورت گری۔ اس پورے عمل کا دورانیہ تین چار دن رہا۔ مگر اس دوران میں زدبی صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ جگہ ان کا اسٹوڈیو اور اسکول تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں اور طالب علموں کے لیے ایک شفیق استاد اور دوست کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی تخلیقی استعداد کو بروئے کار لانے کے لیے بیک وقت فن اور شخصیت، دونوں سے کام لیتے ہیں۔ عام عالم یا فن کار صرف رموز فن سے سروکار رکھتے ہیں۔ یا محض سخنوری کا سہارا لیتے ہیں۔ مگر بعض معلم اور فن کار بیک وقت فن کی گہرائی اور گیرائی اور سخن کی شگفتگی و شادابی پر نظر رکھتا ہے کہ نو آموز ذہن کی توانا اور دلچسپ تربیت اور نشو و نما میں توانائی اور دلچسپی کے جملہ عناصر شامل ہوں جن کے بغیر فن کا صحیح ادراک یا علم اور شخصیت کی معنی خیز بازیافت یا انکشاف ممکن نہیں۔ ان کی تربیت کا انداز تخلیقی شان رکھتا ہے۔ آپ ان میں ان کے اس ماحول میں دیکھیے تو مجھے یقین ہے خود آپ کا جی چاہے گا کہ آپ ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو جائیں۔ میں تقریباً درخواست دینے پر آمادہ تھا لیکن زدبی صاحب کے تیور دیکھ کر ڈر گیا، گمان ہوا کہ میری درخواست پر [illegible] ۷۰ یعنی تجاوز العمر لکھ دینگے۔

زدبی صاحب نے شاگرد تو نہ بنایا لیکن گھر پر آنے کی دعوت دے دی۔ نہایت خوشگوار شام تھی جب بیوی اور میں ان کے دولت کدے پر حاضر ہوئے۔ مکان پر نظر پڑی تو جی خوش ہوا کہ فن تعمیر کا نہایت دلکش نمونہ سامنے تھا۔ اندر داخل ہوئے تو چمن نہ صرف کف گلفروش تھا بلکہ جا بجا حسین و دلکش مجسمے نظارہ ساز تھے۔ اندرون خانہ گئے تو نگار خانے میں جا نکلے۔ طرح طرح کے شاہکار آویزاں اور ایستادہ تھے۔ مسحور اور مبہوت ہو کر رہ گئے۔ بیگم صاحبہ اور صاحبزادی سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا اہل خانہ بھی زدبی صاحب ہی جیسے تھے۔ خاتون خانہ خود باقاعدہ آرٹسٹ ہیں۔ صاحبزادی نہ صرف طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں بلکہ ادب سے گہرا شغف رکھتی ہیں اور تخلیقی نثر و نظم نگاری میں مصروف ہیں۔ کیسا اچھا ماحول تھا، کتنے اچھے لوگ تھے۔ آج بھی ان لمحات کی خوش آئند یاد تر و تازہ ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

اس شام کی روئیداد نامکمل رہے گی اگر زدبی صاحب کے کھانے کی میز کا تذکرہ نہ کیا گیا۔ کھانا نہایت ستھرا اور لذیذ تھا اور میزبان خاتون کی نفاست اور ذوق کا آئینہ دار، اچھا کھانا اور مہذب میزبان میرے نزدیک زندگی کی نعمتوں میں سے ہیں۔ جہاں اور جب یہ دونوں یکجا ہو جائیں تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ کیسی طمانیت اور شگفتگی ہوتی ہوگی۔ اس شام ایسی ہی فضا ہمیں میسر تھی۔ جب تک وہاں رہے ایسا محسوس ہوا جیسے زندگی خوان نعمت ہی تو تھی۔

اس شام ہم اپنے ساتھ ایک نوجوان جوڑے کو بھی لے گئے تھے، حفیظ نوجوان پاکستانی اور عزیز شاگرد اور ساتھی تھے اور نڈین ان کی امریکی نژاد بیوی تھی۔ دونوں کچھ دنوں پہلے امریکہ سے واپس آئے تھے۔ نڈین کے لیے پاکستان نئی جگہ تھی لیکن ان کا مزاج اتنا مرنجاں مرنج اور ان کا طرز فکر اتنا مثبت اور تفہیمی ہے کہ جب سے وہ یہاں آئی ہیں ان کا ردعمل اجنبی کا سا نہیں۔ کتنا فرق ہے ان میں اور خود ہمارے بعض لوگوں میں جو باہر

حواشی: ڈاکٹر احسان رشید نے یہ گرامی نامہ ۸۳ء میں عمان سے ارسال فرمایا تھا۔ ان دنوں آپ اُردن کے سفیر تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔

تھوڑے دن رہ آتے ہیں تو ملک میں اپنے کو اجنبی پاتے ہیں۔ زوبی صاحب کے ہاں سے واپسی پر میں نے دریافت کیا کہ بتایئے کیسے لوگ تھے اور کیسی شام تھی، بولیں، میرے لیے یہ انوکھا تجربہ تھا کہ میرے خیال میں بھی نہ تھا کہ ایسے آرٹسٹ بھی یہاں ملیں گے جو ہر اعتبار سے بین الاقوامی تہذیب کے اعلیٰ معیار کے مطابق ہوں گے۔ نووارد اجنبی خاتون کی اس رائے سے زوبی صاحب کی اہمیت اور ان کے مقام کی کتنی صحیح نمائندگی ہوتی ہے۔

زوبی صاحب کا آرٹ متنوع اور مختلف اصناف پر محیط ہے۔ وہ واٹر کلر، پنسل اسکیچ، آئل پینٹنگ، خطاطی اور مجسمہ سازی سب سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس معاملے میں مٹی، تانبے، لوہے، پتھر سب سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً ان کا آرٹ نقاشی ہے، آرٹ کی دنیا میں تخلیقی عمل مثلاً خیال کو نقش میں منتقل کرنے سے عبارت ہے اور یہ نقش کوئی بھی قالب اختیار کرسکتا ہے۔ خیال اور نقش میں جو بنیادی ربط ہے اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ خیال کس پلڑے کا ہے اور کتنی گہرائی سے ابھرا ہے اور فن کار نے اپنے نقش میں اسے کس طرح اور کیسے منتقل یا تحلیل کیا ہے۔ زوبی صاحب کی اعلیٰ ذہنی دسترس اور کمال صناعی اور اختراع ان کی جملہ تخلیقات میں ایک مخصوص شان سے جلوہ گر ہیں جن کی پذیرائی اور تحسین ہر اس شخص پر فرض ہے جو آرٹ اور تہذیب کو عزیز رکھتا ہے۔ ہمیں اس کا احساس ہونا چاہیے کہ زوبی صاحب نے اپنے معاشرے کو بہت کچھ دیا ہے سوال یہ ہے کہ معاشرے سے انھیں کیا ملا؟ اس کا جواب نہیں چاہتا، صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہم آپ اس پر سوچیں اور سنجیدگی سے سوچیں۔ ہاں اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی زوبی صاحب کے پاس اب بھی بہت کچھ ہے اس لیے کہ "کارِ جہاں" نہ کبھی ختم ہوا ہے اور نہ ختم ہوگا۔ شرط صرف پیر مغاں کی موجودگی ہے؟ اس مبارک موقع پر زوبی صاحب کی سلامتی کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اثر رکھتی ہے! باری تعالیٰ قبول فرمائے۔

خدا حافظ

نیازمند

احسان رشید

مجھے فنونِ لطیفہ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ تمھارا کام میری آنکھوں کو اچھا لگتا ہے جیسے میرے کانوں کو بعض پکّی راگنیاں اچھی لگتی ہیں۔ تمھاری تصویروں میں جلال بھی ہے، جمال بھی۔ میں ڈرتا ہوں اور کھنچا چلا آتا ہوں۔ تمھارا فن تم سے زیادہ مکمّل ہے۔

۱۶ر مئی ۱۹۵۰ء ——— احمد بشیر

ڈاکٹر اسمٰعیل سعد

اعتدال پسند فن کار

زدبی صاحب پر کچھ لکھنے کی فرمائش نے مجھے عجیب قسم کی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ یہ نہیں کہ مجھے اس بات کی خوشی نہ ہو کہ ان کے متعلق ایک خاص شمارہ ترتیب دیا جا رہا ہے، یا یہ کہ ان کے بارے میں لکھنے کا کوئی موقع میرے لیے خوشی کی بات نہ ہو۔ زدبی صاحب پر اس سے پہلے بھی لکھا جاتا رہا ہے، ان کے انٹرویوز بھی شائع ہوئے ہیں اور ان پر مستقبل میں بھی لکھا جاتا رہے گا، لیکن فرمائشاً ان پر کچھ لکھنے میں میری مشکل بڑی حد تک میری اپنی بے خیالی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی کتاب ہاتھ لگ گئی ہو اور میں اسے اپنی دھن میں پڑھتا چلا گیا۔ متن نے اس قدر جذب کر لیا کہ کتاب کی جملہ تفصیلات، عنوان، مصنف، طباعت کا سال، ابواب، فہرستِ مضامین وغیرہ کی طرف کوئی دھیان ہی نہ گیا ہو اور اب کوئی اس کے بارے میں پوچھ بیٹھے تو بس اتنا ہی کہتے بن پڑے کہ بڑی اچھی مزے دار کتاب ہے۔ یہی کچھ میرے اور زدبی صاحب کے تعلق کا حال ہے کہ میں ان کے لیے اپنے اندر ایک کشش اور لگاؤ تو ضرور محسوس کرتا ہوں، لیکن ابھی تک اس بات کا شعوری موقع نہیں مل پایا کہ ان کی شخصیت کے اس تاثر کا پورے طور پر تجزیہ کر سکوں۔ بہرحال اب اگر ان کی کتابِ زندگی

کی کچھ تفصیل مجھے بیان ہی کرنا ہے تو یہ رعایت ضرور چاہوں گا کہ اپنی بات بس موٹے موٹے تاثرات کے حوالے سے شروع کروں۔
زدبی صاحب کی شخصیت کا سب سے گہرا تاثر ان کی دل آویز سادگی میں مضمر ہے۔ مجھے یاد ہے ان سے پہلی ملاقات میں بھی
مجھے بالکل ایسا محسوس ہوا تھا جیسے جانے پہچانے دوست سے مل رہا ہوں۔ ان کی شخصیت کا اثر بجائے اس کے کہ احساس پر کوئی بوجھ بنے،
طبیعت میں ایک قسم کی بشاشت کا موجب ہوتا ہے۔ وہ آپ سے ملتے ہیں تو اپنے کو آپ پر مسلط نہیں کرتے، ہاں آپ کو جذب کرنے
کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ آپ کی باتوں کو محض اشتیاق سے سنتے ہی نہیں، بلکہ حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ آپ بات کرتے رہیں گے
اور وہ بچکانہ سادگی کے ساتھ اپنے استفسارات اور تشریحات سے عرصۂ گفتگو طویل سے طویل تر کرتے رہیں گے اور آپ کو یہ احساس ہی
نہ ہونے دیں گے کہ گھڑی کی سوئی کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں جب بھی زدبی صاحب سے مل کر آیا تو ہمیشہ اپنی اہمیت کے خیال سے کسی قدر
مرعوب ہو کر پلٹا۔ خیال یہی حاوی رہا کہ گرمیٔ گفتار کچھ میری ہی بدولت تھی۔ اس بات کی طرف دھیان تک نہ گیا کہ میری باتوں کا سلیقہ اور
نکھار تو زیادہ تر خود زدبی صاحب کا رہینِ منت تھا۔ ان میں واقعی یہ کمال ہے کہ آپ کے اندر جو کچھ بھی ہے، اُسے صرف تاڑ ہی نہ لیں گے
بلکہ تہ بہ تہ پردوں سے نکال کر باہر بھی لے آئیں گے۔ اور کیا عجب کہ آپ کو اس خیال میں گم چھوڑ دیں کہ

"ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی"

باکمال ہونے کے ناتے اکثر صاحبِ کمال لوگوں میں اپنے نفس کی اہمیت کا احساس قابلِ رعایت سمجھا جاتا ہے لیکن
زدبی صاحب شہرت یافتہ آرٹسٹ ہونے کے باوجود آپ سے کبھی اس رعایت کے طالب نہیں ہوں گے۔ وہ نہایت نارمل انسان ہیں۔
ان کی شخصیت میں نہ کوئی پیچ ہے نہ نشیب و فراز۔ اس سادگی کو جو چیز اور بھی زیادہ پُرکشش بنا دیتی ہے، وہ ہے ان کے اندر مزاح
کی ایک لطیف چاشنی۔ یہ چاشنی خود ان کی شخصیت کا بھی حصہ ہے اور اسے وہ دوسروں میں بھی پسند کرتے ہیں۔ مزاح شخصیت میں
ایک لطافت پیدا کرتا ہے اور انسانی تعلقات میں راہ و رسم کے حجابات اور تکلّفات کو کم کر دیتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق مزاح شائستہ
زندگی کا امتیازی وصف ہے اور شاید اسی لیے وہ مزاح میں شائستگی کا لحاظ ضرور رکھتے ہیں۔ ہنسی بے تکلف ہوتی ہے لیکن اس میں
دل آزاری کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ بس ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ خود محظوظ ہو رہے ہوں اور اس بات کے خواہاں ہوں کہ اس بے تکلف

دعوت میں دوسرے بھرپور طریقے سے شریک ہوں۔
آرٹسٹ ہونے کے باوجود زدبی صاحب ناز والے آدمی نہیں ہیں۔ ہاں نیاز ان کی طبیعت میں ضرور شامل ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ گویا وہ
انسانی رشتوں کو زندگی کی سب سے اعلیٰ قدر سمجھتے ہوں اور اس رشتے کی نگہداشت اور اس کی تزئین و آرائش انھیں خود آرٹ کا مقصود نظر
آتی ہو۔ یہاں تک کہ اس منتہا کی تکمیل میں اگر آرٹسٹ کی انا کے ٹکرانے اور پاش ہونے کا احتمال ہو تو اسے بھی خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے ہوں۔
آرٹسٹ ہونے کے باوجود صلح جوئی کا یہ وصف ان میں اس لیے نمایاں ہے کہ میری دانست میں ان کی شخصیت بنیادی طور پر ایک اچھے اُستاد کی ہے
تدریس کا رسمی شوق بھی ان میں موجود ہے وہ اپنے ہنر یا مہارت کو دوسروں تک پھیلانے بالخصوص نئی نسل تک منتقل کرنے کے بے انتہا خواہش مند
رہے ہیں۔ محض یہی نہیں کہ انھوں نے انفرادی طور پر مختلف صلاحیت مند شاگردوں کو آرٹ کی راہ پر ڈالا۔ یا آرٹسٹوں کی تربیت کے لیے کسی
اکیڈمی کے قیام کے لیے کئی مرتبہ منصوبے وضع کے تجویز کیے۔ بلکہ گھریلو اور دفتری تزئین و آرائش کے لیے ایک باقاعدہ ادارے یا کورس کا اہتمام
بھی کیا جسے وہ زیادہ تر خود اپنی ہی کوششوں سے چلا رہے ہیں۔ لیکن ان رسمی کوششوں سے قطع نظر وہ اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے بھی معلم ہیں
خوبصورتی کی تخلیق سے انھیں دلچسپی ہے لیکن اس سے زیادہ دل بستگی انھیں خوبصورتی کی ترویج سے ہے اور وہ اس نعمت کو عام کرنے میں جو کچھ

بھی کر سکتے ہیں اس کے لیے کوشاں رہتے ہیں اپنی اس خواہش کے زیر اثر ان کی تمام تر شخصیت اور انداز میں ایک اچھے اور مشفق استاد کی جھلک نظر آتی ہے۔ انسانی تعلقات میں ایک غیر معمولی ذکاوتِ حس ان کی شخصیت کے اسی پہلو کی غماز ہے۔

اگر دیکھا جائے تو آخری تجزیے میں زوبی صاحب کی شخصیت آرٹسٹ اور استاد کی ایک دلچسپ آمیزش نظر آئے گی۔ محض یہی نہیں کہ ان دونوں کاموں کو انجام دینے کے لیے جیسی فنی اہلیت کی ضرورت ہے وہ ان میں پورے طور پر موجود ہے بلکہ ان دو قسم کی اہلیتوں سے متعلق و منسلک جو نفسیاتی محرکات اور مہیجات ہو سکتے ہیں وہ اپنی رزمیہ توانائی اور کشاکش کے ساتھ اس طرح پیوست ہیں کہ آپ کے لیے باعثِ حیرت اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ ان کا تصادم نہیں بلکہ ان کا خوبصورت توازن ہے۔ بحیثیت آرٹسٹ ان کی طبیعت میں تخلیقی جولانی ہے۔ اپنی انفرادیت کا بھرپور احساس ہے اور اسی کے حوالے سے انکار و عمل میں ایک قسم کی ایسی آزادہ روی ہے کہ جس پر کسی روایت پسند معاشرے میں ان پر بے راہ روی کا الزام بھی عاید ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف بحیثیت استاد ان کی طبیعت میں ایک ٹھہراؤ ہے۔ دوسروں کی شخصیت میں رسائی اور دلچسپی کی خواہش ہے اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کی چاہے وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی بقا و بہبود سے ایسی وابستگی ہے کہ دیکھنے والے کو قدامت پسندی کا رنگ زیادہ نمایاں محسوس ہو۔ مثال کے طور پر زوبی صاحب میرے خیال کے مطابق طبعاً مذہبی آدمی ہیں لیکن ایک آزادانہ روش کے ساتھ۔ اور یہ ان کے اندر کے آرٹسٹ کی پکار ہے۔ ارکان کی بجا آوری میں بھی یہ انفرادیت غالب رہتی ہے۔ روزے ضرور رکھتے ہیں۔ چاند کی تاریخوں سے نہیں بلکہ مصری کیلنڈر کے لحاظ سے۔ ان کے خیال میں دین کا امتیازی وصف فہم ہے اور خلافِ فہم کسی بھی بات کو وہ دین سے متعلق نہیں رکھنا چاہتے۔ موجودہ دور میں وہ تصویر کشی اور صورت گری پر مذہبی نقطۂ نظر سے کسی مذہبی پابندی کو روا خیال نہیں کرتے۔ اور یہ اسی بنا پر کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عقلی لحاظ سے اب سیاق و سباق بدل چکا ہے اور ضرورت ہے کہ مسئلے کو نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر دیکھا جائے۔ اس قسم کی پابندیوں کی تائید اور تاکید کرنے والوں کے بارے میں بھی ان کا تاثر یہی ہے کہ اپنے تمام تر حوالوں کے باوجود وہ مذہب کی کوئی قابلِ قدر خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں۔ وہ اس نقطۂ نگاہ کو فہم سے دور اور اسی بنا پر بے جا کٹر پن خیال کرتے ہیں اور اس کی اصلاح کے لیے اگر کسی ادائے کافرانہ اور تراش آذرانہ کی بھی ضرورت ہو تو اسے جائز تصور کرتے ہیں۔ پتہ نہیں ان کے فن کارانہ نام کا پہلا حصہ آذر شاید اسی حوصلے کی غمازی کرتا ہے۔

اسی طرح انھیں اپنے ملک سے بے انتہا محبت ہے لیکن سستی جذباتیت سے سخت اجتناب بھی ہے۔ آپ ان سے گفتگو کیجیے اور اس میں کوشش کر دیکھیے کہ ان کے ایسے معتقدات پر ضرب لگائیں جن سے آپ کو خیال ہو کہ انھیں والہانہ لگاؤ یا انتہائی جذباتی وابستگی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ انتہائی خندہ پیشانی اور معروضی سنجیدگی سے آپ کی باتیں سنیں گے اور بعض اوقات تو آپ کو ایسا تاثر دیں گے کہ جیسے آپ کے حملوں اور یورشوں کی ہمت افزائی کر رہے ہیں۔ ؏

تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

لیکن اگر وہ ایک طرف اپنے معتقدات پر بے لاگ محاسبے کے قائل ہیں تو دوسری طرف اپنی آزادروی میں وہ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود بھی نظر آتے ہیں۔ محض یہی نہیں کہ بنیادی طور پر وہ آرٹسٹ ہیں اپنے ملک یا ملک سے باہر ان کی شہرت بھی اسی حوالے سے ہے لیکن اپنی شخصیت کو بحیثیت آرٹسٹ پہچنوانے کے باوجود وہ اپنے فن میں آزادانہ بے راہ روی کے قائل نہیں۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ آرٹسٹ کا کام مشاہداتِ قدرت کی نقل نہیں بلکہ تخلیقی خاکہ گری ہے۔ لیکن وہ اپنے کسبِ کمال کو تجریدیت یا داخلیت کی لہروں کے سپرد کرنے کے قائل نہیں۔ ایسا کرنا نہ تو بحیثیت موضوع ان کو پسند ہے اور نہ بحیثیت فن۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کو خطوط کی کشش پر بے انتہا کمال حاصل

ہے اور اسی طرح رنگوں کی آمیزش ان کا امتیازی وصف ہے۔ صورت گری چاہے وہ خطوط اور رنگوں کی ہو اور چاہے مٹی کے ذریعے، وہ انتہائی مہارت سے انجام دیتے ہیں۔ لیکن اپنی تمام تر ہنرمندی کے باوجود وہ اپنی فن کاری کو اس حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتے کہ جہاں وہ ناظر کے لیے ایک سوالیہ نشان بن جائے یا بجائے ایک استحسانی تجربے کے ذہنی الجھن کی شکل اختیار کر لے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ناظر ان کے ساتھ ساتھ چلے اور ابہام کی بھول بھلیوں کے راستوں میں پھنس کر نہ رہ جائے۔ میرا خیال ہے کہ ناظر کے لیے ابلاغ کی ضرورت کو وہ بحیثیت آرٹسٹ نہیں بلکہ بحیثیت استاد محسوس کرتے ہیں۔ وہ حسن کو اس سطح پر رکھنا چاہتے ہیں جہاں دوسرے بھی اس سے لطف اندوز ہو سکیں اور وہ صرف کسی ژولیدہ ذہن کی انفرادیت کی تسکین کا موجب ہی بن کر رہ جائے۔ اسی طرح آپ ان کے موضوعات کو دیکھیے، ان میں زیادہ تر وہ چیزیں ہیں جن کا انسانی رشتوں یا ہمارے تمدنی رہن سہن یا تہذیبی کاوشوں سے تعلق ہو۔ انسانی رشتوں میں سب سے اہم رشتہ محبت کا ہے اور اس کا سب سے پہلا، سب سے مضبوط اور سب سے اہم مظہر ماں اور بچے کی محبت کا ہے۔ زوبی صاحب کی تصویر کشی میں آپ کو اس کے کئی خاکے مل جائیں گے۔ اسی طرح وطن کے مختلف خطوں میں عام لوگوں کی زندگی اور ان کے رہن سہن کی عکاسی جا بجا ان کی تصویروں میں ملتی ہے۔ قومی تاریخ کے اہم واقعات کی تصویر کشی بھی ان کے فن کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہے۔ اقبال کی مشہور نظم "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" کو بھی انھوں نے تصویری لباس پہنایا ہے۔ خود اپنی مجسمہ سازی کو بھی بیشتر انھوں نے اپنی اسی خواہش پر مرکوز رکھا ہے کہ ملک کے نامور ادیبوں اور شاعروں کے زندہ تاثرات کو سفالی وسیلے سے محفوظ کر لیا جائے۔ پچھلے کچھ سالوں سے انھوں نے کلام پاک کی آیتوں کی خطاطی کی طرف بہت توجہ دی ہے۔ یہ واقعی بڑی فن کارانہ کاوشیں ہیں۔ آدمی دیکھتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ بس دیکھتا ہی رہے۔ رنگ خطوط اور دائرے، ایسا لگتا ہے کہ کائنات کا ملکوتی حسن کاغذ پر تحلیل ہو گیا ہے۔ یہ ایسے ہی شخص کا کام ہو سکتا ہے جس کا دل، اپنی تمام تر گہرائیوں سے اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔

غرض زوبی صاحب کی ذات نمونہ ہے ایک نہایت مناسب مگر انتہائی نازک توازن کا، ایک آرٹسٹ اور ایک استاد کی شخصیت کے درمیان استاد کی شخصیت ان کی آزادروی کا محاسبہ کرتی ہے اور ان کے اندر کا آرٹسٹ بے جا روک ٹوک پر تنقید کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ یہ مسئلہ تو اب آپ ہی طے کیجیے کہ یہ دونوں شخصیتیں ایک ہی مٹی سے کس قسم کی مجسمہ سازی کر سکتی ہیں۔ میں تو اپنی نگاہوں کے سامنے ان کی اس ہنسی کو رکھتے ہوئے، جو قہقہے کی صوتی سطح کو تو نہیں چھوتی لیکن جس میں کسی چھوٹے پہاڑی آبشار کی جولانی اور بہاؤ ضرور ہے، صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ زوبی صاحب ہیں بڑے مزے کے آدمی ۔۔۔ ⁂

دنیا زوبی کو ایک اچھے آرٹسٹ کی حیثیت سے جانتی ہے، میں
انھیں ایک اچھے انسان کی حیثیت سے بھی پہچانتا ہوں۔

محمد طفیل ——— ۱۲ر اگست سنہ ۱۹۵ء
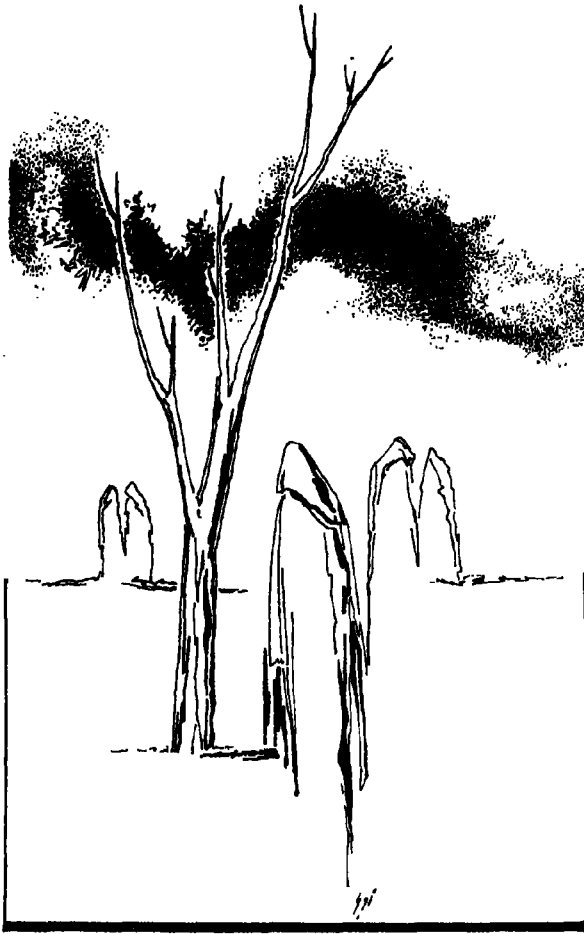
حفیظ رومانی

ایک فطری آرٹسٹ زوبی

میانہ قد، گندمی رنگت، آنکھیں سیاہ، ناک نہ بڑی نہ چھوٹی، کتابی چہرہ، چند سالوں سے چشمہ لگاتے ہیں، مونچھیں، اوپر کے لب کے کناروں تک فیشن دار داڑھی صرف ٹھوڑی پر نظر آتی ہے۔ کلّے صاف۔ داڑھی کے بال چونکہ سفید ہو چکے ہیں اس لیے یوں لگتا ہے (جیسے) شیو کر رہے ہوں تو اٹھ کر آ گئے ہوں اور صرف ٹھوڑی پر سفید بال اور صابن رہ گیا ہو۔

زوبی خوش شکل خوش پوش پُر وقار شخصیت کے حامل انسان ہیں۔ عمر تقریباً ۵۵ سال کی ہوگی مگر صحت اچھی ہے جسم قدرے تنا ہوا نظر آتا ہے مگر جب چشمہ اتار دیں تو آنکھیں مرجھائی مرجھائی سی دکھائی دیتی ہیں، ذرا محتاط قسم کے دوست ہیں، چھوٹے چھوٹے فقروں میں باتیں کرتے ہیں۔ کم گو ہیں۔ باتوں میں سادگی مگر بے تکلف دوستوں سے طنز آمیز گفتگو کرتے ہیں، دل کی باتیں چھپا کر رکھتے ہیں اور زبان پر نہیں لاتے۔ تکرار اور بحث و مباحثے سے پرہیز کرتے ہیں تکیہ کلام "ہوں" "جی ہاں" ہے!

اُن کی مصوری پر ماہنامہ افکار کے کسی ۱۹۶۸ء سال کے شمارے میں میرا ایک تبصرہ چھپ چکا ہے اس تبصرے کا عنوان

آذر زدبی اور اس کا فن تھا۔

اس تبصرے میں جو کچھ نہیں کہہ پایا تھا وہ اب کہے دیتا ہوں! زدبی کا مصوری میں ایک مختلف اپنا مخصوص رنگ ہے مجسمہ سازی میں بھی ان کا ایک مخصوص اسلوب ہے اُن کے اسٹوڈیو میں جو سنٹرل ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۱۱ میں واقع ہے اُن کے دوستوں کے مجسمے سجے ہوئے ہیں یہ وہ دوست ہیں جو ان کے زیادہ قریب تھے یا ہیں اور جنھیں وہ خوش کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے میرا مجسمہ نہیں بنایا، میں یہ سوال ان سے نہیں کر پایا البتہ قارئین کرام بذریعہ خط ان سے پوچھ سکتے ہیں۔

مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ زدبی میرے دوست ہیں اور میرا یہ زعم انھوں نے کبھی پائمال نہیں کیا!

مجھے آذر زدبی سے دوستی کے تعلقات استوار کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی ہم چند ملاقاتوں میں ہی آپس میں گھل مل گئے تھے اور اتنی زیادہ بے تکلفی ہو گئی تھی کہ صبح ہی صبح موسم سرما میں سردی سے ٹھٹھرے لحاف میں گھسے پڑے ہوئے تھے تو میں اُن کے گھر چلا جاتا وہ بلا تکلف مجھے اپنے لحاف میں گھس آنے کی دعوت دے دیتے مگر وہ لحاف کا ایک پہلو بڑی احتیاط سے دبائے رکھتے کیونکہ اس پہلو میں اُن کی بیگم سمٹی سمٹائی پڑی ہوتیں۔ جب ہم کوئی مذاق کرتے تو وہ بے ساختہ ہنس دیتیں یا بہ امر مجبوری کھانسنے لگتیں اس وقت ان کے دو بچے ذوالفقار اور دانش تھے وہ جڑواں معلوم ہوتے کیونکہ ان کی پیدائش کا وقفہ بہت کم تھا۔

آذر زدبی کا ذریعہ معاش ابتدا میں مختلف ادیبوں، شاعروں، صحافیوں کی علمی ادبی کتابوں کے سرورق کا ڈیزائن بنانا اور خطِ زدبی میں مختلف ادبی کتابوں کے سرورق پر نام لکھنا ہوتا تھا۔ خطِ زدبی کے موجد خود زدبی ہی تھے اور یہ خط ہر کتاب کے سرورق پر نظر آتا تھا اور یہ خطِ زدبی لکھنے میں آذر زدبی ید طولیٰ رکھتے تھے۔

لاہور میں اکثر ادیب، شاعر اور مصور بھوکوں مرتے ہیں۔ چنانچہ آذر زدبی کی مالی حالت بھی کچھ تسلی بخش نہ تھی۔ ایک دن وہ منہ بسورے میرے پاس آئے اور بچھٹ سے مجھے کہنے لگے میں کراچی جا رہا ہوں۔ میں نے استفسار کیا "کیوں" جواب دیا "قسمت آزمانے"۔
چند دنوں کے بعد مجھے پتہ چلا آذر زدبی لاہور سے نقلِ مکانی کر کے کراچی کے وسیع شہر میں گم ہو گئے ہیں انھوں نے کسی کو اپنے کراچی پہنچنے کا خط نہیں بھیجا حتیٰ کہ اپنی بیگم کو بھی اپنے کراچی پہنچ جانے کی کوئی اطلاع نہیں بھیجی۔

کئی سال آذر زدبی نے گم نامی میں بسر کیے چنانچہ جب میں فلم کونسل کی یونٹ کے ساتھ چند مناظر ساحل سمندر پر فلمانے کراچی پہنچا تو ایک دن میرا ہے آذر زدبی سے ملاقات ہو گئی وہ مجھ سے گرم جوشی سے ملے اپنی زندگی کے صبح و شام کی تگ و دو کے قصے سنائے اور مجھے وہ کراچی کی زندگی اور ماحول سے مطمئن نظر آئے البتہ میں نے محسوس کیا کہ ایک بات وہ مجھ سے کہنا چاہتے ہیں مگر نہیں کہہ پاتے۔ یہ بات کچھ دنوں کے بعد اپنے کراچی کے قیام کے دوران ہی مجھے معلوم ہو گئی اور وہ یہ کہ انھوں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ آذر زدبی کی دوسری شادی کی وجوہ خواہ کچھ بھی ہوں مگر سب سے بڑی وجہ جو میں نے محسوس کی تھی وہ "صحبتِ ناجنس" یا ذہنی رجحانات کا تضاد تھا۔ ان کی دوسری بیگم برصغیر کی ایک معروف مصورہ صغرا ربابی تھیں دونوں کے مشاغل اور سوچ میں بلا کی ہم آہنگی پائی جاتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دونوں کے ستارے ایک دوسرے کو راس آ گئے تھے اور یہ ملاپ آذر زدبی کے ستاروں کو ہی بدل گیا تھا یہاں تک کہ آذر زدبی انگوٹھی کو ہاتھ لگائے تو وہ سونا بن جاتی۔ چنانچہ آذر زدبی نے خوب محنت سے انٹیریر ڈیکوریشن (Interior Decoration) کے لیے بڑی بڑی کوٹھیوں، بنگلوں اور سینماؤں کے ٹھیکے لیے اور انھیں لاکھوں روپوں کا فائدہ ہوا۔ آذر زدبی چونکہ اردو ادب کے باذوق انسان تھے چنانچہ انھوں نے کراچی میں اردو ادب کا ایک

ایک فطری آرٹسٹ۔ زیدی

نذر ۔۔۔ زیدی

حفیظ رومانی

ایسا مکتبۂ شعور قایم کیا جس نے کئی کتابیں پرنٹ کیں اور ایک اردو مجلۂ شعور ہر ماہ چھاپنے کا اہتمام کیا! یہ مجلہ خوبصورت ترین ادبی رسالہ تھا جس کی مثال تاریخِ ادب میں بہت کم ہی ملتی ہے۔ شعور کے شماروں میں آذر زیدی ان کی تزئین و آرائش کرتے تھے اور وہ مصورِ صنفِ نازک کی بنائی ہوئی تصاویر بھی ان شماروں میں شامل کی جاتی تھیں۔ خدائے سخن میر تقی میر کا مکمل شعری مجموعہ انتہا حسین انداز سے شعور کے ہر شمارے میں بالاقساط شامل کیا جاتا تھا۔ شعور میں ایشیا کے سب سے بڑے افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے غیر مطبوعہ افسانے بھی چھپتے تھے اور برصغیر کے بلند پایہ ادیب و شاعر اس رسالے میں اکثر و بیشتر لکھا کرتے تھے جن اردو نوازادیبوں نے اس رسالے میں اپنی تحریروں اور شاعری سے نوازا وہ یہ تھے —

● مولوی عبدالحق ● فراق گورکھپوری ● رشید احمد صدیقی ● احمد ندیم قاسمی ● راقم الحروف ● قدرت اللہ شہاب ● مجتبیٰ حسین ● اثر لکھنوی ● ممتاز شیریں ● یوسف ظفر ● عزیز حامد مدنی ● جیلانی بانو ● الطاف گوہر ● شان الحق حقی ● مسعود پرویز ● فارغ بخاری ● نریش کمار شاد ● ہنس راج رہبر ● محمد خالد اختر ● خلیل الرحمٰن اعظمی ● جگن ناتھ آزاد وغیرہ —

ازاں بعد آذر زیدی نے اردو کے دو رسالے "بنتِ حوا" اور "کائنات" شائع کیے۔ پہلا خواتین کا مخصوص رسالہ تھا اور خواتین کی سرگرمیوں کو اجاگر کیا کرتا جن میں خواتین کی علمی ادبی کاوشیں بھی شامل ہوتی تھیں اور دوسرا رسالہ مذہبی نوعیت کا تھا اس میں اسلام کی روایات کی تشہیر کی جاتی اور قرآن و سنت کے حقائق بیان کیے جاتے —

آج کل زیدی جذبۂ حب الوطنی سے سرشار کلام پاک کی آیات کی خطاطی اور علامہ اقبالؒ کے کلام کو اپنی مصوری کے فن میں ڈھال کر اُن کے کلام کو پیش کر رہے ہیں —

آذر زیدی کی مصورانہ تخلیقات میں مصوری کے فن کا حُسن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ آذر زیدی کے فن میں پختگی اور لکیروں کی ندرت جھلکتی نظر آتی ہے۔ ان کی تصاویر میں مختلف رنگ نگینوں کی طرح چمکتے اور اُبھرتے نظر آتے ہیں۔ بے جان نقوش میں زندگی کی روح تھرکتی، ناچتی اور سانس لیتی محسوس ہوتی ہے! سب سے عجوبہ بات یہ کہ اُن کی مصوری کا شعور دن بہ دن اُبھرتا اور کھلتا ہی چلا جا رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے وہ شہاب ثاقب کی طرح نکلے تھے اور اب آفتاب کی طرح غروب ہوں گے! وہ اپنی تخلیقات میں ایسے کردار پیش کر رہے ہیں کہ ان کرداروں کے مزاج کی پہنائیوں میں اُتر جاتے ہیں اور ان کا کوئی راز ان سے پوشیدہ نہیں ہوتا ان کے کرداروں میں ان کی بھلائیاں اور برائیاں، جزئیات و کیفیات اور احساسات صاف صاف نظر آتے ہیں اس وقت برصغیر کا کوئی زندہ مصور ان کے اس مخصوص انداز کی ہمسری کرتا نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے شاہکاروں کے نقوش کرداروں کی ہیئت اور طبعی نفسیات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں وہ اپنے مجسموں میں بھی اپنے اس خوبیٔ فن کا مظاہرہ کرتے ہیں! اپنے کرداروں (شخصیتوں) کا وہ مجسمہ بناتے ہیں ان کی شخصیت اور سیرت ان کے مجسموں میں صاف نظر آتی ہے اور مختلف شخصیات اور مناظر کی تصویریں بنانے میں مرقع، غیر ضروری رنگوں سے اُن کی حاشیہ آرائی نہیں کرتے ان کا برش تصنع سے مبرا نظر آتا ہے!۔

آذر زیدی مجھے رنگوں کی آمیزش اور انتخاب کا ایک فطری نقاش محسوس ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں انھیں ایک فطری انداز کو اپنانے والا ماہر ترین مصور تصور کرتا ہوں۔ آج کل مغرب میں مصوری کا آفتاب غروب ہو رہا ہے اور ہمارے مصور بھی ایک خلجان میں مبتلا ہیں کہ وہ کون سا اسلوب اختیار کریں کیونکہ فی زمانہ برصغیر میں اسلوب کا خلفشار ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آذر زیدی نے

اب ایک اسکول اف ڈیکور (school of Decor) کھول رکھا ہے اور مصوری کے شاہکار بنانے کے بجائے اس اسکول کے طلبا اور طالبات کے ساتھ اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں!۔

میرے خیال میں آذر زوبی بھی اسلوب کے خلفشار کا شکار ہو چکے ہیں اور میرا اچھا ستھرا مصور "بے رہروی" کے مرض میں مبتلا ہو چکا ہے مصوری کے اسلوب پر اس شمارے میں جو زوبی نمبر پر ہی مشتمل ہے میں کچھ کہہ کر قارئین کرام کو "فرسودگی" میں مبتلا نہیں کروں گا اور بس ان الفاظ پہ میں اپنی تحریر کا اختتام کروں گا کہ جو آسودگی مجھے آذر زوبی کی مصوری کی تخلیقات دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے وہ کسی ماضی اور حال کے مصوروں سے نہیں ہوتی اور آذر زوبی ہی میری دنیا پر چھایا ہوا ہے اور تا حیات چھایا رہے گا!

چونکہ آذر زوبی کی دوسری بیگم صاحبہ بھی ایک اعلیٰ پایے کی مصورہ ہیں اُن کو میں آذر زوبی کے مقابلے میں اعلیٰ اور ارفع یوں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے ایک ایسی لڑکی کو جنم دیا ہے جو "دمیڈیکل کالج" میں پڑھتی ہے اور جب بھی وہ مجھے ملی ہے اُس نے مجھے متاثر کیا ہے گو وہ ڈاکٹری کی تعلیم و تربیت لے رہی ہے مگر اس کا مشغلہ موسیقی ہے یہ برخوردار بچی زیبا نہایت باادب باسلیقہ اور اعلیٰ اخلاق کی اُبھرتی شخصیت ہے اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اِس بچی کا انہماک تعلیم و تربیت میں انہماک، اُسے قابل ترین کامیاب لیڈی ڈاکٹر بنا دے گا اور آذر زوبی کا نام مزید روشن ہوگا۔ ⁘ ⁘

اے فن کار! کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تم خلق کرتے ہو، نقالی نہیں کرتے؛ میاں نیچے آؤ اور ہمارے ساتھ زندگی گزارو۔

۱۵ راپریل ۱۹۵ء ـــــــــــــ اشفاق احمد

O

زوبی: مجھے تمھارا فن پسند ہے، لیکن تم مجھے اس سے بھی زیادہ پسند ہو۔ جب میں تمھارے ساتھ ہوں تو میں علائق دنیا سے دور۔ بہت آسودہ رہتا ہوں۔ جب میں تمھارا فن دیکھتا ہوں تو میں قدرے مضطرب ہو جاتا ہوں۔ تم فن کار ہو یا پھر کچھ نہیں ہو۔!

۲۰ اکتوبر ۱۹۵۳ء ـــــــــــــ حمید دائم
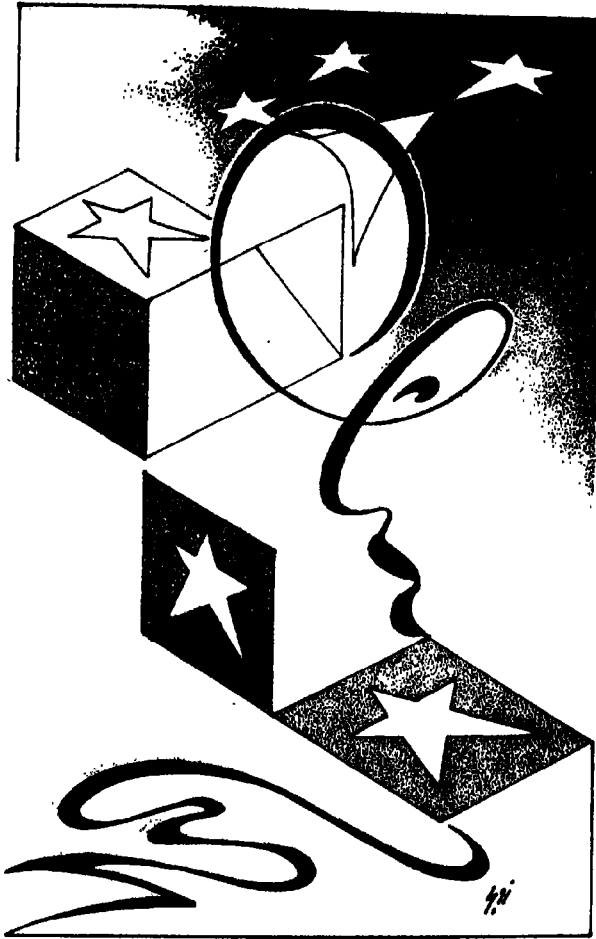
زوبی کے حروف کی رمز آفرینی

اکرام بریلوی

ابتدا ؑ خط کوفی جسے خطاطی کے فن سے موسوم کیا گیا' اسلامی ممالک تک ہی محدود رہا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ عالمگیر فن کی صورت اختیار کر گیا۔ اس فن نے دراصل' عربوں کے عروج کے ساتھ ساتھ فروغ پایا۔ جہاں جہاں بھی اسلام کی خوشبو اور روشنی پہنچی' اس فن نے اپنا رنگ جمایا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ فن' وسطی یورپ' اٹلی' سسلی' اناطولیہ' اندلس' آرمینیا اور منگولوں کے زیر اثر' مارکوپولو اور پھر ابن بطوطہ کے حوالے سے چین تک پہنچ گیا۔ عربی حروف کے دل آویز نقوش نے یورپ اور ایشیائی زبانوں کو متاثر کیا۔ جہاں پہنچ کر اس فن نے ایک ایسی سڈول اور متوازن شکل اختیار کر لی' جس نے دنیا بھر کے مصوروں اور فن کاروں کو متاثر کیا۔ شہرۂ آفاق فنکار پکاسو (جو پیدائش کے اعتبار سے ہسپانوی اور سکونت کے لحاظ سے فرانسیسی تھا) کہتا ہے کہ شعر و ادب کی طرح' ہسپانیہ کی مصوری بھی' عربی حروف کے خموں' گولائیوں' زاویوں' قوسوں اور سرکشیدگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی' کیوں کہ اس فن میں سارا کھیل آڑی ترچھی اور سرکشیدہ لکیروں' مبہم اور غیر مبہم خم و پیچ' گولائیوں' زاویوں اور قوسوں سے عبارت ہے۔

مغلوں کی آمد کے ساتھ ہی اس فن نے' باقاعدہ طور پر' ہندوستان کی سرزمین پر قدم جمایا۔ مگر انگریز کی عمل داری کے آتے ہی فن خطاطی

کا تمام مصورانہ حسن کتابت کی کاروباری تنگنائے میں گھٹ کر رہ گیا۔ ہندوستانی قومیت کی طرح مصورانہ خطاطی کا یہ دور رفتادگی اور زوال پذیری کا دور تھا۔ کیونکہ اس تمام دور میں، انگریز نے طرح طرح کے جال بچھا کر ہندو نیشنلزم کو ہوا دی اور آتی کہ ہندو اکثریت بہت تیزی کے ساتھ، عربی حروف کے تزئینی اور آرائشی خم و پیچ سے ایسی متنفر ہوئی کہ فن کار، عربی حروف کے متنوع اشکال، مصورانہ حسن و سحرکاری سے عاری ہوتے چلے گئے۔ آرٹ کی دنیا میں، یہ دور بڑا صبر آزما اور طویل ثابت ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو تخلیقی سرگرمیاں، ذہنی انتشار اور پراگندگی کا شکار ہو چکی تھیں۔ قتل و غارت گری سے ابتدا ہوئی، لہٰذا یہی مصوری اور صورت گری کا رجحان بن گیا۔ جب بے یقینی اور ابتری پھیلی ہو تو خطاطی جیسے باریک فن کی طرف کون دھیان دیتا ہے۔ خدا خدا کر کے جب حالات معمول پر آئے اور سویا ہوا ذہن جاگا تو جدت و اختراع، رمزآفرینی، حسن ادا اور رنگ و بو کے مصورانہ محرکات نے انگڑائی لی۔ یہی زمانہ مصوری میں عربی حروف یا خط کوفی کے نشاۃ ثانیہ اور اس کے از سر نو آغاز و ابتدا کا موجب بنا۔ مصوروں کو اپنے اندرونی جذبوں اور خیالوں کے اظہار کے لیے عربی حروف کے اتار چڑھاؤ میں اپنے قومی اور فنی تشخص کا عکس دکھائی دینے لگا۔ یوں تو بہت سے مصور اس میدان میں آئے، مگر جو مقام عبدالرحمٰن چغتائی، آذر زوبی اور صادقین نے حاصل کیا، وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ——

آذر زوبی کا مصورانہ فن خطاطی، حسن کاری، رمزآفرینی اور حرف و لفظ کے ادراک سے عبارت ہے۔ ان کے ہاں، حروف جذبوں اور تخیل کو واضح اور غیر مبہم گہرائی و گیرائی عطا کرتے ہیں جس سے ذہن میں عبارت اور حروف کی ترتیب اور کشیدہ خطوط کی دل کشی اور دل آویزی الگ الگ نہیں بلکہ ایک کل کی حیثیت سے نظر میں آتی ہے۔ بعض اوقات تو عبارت، اپنے خیال اور اس کی گہرائی کے عمودی اور افقی تاثر کو حروف میں سمو کر اس طرح سڈول اور متوازن بنا دیتی ہے کہ دیکھنے والا بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔

آذر زوبی نے علم و نظر کی وسعت سے، اپنی مصورانہ فن خطاطی میں پھیلاؤ اور گہر پیدا کیا ہے۔ اُن کے ہاں، عبارت کے حفظ مراتب کے مطابق، حروف کے خطوط میں، رشتہ و ربط اس طرح قائم کیا گیا ہے کہ حرف و لفظ کی پہنائی اور پھیلاؤ میں کشش اور کمی سے اثر و تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ اُن کے حروف کے دائروں، اشاروں اور خم و پیچ میں شعر کا سا ترنم، جذبوں اور خیالوں کی سی لچک اور ایک اٹھتی گرتی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے حروف میں ترتیب، توازن اور حسن پیدا کر کے ایمائی تاثر میں شدت پیدا کی ہے۔ حروف کی مجموعی نشست سے قطع نظر آذر زوبی کے ہاں "الف، لام، نون، س اور ص" کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور انھی حروف کے زیر و بم، اتار چڑھاؤ، گھماؤ اور پھیلاؤ میں ان کے فن کا اعجاز و ایجاز مضمر ہے ——

آذر زوبی، حروف کی خارجی ہیئت کو ایسا خم اور ایسی گولائی عطا کرتے ہیں کہ حروف کے جسموں کی نرمی اور سرسراہٹ روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ حروف، ان کے موقلم سے کاغذی پیراہن میں بھی، کبھی فریاد نہیں کرتے۔ وہ حروف کو اگر نوائے سروش نہیں تو جنت نگاہ ضرور بنا دیتے ہیں۔ ان کے حروف کو، ان کے فن کا جسم اور معانی کی روح تصور کرنا چاہیے جس میں حسن، لطافت، نازکی، باریکی، توازن، وجاہت اور گولائی، خارجی کشش اور وہ سب کچھ موجود ہے، جو کسی آیت یا عبارت کے متن یا فکر و فلسفے میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

حروف نہ مصورانہ ہوتے ہیں نہ غیر مصورانہ، مصور کا جذبہ خیال کی گرمی اور موقلم کی قوت نمو انھیں مصورانہ بنا دیتی ہے اور زوبی اس میں کمال رکھتے ہیں —— زوبی کی علمیت سے سوا زوبی کی شخصیت کے بانکپن نے ان کے فن کو اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں کی تقلید سے آزاد رکھا ہے ان کے حروف میں، فتادگی اور فرسودگی کے بجائے ایک طرح کی تیزی، تناؤ اور تیکھا پن ہے —— ان کے حروف کے خم و پیچ میں ایک خاص انداز کا طنطنہ اور ایک خاص قسم کی شوخی طناز ہے جو انھیں، اپنے ہم عصروں سے الگ تھلگ کر کے ان کی انفرادیت بہر طور برقرار رکھتی ہے چنانچہ یہی انفرادیت ان کے مصورانہ فن خطاطی کی جان ہے، جو کاغذ پر اپنے کیف و کم اور چوب خشک میں آڑی ترچھی سرکشیدہ لکیروں، مبہم اور غیر مبہم خموں، نرم و گرم گولائیوں، لطیف زاویوں، اور افقی و عمودی اشاروں کو سڈول اور متوازن بنا کر رمزآفرینی کے طلسم رنگ و بو میں سمو دیتی ہے —— ♠♠

بشیر موجد

زوبی ایک مطالعہ

برسوں پہلے کی بات ہے۔ جب زوبی حکومت پاکستان کی جانب سے دوسال کے لیے وظیفے پر اٹلی گئے۔ واپس آئے تو انھوں نے مال روڈ پر روزنامہ ہلال پاکستان کے دفتر کے قریب دوسری منزل میں اپنا تصویرخانہ (Studios) قایم کیا۔ ان دنوں لاہور میں بین الاقوامی شہرت کے دو استاد مصور جناب عبدالرحمٰن چغتائیؒ اور استاد اللہ بخش موجود تھے جو اپنے اپنے اسلوب کے آپ ہی خالق تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی بین الاقوامیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب ہمارے ہمسایہ ملک بھارت نے دہلی میں نیشنل آرٹ گیلری قایم کی تو ان دونوں مصوروں کو اپنی گیلری میں نمایاں جگہ دی۔ میرے نزدیک پاکستان کے ان دو قدآور مصوروں کا ذکر کیے بغیر مصوری کی تاریخ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ لیکن ازحد کرب انگیز ہے یہ حقیقتِ حال کہ آج ۴۵ برس گزر جانے کے بعد بھی ہمارے یہاں مصوری کی نہ کوئی تاریخ ہے اور نہ نیشنل آرٹ گیلری اور نہ ہی اس بنیادی ضرورت کو آج تک ہمارے ثقافتی یا فنی ادارے نے محسوس ہی کیا ہے۔ حالانکہ سب سے پہلا کام کرنے کا یہی تھا۔

یہ ثقافتی ادارے اور آرٹ کونسلیں ہر سال لاکھوں روپے کی گرانٹ حکومت سے وصول کرتی آ رہی ہیں۔ لیکن کسی مستقل اور بنیادی کام کی طرح آج تک نہیں ڈالی جا سکی ۔

ذکر تو میں زوبی صاحب کا کرنے لگا تھا لیکن آغاز کار ہی میں ایک ایسی تلخ حقیقت سامنے آ گئی جس کا ذکر کیے بغیر نہ رہ سکا مگر اس کے ساتھ ہی مجھے اس اظہار میں مسرت حاصل ہوتی ہے کہ اُس دور میں مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی اور استاد اللہ بخش کے بعد جن چند مصوروں کا نام سامنے آتا ہے اُن سب میں نمایاں نام آور زوبی کا تھا ۔

قدیم و جدید آرٹ دونوں میں جن کا برش یکساں صلاحیت سے رواں تھا۔ ان دنوں وہ کمرشل اور فائن آرٹ کے امتزاج سے ایک نئے اسلوب مصوری کی بنیاد رکھنے میں مصروف تھے۔ اور اپنی اس کوشش میں خاصے کامیاب اور مقبول تھے۔ گو ان کے بعض ہم عصروں نے بھی اس اسلوب کو اپنانے کی شعوری کوششیں کیں مگر وہ کامرانی کی منزل سے ہم کنار نہ ہو سکے ۔

جب کسی رسالے یا کتاب کا سرورق چغتائی صاحب کے نقوش سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آتا تو مہینوں فن کاروں میں اس ڈیزائن کا تذکرہ رہتا۔ اسی طرح جب زوبی صاحب کا کوئی سرورق زوبیت سے مزین ہو کر شائع ہوتا تو وہ بھی خاص و عام سے داد ضرور وصول کرتا۔

زوبی صاحب کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ اسحٰق شعور جو ایک خطاط اور مصور ہیں اور حضرتِ احسان دانش، اور زوبی صاحب کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ میرا بھی ان سے نیاز مندی کا سلسلہ برسوں پرانا ہے۔ الحمدللہ کہ اس میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا ۔

میں اپنے کام سے فارغ ہوتا تو اکثر استاذی المکرم حضرت احسان دانش کے ہاں چلا جاتا۔ استادِ محترم کا مکتبہ ان دنوں مال روڈ پر تھا جہاں آج کل لاڈز ہوٹل ہے۔ یہ اس وقت ایک جنرل اسٹور تھا۔ اس کے ساتھ والی بلڈنگ کے اوپر والی منزل پر چشتی برادر کے ساتھ ایک کمرہ جسے دو حصوں میں مساوی تقسیم کیا گیا تھا۔ آدھے میں مکتبہ دانش اور آدھے میں دوا مرکز تھا۔ احسان صاحب نے اپنے ایک مہاجر دوست کو از راہِ دوستی نصف کمرہ دے رکھا تھا۔ اگر کبھی احسان صاحب نہ ملتے تو میں اسحاق شعور کی طرف چلا جاتا ۔

اسحاق شعور کا درویش خانہ موجودہ پنجاب آرٹ کونسل جو ان دنوں جادوگر وال بلڈنگ کہلاتی تھی کے عقب میں ایک چھوٹی سی نیم سی مسجد کے قریب دو جھونپڑا نما کمروں پر مشتمل تھا جہاں کبھی کبھی لاہور کے چند ادیب شاعر اور مصور مل بیٹھتے تھے۔ جن میں شاکر علی۔ شمزا۔ قطب شیخ علی امام۔ حضرت احسان دانش مرحوم و مغفور اور حکیم حافظ جلیل مرحوم پرنسپل طبیہ کالج کے نام مجھے آج بھی یاد رہ گئے ہیں ۔

ایک دن میں اسحاق شعور کی طرف جا رہا تھا۔ سخت گرمی کے دن تھے جب میں مال روڈ پر پہنچا تو ایک جگہ شکر کا شربت پینے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ شکر کا شربت بیچنے والا ایک ہی آدمی تھا جو اپنی پیٹھ پر حمام قسم کا برتن، اٹھائے گرمیوں میں مال روڈ پر شربت فروخت کیا کرتا تھا۔ ان دنوں اس کا ریٹ ایک آنہ فی گلاس تھا ۔

میں شربت پی کر ابھی فارغ نہیں ہوا تھا کہ سامنے اسحاق شعور اور ان کے ساتھ ایک خوب رو نوجوان کھلتے ہوئے گندمی رنگ بیچ سیاہ بال۔ تیکھے نقش، آنکھوں پر چشمہ پینٹ اور شرٹ میں ملبوس ملا رسمی علیک سلیک کے بعد شعور صاحب نے کہا ہم حکیم جلیل صاحب کی طرف جا رہے ہیں اگر تم فارغ ہو تو ہمارا ساتھ دو۔ میں ان دونوں کے ساتھ ہو لیا۔ ہمیں پیدل بیڈن روڈ سے گزر کر گوالمنڈی کے راستے چوک برف خانہ پہنچنا تھا۔ چوک برف خانہ سے فلیمنگ روڈ کی طرف چند قدم چلیں تو دائیں ہاتھ دوا خانہ اور بائیں ہاتھ دوسری منزل پر حکیم صاحب کا مطب تھا۔ جب ہم چوک برف خانے کے قریب پہنچے تو شعور نے ایک دم چونکتے ہوئے جیسے کوئی بات اچانک یاد آ گئی ہو کہا۔ " معاف کیجیے میں تو بھول ہی گیا ان سے ملیے یہ مشہور مصور زوبی صاحب ہیں۔ دو برس بعد اٹلی سے واپس وطن لوٹے ہیں۔ ان تاریک گلیوں میں سے گزرتے

ہوئے گھبراتے ہیں۔کچھ علیل بھی ہیں۔ میں انھیں دکھانے کے لیے حکیم صاحب کی طرف لے آیا ہوں "اسحاق صاحب مجھ سے مخاطب تھے۔

"کیا یہ گلیاں دو برس پہلے ایسی تاریک نہ تھیں ؟" میں نے کہا

"یہ گلیاں تو پہلے بھی ایسی ہی تاریک تھیں اس وقت مجھ میں ایسی روشنی نہ تھی" زدبی بولے

یہ میری زدبی صاحب سے پہلی بالمشافہ گفتگو تھی یا اسے پہلا تعارف کہہ لیجیے۔

ہم تینوں مطب کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

مطب پہنچ کر شعور نے حکیم صاحب سے زدبی کا تعارف کروایا۔ حاضر ہونے کی وجہ بتائی۔ حکیم صاحب نے نسخہ تجویز کیا۔ دواخانہ نیچے تھا۔ حکیم صاحب نے نسخہ ملازم کے ہاتھ نیچے بھیجتے ہوئے کہا "چائے والے کو چائے بھی کہتے آنا"۔ چائے آنے تک حکیم صاحب زدبی صاحب سے اٹلی کے مصوروں اور آرٹ گیلریوں کے بارے میں معلومات آفریں سوالات کرتے رہے۔ زدبی صاحب کے انداز گفتگو اور فنی معلومات سے جس کا اظہار وہ اپنی گفتگو میں فرما رہے تھے۔ حکیم صاحب خاصے متاثر نظر آرہے تھے۔

حکیم صاحب ایک نامور طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب اور فن مصوری پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اتنے میں چائے آگئی سلسلہ کلام منقطع ہوگیا۔

حکیم صاحب دھان پان قسم کے آدمی تھے اور دمے کے مریض تھے، باتیں کرتے کرتے ان کی سانس پھول گئی کھانستے کھانستے نڈھال ہوگئے۔ کھانسی ذرا سی رکتی تو حکیم صاحب معذرت کرنے لگ جاتے پھر کھانسی آجاتی۔ دوسری یا تیسری دفعہ جو وقفہ ہوا ہم نے اسے غنیمت جان کر اجازت چاہی جو بخوشی مل گئی۔

ہم جس وقت تینوں مطب سے نیچے اُترے شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ اس لیے پیدل واپس جانے کی بجائے تینوں ایک دوسرے سے رخصت لے کر تانگوں میں بیٹھ کر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔

زدبی صاحب سے اس تعارف کے بعد اب میں دوسرے چوتھے روز زدبی صاحب کے (studio) تصویر خانے مال روڈ پر جانے لگا۔ گھنٹوں زدبی صاحب کو کام کرتے دیکھتا رہتا۔ اور دل ہی دل میں کہتا کہ کاش میں بھی کبھی ایسا کام کرسکتا۔

یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا۔ زدبی صاحب بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے رہے۔ کبھی کوئی ٹیکنیکل بات پوچھ بیٹھتا تو پرانے فن کاروں کی طرح چھپانے کی بجائے بڑی فراخ دلی سے مذکورہ نقطہ سمجھا دیتے۔ میں ان کی شخصیت کے اس پہلو سے بے حد متاثر تھا۔

ایک دن میرا ایک سرورق ڈیزائن زدبی صاحب کی نظر سے گزرا ہلکی سی داد دی۔ پھر فرمانے لگے تم کل ڈرائنگ بورڈ، پوسٹر کلر اور برش وغیرہ لے کر آجاؤ تم سے کبھی معاملہ رہے گا۔

معاملہ رہے گا سے میں یہ سمجھا کہ چند لڑکیاں اور لڑکے جو ان کے یہاں مصوری سیکھنے آتے ہیں، مجھے بھی شاید ان میں شامل کرلیا گیا ہے۔ ان کی اس فیاضانہ پیش کش نے میرے دل کو بہت متاثر کیا۔ چند ہی دن بعد حسب ارشاد کلر برش وغیرہ لے کر میں پہنچ گیا۔ جب میں تصویر خانے پہنچا تو زدبی صاحب اس وقت علامہ اقبال کا آئل میں پورٹریٹ بنا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے "میرے پاس آپ کے لیے فی الحال کوئی جگہ نہیں جو تمھارے لیے جگہ تھی وہ پُر ہو گئی ہے جب کبھی جگہ خالی ہوئی میں تمھیں ضرور بلوا لوں گا۔"

میں اُن کے اس غیر متوقع انداز کلام سے چکرا گیا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں خاموش کھڑا رہا۔ زدبی صاحب تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد فرمانے لگے چغتائی صاحب کو ایک پین ورک کرنے والے کی ضرورت ہے۔ میرا رقعہ لے کر وہاں آج ہی چلے جاؤ تمھارے

لیے وہ جگہ بہتر رہے گی۔

زوبی صاحب کی یہ باتیں سنتے ہوئے مجھے اپنے کانوں اور آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ کیا یہ مجھ سے شفقت و محبت سے پیش آنے والے وہی زوبی صاحب ہیں۔ یا کوئی اور ؟ بالآخر میں نے کلر برش اٹھائے اور اپنی آنکھوں کے سامنے چھا جانے والے اندھیرے میں سیڑھیوں کا راستہ تلاش کرنے لگا۔

میں ابھی سیڑھیوں تک پہنچا بھی نہ تھا کہ زوبی صاحب کی آواز نے میرا راستہ روکا۔ اور کہا
"چغتائی صاحب کے نام رقعہ تو لیتے جاؤ۔" واپس ہوتے ہوئے میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ رقعہ چغتائی صاحب کے نام لوں یا نہ لوں، اتنے میں زوبی صاحب کے تیز قدم سیڑھیوں تک آ پہنچے مجھے رقعہ دیا اور فرمایا۔" تم چغتائی صاحب کے پاس جا ہو تو آج ہی چلے جاؤ۔"
میں کئی دن تک زوبی صاحب کے اس لب و لہجے کی گرد کو اپنے ذہن سے جھاڑتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ آخر ایسا ہوا کیوں — یہاں تک کہ میں اپنے آپ کو یہ بات سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ جن شخصیتوں کا دل میں احترام ہو ان کی چھوٹی موٹی باتوں کو بھول ہی جانا بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا میں چند دن بعد اس واقعے کو بھولنے میں کامیاب ہو گیا۔
کچھ دن بعد مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی صاحب کی خدمت میں زوبی صاحب کا رقعہ لے کر حاضر ہوا چغتائی صاحب کے بھائی رحیم چغتائی صاحب کمال مہربانی سے پیش آئے۔ مجھ سے رقعہ لے کر چغتائی کو دیا۔ چغتائی صاحب نے مجھے اوپر کی منزل پر بلوا لیا جہاں وہ کام کرتے تھے۔

سب سے پہلے مجھ سے یہ وعدہ لیا کہ میں ان کے کسی بھی کام کی نقل اپنے پاس نہیں رکھوں گا۔ دوسرا یہ کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ میں ان کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ اور تیسرا یہ کہ جو کام بھی ہوگا وہ گھر سے مکمل کر کے لے آیا کروں گا یہاں بیٹھ کر کام کرنے کی جگہ نہ ملے گی اور اجرت جو مناسب ہوگی وہ ادا ہو جائے گی۔

میں تقریباً چار ماہ تک چغتائی صاحب کی فنی خدمت بجا لاتا رہا۔ اس زمانے میں چغتائی صاحب علامہ اقبال پر کام کر رہے تھے۔ ان کے یہاں کام کرنے سے مجھے wash painting (واش پینٹنگ) کی ٹیکنیک کو سمجھنے میں خاصی مدد ملی ان چار مہینوں کی داستان بھی بڑی دلچسپ اور معلومات آفریں ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ وقت نہیں۔
زوبی صاحب کے متذکرہ رویے کے بعد میں نے اُن کے studio میں جانا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد دو چار بار ملاقات بھی ہوئی لیکن نہ انھوں نے کبھی مجھ سے نہ آنے کی وجہ پوچھی اور نہ میں نے اس سلسلے میں کبھی کوئی بات کی حتیٰ کہ وہ لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے۔ اب جب کبھی وہ مجھ سے ملتے ہیں تو میں اسی احترام سے ان کا استقبال کرتا ہوں۔
جب کوئی واقعہ یا حادثہ انسانی زندگی میں رونما ہوتا ہے تو حسّاس انسان پر اس کا شدید ردِ عمل ہوتا ہے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ میرے لیے یہ بہت ہی بُرا ہوا لیکن مشیتِ ایزدی کا منشا کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ برسوں بعد آج یہ نکتہ میری سمجھ میں آیا ہے اگر زوبی صاحب مجھے اس طرح چغتائی صاحب کے پاس نہ بھیجتے تو جو فیض چغتائی صاحب کی صحبت سے مجھے حاصل ہوا میں اس سے محروم رہ جاتا اور نہ مجھے اس دور کے نامور مصور کو قریب سے دیکھنے کی سعادت حاصل ہوتی۔

نذر [illegible] زوبی

شبنم رومانی

ایک تخلیقی فن کار

فن مجسمہ سازی کا آغاز تخلیق آدم سے ہوا اور فن مصوری کی ابتدا تخلیق کائنات سے، شاید یہی سبب ہے کہ آذر زوبی نے انسان اور فطرت کو ہزار ہا آنکھوں سے دیکھا اور ہزار ہا رنگوں میں ظاہر کیا ہے۔

بعض فنکار غیر معمولی ذہانت کے مالک ہوتے ہیں یہی ذہانت انھیں روایت سے بغاوت پر آمادہ کرتی اور جستجو کے صحرا کی خاک چھاننے کا چسکا ڈالتی ہے جس فنکار میں جستجو کا مادہ جتنا زیادہ ہوگا وہ اتنا ہی بڑا فنکار ہوگا۔

دوسری قبیل کے وہ فنکار ہیں جو صداقت کی تلاش کے بجائے انفرادیت کی شعوری تگ ودو میں رہتے ہیں، نتیجے کے طور پر انھیں شہرت تو مل جاتی ہے مگر وہ ہمیشہ دھندلکوں میں کھوئے رہتے ہیں جو کچھ وہ دیکھتے ہیں ہمیں نظر نہیں آتا اور جو کچھ وہ کہتے ہیں ہم تک نہیں پہنچتا۔ کیونکہ تجریدی ادب کی طرح تجریدی مصوری میں

بھی ابلاغ (communication) کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ زندگی "تجرید" سے خالی ہوتی ہے۔ زندگی کا سفر تجرید ہی کی وادی سے شروع ہوتا ہے مگر یہ اس کا نقطۂ آغاز ہے، منزل نہیں، ہر گونگے خیال کو زبان کی اور برہنہ فکر کو پیرہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی رُوحِ تہذیب و ثقافت ہے۔ ادب ہو یا مصوری یا فنونِ لطیفہ کی کوئی بھی شکل، اگر وہ تہذیب و ثقافت کی اس رُوح سے ناآشنا ہے تو اسے مسندِ اعزاز پیش کرنے سے پہلے ہمیں اس کی حیثیت کا تعین کرنا پڑے گا۔

مصوری آفاقی زبان بھی ہے جو ہر خطہ ارض میں سمجھی جاتی ہے اور اظہارِ ذات کا ذریعہ بھی۔ مگر جب تک ذات جامع الصفات نہ ہوگی اس کا اظہار بھی ناقص ہوگا۔

آذر زوبی جامع الصفات شخصیت کے مالک ہیں یہی سبب ہے کہ ان کا فن بھی ان کی ذات کی طرح محاسن سے مالا مال ہے، وہ برشس کی اوٹ پٹانگ حرکت کے قائل نہیں بلکہ مصوری میں نظم (discipline) کو بہت اہمیت دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی بنائی ہوئی تصویریں پہیلیاں بوجھنے پر مجبور نہیں کرتیں بلکہ ان کا فن تجریدیت اور واقعیت کے آمیزے سے تخلیق پاتا ہے اور اپنی تہذیبی بنیاد اور ثقافتی پس منظر سے پہچانا جاتا ہے ان کا وسط (Medium) اگرچہ آفاقی ہے مگر اس کی اساس زمین (soil) پر ہے۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں فکر انگیز ہوتی ہیں اور زندگی کی توانائیوں کا بھرپور احساس دلاتی ہیں۔

زوبی کے نگار خانے میں ہر طرف "مرد اور عورت"۔ "ماں اور بچہ" اور "فطرت کا برہنہ حسن" نظر آتا ہے۔ یہ ان کے محبوب موضوعات ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی حقیقی زندگی کے موضوعات ہیں باقی موضوعات ان کے ذیل میں آتے ہیں۔ چنانچہ مرد ہو یا عورت، ماں ہو یا بچہ، پیڑ ہو یا دریا ان کی تصاویر کا ہر جسم، ہر چہرہ، ہر منظر صحت مند اور توانا ہے رنگوں کا انتخاب بھی زوبی کے صحت مند ذوق کا ثبوت ہے، مریضانہ رنگوں کے بجائے ان کے کینوس پر شوخ اور چمکدار رنگ لہراتے ہیں اور ان کے پین ورک کی تصویریں پنجاب کی کھلی فضا میں پروان چڑھنے والی الہڑ لڑکیوں، کسے ہوئے جسم والی جوان عورتوں، لمبی مونچھ والے بانکے جوانوں اور نفس کے سرکش گھوڑوں کے گرد گھومتی ہیں۔

ادب اور ادیبوں سے زوبی کا تعلق گہرا رہا ہے، اس سے ان کا فن اور بھی نکھرا ہے۔ چٹان، نقوش، نیا دور، نمکدان، اردو ادب اور بہت سے دوسرے ادبی رسالوں کے ابتدائی سرورق زوبی ہی کے بنائے ہوئے تھے۔ اب بھی وہ گاہے گاہے افکار کو مزین کرتے رہتے ہیں۔ ۱۹۵۶ء تا ۱۹۵۸ء "شعور" جیسا معتبر ادبی رسالہ انھیں کی ادارت میں شائع ہوا۔ قدرت اللہ شہاب کا "سرخ فیتہ" اور عبدالعزیز خالد کے ابتدائی دو شعری مجموعے "زرِ داغِ دل" اور "ماتم یک شہر آرزو" انھیں کے مکتبہ سے شائع ہوئے۔

زوبی کا ایک عظیم کارنامہ اقبال کا مصور شکوہ ہے، زوبی نے اس میں ادب اور مصوری کو ایک دوسرے میں اس طرح سمو دیا ہے کہ انھیں الگ کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ انھوں نے شکوہ کے ہر بند کو متشکل کیا ہے، افکار کو صورت عطا کرنا آسان کام نہیں۔ پھر اس صورت کشی میں اقبال ہی نہیں زوبی بھی اپنے تمام و کمال اعتقادات

اور نظریات کے ساتھ موجود ہیں۔

انھوں نے محض اقبال کے اشعار کو رنگوں میں منتقل نہیں کیا ہے ان کی تشریح بھی کی ہے اور اس تشریح میں اجتہاد سے بھی کام لیا ہے ــــــ چنانچہ اس فکری عمل میں زوبی نے اقبال کو بہت قریب جا کر دیکھا ہے ــــــ ویسے بہت قریب سے دیکھنا کوئی معتبر اقدام نہیں ہے۔ اکثر بہت قریب سے دیکھنے میں نگاہ دھندلا بھی جاتی ہے اور مشاہدہ ناقص بھی ہو جاتا ہے مگر اقبال کے "شکوہ" کے ساتھ زوبی نے انصاف کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے موضوع پر ۲۴ فٹ لمبی اور ۶ فٹ چوڑی آئل پینٹنگ "بیداری" ــــــ (The Awakening) ان کی ایک شاہکار تصویر ہے۔ اس تصویر میں زوبی نے جارحیت کے پہلے دھاکے سے پیدا ہونے والے مدافعتی ردِ عمل کے لمحے کو کمالِ حسن کے ساتھ کینوس پر محفوظ کیا ہے۔ یہ تصویر قومی گیلری میں سجائے جانے کی مستحق ہے۔

زوبی کے بنائے ہوئے مجسمے بھی قومی اہمیت کے حامل ہیں۔ سیاسی شخصیات میں محترمہ فاطمہ جناح، بیگم لیاقت علی خان، حسین امام اور ایم ایچ اصفہانی وغیرہ کے علاوہ ادب و شعر سے گہرے ربط کے سبب انھوں نے بہت سے پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کے مجسمے بھی بنائے ہیں جن میں جسٹس رحمان، مولانا صلاح الدین احمد، مجنوں گورکھپوری، سعادت حسن منٹو، امتیاز علی تاج، حفیظ ہوشیارپوری، ممتاز مفتی، فیض احمد فیض، سراج الدین ظفر، ظہیر کاشمیری، ہاجرہ مسرور وغیرہ کے مجسمے قابلِ ذکر ہیں۔ ان مجسموں کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کے خدوخال میں پوری شخصیت کو منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً حفیظ ہوشیارپوری کا مجسمہ اس ایک لمحے کی تجسیم ہے جب وہ بولتے بولتے اچانک کسی خیال میں ڈوب جاتے تھے یا مجنوں گورکھپوری کا مجسمہ جیسے وہ گفتگو کرتے کرتے رک کر کوئی چونکا دینے والی بات کہتے جا رہے ہوں!

زوبی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے دوسروں سے اثر کم قبول کیا ہے۔ دوسروں کو متاثر زیادہ کیا ہے دوسری یہ کہ وہ اپنے ہی اسلوب کے اسیر ہو کر نہیں رہ جاتے بلکہ نئے نئے اسالیب وضع کرتے رہتے ہیں اور ان کا فن کسی ایک منزل پر آکر ٹھہر نہیں گیا ہے بلکہ مسلسل سفر میں ہے۔

تم فن کے لیے زندہ رہو تاکہ فن تمھیں زندہ رکھے۔

۸ر جولائی ۱۹۸۰ء ــــــ شیخ احمد

کئی لوگوں سے مل کر ان کی شکلیں بھول بھی جائیں، ان کی دلآویز شخصیت کا تاثر ذہن میں گھر کیے ہوتا ہے اور یوں ان کی رفاقت اور قربت کا احساس سدا ابنار رہتا ہے۔ زوبی سے بھی عمر بھر میں میں کل دو چار گھنٹوں کے لیے ہی ملا ہوں، مگر اس سے ملاقات پر مجھے یہی لگا کہ وہ دیرینہ شناسا ہے۔ ملاقات کے بعد بھی مجھے اس سے جدا ہو جانا محسوس نہ ہوا۔ اس کا خیال آتے ہی ملاقات کی وہی کیفیت میرے ذہن میں آباد ہو جاتی ہے، گویا وہ اب بھی ویسے ہی میرے سامنے بیٹھا ہو۔

کھرے فنکار دراصل اسی لیے دل و دماغ سے محو نہیں ہوتے کہ وہ کہیں اپنے چہروں کی پناہ گاہوں میں دبک کر نہیں بیٹھے ہوتے۔ اپنے چہروں کو تو نہ جانے کہاں سونپ کر وہ ان قدروں کی چہرگی تخلیقنے کی جد میں لگے رہتے ہیں جن کی بدولت انسانی بقا کا ساماں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے کسی بھی پسندیدہ چہرے سے رابطہ ہونے پر مجھے بے اختیار ان کا بھی خیال آجاتا ہے۔ زوبی سے میرا بار ہا اسی طرح ملنا ہوتا ہے۔ اس سے ملتے ہوئے میں گویا اپنے کئی دوسرے محبوب فنکاروں سے مل لیتا ہوں اور اوروں سے ملتے ہوئے اس سے۔

برنارڈ شاہ کی تخلیقی حیثیت اس لیے مشکوک ہے کہ اس نے اپنے ہر ڈرامے میں صرف ایک ہی کردار پیش کیا ہے، یعنی اپنا آپ۔ یہ 'خوبی' زیادہ
یادہ کلیتور لٹریچر کی محرک ہو پاتی ہے۔ فنون لطیفہ کی لطافت کا انحصار تو اس امر پر ہوتا ہے کہ فنکار خود آپ سین سے یکسر غائب ہو اور اس کی
یریں خود رو ہو کر زندگی کرتی ہوئی محسوس ہوں۔ زوبی کی پنجاب کی تصویریں اسی لیے اس قدر زندہ ہیں کہ مصور کا شخصی حوالہ بننے کی بجائے وہ اپنے
ل میں بسی ہوئی ہیں اور کرداروں کو ان کی اپنی ہی عادتوں کے مطابق پیش کرتی ہیں اور یوں اپنے ایچوں کے کینوس سے نکل کر اس بے پایاں باشندگی
سو ر کھرا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں جس سے پنجاب کی روح آنکھوں میں بھر آئے۔

ہماری ملاقات پر جب ہم سب دوست اس کے ڈرائنگ روم میں باتیں کر رہے تھے تو وہ بھی بڑی سرگرمی سے ہماری گفتگو میں شریک تھا۔
بان خاموشی، اپنی تصویروں کے مانند، جو ڈرائنگ روم کی دیواروں پر سے اپنے اپنے چوکھٹے سے برآمد ہو کر ہمارے ساتھ آبیٹھی تھیں اور ہماری
بث میں شامل تھیں۔

کوئی ادیب بھی اپنی معراج پر پہنچ کے لفظوں کا صرف اتنا ہی سہارا لیتا ہے کہ کسی مصور کی طرح چپ چاپ اپنی ساری بات کہہ پائے۔
ی اپنی خاموش کردار نگاری سے بات چیت کا جو بھرپور سماں باندھ لیتا ہے اس کا مشاہدہ کر کے جی چاہنے لگتا ہے کہ قلم بھی برش ہوتا ———
ہ ہزار شعبدہ گر ہو تخلیق کی روح تو تماشہ گری کے فن میں ہی مضمر ہوتی ہے۔

زوبی کی جادوئی خاموشی پر مجھے ابلاغ کے افضل تر وسیلے کا گمان ہوتا ہے۔ فنون لطیفہ کے قدیم اساتذہ بھی تو یہی کہا کرتے تھے '
ست، دکھاؤ!

میں سمجھا تھا، اقتصادیات کی خشکی نے میرے ذہن میں لطافت کی آخری بوند
بھی خشک کر دی ہوگی، لیکن آج پتھر میں جان دیکھ کر میرے جذبات نے بھی
ایک خاموش انگڑائی لی اور لگتا ہے اس کا اثر کافی دنوں تک رہے گا۔

۱۱ر اپریل ۱۹۵۰ء ———— سرتاج عزیز

آج کے فن کاروں پر ذمے داریوں کا بوجھ آ پڑا ہے۔ ہم حق و صداقت
اور امن کے علم بردار ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی قوم کو ثقافتی طور پہ توانا بنانے
کے لیے مشترکہ طور پر سعی کریں۔

۱۹ر مئی ۱۹۵۰ء ———— بلبل چودھری
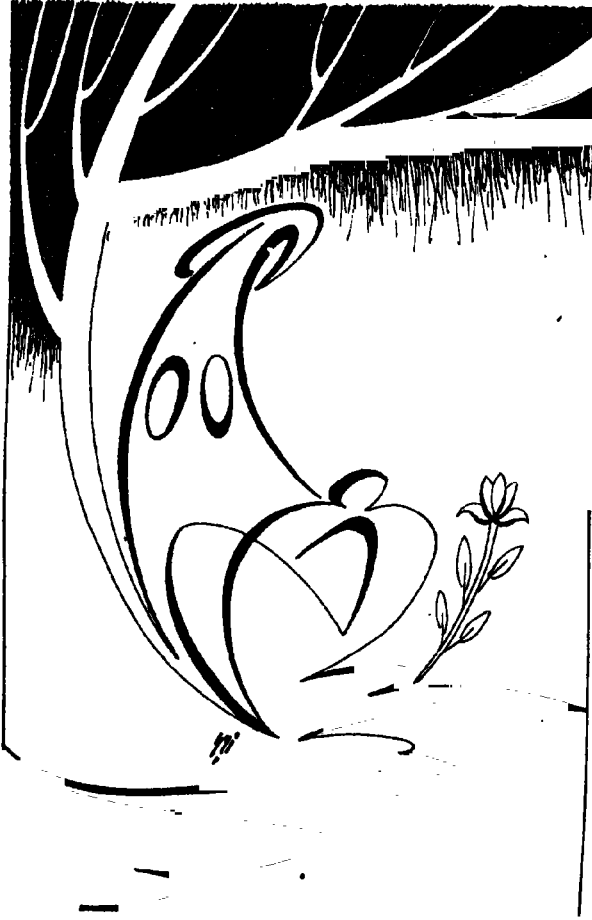
ڈاکٹر انور سدید

آذر زوبی کی بازیافت

سب سے پہلے تو مجھے اپنی اس محرومی کا ذکر کرنا ہے کہ میں ابھی تک آذر زوبی سے ملاقات نہیں کر سکا۔ زوبی لاہور میں تھا تو میں تھل کے صحراؤں میں خاک چھان رہا تھا۔ لاہور کے قرب و جوار میں آیا تو زوبی کراچی منتقل ہو چکا تھا۔ اس لیے میں زوبی کے رسمی شناساؤں میں شامل نہیں ہوں۔ میں نے اس کی تصویروں کی کسی نمائش میں شرکت نہیں کی، اس لیے میں زوبی کے فن کے سب گوشوں کو قریب سے دیکھنے کا دعوی نہیں کر سکتا۔ مجھے زوبی کے نگار خانے کو دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ اس لیے میں یہ رائے دینے کی حیثیت میں بھی نہیں ہوں کہ زوبی موضوعات پر کس طرح کمند ڈالتا ہے اور پھر کس طرح رنگوں کے امتزاج یا موقلم کی باریک ترین لکیروں سے کینوس پر اتار دیتا ہے۔ اس سب کے باوجود میں محسوس کرتا ہوں کہ جس طرح غالب، میر تقی میر، اقبال، فیض، مجید امجد اور وزیر آغا میری رگ جان سے قریب ہیں، اسی طرح زوبی کے فن سے میری برسوں کی شناسائی ہے اور اس نے بعض ایسے جذبوں کی صورت گری کی ہے جو میں نے بھی محسوس کئے تھے، اس لحاظ سے میں اس کے فن کے پرانے مداحوں میں سے ہوں اور میری اس سے ایک نہیں کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل بیان کرنے کی اجازت دیں تو مجھے سب سے پہلے زوبی سے اپنی اولین ملاقات کی بازیافت کرنی ہوگی۔ زوبی سے میری یہ
ت سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری نے کرائی تھی۔ ان دو اکابر ادب نے مل کر لاہور سے ایک جاندار رسالہ "اردو ادب" کے نام سے جاری
ا۔ "اردو ادب" نے تو اپنی چھب صرف دو مرتبہ دکھائی اور پھر مطلع صحافت سے غائب ہوگیا لیکن زوبی کے بارے میں اہل ادب کے دل میں ایک
ان نقش قائم ہوگیا اور اس نقش کو قائم کرنے میں ان مجسموں کا عمل دخل زیادہ تھا جو زوبی نے بنائے تھے اور جن کی عکسی تصویریں رسالہ
ادب" نے شائع کی تھیں۔ یہ مجسمے جن میں باری علیگ، امتیاز علی تاج، فیض احمد فیض، حفیظ ہوشیار پوری، ممتاز مفتی، اشفاق احمد،
منظر، ظہیر کاشمیری جیسے ادبا کے تخلیقی نقوش کو محفوظ کیا گیا تھا، اتنے الوکھے تھے کہ انہیں دیکھتے ہی لوگوں کے دلوں میں زوبی جیسا غیر مانوس
رکھنے والے فنکار کے لیے بے پناہ محبت کا چشمہ ابل پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ ادیب کو اس زمانے میں بھی معاشرے کا ODDMAN OUT
شمار کیا جاتا تھا۔ اس کی تخلیقات میں عوام الناس کو دلچسپی تو تھی لیکن شاید ان دلوں میں اس کے لیے احترام کا گہرا جذبہ موجود نہیں تھا۔ چنانچہ
سی ادیب کی زندگی کا کفیل نہیں تھا۔ یہ لوگ اپنے من کی جوالا میں سلگ سلگ کر ادب تخلیق کرتے اور اپنے داخل کے خلا کو پُر کرسکے
ہوجاتے۔ المناک حقیقت یہ ہے کہ سعادت حسن منٹو جس نے اردو ادب کو اعلیٰ پائے کے افسانے دیئے اور اردو زبان کو عالمی ادب
سربلند کردیا اپنی نجی ضرورتوں کے سامنے ہمیشہ نگوں سار رہا اور بالآخر اقتصادی بدحالی کے چرکوں کا سامنا کرتے کرتے مرگیا۔ محمد حسن عسکری
شراب نہیں پیتے تھے اور زندگی کی ضرورتوں کو بے حد قلیل کرکے طمانیت قلبی سمیٹ رہے تھے لیکن اب جو ان کا احوال ان کے ذاتی خطوط
سامنے آیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نان جویں کے لیے نوکری کی تلاش میں انہیں کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑے، کس کس در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں،
فضل کی دولت فراواں رکھنے کے باوجود کوئی ان کا پرسان احوال نہیں تھا۔ یہ لوگ تو ادب کے سحر میں اسیر تھے، زوبی نے اس دور کے چند
قدر ادیبوں کے باطن میں جلنے والی چتا کا مشاہدہ کیا اور پھر اس چتا کو مجسموں میں ڈھال دیا۔ لاہور میں ادیبوں کی عظمت کے اعتراف کی
یہ پہلی مرصع مثال تھی اور زوبی کا کمال یہ تھا کہ اس نے محض خدوخال کی نقاشی نہیں کی تھی بلکہ ادیب کے باطن میں پرورش پانے والے اضطراب
محسوس کیا تھا اور اس کی داخلی بے چینی کو اس کے چہرے پر سجا دیا تھا اور یہ ایسے مجسمے تھے جن سے ادیب کے داخل میں بھی جھانکا جاسکتا تھا۔

سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری نے "اردو ادب" کے ادارتی شذرے میں لکھا تھا کہ [1]

"کہا جاتا ہے کہ فی الحال پاکستان میں فنون لطیفہ کے لیے ماحول سازگار نہیں ہے۔ خصوصاً مصوری اور مجسمہ سازی کے لیے نہ
مت فن کاروں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے نہ عام لوگوں کو اس قسم کی سرگرمیوں سے دلچسپی ہے۔ فنکاروں اور فن کے معدودے چند
دالوں کی یہ شکایت بالکل بجا ہے۔ حقیقت ہے کہ حکومت یا چند خوش ذوق سرپرست یا پورا معاشرہ فن کار کی کوششوں کو قدر کی نگاہ
یکھے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ تخلیق کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اگر فنکار کو قدردانی میسر ہو تو اسے تحریک ہوتی ہے کہ اپنے ناآسودہ نفسیاتی
ات کو ارتفاع دینے کے لیے فن کی طرف رجوع کرے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ فن کوئی منڈی کا مال نہیں ہے کہ
بازار میں کھپت نہ ہو تو پیداوار رکی پڑی رہے۔ فن کار کے دل میں اپنے فن کا اتنا تو احترام ضرور رہنا چاہیے کہ وہ ایک حد تک دوسروں
قدردانی سے بے نیاز ہو۔ اس کے لیے اپنی تخلیقی کاوش کسی نہ کسی حد تک تو بجائے خود قابل قدر ہونی چاہیے۔ دراصل ہمارے یہاں فن
پر اس قسم کے یقین کی کمی نے جب لوگوں کے سامنے کوئی چیز قدر کے لیے ہوگی ہی نہیں تو وہ قدر کس کی کریں گے؟۔ اگر فنکاروں کو اپنے فن پہ

[1] اس شذرے کا اسلوب چغلی کھاتا ہے کہ اسے محمد حسن عسکری نے لکھا ہے۔ (انور سدید)

تخلیق یقین ہو تو وہ ماحول کو کچھ نہ کچھ تو سازگار بنا ہی سکتے ہیں۔ اگر ان کی سرگرمیاں جاری رہیں تو کم سے کم لوگوں کو ان کا وجود تو تسلیم کرنا ہی پڑے
لیکن پاکستان میں فنکاروں نے فن سے ایسے شغف کا مظاہرہ بہت ہی قلیل مقدار میں کیا ہے۔ مشکل سے چار پانچ ایسے مصور ہوں گے جنہوں نے
ماحول کی شکایت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی سرگرمیاں بھی پوری تندہی سے جاری رکھیں اور مجسمہ سازی کے بارے میں تو یہ معلوم نہیں کہ پاکستان
میں اس فن کا وجود بھی ہے یا نہیں۔ بہرصورت اس معاملے میں لاہور کے عنایت اللہ آذر صاحب کی کوششیں ضرور قابلِ تحسین ہیں کہ انہوں نے
ماحول کی ناقدردانی سے بددل ہو کر بیٹھ جانے کے بجائے اپنا کام جاری رکھا۔ بلکہ اپنے فن کو ترقی دینے کی بھی فکر کی۔" ص۱

آذر زوبی کو جس قسم کے نامساعد حالات اور ناسازگار ماحول کا سامنا تھا اس شذرے میں اس کا ذکر بھی تفصیل سے موجود ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

"جہاں تک ماحول کا سوال ہے وہ آذر صاحب کو ہمیشہ ناسازگار ملا۔ اور فنکار کو عموماً ملتا ہے۔ مصوری سیکھنے کے لیے انہیں اپنے والدین
کی مرضی کے خلاف گھر چھوڑ کر لاہور آنا پڑا۔ چنانچہ فنی تعلیم کے دوران میں اپنے تمام اخراجات کا انتظام بھی انہیں خود ہی کرنا پڑا۔ انہیں اصل
شوق تو مجسمہ سازی ہی کا تھا۔ مگر اسے ہمارے ملک میں ابھی تک پیشہ نہیں بنایا جا سکتا۔ لہٰذا تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے "زوبی"
کے نام سے تجارتی کام شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ گھر پر مجسمہ سازی کی مشق کرتے رہے۔ اب ایک مصیبت پیش آئی کہ محلے والوں نے جو
انھیں "بت" بناتے دیکھا تو پہلے تو انھیں سمجھایا کہ یہ حرکت چھوڑ دو اور جب وہ نہ مانے تو دھمکیاں دینا شروع کر دیں، آخر آذر صاحب کو نیا
محلہ تلاش کرنا پڑا جہاں ـــــــ "کسے را باکسے کارے نہ باشد!"

اب تک تو وہ قائداعظم یا گاندھی جی وغیرہ کے مجسمے بنا کر مشق کرتے رہے تھے یا پھر کوئی بھولا بھٹکا گاہک آگیا تو اس کی شکل کو لیپ
پوت کر ذرا خوبصورت سا بنا دیا اور اس کا جی خوش کر دیا۔ نئے مکان میں پہنچ کر انھیں ایک بڑی انوکھی بات سوجھی۔ وہ یہ کہ اپنے ہم عصر ادیبوں
اور شاعروں کے مجسمے بنائے جائیں۔ یہ بات بھی آذر صاحب کے خلوصِ نیت پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے ایک ایسے طبقے کو
نوازا جسے ملک کے سماجی نظام میں شایانِ شان مقام حاصل نہیں ہے۔ مگر اس تجویز کو عملی جامہ پہناتے میں بھی آذر صاحب کو طرح طرح
کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اول تو یہی کہ فی الحال خرچ ہی خرچ ہے۔ کسی قسم کا مالی فائدہ نہیں، پھر ادیبوں کو مجسمہ بنوانے پر آمادہ کرنے میں بھی
انہیں خاصی پریشانی اٹھانی پڑی۔ شروع شروع میں تو کسی نے ان کی بات کو درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا۔ کسی نے منظور بھی کیا تو اسٹوڈیو پہنچنے میں
ڈھیل کی اور آذر صاحب کو ہفتوں انتظار کرنا پڑا۔ لیکن انہوں نے نہیں مانی اور آخر بھاگ دوڑ کر کے دس بارہ مجسمے اب تک مکمل کر ہی لیے۔ ابھی
انھیں چالیس پچاس مجسمے اور بنانے ہیں۔"

اس طویل شذرے میں زوبی کے فن کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ مدیرانِ اردو ادب نے لکھا ہے کہ۔

"آذر صاحب مصوری بھی کرتے ہیں اور مجسمہ سازی بھی۔ لیکن دونوں میں ان کا انداز الگ الگ ہے۔ مصوری میں تو ان کا رنگ تخیلی ہے۔
بلکہ تخیلی سے بھی زیادہ جذباتی۔ یہ چیز ان کے موضوع اور طریقۂ کار دونوں میں جھلکتی ہے۔ ان کے موضوع کی نوعیت عموماً رومانی ہوتی ہے۔ خواہ بنیادی
جذبہ کسی قسم کا بھی ہو، افتخار، یا اہتزاز یا احتجاز۔ لیکن مجسمہ سازی میں ان کا رجحان حقیقت پسندی کی طرف ہے۔ تعلیم کے دوران میں انھوں نے
تخیلی قسم کے مجسمے بنائے ہوں تو بنائے ہوں فی الحال تو وہ ایجاد کے بجائے مشاہدے کی طرف راغب ہیں۔ اب انہوں نے ایسے مجسمے بنانے بالکل
چھوڑ دیئے ہیں جو مجسمہ بنوانے والے کو خوش آمد معلوم ہوں۔ دراصل اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ پیسے خرچ کر کے مجسمہ بنوانے والے

ص۱ سعادت حسن منٹو۔ محمد حسن عسکری۔ "اردو ادب"۔ نمبر ۲۔ ص ۷۔

ہمارے ملک میں ہیں ہی کہاں۔ مگر آذر صاحب نقل مطابق اصل کے بھی قائل نہیں ہیں کہ اصل آدمی اور مجسمے میں نقطے کا بھی فرق نہ رہے۔ ساتھ ہی انھیں شبیہ سازی کا جدید ترین انداز بھی قبول نہیں جس میں آدمی کی شکل پہچانی ہی نہیں جاتی۔ ان کی رائے میں ایسے مجسموں کو شبیہ کہنا ہی غلط ہے۔ ممکن ہے کہ بعض حضرات کو آذر کا یہ خیال درست نہ معلوم ہو اور وہ کہیں کہ ہم شبیہ سازی میں بھی حقیقت کی نقل نہیں بلکہ نئی حقیقت کی تخلیق چاہتے ہیں، جس میں موضوع، فنکار اور ناظر سب کی ہستیاں گھل مل جائیں۔ بہرحال آذر صاحب فنکار ہیں "ان کا ایک طریقۂ کار ہے، جس کے انتخاب میں وہ آزاد ہیں اور اس انتخاب اور ترجیح کا اثر ان کے نظریات پر بھی پڑنا ہی چاہیے۔ غرض نہ تو انھیں یہ بات پسند ہے کہ فنکار اصل ہیت کا غلام ہو کر رہ جائے۔ نہ ہی یہ پسند ہے کہ وہ بالکل آزاد ہو۔ آذر صاحب اعتدال چاہتے ہیں، مجسم سازی میں ان کا آدرش یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اصل آدمی کا کردار نمایاں کیا جائے۔ اگر کردار کی وضاحت کے لیے اصل سے تھوڑا بہت انحراف کرنا پڑے تو وہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن اتنا انحراف روا نہیں رکھتے کہ اصل میں اور مجسمے میں کوئی مماثلت ہی باقی نہ رہے۔ وہ آدمی کی باطنی ہیت کو بھی گرفت میں لانا چاہتے ہیں۔ مگر خارجی ہیت کو کھو کر نہیں۔ مختصر یہ کہ ان کے نزدیک شبیہ سازی کا اعلیٰ ترین وصف کردار نگاری ہے۔ اس بات میں وہ روڈاں اور ایپسٹائن کی شبیہوں کو مثالی نمونہ سمجھتے ہیں مگر ہو سکتا ہے کہ روداں کا "بالزک" ان کے لیے قابل قبول نہ ہو۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی مجسمہ سازی کے اگلے دور میں آذر صاحب کی نئی راہیں ڈھونڈنی پڑیں۔

چونکہ ابھی تک آذر صاحب کے فن کا ابتدائی دور ہے اس لیے ان کے متعلق لمبے چوڑے دعوے تو نہیں کئے جا سکتے۔ مگر انہوں نے ادیبوں، شاعروں، سیاستدانوں اور دیگر افراد کے تقریباً سو (۱۰۰) مجسمے بنائے ہیں، انھیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا فن بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ ان میں سے جو مجسمے انھوں نے شروع میں بنائے ہیں ان میں اتنی معنویت نہیں ہے جتنی بعد والے مجسموں میں ہے۔ ان کا آدرش کردار نگاری ہے اور اس میں انھیں سب سے زیادہ کامیابی حفیظ ہوشیارپوری کی شبیہ میں حاصل ہوئی ہے۔ اس مجسمے کے بالوں میں ہونٹوں، ٹھوڑی، ناک میں اور سب سے زیادہ اس مجسمے کے مجموعی تصور اور نشست" میں ذاتی طور سے حفیظ کی شخصیت ہی نہیں بلکہ ایک حد تک ان کی شاعری بھی اتر آئی ہے، اس کے بعد پھر ممتاز مفتی صاحب اور امتیاز علی تاج صاحب کی شبیہیں آئی ہیں۔ ان میں مجموعی تاثر اتنا کامیاب نہیں۔ مگر تفصیلات کے ذریعے مجسمہ ساز نے کردار تک پہنچنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ یہ کوشش کم و بیش سب مجسموں میں ملتی ہے۔ لیکن ان مجسموں میں ایک ذرا سی یہ کمی ضرور ہے کہ عام طور سے ان میں ہمیں ادیب کی تخلیق کی ہوئی دنیا نہیں ملتی۔ ادیبوں کے مجسموں میں اس عنصر کی موجودگی ایک حد تک لازمی تھی۔ ادیب کے مجسمے کو خالی ایک شخص کا مجسمہ نہیں بلکہ شخصیت اور تصنیف دونوں کا مجسمہ ہونا چاہیے۔ مگر یہ ایسی کمی ہے جو تجربے اور مشق سے پوری ہو سکتی ہے۔ ابھی تک آذر صاحب کے سامنے پوری عمر پڑی ہے۔ اپنا کام اسی تندہی اور خلوص سے جاری رکھیں گے تو بیسیوں نئی چیزیں سمجھ میں آئیں گی جن کی مدد سے ان کا فن اور تہہ دار بن سکے گا۔ فی الحال تو یہی بہت غنیمت ہے کہ ماحول کی سازگاری کا انتظار کرنے کے بجائے وہ اپنے تخلیقی کام میں لگے ہوئے ہیں اور اس طرح اپنی کوششوں سے ماحول کو سازگار بنا رہے ہیں۔ ہمارے ملک کا بہتر مستقبل ایسے ہی نوجوانوں کی ہمت سے روشن ہو سکتا ہے جو قدر دانی کے لالچ سے نہیں بلکہ تخلیق اور تجربے کو بذات خود قابل قدر سمجھ کر فنون لطیفہ کی خدمت کریں۔"[1]

زوبی بے حد خوش قسمت تھا کہ اس دور میں جب اس کے فن کی پہلی کونپل پھوٹ رہی تھی۔ اسے اردو ادب کے دو ایسے متنازعہ ادیبوں

---

[1] سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری۔ "اردو ادب نمبر ۲" ص ۷ تا ۱۰۔

نے سراہا جو جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ کہنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری نے زوبی کا تعارف جس بامعنی انداز میں کرایا تھا اس نے زوبی کی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ کیا اور زوبی پر شہرت کی دیوی ایک ہی رات میں مہربان ہو گئی۔ زوبی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور اب وہ میرے لیے ایک ایسا مانوس اجنبی تھا جس کی مزید تخلیقات دیکھنے کی تمنا میرے دل میں ہمہ وقت بیدار رہنے لگی۔

زوبی سے ایک اور ملاقات کا وسیلہ اس کی تصویریں اور مجسمے نہیں بلکہ اس کا رسالہ "شعور" تھا۔ ہرچند اردو لفظ کو مصور کرنے کے تجربات اس سے قبل "نیرنگ خیال" جیسے ادبی رسالہ میں کئے جا چکے تھے اور انھیں قبول عام بھی حاصل ہوا تھا لیکن کسی مصور نے ادبی پرچے کا مدیر بننے اور زیاں کے اس کاروبار کو تخلیقی لگن سے سرانجام دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ زوبی نے "شعور" جاری کیا تو اس سے ایک دفعہ پھر یہ حقیقت سامنے آگئی کہ زوبی جذبے کو محض لگن سے اور خطوں میں پیش کرنے والا فنکار ہی نہیں بلکہ وہ تخلیقات کو خوبصورت انداز میں پیش کرنے کا فن بھی جانتا ہے۔ "شعور" اپنی نوع کا پہلا رسالہ تھا جس میں مدیر کسی ڈاک خانے کا پوسٹ ماسٹر نظر نہیں آتا تھا کہ ادیبوں سے تخلیقات وصول کرے اور انھیں ایمانداری سے قارئین تک پہنچا دے۔ زوبی نے تخلیقات کو ملفوفہ بنانے کے بجائے تخلیق اور تخلیق کار کو اس طرح پیش کیا کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں لکھنے والوں کے لیے محبت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور مصنف کی تحریر کے ساتھ مدیر کے موقلم کی آرائش بھی جلوہ گر ہونے لگی۔ شعور ایک بلند پایہ ادبی پرچہ تھا لیکن زوبی نے اس کی تزئین جس تخلیقی انداز میں کی اس نے "شعور" کو ایک مصور پرچہ بھی بنا دیا۔ اور قاری نے تخلیقی لفظوں کے ساتھ ساتھ ان لکیروں میں بھی ایک جہاں معنی دیکھ لیا جو "شعور" کے ہر صفحے پر بین السطور معنی خیز انداز میں پیش کر دی جاتی تھیں۔

"شعور" کا ایک اور اجتہادی اقدام ٹائپ کا وہ تجربہ تھا جسے اس دور کی حکومت بھی آزمانے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ زوبی کو احساس تھا کہ لیتھو پر نستعلیق کی طباعت ماضی کا ورثہ ہے لیکن اس نے ارباب سیاست کو باور کرایا کہ یہ سسٹم طباعت و اشاعت کی جدید تکنیک سے فائدہ اٹھانے میں بڑی حد تک حائل ہے۔ اور ہم اردو کو وسعت دے کر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں لانے سے قاصر ہیں۔ چنانچہ اس وقت زوبی کے اندر کے فنکار نے ایک مصلح کا روپ اختیار کیا اور اردو رسم الخط اور طریق طباعت کو ارتقاء کی طرف تیزی سے قدم بڑھانے کے لیے ٹائپ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اس مشورے کے عملی اظہار کے لیے زوبی نے "شعور" کے علاوہ مکتبہ شعور کی کتابوں کو خوبصورت، جاذب نظر اور دلآویز ٹائپ میں چھاپنے کا آغاز بھی کر دیا۔ جن لوگوں نے "شعور" کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ اگرچہ زوبی نے یہ اقدام ہنگامی طور پر کیا تھا لیکن اس کی پذیرائی خاطر خواہ ہوئی۔ اس کی تقلید ملک کے کئی ادبی ماہناموں اور ہفت روزہ رسائل نے کی۔ اور ٹائپ میں چھپنے کے باوجود "شعور" اس دور کے خوبصورت ترین پرچوں میں شمار کیا گیا۔ پاکستان میں اردو ٹائپ کے فروغ کے امکانات تاحال روشن نہیں ہوئے تاہم جلد یا بدیر ہمیں ٹائپ کو قبول ضرور کرنا ہے۔ یہ وقت جب بھی آئے گا تو ہم سب زوبی کی طرف افتخار اور احسان مندی کے جذبے سے دیکھیں گے کہ اس نے ربع صدی قبل ہمیں ایک دلآویز ٹائپ سے متعارف کرایا تھا لیکن مفاد پسند سیاست کے سوئے ہوئے دربانوں نے اس کی قدرمندی اور قومی ترقی کی رفتار کو کمزور تر کرنے کے لیے ٹائپ کی ترویج عام کو معرض التوا میں ڈال دیا۔

اب زوبی سے ملاقاتوں کا سلسلہ روز بروز بڑھنے لگا۔ اس دور کے اہم ادبی رسائل میں وہ نظر آتا تو میں اس کی طرف بے اختیار کھنچا چلا جاتا۔ اردو ادب کے اس دور میں حقیقت کو باریک ترین اور بعض اوقات غیر اہم جزئیات سے پیش کرنے اور تاثر کو گہری شدت سے ابھارنے کی سعی کی جاتی تھی۔ زوبی کی تصویروں میں روحانیت تو موجود تھی لیکن یہ نیم غنودہ اور خوابناک نہیں تھی اور تخیلی ہونے کے باوصف وہ حقیقت کی لطیف سے لطیف چاپ کو بھی بگوش ہوش سنتا تھا۔ دوسری طرف زوبی کی طنز نگاری کو پیش نظر رکھا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کو علامتی پیرائے میں پیش کرنے کا فن بھی جانتا تھا۔ اس کے طنز دل کے معنی چونکہ لکیروں کے ساتھ پیوست نہیں ہوتے تھے اس لیے معنی کی تہہ میں اتر نے

یے مکروں کے بطون میں جھانکنا بھی ضروری ہوتا تھا۔ اس ضمن میں حلقہ ارباب ذوق کے رسالہ "نئی تحریریں" کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس کے لیے
ربی نے ایک ایسا علامتی طغرہ تخلیق کیا جس میں بڑی گہری معنویت اور تہہ داری تھی۔ اس طغرے سے کائنات، انسان، جمالیات فن اور حلقہ ارباب ذوق
تخلیقی جہت پوری قدرت کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ طغرہ ملاحظہ کیجیے۔

ے طغرے کی جو خیال آفریں تعبیر "نئی تحریریں" کے مدیر نے کی اس کا اقتباس یہاں برمحل نظر آتا ہے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ ——

"اس طغرے میں جو چیز سب سے پہلے دیکھنے والی آنکھ کی توجہ اپنی طرف منعطف کراتی ہے وہ ایک بڑا دائرہ ہے۔ یہ دائرہ ——
قر —— دوہری معنویت کا حامل ہے۔ ایک طرف تو یہ حلقہ ارباب ذوق کی غمازی کرتا ہے اور دوسری طرف کائنات کی وسعتوں کا احاطہ کیے ہوئے
ل اور ہم آہنگی کا مظہر ہے۔

اس دائرے کے اندر ایک کرہ ہے۔ یہ اندرونی کرۂ زندگی کی کرخت اور ٹھوس حقیقتوں سے حسن و رعنائی کو جنم دے کر ایک مرکزی دائرے
صورت اختیار کرتا ہے۔ یہاں سفید اور سیاہ کا امتزاج خیر و شر اور حق و باطل کی ایک ازلی علامت ہے جن کی آویزش سے فن ظہور پاتا ہے
بڑی دائرہ سفید ہے اور ایک انسانی چہرے کے روپ میں ڈھل گیا ہے۔ اس چہرے کے دو رنگ ہیں جو انسان کی دونوں جنسوں کی غمازی
ہیں اور دائرے کی سفیدی ذہنی جلاء کا استعارہ ہے۔

مرکزی سفید دائرے میں تین چیزیں نمایاں ہیں، سب سے پہلے تو وہ کھلا ہوا صحیفہ ہے جس پر انسان کی صدیوں کی ذہنی ترقی
پنے نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ نقوش ریاضی کی بنیادی اشکال —— مربع (تناسب و توازن)۔ دائرہ (تکمیل)۔ مثلث (صداقت، خیر، حسن)
ورت میں ظاہر کیے گئے ہیں اور حلقہ ہمیشہ ادب میں انھیں اقدار کا علمبردار رہا ہے۔ صحیفہ چہرے کے چشم و گوش پر محیط ہے۔ اور اس
ا آئینہ دار کہ ارباب ذوق کو جو آنکھیں اور کان ملے ہیں انھوں نے کسی بے جا تعصب کی بنا پر نہ تو کسی منظر سے روگردانی کی اور نہ کسی
ہیں سے بے اعتنائی برتی ہے۔

مرد کے نصف چہرے پر یک رخی نسوانی چہرہ مرتسم کیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کرخت احساسات و جذبات پر جمالیاتی تاثر کو حاوی
گیا ہے۔ نسوانی چہرے کے ہونٹوں کا لطیف و نازک خم، فطری حسن، کان کا آویزہ تزئین جمال کی لگن اور ناک کی کیل مشرق کی روایتی دھج
بھرتی ہے۔ بنیادی اقدار (اشکال ریاضی) کی تقسیم کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ نسائی چہرے والا رخ زیادہ پُر ہے۔ گویا بیشتر اقدار جمالیاتی
ساسے وابستہ ہیں۔ اس کے مقابلے میں دوسری طرف حسن اور دیگر اقدار کو پرکھنے والی آنکھ ہے جیسے ایک استفہامیہ علامت کی صورت
جاگر کیا گیا ہے۔ یہ چھان پھٹک کرنے والی وہ آنکھ ہے جس نے کڑی نظروں سے ہر صحیفہ کو کھنگالا، ہر تخلیق کو پرکھا اور ہر فنکار کے قلب و شعور
یوں میں جھانکا ہے —— اور حلقہ ارباب ذوق نے اسی تنقید اور خود احتسابی کی بنا پر ایک منفرد دبستان خیال کی حیثیت حاصل کی ہے۔
اس طغرے کے لیے حلقہ ارباب ذوق پاکستان کے جواں سال اور جواں فکر فنکار زدبی کا ممنون ہے۔ ھٰ

ئی تحریریں"۔ شمارہ اول۔ ص ۸۔

زدبی نے ایک اور انوکھا طغرہ اپنے "مکتبہ شعور" کے لیے تخلیق کیا تھا۔ یہ طغرہ بظاہر علامتی نظر نہیں آتا اور واضح خدوخال میں عکاسی کرتا ہے۔ تاہم زدبی کا تجزیہ پڑھیں تو احساس ہوتا ہے کہ اس طغرے میں بھی انھوں نے معنی کا جہان سمونے کی پوری کاوش کی ہے۔

مکتبہ شعور

یہ خاکہ کتاب بھی ہے اور صاحب کتاب بھی۔ کتاب جس کو طلسم زندگی کہیں اور صاحب کتاب ایک جہاندیدہ فنکار، جس کے چہرے پر فراست کی سنجیدگی اور آنکھوں میں تفکر کی گہرائی ہے۔

اوپر کا حصہ کتاب کے اوراق بھی ہیں اور ایک فنکار کا ذہن بھی جو حکمت و دانش کا مخزن ہے۔ سیاہ حصہ کتاب کی جلد بھی ہے اور تحت الشعور بھی۔ جس میں صدیوں کا تہذیبی ورثہ، نئے قالب میں ڈھلنے کے لیے بے قرار ہے۔ یہ ورثہ وہ گراں بہا سرمایہ ہوتا ہے جس سے فنکار نئے خیالوں کی کشید کرتا ہے۔ اور ان میں اپنے خون جگر کو شامل کر کے ایک نئے نادر اور منفرد پیکر کی تشکیل کرتا ہے۔

خاکہ کے اوپر مصرع عرب کے سرآمد شعرا المتنبی کا ہے۔

پورا شعر یہ ہے۔ واعز مکان فی الدنیٰ سرج سابح

وخیر جلیس فی الزمان کتاب

کہ اس فانی زمانے میں سب سے اچھی مسند سمند بادپا کی زین ہے اور سب سے اچھا دوست روزگار میں کتاب ہے ؀

زدبی کے علامتی اظہار کا ذکر آیا ہے تو مجھے یہاں بالخصوص اشفاق احمد کی کتاب "ایک محبت سو افسانے" کے سرورق کا ذکر بھی کرنا ہے۔ زدبی نے یہ سرورق اس دور میں بنایا تھا جب کسی مصنف اور اس کی کتاب کی داخلی تخلیقی لہر کو گرفت میں لینے کا رواج نہیں تھا۔ اس کے بجائے سرورق کو بالعموم خوبصورت لڑکیوں کی خیالی شبیہوں سے سجانے اور سرورق کو جذبات انگیز اشتہار بنانے کی سعی کی جاتی تھی۔ "ایک محبت سو افسانے" کا سرورق بظاہر سادہ اور آڑھی ترچھی لکیروں سے تراشا گیا تھا لیکن اس میں ایک تخلیقی رعنائی اور داخلی قوت موجود تھی، یہ لکیریں کبھی انسانی مجسموں کی صورت اختیار کر جاتیں کبھی یہ لکیریں غیر شعوری طور پر الفاظ میں ڈھلنے لگتی۔ اور کبھی اس ذہنی کشمکش کی علامت بن جاتیں جسے اشفاق احمد نے محبت کے ان افسانوں میں پیش کرنے کی کامیاب کاوش کی تھی۔ زدبی نے یہ سرورق بنا کر مقبول عام رواج کی سنگلاخیت کو توڑا تھا۔ چنانچہ اشفاق احمد کے نئے ذائقے کے افسانوں کے ساتھ ساتھ زدبی کا نئے انداز کا سرورق بھی محفلوں میں سرگرم گفتگو کا موضوع بنا رہا اور کچھ عرصے کے بعد تو یہ احساس بھی ہونے لگا کہ کتاب کی مصوری زدبی کے فن

صا "رسالہ شعور" ۲ ۔ کراچی ۱۹۵۷

نذر زوبی

انور سدید

کا ایک مخصوص زاویہ ہی نہیں بلکہ اردو ادب سے ایک مستقل رابطے کا وسیلہ بھی ہے۔

واضح رہے کہ زوبی کے سرورق توضیحی یا تشریحی نہیں ہوتے۔ وہ خیال کی جوئے تیزرو کو مصنف کے طغیانِ فکر کے ساتھ ہم آہنگ تو کرتا ہے۔ لیکن گردن جھکا کر اس کا تعاقب نہیں کرتا۔ زوبی تخلیقی فنکار ہے اور وہ کسی خیال کو بالعموم اس وقت کاغذ پر اتارتا ہے۔ جب یہ وجدان کی شاخ ثمردار سے خود بخود ٹپکنے پر آمادہ ہو۔ زوبی کے بنائے ہوئے سرورقوں میں جو رعنائی ہے وہ جذبہ و خیال کی رعنائی ہے لیکن یہ رنگوں اور خطوں کے داخل سے ابھرتی ہے اور ناظر کو بے اختیار اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال عرفانہ عزیز کی کتاب "کفِ بہار" کا سرورق ہے۔ اس سرورق کے رنگ "الفاظ کے عمودی اور افقی خطوط اور قوسین اور رحالے ایک سنہری حاشیے سے ابھرتے ہیں، "ف" کا نقطہ نسیم بہار کے اس جھونکے کی عکاسی کرتا ہے کہ جو جرس غنچہ کی صدا پر بے اختیار لپکتا چلا جا رہا ہے۔ "بہار کی "ب" کا نقطہ شگفتن گل کا منظر بھی پیش کرتا ہے اور یہ غنچۂ لب بھی ہے۔ لفظ "بہار" میں "الف" اور "ر" کے عمود آپس میں ہم وصل ہیں لیکن "ر" "مقام وداع" پر قلم کا روپ اختیار کر جاتی ہے۔ لفظ کا بالائی حصہ فضائے بسیط کا ترجمان ہے اور یہ ملگجے ماحول سے تخلیق کی سفید لکیر کو جنم دیتا ہے۔ "کف" اور "بہار" کے درمیان جو کشادہ میدانی فاصلہ ہے وہ سبزۂ نورستہ سے اٹا ہوا ہے اور اس کے نیچے زمانِ ما ہے جس میں بہار کی خوش رنگی نے قیامت برپا کر رکھی ہے۔ اس خوش نظر فضا میں بہار کی "ہ" "درحقیقت حسینۂ بہار کے کان کے بالے کے مترادف ہے اور یہ تزئین و جمال کی علامت بھی ہے اس سرورق میں زوبی نے شوخ رنگ زیادہ استعمال کئے ہیں لیکن واضح رہے کہ فطرت بھی تو بہار میں شوخ رنگوں ہی کی جولا بکھیرتی ہے۔ چنانچہ سرورق کا مجموعی تاثر اس سمعنی کی طرح ہے جس میں موسیقی کے کئی سُر داخلی التفات باہمی سے آپس میں گھل مل جاتے ہیں، اہم بات یہ کہ زوبی نے رنگوں کو بے محابا کاغذ پر نہیں انڈیلا بلکہ ہر رنگ کی انفرادی کیفیت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے اتنی ہوشمندی سے استعمال کیا ہے کہ پورا نقش کفِ بہار نظر آنے لگتا ہے۔ اشفاق احمد کی کتاب "ایک محبت سو افسانے" سے لے کر عرفانہ عزیز کی تصنیف "کفِ بہار" تک زوبی نے شاید سیکڑوں کتابوں اور رسالوں کے سرورق بنائے ہیں۔[ملہ] ترتیب و تاثر کی سیکڑوں نئی کیفیتوں کو جنم دیا ہے۔ اپنے تخلیقی مزاج سے مصنف کے فکر تک رسائی حاصل کی ہے۔ اور یوں کتاب کی روح کو سرورق پر اس طرح مجسّم کر دیا ہے کہ مصنف کی تخلیق سے ملاقات کرنے کے لیے دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ زوبی کے بنائے ہوئے سرورقوں کا یہ امتیازی وصف کسی طرح نظر انداز نہیں ہو سکتا کہ وہ نہ صرف مصنف اور قاری کے درمیان ایک مستقل رابطہ بن جاتا ہے بلکہ اس کے بنائے ہوئے سرورقوں میں مصنف اور مصور دونوں آپس میں گلے ملتے ہوئے بھی محسوس ہوتے ہیں۔

ثمین خان نے لکھا ہے کہ زوبی نے مصوری کی تربیت اس گہوارہ فن میں حاصل کی جسے اٹلی کہتے ہیں۔ زوبی کی تصویریں دیکھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دیارِ مشرق کے اس حساس مصور نے مغرب کے بلوری کنگروں میں اپنے دل کو اٹکنے نہیں دیا۔ ان کے فن میں باریک قلم کا استعمال فراواں ہمیں مغل آرٹ سے زوبی کی گہری وابستگی کی طرف متوجہ کراتا ہے۔ اس کی تصویروں کے دیہاتی موضوعات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اس فن میں پانچ دریاؤں کے پانی اور مٹی نے یکساں امتزاج پیدا کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ موقلم سے بنائی ہوئی تصویروں میں زوبی نے صرف خیال کو ہی سطح پر نہیں اتارا بلکہ اس جذبے کو بھی منقش کیا ہے جو تصویروں کے پیکر میں مسرت اور غم، دکھ اور خوشی، اضطراب اور تحیّر کی مختلف کیفیات پیدا کر رہا ہے اور خالصتہً مشرق کا مزاج فن ہے۔ چنانچہ زوبی کی خطی تصویروں میں حرکت بھی ہے اور حرارت

[ملہ] رسالہ "افکار" کی تزئین اور اس کے سرورقوں کی آرائش میں بھی زوبی کے ذوقِ جمال کا ثبوت ملتا ہے۔ انھوں نے اس رسالے کے متعدد خیال انگیز سرورق بنائے ہیں۔

(انور سدید)

بھی ..۔ یہ انسانی جذبے کی لطیف ترین لہ کو بھی کامیابی سے آنکھ کے راستے ناظر کے دل میں اتار دیتی ہیں۔

اس ضمن میں مجھے زوبی کی وہ تصویر اکثر یاد آتی ہے جس میں ایک نوبیاہتا دیہاتی جوڑا محوِ سفر ہے۔ دولہا ہمہ تن اشتیاق ہے اور دلہن ہمہ تن حجاب۔ لیکن دونوں جذباتی وفور سے مغلوب ۔ اور کسی گوشۂ خلوت کی طرف بے اختیار لپکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ زوبی نے اس بات کا واضح اظہار تو نہیں کیا لیکن دولہا کی مشتاق دمیدہ آنکھیں اور دلہن کی حیا پرور جھکی جھکی نگاہیں اس حقیقت کو آشکار کرتی ہیں کہ دلہن اپنے سسرال کو جا رہی ہے۔ میں جب بھی اس تصویر کو دیکھتا ہوں میری لوحِ دل پر شبنم سی برسنے لگتی ہے حالانکہ زوبی نے اس میں خطوں کے سوا کسی تمازت آمیز رنگ کو استعمال تک نہیں کیا اور سارا تاثر لکیروں سے ہی ابھارا ہے۔

محبوبہ کی ایک مثالی صورت اس کی تصویر "رانجھا" بھی ہے۔ یہ تصویر بادل کے آنچل سے ٹپکا ہوا بارش کا پہلا قطرہ اور مصور کے دیکھے ہوئے خواب کی لطیف سی تعبیر ہے۔ یہ تصویر رانجھے کی ونجلی سے نکلی ہوئی وہ مدھر تان ہے جسے سن کر ہر نوجوان لڑکی بے تاب ہو جاتی ہے۔ زوبی نے اس قسم کی سب تصویروں میں رنگوں کی آمیزش اور آویزش سے احتراز برتا ہے اور گہرائی اور گیرائی لکیروں کی سنگی سے ہی پیدا کی ہے۔ تاہم محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس نے ہیر اور رانجھے کے وجدان تک رسائی حاصل کی اور فضا کو لمحۂ وصال کی مسرت سے لبریز کر دیا۔

زوبی نے اپنی تصویروں میں عورت کے متعدد روپ پیش کئے ہیں لیکن وہ جذبات میں اختلال پیدا کرنے کے بجائے انھیں اعتدال کی راہ دکھاتا ہے۔ اس کی تصویروں میں گھر معاشرتی اکائی کا نمائندہ ہے اور اس وحدت میں ماں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ ماں کا تخلیقی روپ زوبی کے ذہن کے ارگرد ہمہ وقت منڈلاتا رہتا ہے۔ اور یہ روپ اس کی تصویروں میں بار بار ابھرا ہے۔ اس کی تصویروں میں عورتوں کی چھاتیاں مدوّر، صحت مند اور دودھ سے بھری ہوئی ہیں اور بچوں کو ان کی طرف والہانہ انداز میں لپکتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ عورتوں کے چہروں پر طمانیت اور تازگی ہے اور یہ تخلیق کا فریضہ خوش اسلوبی سے انجام دینے اور گھر کی وحدت کو قائم رکھنے کی طمانیت کے سوا اور کچھ نہیں، اس لحاظ سے دیکھئے تو زوبی کا فن معاشرے کو جوڑتا ہے اور انسانیت کے بنیادی تقاضوں میں یقین کامل پیدا کرتا ہے۔

زوبی کی رنگین تصویروں میں رنگوں کی انفرادی حیثیت اکثر اوقات نمایاں نظر آتی ہے مجھے یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک رنگ کو مفرد طور پر استعمال کر کے زوبی اس آہنگ کو ابھار دیتے ہیں جو تصویر کے دوسرے حصوں میں متعدد ہلکے اور لطیف رنگوں کے امتزاج سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مجھے اس کی ایک تصویر کا بالخصوص حوالہ دینا ہے جس میں گہرے نیلے پس منظر سے ایک حیران گھوڑے کو محوِ تحرک دکھایا گیا ہے۔ اس تصویر میں عورت اور مرد کے پیکر تجریدی صورت میں پیش ہوئے ہیں لیکن خطوں اور قوسوں میں ہلکے رنگوں کو اس دلآویزی سے ترتیب دیا گیا ہے کہ تصویر میں مفرد رنگ کا جوکھا بھی بامعنی نظر آنے لگتا ہے۔

ہماری دیہاتی مصوری میں استاد اللہ بخش اور مغل آرٹ میں عبدالرحمان چغتائی کو قد آور مصوروں کی حیثیت حاصل ہے اور یہ ہر نئے مصور پر کسی نہ کسی صورت میں ضرور اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ آذر زوبی کی خوبی یہ ہے کہ اس نے اپنی انفرادیت اپنے فن کے باطن سے پیدا کی ہے۔ اس کی لکیروں اور رنگوں میں وہ چیز موجود ہے جسے بلا تاخیر "آذر زوبیت" کہا جاتا ہے چنانچہ ان کی تصویر دیکھتے ہی ناظر بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ

"یہ آذر زوبی کی تصویر ہے"

مشرقی مصوری میں یہ کمالِ فن بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔

ڈاکٹر منیر الدین احمد

زوبی کے ہاں منٹو سے ملاقات

آذر زوبی کے نام سے میں اس وقت سے واقف ہوں، جب میں محض طفلِ مکتب تھا اور وہ ملک کے ایک بڑے آرٹسٹ کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ میرے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی تھی کہ کسی روز وہ مجھے اپنے دولت کدہ پر آنے کی دعوت دیں گے۔ عمر کا ایک بڑا حصہ جرمنی میں گزارنے کے نتیجے میں خواہش کے باوجود میری ملاقات بعض قابلِ قدر ہستیوں کے ساتھ نہیں ہو پائی۔ اگرچہ یہ بھی ہوا ہے کہ بعض ادیبوں، شاعروں اور آرٹسٹوں کے ساتھ محض اس وجہ سے ملاقات ہو سکی کہ وہ اپنے کسی سفر کے دوران ہمبرگ تشریف لائے اور ہماری مہمان نوازی کو قبول کیا۔ ان لوگوں میں مرحوم ابن انشا بھی شامل تھے جن کے ہمراہ مجھے دسمبر ۱۹۷۱ء میں دو گھنٹے ٹیلی ویژن ٹاور کے ریستوران میں گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ احمد ندیم قاسمی، فتح محمد ملک، صہبا لکھنوی، پروین شاکر، صدیقہ بیگم، آصف فرخی اور دوسرے ادیبوں نے ہمیں شرفِ مہمان نوازی بخشا۔ صادقین اپنے بیٹے کی بیماری کے سلسلے میں تشریف لائے اور ان کے ساتھ تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔ مگر آذر زوبی کبھی ہمبرگ نہیں آئے اور میری ملاقات ان کے ساتھ کراچی میں ہوئی اور وہ بھی ان کی دعوت

پر۔ اس سے قبل ایک ایسا اتفاق مجھے فیض احمد فیض کے ساتھ ہو چکا تھا۔ اپریل ۱۹۷۳ء میں اسلام آباد میں بین الاقوامی ہسٹری کانفرنس کے موقع پر میں نے شرکت کی تو ایک روز کسی دوست کے ہاتھ یہ پیغام ملا کر فیض نے مجھے اپنے دولت کدہ پر آنے کی دعوت دی ہے۔ دراصل ان کے کانوں تک یہ بات پہنچی تھی کہ میں جرمن شاعر اور ڈرامہ نویس برتھولٹ برشٹ کی نظموں کو اردو میں ڈھال رہا تھا اور وہ مجھ سے ان تراجم کو سننا چاہتے تھے۔

نومبر ۱۹۸۳ء میں مجھے پاکستان کے سفر کے دوران کراچی میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر جرمن ادب پر ایک تقریر کرنا تھی۔ تقریر کے بعد محمد علی صدیقی نے آذر زدبی کا پیغام دیا کہ وہ خود دل کے عارضے کے سبب کار نہیں چلاتے اور ان کی اہلیہ موجود نہیں ہیں جو انھیں مقامِ تقریر پر پہنچا سکتیں۔ اس لیے وہ تو نہیں آسکے، البتہ انھوں نے مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی ہے۔ میرے لیے اس سے بڑی عزت افزائی بھلا کیا ہو سکتی تھی۔ ہم رات دس بجے کے لگ بھگ ان کے ہاں پہنچے تو وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اس قدر بے تکلفی سے ملے، جیسے ہماری دوستی صدیوں سے ہو۔

ان کا اسٹوڈیو اوپر سے نیچے تک تصویروں، سکیچوں اور مجسمہ سازی کے بہترین نمونوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے ان کے کئی ایک فن پارے دیکھ رکھے تھے، مگر اس رات جو چیزیں دیکھنے میں آئیں وہ میرے اندازے اور توقع سے کہیں بڑھ کر تھیں۔ مثلاً مجھے علم نہ تھا کہ انھوں نے بھی خطّاطی کو اپنے فن پاروں میں ایک ممتاز جگہ دے رکھی تھی۔ سب سے زیادہ جس پینٹنگ نے مجھے محوِ حیرت کر دیا وہ ایک چھے فٹ اونچی اور بیس فٹ لمبی تصویر تھی جس میں ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کے روز ملک بھر میں ہندوستان کے پاکستان پر حملے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جوش و خروش اور ولولے کو نقش کر دیا گیا ہے۔ میں نے ایسی تصویریں چینی آرٹ کی دیکھی ہوئی ہیں۔ جن میں ملک کے اہم تاریخی واقعات یا کسی علاقے کی تقریبات، لوگوں کے رہن سہن اور حالکان وقت کی زندگی کو پیش کیا جاتا ہے۔ مگر اس روز تک مجھے پتہ نہ تھا کہ آذر زدبی نے شاعروں، ادیبوں اور خطیبوں کے پہلو بہ پہلو قومی ہلچل اور امنگ آزادی کو اپنی شاہکار تصویر میں محفوظ کر کے ملک و قوم کے جہاد میں برابر کا حصّہ لیا ہے۔ یہ تصویر جس میں ملک کے ہر علاقے، مختلف عمروں اور پیشوں کے لوگوں کے اندر پیدا ہونے والے ولولے اور شوقِ شہادت کو دکھایا گیا ہے، اس قابل ہے کہ اسے ملک کے کسی نمائندہ میوزیم یا آرٹ گیلری میں جگہ دی جائے۔ آذر زدبی نے بتایا کہ انھیں امریکن ماہرین بار بار ہزار ہا ڈالر کی رقم پیش کر چکے ہیں۔ مگر ان کا پختہ ارادہ ہے کہ تصویر کو ملک کے اندر کسی مناسب جگہ پر رکھا جائے۔

آذر زدبی کی سعادت حسن منٹو کے ساتھ دوستی کو ہر کوئی جانتا ہے۔ افسانہ نگار ہونے کے ناتے میری دلچسپی منٹو میں شروع سے رہی ہے۔ میں نے اس کے افسانوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ زمانہ بدلنے کے ساتھ موضوعات تبدیل ہوتے رہتے ہیں، مگر منٹو کی تکنیک ہمیشہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہے گی۔ چیزوں کے پس منظر میں دیکھنا، کہانی کے اندر کہانی پیدا کرنا، پلاٹ کی بنت و ساخت اور کرداروں کے حرکات و سکنات میں معانی پیدا کرنا منٹو کے فن کا خاص پہلو ہے۔ کرافٹ اسٹوری، جس کو آج کے نقاد رد کرنے پر تلے ہوئے ہیں، وہی چیز منٹو کے افسانوں کی خاص پہچان بنتی ہے۔ اس کے پلاٹ کی بنت اتنی مہارت سے تیار ہوتی ہے کہ کہانی کی کوئی چول ڈھیلی نہیں ہوتی۔ آج جب میں منٹو کے افسانوں کو پڑھتا ہوں (میں ان دنوں اس کے افسانوں کا انتخاب جرمن زبان میں ترجمہ کرنے کی خاطر کر رہا ہوں، جو انشاء اللہ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی جرمن کتاب کے چھپنے کے بعد میری اگلی کتاب ہو گی) تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس کے ہاں توانا کہانیوں کی مقدار

اکٹر میرالدین احمد

ں کے ہم عصروں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ منٹو کو آخری دنوں میں اس کی بسیار نویسی لے ڈوبی۔

منٹو کے آخری دنوں کے گواہ زوبی ہیں جو نقشہ انھوں نے ہماری ملاقات کے وقت ان دنوں کا کھینچا، اس کا ذکر منٹو کی داستان
یات کے ضمن میں دوسری جگہوں پر بھی آچکا ہے۔ مگر زوبی کی زبانی ان دنوں کی سرگزشت کا سننا میرے لیے حاصل ملاقات ثابت ہوا ر
، اس گفتگو کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں تا کہ قارئین کے سامنے زوبی کی زندگی کا یہ پہلو، جو اردو ادب کی تاریخ میں جگہ پانے کا مستحق
ہے، چھپا نہ رہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے، جب منٹو کی بسیار نوشی تمام حدود کو توڑ چکی تھی اور اس کی زندگی کا ڈراما تیزی کے ساتھ آخری
یلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان دنوں منٹو نے بے تحاشا لکھا۔ ہر روز ایک افسانہ تو اس کا معمول بن چکا تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ زود
ویسی جس پر اسے فخر تھا، اس کے ادب کے لیے زہر ہلاہل ثابت ہوئی۔ میں نے منٹو کے بارے میں کہیں پڑھا تھا کہ اس نے اپنے ملاقاتیوں سے
اکہ تم پہلا فقرہ لکھوا دو میں باقی کہانی مکمل کر دوں گا۔ کم از کم ایک ایسی کہانی کا سراغ لگایا گیا ہے جس کا پہلا فقرہ ایک لڑکی کا تجویز کردہ تھا۔

زوبی نے منٹو کے ان ایام کی جو تصویر کھینچی وہ ایک ایسے شخص کی تھی جو کھلی آنکھوں کے ساتھ اپنی تباہی کی جانب رواں تھا۔ وہ
رسے نکلنے سے پہلے افسانہ لکھتا تھا۔ اسے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے سڑک پر قدم دھرتا تھا، تانگہ پکڑتا تھا۔ رستے میں تانگے والے سے
گریٹوں کی دوکان پر رکنے کو کہتا تھا اور اسے قینچی مارکہ ڈبیہ اور ماچس لانے کے لیے بھیجتا تھا۔ تانگہ بان اپنی جیب سے پیسے ادا کر کے
گرٹ لا کر دیتا تھا۔ اب تانگہ اردو بازار میں چوہدری برکت علی یا چوہدری نذیر احمد کی دوکان کے سامنے جا کر رکتا تھا۔ منٹو افسانے
مسودہ تانگے میں بیٹھے بیٹھے لہراتا تھا اور کہتا تھا کہ لینا ہو تو پیسے بھیج دو۔ تانگے والا مسودہ لے کر چوہدری حضرات کے حوالے کرتا اور
بیس روپے لا کر منٹو کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔ اب تانگے کا رخ شراب خانے کی طرف ہوتا تھا جہاں سے ادھا خریدا جاتا تھا اور تانگہ
زر زوبی کے اسٹوڈیو کے سامنے جا کر ٹھہرتا تھا۔ منٹو تانگے والے کو انتظار کرنے کے لیے کہتا تھا اور آذر کے پاس جا کر بیٹھ جاتا
تھا۔ آدھ پون گھنٹے میں اسے یاد آتا تھا کہ تانگے والا انتظار کر رہا ہے۔ وہ آذر سے کہتا تھا کہ جاؤ تانگے والے کو رخصت کر دو۔
یچارا مجھ سے میرے ساتھ پھنسا ہوا ہے۔ آذر جا کر تانگے کی اجرت اور سگرٹوں کے پیسے ادا کر دیتا تھا۔ جب ادھا ختم ہو جاتا تھا
و منٹو کہتا تھا، چلو کسی اور جگہ چلتے ہیں۔ دونوں وہاں سے نکلتے تھے اور دوسرے خانے میں جا بیٹھتے تھے، جہاں سے رات گئے اپنے اپنے
ھروں کو لوٹتے تھے۔ اگلے روز پھر وہی معمول۔ شام ہونے تک منٹو کی دن بھر کی کمائی ختم ہو چکی ہوتی تھی اور اگلے روز پھر وہ
ھر سے خالی جیب لے کر افسانے کا مسودہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے نکلتا تھا۔

منٹو کی داستان نے مجھے اس قدر غمگین کر دیا کہ باقی باتیں، جو ہم صبح کے دو بجے تک بیٹھے کرتے رہے، میرے ذہن میں محفوظ نہ
ہ سکیں۔ آذر زوبی کے پاس منٹو کے کئی افسانوں کے مسودے محفوظ ہیں جو اب تک شائع نہیں ہوئے۔ پچھلے دنوں سنا تھا کہ بلراج مینرا
زوبی سے ان افسانوں کی نقلیں لے کر گیا ہے اور انھیں چھاپنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس عظیم افسانہ نگار کی زندگی اور اس کی جوانی
ی موت اردو ادب کے لیے ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ منٹو کی زندگی میں اسے فحش نگار کہا گیا، اس کی کتابوں پر پابندیاں لگیں اور
س پر مقدمے چلے، آج اگر آپ بازار میں منٹو کے افسانوں کے مجموعے خریدنے جائیں تو بمشکل دو تین کتابیں پائیں گے۔ سالہا سال کی جدوجہد
کے باوجود مجھے اب تک اس کی ساری کتابیں حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔

میں اس رات آذر زوبی سے ملنے گیا تھا اور منٹو سے ملاقات کر کے اٹھا تھا۔ (رہبر گسلے) ۔۔

نذرِ زوبی

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا (غالب)

آذر زوبی

نذرِ دہلی
ے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
ب جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا (غالب)
آزر زوبی

نذرِ روبی

آزرزو

پاک سرزمین شاد باد

نذرِ زوبی

نذرِ زوبی

آذرزوبی

نذرِ زوبی

سیلابِ غم

آزرز

آزر زوبی

آذر زوبی کا فن

سحر انصاری

شاعری کی طرح مصوّری کی بھی ایک زبان ہوتی ہے۔ اس زبان کا اظہار خطوط اور رنگ و آہنگ کے ذریعے ہوتا ہے جسے مظاہرِ فطرت کی ترجمانی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی میں علامات اور داخلی کیفیات اپنے لیے جگہ بنا لیتی ہیں۔ ہمارے یہاں مصوّری کی روایت خاصی قدیم ہے۔ جمالیاتی ذوق کے اظہار کے لیے فنِ تعمیر، نقاشی، خطاطی، اور مجسمہ سازی کے نمونے بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ہر عہد میں ہمارے فن کار اپنے اسالیب کی انفرادیت پر زور دیتے رہے ہیں۔

اپنے عہد کے ایک ممتاز مصوّر، مجسّمہ ساز اور خطّاط و نقّاش آذر زوبی کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے یہ خیالات ذہن میں نمایاں ہو گئے۔ اس سلسلے کو اگر آگے بڑھایا جائے تو برِّصغیر پاک و ہند میں مصوّری کی روایت، ارتقا، اور مختلف دبستانوں کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بیرونی اثرات اور تحریکات کا جائزہ لے کر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ خود آذر زوبی کس مکتبِ مصوّری سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن مجھے ڈر ہے یہ سارا سلسلہ بڑا کتابی اور اکتسابی سا ہو جائے گا۔ اس کی اپنی ایک اہمیت ضرور ہے لیکن چونکہ آذر زوبی اپنی عام زندگی، نشست و برخاست اور فن کی جملہ جہات کے اظہار میں کبھی کتابی، نصابی یا اکتسابی نہیں رہے اس لیے

ان کے فن اور شخصیت پر لکھتے ہوئے اس پیرائے سے گریز ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

آذرزوبی سے میں بہت قریب بھی نہیں رہا اور بہت دور بھی نہیں۔ ان کی من موہنی شخصیت سے میں ۱۹۵۶ء میں متعارف ہوا تھا جب وہ "شعور" نکالتے تھے اور "بڑا ادب چھوٹی کتاب" کے تحت منٹو، عصمت چغتائی اور کرشن چندر کی کہانیاں خوبصورت ٹائپ میں چھاپ رہے تھے۔ اور ان کی شائع کردہ افسانے کی ہر کتاب ایک تعویذ ادب کا درجہ حاصل کرتی جا رہی تھی۔ "شعور" کی ترتیب پروفیسر مجتبیٰ حسین کے ذمے تھی، اور تزئین آذرزوبی کرتے تھے۔ ہمارے بیشتر مصوّر ادب سے گریزاں نظر آتے ہیں اور ادب کو موضوع بنا کر مصوّری یا مجسّمہ سازی کرنے والوں کو مصوّر نہیں بلکہ تصویر ساز کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس طرح ایسے مصوّر خود کو "طبقہ اولیٰ" یا ELITE میں شمار کر لیتے ہوں مگر جب میں ان کی تخلیقی فطانت کو اس تناظر میں دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے پردے میں ان کا جہل نمایاں نظر آتا ہے۔ آذرزوبی ادب و شعر، تاریخ و فلسفہ کے بھی اتنے ہی دلدادہ ہیں جتنے مصوّری، خطّاطی اور مجسّمہ سازی کے۔ اس طرح ان کی شخصیت اور فن میں تخلیقی ثروت پیدا ہو گئی ہے وہ ایک پرت کے آرٹسٹ نہیں معلوم ہوتے۔ یہ انفرادیت آذرزوبی کا ایک اثاثہ اور ان کے فن کی پہچان ہے۔

آذرزوبی کو میں نے ہمیشہ ایک درد مند، مخلص انسان پایا۔ وہ یاروں کے یار اور قلندر منش ہیں۔ حاضر جوابی اور بذلہ سنجی ان کی شخصیت کا ایک اضافی پہلو ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس قدر "تیز" ہونے کے باوجود اہانت یا دل آزاری کے مرتکب نہیں ہوتے۔ ان سے مل کر ہمیشہ ایک تازگی اور زندہ دوستی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ دھیمے دھیمے، میٹھے میٹھے انداز میں بات کرتے ہیں خود ستائی سے بھاگتے ہیں اور اگر کوئی ان کے اوصاف بیان کرنے لگے یا فن کو سراہنے لگے تو اس قدر پختہ خیالی کے باوصف شرما جائیں گے اور نظریں نیچی کیے اس طرح مسکرائیں گے جیسے کہہ رہے ہوں "یار بہت دیر ہو گئی۔ کوئی اور بات کرو" اور خود ہی کوئی انتہائی غیر متعلق بات شروع کر دیں گے مثلاً راجا رنجیت سنگھ کے عہد حکومت پر روشنی ڈالنے لگیں گے۔

آذرزوبی ایک خود ساختہ انسان ہیں۔ انھوں نے زندگی کے سارے موسموں کا ذائقہ خود ہی چکھا ہے۔ سنی سنائی باتوں پر ان کے فن کا دار و مدار نہیں ہے۔ وہ مشرق و مغرب کے تمام دبستانوں سے آگاہی رکھتے ہیں۔ بیشتر اہم مصوّروں اور آرٹ کے ناقدین سے ان کے ذاتی مراسم رہے ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں میں بھی ایک وسیع حلقہ ان کے مدّاحین میں شامل ہے لیکن آذرزوبی نے نہ کبھی یہ تذکرہ کیا کہ میں اس سے متاثر ہوا، اس سے یہ سیکھا، وہاں یہ اعزاز حاصل کیا۔ بلکہ جب بھی کسی کے بارے میں بات کی اسی کی شخصیت کے رنگ ابھارتے رہے۔

فن کے حوالے سے آذرزوبی ایک ان تھک اور زرخیز ذہن کے مالک ہیں۔ انھوں نے ہر ذریعۂ اظہار میں اپنی تخلیقی اور فن کارانہ دانش کا عکس پیش کیا ہے۔ رنگ، روشنائی، قلم اور موئے قلم کے ساتھ مٹی، پتھر، لکڑی اور دھات میں ان کا کام اپنی ایک الگ جہت رکھتا ہے۔ مصوری کو خطّاطی سے ہم آہنگ کر کے اس اسلوبِ جدید کی بنا آذرزوبی نے رکھی ہے۔ ان کی خطّاطی میں خطوط کا آہنگ اور روانی ایک منفرد وصف ہے جو شاذ ہی نظر آتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے فن کو طرزِ حیات سے وابستہ کر دیا ہے۔ ان کی مصوّرانہ صلاحیتوں کے سارے پیرائے اس وقت یکجا ہو جاتے ہیں جب وہ کسی عمارت کی اندرونی اور بیرونی آرائش و تزئین کا کام کر رہے ہوں۔ ان کے ہمہ جہت ہونے کے ثبوت قدم قدم پر ملتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ آذرزوبی کا ذہن خود ایک نگار خانہ ہے جس کا ایک عکس اپنے تنوع اور بوقلمونی کے ساتھ ہمیں عالمِ ظاہر میں دکھائی دے رہا ہے۔

آذرزوبی نے ایک دن باتوں باتوں میں کہا کہ تصویر یا پینٹنگ کا بڑا تعلق مصوّر کے وجدان سے ہوتا ہے۔ اکتسابی چیزیں

بعض اوقات دھوکا دے جاتی ہیں۔ اس کی مثال انھوں نے یوں پیش کی کہ کبھی کبھار ہم کوئی تصویر بناتے ہیں۔ پیمائش، خطوط کے تناظر، رنگوں کی آمیزش اور مصوّرانہ چابکدستی کے سارے زاویے اس میں ٹھیک ٹھیک اور مصوری کی گرامر کے عین مطابق ہوتے ہیں لیکن جب ہم اس پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجموعی اعتبار سے، اپنی کلّیت میں اپنی TOTALITY میں پینٹنگ نہیں ہے۔ بس یہیں مصوّری کے میکانکی رویّوں کی پول کھل جاتی ہے۔ آذر زوبی کا زیادہ اصرار ہر فن پارے کی مجموعی کیفیت اور مجموعی تاثر پر ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے میں نے ان کی انفرادی تصویروں کو بھی دیکھا ہے اور اقبال کے "شکوہ جوابِ شکوہ" جیسی طویل سلسلہ وار تصاویر کے مجموعے کو بھی۔

زوبی کی ایک پینٹنگ ہے جس میں ایک ملنگ اک تارا لیے وجد کی کیفیت میں محوِ رقص ہے اور ساتھ ہی ایک عورت بھی اسی کیفیت کا حصّہ بنی ہوئی دھمال کر رہی ہے۔ یہ رقص والہانہ ایک روحانی تجربے کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ بے خودی، بے نیازی، گم شدگی اور محویت کو رنگوں اور خطوں کی گرفت میں لے کر ایک شاہکار تخلیق کر دیا گیا ہے۔ زوبی کی اس تصویر کو میں جب بھی دیکھتا ہوں مجھے مولانا روم کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے ؎

یک دست جامِ بادہ و یک دست زلفِ یار
رقصے چنیں میانۂ میدانم آرزوست

آذر زوبی کے فن کی جہات حقیقت پسندانہ ہوتی ہیں۔ ان تصویروں اور مجسّموں میں بھی جو تجریدی خطوط اور تجریدی اشکال سے تکمیل پاتی ہیں ان کا سماجی شعور برابر کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ ارضی اور انسانی رشتوں سے اپنے فن کے لیے تخلیقی توانائی حاصل کرتے ہیں۔ ماں اور بچّہ ان کی مصوّری اور مجسّمہ سازی کا ایک مستقل موضوع ہے جو ہر دور میں زوبی کے مصوّرانہ موڈ کے مطابق ظاہر ہوتا رہا ہے۔ اس میں آذر زوبی تخلیق کے بنیادی تصوّر کو بار بار پیش کرتے ہیں تاکہ زندگی کی ایک بڑی نامیاتی حقیقت اپنے پیرایے ظاہر کرتی رہے۔

آذر زوبی نے تجریدی مصوّری بھی کی ہے لیکن انسانی شکلوں اور جسموں کو کبھی مسخ نہیں کیا۔ ان کے مصوّرانہ شعور کی بنیاد ہی ان کے اس طرزِ اظہار پر ہے کہ وہ اپنے سارے کرداروں کو تندرست اور صحت مند پیش کریں گے۔ ماں، باپ، بچّہ، کسان، مزدور سب تندرست اور صحت مند ہوتے ہیں تاکہ دیکھنے والے کو خود بھی زندگی کا صحت مندانہ زاویہ نظر آئے اور اس پریشان حال اور آشوب زدہ معاشرے میں بیمار ذہنیت یا MORBIDITY کی جڑیں مضبوط نہ ہوں۔ یہی آذر زوبی کا پیغام ہے اور یہی مقصدِ فن۔

آذر زوبی نے بعض یادگار "میورل" بھی بنائے ہیں۔ انھوں نے پاکستان کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی تاریخ کے مرقعے بھی تیار کیے ہیں جو ان کے بنیادی تخلیقی شعور کا ایک حصّہ ہیں۔ ہمارے ہاں مصوّروں کو ایسی انفرادیت کم ہی نصیب ہوئی ہے کہ عوام و خواص ایک نظر میں ان کے مخصوص اسلوب کو پہچان کر کہہ اٹھیں کہ یہ تصویر تو فلاں مصوّر نے بنائی ہے۔ چغتائی، عسکری اور صادقین کی طرح آذر زوبی کے فن پارے بھی اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں اور ان کے دستخط اس فن پارے پر ہوں یا نہ ہوں آن کے فن سے مس رکھنے والا فوراً پہچان لیتا ہے کہ یہ آذر زوبی کی تخلیق ہے۔ یہ خصوصیت کم اہم نہیں ہے۔

جنسی جمالیات فنِ مصوّری کا ایک اہم پہلو ہے جس کے بغیر بڑے مصوّروں کی فنی دسترس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔

کیوں کہ زندگی کے عام تجربے کو ایک جمالیاتی تجربے میں ڈھال دینا اور ایک ART-FORM میں بدل دینا وہ کمال ہے جس کی پرکھ سے ہی کسی آرٹسٹ کے جمالیاتی وصف کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ جنسی جمالیات میں ذرا سی بدسلیقگی ابتذال کا سبب بن سکتی ہے۔ اس ضمن میں بھی آذر زیدی کو فن کا مانہ دسترس حاصل ہے۔ ان کی بے لباس تصویریں اور مجسمے کسی قسم کے غیر صحت مندانہ محرکات کا سبب نہیں بنتے۔ اس طرح آذر زیدی کی سماجی زندگی سے وابستگی ایک نوع کی تکمیلیت کا احساس دلاتی ہے۔

دورِ جدید کی مصوّری پر بھی فنونِ لطیفہ کے دیگر شعبوں کی طرح نفسیات کے مختلف نظریوں اور دبستانوں کا اثر پڑا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی اور انسانی معاشرے میں پھیلنے والے مثبت و منفی رویّے اور رجحانات نے زندگی کو دشوار اور پیچیدہ بنا دیا ہے۔ آذر زیدی کو بھی اس کا احساس ہے لیکن وہ اپنے فن میں مشکل سے آسان اور پیچیدہ سے سادہ کی طرف سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ شاید اس نقطۂ نظر کے قائل ہیں کہ

"آلامِ روزگار کو آسان بنا دیا"

فن کی دسترس اور تکمیلیت کی یہ کون سی منزل ہے اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جو ریاضت کو بے ساختگی اور اکتساب کو وجدان کی سطح تک لانے کا ہنر جانتے ہیں۔ انسانی ذہن کی تحت الشعوری تہوں اور خوابوں کی دنیا کی نیم حقیقی، نیم تجریدی علامتوں سے آذر زیدی کے فن کو سروکار نہیں ہے۔ ان کے فن کا تجریدی رویّہ بھی زندگی کے حقیقی موضوعات سے قریب تر رہتا ہے۔

جدید آرٹ کی دنیا اس اعتبار سے بہت دلچسپ رہی ہے کہ اس میں بڑے بڑے آرٹسٹوں نے اپنی شخصیت، وضع قطع اور اسلوبِ مصوّری سے خاصی سنسنی خیزی کی ہے۔ ان میں سب سے دلچسپ اور سنسنی خیز شخصیت ہسپانوی مصور سلوا دور دال (SALVADOR DALI) کی تھی جن کا پچھلے دنوں ۸۴ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ وہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر بچھو کے ڈنک کی طرح ابھارے رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ میرے تخلیقی وجدان کا "اینٹینا" ہیں۔ کیٹلانی زبان میں "دال" کے معنی آرزو یا خواہش کے ہیں۔ انھیں ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ انھیں جدید مصوّری کے نجات دہندہ کے نام سے موسوم کیا جائے۔ وہ اپنی ہیلبی اور مضحک حرکات ڈرامائی تراکیب میں برنارڈ شا سے بھی کئی بات آگے تھے۔ انھوں نے خود کو ایک "جینئس" کہا اور ایک دلچسپ کتاب "ایک جینئس کی ڈائری" تحریر کی جس سے ان کے معتقداتِ فن تک رسائی ہو سکتی ہے۔

اگرچہ آذر زیدی روم میں بھی رہے، فرانس اور یورپ کے دیگر ممالک کے ماحول کو بھی قریب سے دیکھا۔ پکاسو اور دال کی عظمت کے قائل ہیں لیکن اپنے بیشتر معاصرین کے برخلاف ان کی وضع قطع کبھی "ایب نارمل" یا سنسنی خیز نہیں رہی۔ وہ فن کے بارے میں ایک سنجیدہ رویہ رکھتے ہیں۔ فن ان کے لیے عبادت کے مترادف ہے اس لیے وہ اسے فیشن یا ڈرامائی ہتھکنڈوں کے ذریعے "غارت" نہیں کرنا چاہتے۔ وہ صاف، ستھرے، صحت مند انسان ہیں جن کی سوچ آج کے مردم بیزار فلسفوں یا تنہائی کی وجودی تعبیروں سے یکسر آزاد ہے اور اسی کا عکس ان کی تصاویر اور سہ ابعادی مصوّرانہ خطّاطی میں ملتا ہے۔

جدید مصوّری کو انسان اور فطرت کے علامتی اور اظہاریاتی حوالوں سے جو نئی جہات حاصل ہوئی ہیں ان میں انفرادی خلاقی کے نادر نمونے سیزان، وان گو، گاگن، میتیسے، پکاسو، کانڈنسکی، سلوا دور دال اور ٹیرنش کے مختلف اور متنوع اسالیب میں ملتے ہیں۔ اسی طرح مجسمہ سازی میں راڈین، ہنری مور، ایپسٹین اور باربرا ہیپورتھ نے نئے نئے تجربات کیے اور اس

قول کو عملی پیراکوں کے ذریعے ثابت کیا کہ "آرٹ اصولوں کا نہیں بلکہ سراسر تجربے کا معاملہ ہے"۔

آذر زوبی کے پیشِ نظر مصوّری اور مجسمہ سازی کی تاریخ اور اس کا ارتقا رہا ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ وہ پانچویں دہائی سے اب تک مصوّری، خطاطی، مجسمّہ سازی اور فنِ تزئین و آرائش کے استاد بھی رہے ہیں۔ ان کے کئی ایک قابلِ ذکر شاگرد ہیں جو اب بجائے خود استاد کا درجہ حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ زوبی نے ان سب میلانات سے گزر کر اپنا ایک اسلوب وضع کیا اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پانچویں دہائی کے شروع ہی میں طرزِ زوبی کے نقوش کا تعین ہو چکا تھا اور وہ اس میں پختگی اور سہولت پیدا کر کے اس منزل تک اپنے فن کو لے آئے ہیں تو ان کے مصوّرانہ شعور کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ آذر زوبی کے فن میں آہنگ، روانی، حرکت اور غنائیت کا عنصر اس قدر نمایاں اور غیر معمولی ہے کہ اس کو مجموعی طور پر اپنے فن میں اس طرح پیش کرنے میں ان کا کوئی معاصر ان کی ہمسری کا دعوا نہیں کر سکتا۔ لکیروں اور رنگوں کی یہ غنائیت ان کے تمام فن پاروں میں بلا استثنٰی نظر آتی ہے جو بلاشبہ ایک غیر معمولی خوبی کا درجہ رکھتی ہے۔

ٹالسٹائی نے اپنی مشہور کتاب "فن کیا ہے؟" میں جمالیات کے مختلف عالمی نظریات سے سیر حاصل بحث کے بعد کہا ہے کہ آرٹ ایک ایسا انسانی عمل ہے جو دوسروں تک اعلیٰ ترین اور بہترین محسوساتِ انسانی کی ترسیل کرتا ہے اور اس کا مرکز و محور محض حظّ و مسرّت ہی نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ طبقۂ اشرافیہ کا خیال ہے بلکہ حقیقی آرٹ وہ ہے جس میں تمام انسانیت اور تمام طبقات کے لیے کشش ہو۔ اسی کو ٹالسٹائی نے آفاقی فن کہا ہے۔

آذر زوبی اپنے ماحول اور مقامی علامتوں کے ساتھ، اپنی تہذیبی شناخت کے ہمراہ، اپنے فن کو آفاقی بنا رہے ہیں یہی ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا سبب ہے۔ وہ گوشہ گیر ہوتے ہوئے بھی اپنے پسند کرنے والوں کا ایک ملک گیر حلقہ رکھتے ہیں اور جب کبھی عالمی سطح پر پاکستانی مصوّری کی نمائندگی کا سوال اٹھتا ہے تو آذر زوبی کے فن کی بھی ان کے مقام و مرتبے کے مطابق پذیرائی کی جاتی ہے۔

میں زوبی کے فن سے ایک سال پہلے متعارف ہوا۔ تب سے میرے یہاں زوبی کی عزّت و توقیر میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ آج مجھے "بے ہیئت کی ہیئت" والی دنیا سے اپنے تعلقِ خاطر کی تجدید کر کے حقیقی خوشی حاصل ہوئی ہے۔

۷ ار ستمبر ۱۹۵۴ء —————— سیّد سعید جعفری

ایک ہمدرد دوست
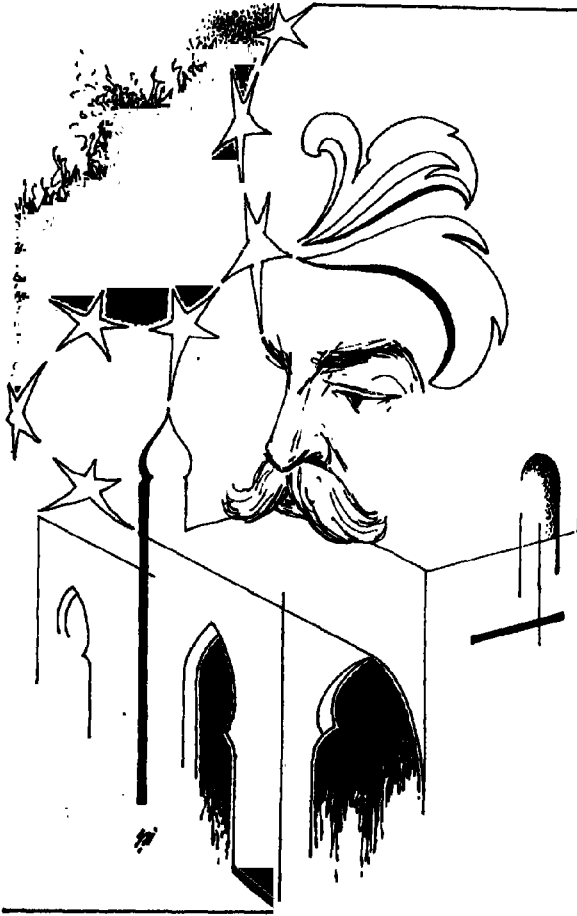
اختر مرزا

۱۹۵۲ء میں سیالکوٹ سے لاہور آیا تاکہ زوبی آرٹسٹ کو مل سکوں۔ چند دوست اور بھی لاہور کی سیر کو آ رہے تھے لہٰذا میں بھی اُن کے ساتھ لاہور آیا۔ مال روڈ پر شیزان ہوٹل کے قریب اِن کا اسٹوڈیو تھا۔ ہم سب دوست ان کے اسٹوڈیو جا پہنچے۔ اس لمبے سے کمرے میں جا بجا بُت پڑے ہوئے تھے جن میں مشہور شاعر اور ادیبوں کے سروں کے ڈھانچے تھے۔ ان خاموش چہروں کو میں بہ آسانی پہچان رہا تھا۔ احمد ندیم قاسمی۔ فیض احمد فیض۔ جسٹس رحمان۔ ظہیر کاشمیری وغیرہ کو میں بغور دیکھتا رہا اور زوبی صاحب ہم سب لڑکوں کو نہ تو کوئی اہمیت دے رہے تھے اور نہ ہی انھوں نے اپنی توجہ ہماری طرف دلوائی۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی بڑی بڑی تصاویر کو دیواروں پہ چند ترکھانوں کے ساتھ آویزاں کرنے میں مصروف تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک لڑکے نے ان سے باتوں کا سلسلہ چھیڑا تو وہ اپنا کام چھوڑ کر ہم سب کے پاس آ گئے اور دیر تک اپنی تصاویر اور مجسموں کے بارے میں بتاتے رہے۔ اُن دنوں اُن کے فن پارے نقوش میں اکثر نمودار ہوا کرتے تھے۔ پین ڈرائنگ میں انسانی ڈھانچے سر جھکائے پتھروں کی صورت میں وسیع میدانوں میں سنگِ میل بنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اِن تصاویر میں

ایک جدت تھی اور یہ ایک آرٹسٹ کی انفرادی حیثیت کی ترجمانی کرتی تھیں۔ میں نے زوبی کو نقوش کے سرورق سے ہی پہچانا تھا اور اسی لیے میرے دل میں خواہش تھی کہ میں انھیں مل سکوں۔ لہٰذا اُس روز میں انھیں دیکھ رہا تھا اور ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ لیکن میں نے اُن سے کوئی بات نہ کی اور گھنٹہ بھر ان کے اسٹوڈیو میں رہنے کے بعد شام کو واپس سیالکوٹ چلا آیا۔

۱۹۵۶ء میں مستقل رہائش اختیار کرنے کے لیے لاہور آ گیا۔ اس سے پہلے زوبی اپنا اسٹوڈیو بند کر کے کہیں چلے گئے تھے۔ پتہ چلا کہ وہ کراچی گئے اور پھر بعد میں اٹلی جا چکے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں کراچی سے ایک رسالہ شعور نکلا۔ دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ شعور ایک آرٹ کا نمونہ تھا اس کا ایک ایک صفحہ دید کے قابل تھا۔ بڑے پیارے سجایا گیا تھا۔ بڑے پیارے چھاپا گیا تھا اور بڑے ہی پیارے مضامین۔ افسانے اور غزلیں شریک اشاعت تھیں۔ دوسرے ماہ پھر شعور خریدا اور اب تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے زوبی صاحب کو خط لکھا کہ آپ ضرور VIRGO اسٹار یعنی سنبلہ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ اس خط کے ساتھ میں نے زوبی صاحب کو ایک کتاب بھیج دی جس کا نام تھا VIRGO BABY میں چونکہ خود سنبلہ کی پیدائش ہوں لہٰذا شعور کو دیکھ کر اور زوبی کے آرٹ کو قدرے پرکھتے ہوئے میں نے یہ حرکت کر ڈالی۔ چند روز بعد زوبی صاحب کا خط ملا جس میں انھوں نے حیرانگی ظاہر کی کہ اگر واقعی شعور کو دیکھ کر آپ نے اندازہ لگایا ہے کہ میں VIRGO یا سنبلہ کی پیدائش ہوں تو آپ کا اندازہ درست ہے۔ میری پیدائش ۸ ۲ اگست کی ہے۔ بہر کیف میں آپ کے ذہن کی داد دیتا ہوں۔

اس خط کے چند ماہ بعد مجھے کراچی جانے کا موقع ملا۔ کراچی پہنچ کر میں دوسرے روز زوبی صاحب کے ہاں اُن کے دفتر جا پہنچا۔ وہ اندر ایک چھوٹے سے ٹیبل پر بیٹھے چائے پی رہے تھے اور شعور کا مسودہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنا تعارف کروایا تو انھوں نے تھوڑی دیر کے لیے سوچا پھر مسکرا دیے اور بولے "آیئے تشریف رکھیے۔ جی میں ہی VIRGO BABY ہوں۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ یہ کوئی گیارہ بجے کا وقت تھا اور جب باتیں ختم ہوئیں تو شام کے پانچ بج چکے تھے۔ پہلی ملاقات جو اردو زبان سے شروع ہوئی تھی پنجابی زبان پر ختم ہوئی۔ اسی دوران انھوں نے مجھ پر ایک وار کیا۔ میرا پنجابی لب و لہجہ سنتے سُنتے پوچھنے لگے۔ "کیا تُسی سیالکوٹ دے او" (کیا آپ سیالکوٹ سے ہیں) جی ہاں۔ میں نے جواب دیا اور پوچھا "میرا آپ نے سیالکوٹ سے تعلق کیسے پہچان لیا" فرمانے لگے "سیالکوٹی بڑی تیز پنجابی بولتے ہیں اور لفظ "یا" اکثر استعمال کرتے ہیں۔ ہے گا کی بجائے ہے وے کہیں گے وغیرہ وغیرہ"۔ دوسرے روز میں اپنا کام ختم کرنے کے بعد پھر زوبی صاحب کے ہاں جا پہنچا۔ ایسے لگا جیسے وہ میرے انتظار میں تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ ہم دونوں نے محسوس کیا کہ ہماری عادات کافی مشترک ہیں لہٰذا ہمیں گھل مل جانے میں اور دلی احساسات کی ترجمانی کرنے میں بالکل کوئی دیر نہ لگی۔ چند ہی دنوں میں ایسے ہل گئے کہ زوبی صاحب شہر میں جہاں بھی جاتے مجھے ساتھ لیے گھومتے۔ شام کو بھی ہم اکثر کلفٹن جا کر کافی پیتے اور دیر تک باتیں کیا کرتے۔ زوبی صاحب نے مجھے اپنے بچپن کی یادوں سے لطف اندوز کیا۔ فرمایا "جب میں شہر قصور میں اسکول سے چھٹی کے بعد گھر جایا کرتا تو راستے میں ایک ہندو سُنار کی دوکان آتی تھی وہ سونے کی ایک ڈلی لو ہے کی (DYE) ڈائی میں ڈال کر لمبا باریک تار کھینچا کرتا جس سے وہ ہاتھ کی چوڑیاں وغیرہ بناتا تھا۔ مجھے یہ تار کھینچنے کا عمل بہت بھلا لگتا تھا۔ میں اکثر سُنار کی دوکان کے پاس بیٹھ جاتا اور یہ تار کھینچنے کا عمل دیکھا کرتا۔ سُنار بھی مجھے دیکھ کر خوش ہوتا اور مجھے ہمیشہ پیار کی نگاہ سے دیکھ کر چُپ ہو رہتا"۔

"ایک دفعہ لاہور میں طالب علمی کے زمانے میں میرے پاس پیسے ختم ہو گئے تو گھر والوں کو خط لکھنے کی ہمت نہ پڑی کہ ایک ماہ میں دوبارہ پیسے نہ مل سکیں گے۔ شیخوپورہ میں میرا ایک قریبی رشتہ دار رہتا تھا جو میرا دوست بھی تھا۔ سوچا اُس سے کچھ پیسے مانگے جائیں۔ سوال

یہ تھا کہ شیخوپورہ کیسے پہنچا جائے۔ دوستوں سے کرائے کی رقم مانگنے کو دل نہ چاہا۔ لہٰذا ایک دوست سے سائیکل حاصل کی اور لاہور سے شیخوپورہ تک ۲۲ میل کا سفر طے کر کے وہاں پہنچا۔ جب دوست سے مطلوبہ رقم طلب کی تو اُس نے اپنی مجبوری کا اور دگرگوں حالت کی بنا پر صرف پانچ روپے دیے۔ میں اُسی سائیکل پر واپس لاہور آ گیا۔"

کلفٹن کی اس ٹھنڈی فضا میں' پانچ روپے ملنے پر ہم دونوں ہی بے ساختہ ہنس پڑے۔ ہنسی کی آواز اتنی تیز تھی کہ جو لوگ آس پاس بیٹھے تھے ہمارے قہقہوں کی وجہ سے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ زوبی صاحب نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم ایک اور جگہ جا کھڑے ہوئے!

کچھ عرصے بعد اُن کے سسرال والوں کا ایک سینما لاہور میں دوبارہ تعمیر کیا جانا تھا۔ لہٰذا اس کا نقشہ زوبی صاحب نے تیار کیا اور وہ چند ماہ کے لیے لاہور آ گئے۔ لاہور پہنچتے ہی انھوں نے مجھے فون کیا اور میں میکلوڈ روڈ اُن کے بتائے ہوئے سینما پر جا پہنچا۔ سینما بڑے زور شور سے گرایا جا رہا تھا اور زوبی صاحب مزدوروں میں مزدور دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی چھت پر چڑھ جاتے اور کبھی نیچے آ جاتے۔ میں یہ دیکھ کر قدرے حیران بھی تھا کہ ان میں یہ صلاحیت بھی ہے کہ آرٹسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ تعمیراتی کام اور آرکیٹیکچرل کام کو بھی جانتے ہیں۔ دو تین ماہ کے اندر اندر انھوں نے سینما کو ایک بالکل نئی شکل و صورت میں تبدیل کر دیا جسے اہلِ لاہور نے بہت سراہا۔ اس کے بعد کئی اور سینما والے بھی ان کے پاس آئے تاکہ اُن کی بوسیدہ عمارتوں کو اسی طرح نئی طرزِ تعمیر میں بدل دیا جائے۔ لیکن زوبی صاحب نے کراچی سے دوری کی بنا پر کسی بھی دیگر کام کو منظور نہ کیا اور واپس چلے گئے۔

میں نے کاروبار میں نیا نیا قدم رکھا تھا اور پھر شادی کی بات چیت بھی چل رہی تھی اکثر اوقات زوبی صاحب سے ملاقاتوں کے دوران ان باتوں کا ذکر کرتا تو وہ گھنٹوں میرے لیے وقف کرتے۔ ایک ایک نقطے کو ہمدردانہ طریقے سے سمجھاتے اور جب انھیں خط لکھتا تو بھی جواب میں تین چار صفحوں سے کم ان کی تحریر نہ ہوتی اور میری پیچیدہ باتوں کو بخوبی سُلجھا دیا کرتے۔ ان کی یہی شفقت تھی جو پہلے دن سے ہی VIRGO BABY نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ورنہ آرٹسٹ تو محض اپنی تعریف سننے کے سوا اپنی دنیا میں ہی غرق رہتا ہے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ستم رسیدہ سمجھتا ہے اُسے کسی سے رسمی بات چیت کے سوا کوئی اور سروکار نہیں ہوتا۔ عورت سے بھی چاہتا ہے کہ وہ اُس سے محبت کرے۔ مرد ہوتے ہوئے بھی اُس میں مردانگی کم نظر آتی ہے۔ بلکہ وہ عورت سے بھی زیادہ نسوانیت کا اظہار کرتا ہے۔ زوبی آرٹسٹ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ مردِ قلندر کی سی طبیعت رکھتے ہیں اگر کوئی تکلیف پہنچی تو اپنے اندر ہی اندر سہہ گئے یا اپنے چند قریبی دوستوں سے ذکر کر کے چُپ ہو گئے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ تین سال قبل اُن کے بڑے بیٹے کو کسی نے چاقو مار کر بے حد زخمی کر دیا۔ لڑکا ہسپتال میں تھا تو خود ہی چند روز اُس کی تیمارداری کرتے رہے لیکن شور و غوغا نہ کیا اور یہ دُکھ اپنے اندر ہی لے کر بھسم ہو گئے جس کے نتیجے میں چند روز بعد انھیں دل کا دورہ پڑا اور خود ہسپتال میں جا لیٹے اس واقعے کے تقریباً دو ماہ بعد مجھے پتہ چلا کہ زوبی صاحب کو دل کا دورہ پڑا تھا اور اب اپنے گھر آرام فرما رہے ہیں۔ میں نے اُسی وقت فون کیا تو دس پندرہ منٹ تک ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ لہٰذا میں نے بھی صحت کے بارے میں پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ اور اِدھر اُدھر کی گپیں مارتا رہا۔ کچھ عرصے بعد کراچی گیا تو سنٹرل ہوٹل میں زوبی کے اسٹوڈیو پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی مُسکرا دیے۔ میں چپکے سے سامنے بیٹھ گیا لیکن وہ برابر مسکرائے جا رہے ہیں۔ میری خاموشی کی وجہ پوچھنے لگے۔ میں نے جب بیماری کے بارے میں استفسار کیا تو کہنے لگے "چھوڑو یار ان باتوں کو سناؤ لاہور والوں کا کیا حال ہے۔ کبھی اشفاق سے ملے ہو۔ کہیں حفیظ نظر آیا تھا۔؟

"اشفاق صاحب سے تو نہیں ملا۔ البتہ حفیظ صاحب سے کبھی کبھی سر راہے ملاقات ہو جاتی ہے وہ سنتے زیادہ ہیں اور سُناتے کم ہیں" میری یہ بات سُن کر خوب ہنسے اور کہنے لگے "حفیظ شروع سے ہی اسی طرح ہے بولتا ہی نہیں"

جن دنوں میرے ہم زلف ایس یو۔ درّانی پی آئی اے کے چیرمین مقرر ہوئے تو میں کراچی گیا اور اُن کے ہاں باتھ آئی لینڈ میں ٹھہرا۔ شام کو کھانے پر باتوں باتوں میں مجھے محسوس ہوا کہ بیگم درّانی، جنھیں میں ثمینہ آپا کہتا ہوں کو چند پینٹنگز کی ضرورت ہے اس کے لیے انھوں نے گل جی سے بھی رجوع کر رکھا ہے لیکن گل جی کی بنائی ہوئی تصویر کی قیمت ادا کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ تقسیم سے پہلے جب میں علی گڑھ سکول میں پڑھتا تھا تو گل جی کا چھوٹا بھائی محمد اسمٰعیل میرا کلاس فیلو تھا لہٰذا گل جی کے گھر میرا آنا جانا اسی طرح سے تھا جیسے کہ میں زوبی صاحب کے ہاں چلا جاؤں۔ میں نے ثمینہ آپا کے اظہارِ خیال کو اپنے دل میں ہی رکھا اور دوسرے دن جب زوبی صاحب کے ہاں گیا تو میں نے پہلی دفعہ اُن سے ایک پین ڈرائنگ مانگی تو ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ آؤ میرے ساتھ۔ پچھلے کمرے میں لے جا کر اپنی تمام ڈرائنگ کھول کر سامنے رکھ دیں ــ "ان میں سے جو بھی پسند ہے لے لو" یہ کہہ کر وہ اپنی میز پر جا بیٹھے۔ میں نے ایک ڈرائنگ اُٹھالی جسے دیکھ کر کہنے لگے "آخر تم بھی تو آرٹ کو سمجھتے ہو یہ ڈرائنگ مجھے بھی بہت اچھی لگتی ہے" میں نے انھیں بتایا کہ یہ ڈرائنگ میں بیگم درّانی کو تحفے میں دینا چاہتا ہوں۔ پہلے تو چُپ ہو گئے پھر کہنے لگے ــ "میں نے تو یہ تمھیں دی ہے۔ بہتر تو یہ تھا کہ اسے تم ساتھ لاہور لے جاتے۔ بہرکیف اب جو تمھاری مرضی سو کرو"

ثمینہ آپا کو وہ ڈرائنگ اتنی پسند آئی کہ انھوں نے زوبی صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن مجھے چونکہ دوسرے روز لاہور جانا تھا لہٰذا یہ ملاقات نہ ہو سکی! آج جب کہ وہ لندن میں مقیم ہیں تو اُن کے گھر میں سب سے خوبصورت جگہ پر زوبی صاحب کی پین ڈرائنگ ہی لگی ہوئی ہے جس کو دیکھ کر انگریز اور عرب ممالک سے آنے والے لوگ خاص کر اس ڈرائنگ کے خالق کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ زوبی صاحب ہمدرد، دل دار اور درگزر کر دینے والے لوگ ہیں اگر اُن کا بس چلے تو ہر ایک کو خوش رکھا کریں لیکن ان کے ساتھ چند مجبوریاں بھی ہم سفر رہتی ہیں۔ ایک دفعہ اُن کا ایک پرانا کلرک۔ ان کی چیک بُک کے اندر سے چیک پھاڑ کر ان کے دستخطوں کی نقل کر کے بنک سے پیسے نکلواتا رہا۔ کئی ماہ بعد پتہ چلا کہ بنک میں رقم کم ہو گئی ہے جب انھیں کلرک کی اس حرکت کا پتہ چلا تو اس کو صرف دفتر سے نکال دیا اور معمولی کارروائی کے بعد بات آئی گئی ہو گئی۔ کلرک نے لکھ کر دے دیا کہ وہ رقم قسطوں میں ادا کر دے گا۔ میرا خیال ہے کہ آج تک ایک بھی قسط انھیں نہیں ملی ہو گی۔ لاہور میں جب سینما تعمیر کروا رہے تھے تو اُن کے کراچی کے پریس میں چوری ہو گئی۔ میں شام کو ملنے گیا تو ذرا چُپ چپ سے نظر آئے۔ رات بارہ ایک بجے تک کوئی ڈھب کی بات نہ کر پائے۔ بڑی مشکل سے پتہ چلا کہ پریس میں چوری ہو گئی ہے۔ لیکن پھر بھی لاہور ہی میں مقیم رہے اور کام کی متواتر نگرانی کرتے رہے!

۱۹۶۵ء کی جنگ کے چند ماہ بعد میں کراچی گیا اور حسبِ معمول اُن سے ملا۔ شام کو مجھے اپنے گھر لے گئے اور ایک بہت لمبی چوڑی پینٹنگ دکھائی جس میں پنجاب کے دیہاتی ہندوستان کے اچانک حملے کی وجہ سے پریشان حال گھروں سے بھاگ رہے ہیں۔ میں چونکہ سیالکوٹ بارڈرز کا دورہ کر آیا تھا اور خاص کر چونڈہ محاذ پر ہندوستان کے تباہ حال ٹینکوں کا نظارہ بھی دیکھ چکا تھا۔ لہٰذا میں انھیں ایک ایک بات کی تفصیل سے آگاہ کرتا رہا۔ وہ خاموش بیٹھے سُنتے رہے جب میں نے غور سے اُن کی جانب دیکھا تو اُن کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں وہ پینٹنگ جو ہمارے سامنے پڑی تھی انھیں محاذوں کی عکاسی کر رہی تھی جن میں پاکستان کے مسلمانوں کی آہ و پکار تھی اور جس میں زوبی کے آنسوؤں کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

جہاں تک میں جانتا ہوں زوبی صاحب نے آج تک کسی آرٹسٹ کی مخالفت نہیں کی وہ اچھے آرٹسٹوں کی بہت قدر کرتے ہیں لیکن اُن میں بھی ایک خاص قسم کے آرٹ پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر وہ کسی آرٹسٹ پر تنقید کریں تو اس کا مطلب

اختر مرزا — نذرِ زدبی — ایک ہمدرد دوست

یہ ہرگز نہیں کہ وہ اُس کی مخالفت پر اُتر آئے ہیں۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ وہ آرٹ کو پاکستان میں پنپنے کے بہت آرزومند ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُس کی بہتر سے بہتر طریقے پر سرپرستی کی جائے۔ اکثر اخبارات نامناسب طور پر فنِ مصوری کے نوخیزوں کی جس طرح بڑھ چڑھ کر تعریفیں کرتے ہیں زدبی صاحب کی نگاہ میں ایسا کرنے سے لڑکے محنت کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ اُن کی صلاحیتیں خوش فہمی میں دب کر رہ جاتی ہیں۔ نتیجتاً وہ لڑکے اور لڑکیاں اپنی محدود سی صلاحیتوں سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ کئی نوجوان ایسے بھی ہیں جو انسانی شکل بھی صحیح نہیں بنا سکتے لیکن رنگوں کا سہارا لے کر وہ تجریدی آرٹ کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ تین چار سال کی اس کش مکش میں وہ رسالوں اور اخبارات کا سہارا لے کر اپنا نام روشن کرنا چاہتے ہیں۔ اخبارات، رسالوں کا یہ سہارا اُن کی کمائی میں معاون تو بن سکتا ہے لیکن بعد میں ایک نوجوان آرٹسٹ کے لیے یہ بہت مضر ثابت ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

زدبی صاحب کی پین ڈرائنگز جو آج سے تیس سال پیشتر منظرِ عام پر آئی تھیں۔ آج کے اس دور میں زیادہ مقبول ہیں اور ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ زدبی صاحب نے ایک نئی راہ اختیار کی تھی اور وہ موومنٹ جو انھوں نے اس لحاظ سے اُن ڈرائنگ میں دکھائی تھیں آج بھی لوگوں کے دل و دماغ میں محفوظ ہے۔ اس عمل کو برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے علامہ اقبال کے شکوہ پر جو پین ڈرائنگ بنائی ہیں آرٹ کے ایک اعلیٰ نمونے سے کم نہیں ہیں۔

زدبی صاحب نے اپنے فن میں بہت کام کیا ہے لیکن میرے نقطۂ نگاہ سے اُن کو جتنا کام کرنا چاہیے تھا وہ نہیں کر سکے۔ اُستاد اللہ بخش زندگی کے آخری ایام تک کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ عبدالرحمٰن چغتائی کا آرٹ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لافانی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اُستاد اللہ بخش کی پینٹنگز اکثر اوقات دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ لیکن زدبی صاحب جو اپنے فن میں کمال حاصل کر چکے ہیں اُنھوں نے ہمارے اور آپ کے لیے وہ سب کچھ نہیں چھوڑا جس سے کہ میں یہ لکھ سکوں کہ کل کو آنے والی نسل اُنھیں یاد رکھ سکے۔ زدبی صاحب نے بہت تھوڑا کام کیا ہے اور وہ کوئی اتنے عمر رسیدہ تو ہیں نہیں کہ اس فن کو دنیا کے سامنے اور زیادہ نہ پھیلا سکیں۔ جہاں تک بُت تراشی کا تعلق ہے تو وہ اس فن کے ہر پہلو سے واقف ہوتے ہوئے بھی ہم تک نہ پہنچا سکے۔ جہاں پین ڈرائنگ کا ذکرِ خیر آتا ہے تو زدبی صاحب اس کو بھی قوم تک صحیح معنوں میں نہ پہنچا سکے۔ اس کے ساتھ انھوں نے دیہاتی زندگی پر جو تصاویر بنائی ہیں اُن سے بھی لوگوں کی آنکھیں محروم ہیں تو ان سب خیالات سے جو تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ محض یہی ہے کہ زدبی صاحب یا تو اپنے اس ماحول سے باہر نکلیں اور اپنے فن کا مظاہرہ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں کریں تاکہ لوگ اُن کے فن سے حقیقی معنوں میں متعارف ہو سکیں۔ ورنہ آنے والی نسل پر بڑا ظلم ہوگا اور وہ ان کو یاد رکھنے سے قاصر رہ جائیں گے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا آرٹسٹ جو ایک نقطے سے لکیر کھینچتے ہوئے ایسی تصویر بنا سکتا ہے جس میں جسم کے پورے خدوخال بغیر کسی لائٹ اینڈ شیڈ کے سامنے نظر آنے لگیں۔ ایسے آرٹسٹ کو لوگوں تک پہنچنے سے خود کو محروم نہیں رکھنا چاہیے۔

زدبی صاحب سے معذرت کے ساتھ یہ کہوں گا کہ ابھی ہمیں اُن سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ زدبی ایک پینٹر ہیں۔ زدبی ایک بُت تراش ہیں۔ زدبی ایک معمار ہیں۔ زدبی ایک تجریدی آرٹ کے ماہر ہیں۔ زدبی خوشبو کی نزاکت بھی جانتے ہیں اور زدبی ڈیکور کے استاد بھی ہیں۔ زدبی میرے بڑے بھائی اور دوست بھی ہیں۔

صمد انصاری

آیات کا تجسیم کار

اُنھوں نے ایک نئی اقلیدس کو دریافت کیا ہے اور اس کی بنیاد ڈالی ہے، تناسب کے نئے زاویے تشکیل دیئے ہیں لفظوں، دائروں اور خطوط کے نئے تصورات پیش کیے ہیں، سمتوں کو نئی راہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ جو بیان سے ماورا ہے، بیان کیا جائے وہ جو لا محدود ہے، حدود میں آئے، وہ جس کی گہرائیاں پیمائش سے باہر ہیں۔ ناپا جائے (بے شک یہ پیمانے بطور خود کتنے ہی وسیع ہو) انھوں نے سعی کی ہے کہ اُسے جو شکل اور صورت سے عاری اور بعید ہے، ایک شائبہ دیا جائے (ہر چند کہ وہ رمزیہ اور سحر کارانہ ہو) انھوں نے کوشش کی ہے۔ کہ اُسے جو وقت سے مستغنی ہے جو نہ حال ہے نہ ماضی نہ مستقبل، اُسے وقت کے تناظر میں ظاہر کیا جائے (ہر چند کہ یہ نظارگی غیر فانی ہو) اور وہ جو حادثہ عقل و فہم سے دور ہے اُسے انسانی جبلت کے قریب تر کیا جائے، اور وہ جنہوں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ آزر زوبی ہیں۔

میں پہلی بار ان سے کینپ کالونی کے پیش منظر میں متعارف ہوا۔ کراچی سے میلوں دور' پیراڈائز پوائنٹ کے عقب میں وہاں وہ سنگِ مرمر میں ملفوف کھڑے تھے۔ اپنی بے مثال فن کاری کے سائے تلے۔ اُس مجسمے کے تلے جس نے اسم ذات کو مرمریں پیراہن عطا کیا تھا۔ لفظ اللہ کو اپنی تمام وسعتوں سمیت، شش جہات میں مصوّر کیا تھا۔ میں اس شاہکار کے سامنے بہت دیر تک مبہوت کھڑا رہا۔ ایک قسم کی ذہنی اور روحانی آسودگی' میرے وجود میں سماتی چلی گئی۔ میں روح کی گہرائیوں تک اس پاکیزگی میں بھیگتا چلا گیا۔ جو اس مجسمے سے تُرشّح پذیر تھی۔ ایک عجیب والہانہ خود آگاہی اور حق آگاہی، مجھ میں اترتی چلی گئی، اور میں اس وسعت میں جو زمین آسمان پر محیط ہے گم ہوتا چلا گیا، اُس سے قریب تر' جسے نہ آنکھ پا سکتی ہے نہ سماعت سُن سکتی ہے۔ اور نہ لمس چھو سکتا ہے، وہ کہ بہر طور، بہر عنوان بے مثال ہے، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس مجسمے نے جو میرے سامنے ہے، مجھ میں' میرے حواس خمسہ میں، ایک نئی حِس کا اضافہ کر دیا ہے، جس سے میں اللہ جلّ شانہٗ کی عظمت اور شان کا احساس کر سکوں آگاہی کے حدود اور امکانات میں بتدریج، در آتی ہوئی یہ توسیع آزر زوبی کی اکثر تخلیقات میں ہے ذوقِ سلیم کے لیے صلائے عام ہے۔ یہ ان کے لفظوں میں موجود ہے، ان کے خطوط کے ساتھ رواں ہے اور ان کے دائروں میں رقص کرتی ہے، ان کے تخلیق کردہ نقوش ہوں کہ تصاویر، مجسمے ہوں کہ مورتیاں، بے سمتیاں ہوں کہ کثیر الاطرافیاں، یہ آگاہی ان کے یہاں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہے۔ شاید دید۔ وری کے انتظار میں :۔

یہ اس صدی کے درمیان کی بات ہے کہ مجھے فرانسیسی فن کاروں کی ایک بستی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ بستی' پیرس کے نواح میں' لوتڑے ڈیم کے ساتے میں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ محراب بہ محراب' خانے بہ خانہ' ایک وسیع مدرسہ ہے فنکاری کا۔ فن کی تخلیق کی کیفیات میں شرابور، جہاں فن' زچگی' شیر خواری اور پرورش کے مرحلوں سے گزرتا ہے ـــــ اور بلوغ تک پہونچتے پہونچتے محلات کی زینت بن جاتا ہے۔ جس سے لوورے اور وارسائی کے قصر مزیّن ہیں، اُن کی دیواریں، ان کے سقف، ان فن پاروں، ان شاہکاروں کے خطوط اور رنگوں سے جگمگا رہے ہیں، دنیا کو امن اور سلامتی کی طرف بلا رہے ہیں، ان ہی خطوط، ان ہی رنگوں کی ایک دل آرا اور دلکش آمیزش، ایک محدودیت کے ساتھ کراچی کے سنٹرل ہوٹل کی پہلی منزل کے ایک گوشے میں رُونما ہے۔ یہ زوبی صاحب کا آرٹ اسکول ہے، اس کی دیواریں دل آویز خطوط اور تصاویر سے ڈھکی ہوئی ہیں، فن کارانہ تخلیق کے سہ اطرافی، شاہکار، مجسموں کی صورت میں، جن میں بیشتر قرآنی آیات ہیں، چاروں سمت پھیلے ہوئے ہیں۔ اِن میں ولولہ انگیزی بھی ہے۔ شجاعت آموزی بھی، ان میں زمین بھی ہے اور آسمان بھی، ان میں آج بھی ہے کل بھی۔ ان میں مادیت بھی ہے روحانیت بھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روحانی ثقافت، آج کے ماحول میں جلوہ آرا ہے، قرآن کریم سے نکلی ہوئی روشنی کی ایک کرن حق کی نشاندہی کرتی ہوئی، جامد ہو گئی ہے، کہیں کاغذ پر، کہیں لکڑی میں، کہیں سنگ مرمر میں۔

چند روز قبل کی بات ہے میں نے زوبی صاحب کی کتاب "سم تھنگ وِد آوٹ کلر" ـــــ (کچھ بلا رنگ) دیکھی، ورق گردانی کے بعد میں نے محسوس کیا کہ دراصل اس کتاب کا نام "کچھ بلا رنگ" کی بجائے "سب کچھ بلا رنگ"

ہونا چاہیے تھا، میں نے اس تمام کتاب کو انتہائی رنگین پایا۔ بغیر رنگوں کے استعمال کے، اس کتاب کے خاکوں میں، دائروں اور نقطوں میں، خطوط اور شکلوں میں، رنگ پکار پکار کر کہہ رہے تھے، ہمیں دیکھو، ہم یہاں ہیں۔ اس کتاب کے صفحوں پر، سمتوں کا شعور بول رہا تھا، خطوط اور نقطے صفحات کے باہر نکل آئے تھے۔ زندگی اپنے اصل کی طرف مائل پرواز تھی۔

ع سینۂ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا

زدبی صاحب نے دراصل ایک نئی زبان ایجاد کی ہے، انھوں نے انسانی خطوط کو حرفوں اور لفظوں کی طرح استعمال کیا ہے۔ ان کا فن "توسین" کی زبان میں بولتا ہے۔

میں نے کھولے ہیں تکلم کے دریچے کتنے　　　میں نے حرفوں کو سنوارا لب و گیسو کی طرح (تقدیم)

انھوں نے درحقیقت لب و گیسو سے، حرفوں کا کام لیا ہے۔ انھوں نے انسانی خطوط کی دلآویزی کو علامات میں ڈھال دیا ہے، جن کی وساطت سے وہ زندگی کے حقائق کو بیان کرتے ہیں، ان کی منظر کشی کرتے ہیں، زندگی کو نیا مفہوم دیتے ہیں، امن اور فلاح کی طرف، حیرانیوں کے لیے راہیں کھولتے ہیں۔

چہروں سے بناتے ہیں صمد شکل معانی　　　آئینۂ ایام کو حیراں نہیں رکھتے (توسین)

انھوں نے ان خطوط کو صرف مجسم ہی نہیں کیا ہے، ان مجسموں کو تصورات میں بھی ڈھالا ہے، ہے کوئی جو آئے اور ان کے بطون میں پوشیدہ حقیقتوں کا نظارہ کرے، انھیں آشکار کرے۔

کون دکھلائے حقیقت کو صمد راہ مجاز　　　حاصل دیدہ و دل نذر بتاں کون کرے (ھدف)

انھوں نے حقیقت کو راہ مجاز سے آشنا کیا، نور کہ بے جسم تھا اس کی تجسیم کی، اور پھر اس تجسیم کو دوبارہ نور میں ڈھال دیا، ایسے نور میں جو انسانی تصور کے قریب تر تھا، آیئے "پھر بلا رنگ" میں، ان کے ایزد گارڈن کو دیکھیں یا "آنا مارکا" کا مشاہدہ کریں، ایک مجسم حیرانی ہے اور دوسرا مجسم درد والم، کہتا ہے۔

میں کائنات کے سینے میں موتی غم ہوں　　　کسی کی آنکھ کا آنسو نہیں کہ بہ نکلوں (موج نکہ)

اور اگر یہ آنسو بہ نکلتا، جسے زدبی کے فن نے ضبط کے دامن میں بند کر دیا۔ تو ایک اور تاج محل تخلیق پا سکتا تھا، آیئے آگے بڑھیں، یہ سید امتیاز علی تاج ہیں۔ تخلیق کے ایک لمحے میں بند، جنھوں نے انارکلی کو، اس کے مقبرے سے باہر نکالا، شہنشاہیت نے اُسے زندہ دفن کیا تھا، امتیاز علی تاج کے فن نے اسے لافانی بنا دیا، لیکن آج جہاں انارکلی امتیاز علی تاج کے فن کی مرہون منت ہے، کل، امتیاز علی تاج اس سے زیادہ زدبی کے فن کے شرمندہ احسان ہوں گے۔

مجھے ہمیشہ حیرانی رہی ہے کہ کیسے ایک کونے میں جلتی ہوئی شمع تمام ماحول کو روشنی سے بھر دیتی ہے۔ آگہی سے معمور کر دیتی ہے، لیکن کچھ ایسا ہی معاملہ زدبی صاحب کے فن کا ہے، جہاں بھی ان کا قلم ہے وہ وہاں ہیں، جہاں جہاں اُن کا برش پہنچا ہے، زدبی کی شخصیت کے رنگ بھی نمایاں ہیں اور جہاں جہاں ان کی سنگ تراشی کا ہنر نمودار ہوا ہے، ان کی فنکارانہ صلاحیت پھیل گئی ہے۔ جس طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں۔ کم و بیش اسی طرح ان

کے فن میں فن کار ہے۔

اور وہ جو سامنے دیوار پر، ایک حسین بنفیاوی حلقہ لکڑی کے خول میں لٹک رہا ہے۔ وہ نہ صرف ہنرو موعظت کا کمال ہے۔ بلکہ زوبی صاحب کا بھی شاہکار ہے۔ آپ اسے پڑھ سکتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ۔ (الرعد ۱۱)

(اور یقیناً اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا، اس احوال کو جس میں قوم بستی ہے، جب تک وہ خود تبدیلی کے خواہش مند نہ ہو)

یعنی تبدیلی اندر سے آتی ہے باہر سے نہیں، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر تمام انسانی تاریخ گواہ ٹھہرتی ہے، جسے ہم نے بھلا دیا ہے۔ اور یہ غفلت ابھی چھوٹی نہیں ہے، اب دیکھیں اسی عبارت کو مجسم کرنے میں، زوبی صاحب نے کیا کمال کیا ہے، انھوں نے "حتّٰی" یعنی "وقت" کو کف دست بنایا ہے، اور باقی آیت کو اس پر سجا دیا ہے، اس طرح کہ "اِنَّ" کا الف "حتّٰی" کی "ح" سے مل گیا ہے اور "اَنْفُسِہِمْ" کا میم "حتّٰی کی "ی" سے متصل ہے کیا بالغ نظری ہے، وقت جیسے کی بنیاد ہے کہ ایک حدیث قدسی، کے مصداق، وقت اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، یعنی آتا سب ہے، سب سے بڑی حقیقت ہے جس کے ابتدا سے "نفس" کی انتہا منتصل ہے۔ اور "نفس" کائنات کی ایسی حقیقت ہے جس میں ربوبیت پیوستہ ہے۔ (وَاَشْہَدَہُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ، اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ۔ الاعراف ۱۷۲)

میری مٹی میں مرے جسم کی سرشاری ہے   مجھ میں جو کچھ ہے مرے نفس کی بیداری ہے (قوسین)

اس بیداری کو زوبی کے فن نے وقت کی انتہا سے ملا دیا ہے، "نفس" اور اس کے محاسبے کو "حشر" سے ملا دینا، روشن ضمیری کی علامت ہے۔ اسی طرح "حتی" کی ابتدا کو یقین (اِنَّ) سے مربوط کر کے انھوں نے اپنے طور پر حدیث قدسی کا اثبات کیا ہے، اور پھر، درمیان میں لفظوں کی نشست اس طرح ہے کہ "اسم ذات" نمایاں ترین ہے۔ اور پھر روحانیت سے قطع نظر یہ آیت نیوٹن کے قوانین حرکت کا پہلا کلیہ ہے۔ زوبی صاحب نے کس فنکارانہ مہارت کے ساتھ، مذہب، سائنس اور فن کو ملا دیا ہے، اگر یہ تثلیث، ہمارے باقی ماحول میں اتر جائے تو کیا اہل صلیب، پیچھے نہیں رہ جائیں گے، کیا مغرب مشرق کی طرف نہیں دیکھے گا۔

اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے کہ نہ ہمارے ہاں نہ سائنس مقبول رہی اور نہ فن۔ ہر چند کہ اوّل کے متعلق قرآن میں اصرار ہے اور آخر کے متعلق جواز، چنانچہ فرمایا گیا ہے۔

یَعْمَلُوْنَ لَہٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَتَمَاثِیْلَ (سبا ۱۳)

اور تماثیل میں، زوبی صاحب کا تمام فن شامل ہے، رہا سائنس کا معاملہ وہ تمام قرآن میں پھیلا ہوا،

یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ۔ (آل عمران ۱۹۱)

اس میں یتفکرون، تمام سائنس ہے، اور سبحنک کا تمام عبارت، اور اس کی تجسیم تمام فن؛

انسانی خطوط کے علاوہ، زوبی صاحب نے اپنے نقطوں، خطوط اور دائروں کو نئی نئی معنویتیں دی ہیں، یہ عمل بھی اسی طرح وقوع پذیر ہوا ہے، جیسے، شعراء اور ادیب، الفاظ کو نئے معانی اور نئے آہنگ عطا کرتے ہیں، ان کے فن میں ویرانی، درختوں کی برہنہ شاخیں مہیا کرتی ہیں۔ نسوانی سینے، ان کے فن میں، محبت مادری، شیرخواری

اور پرورش کی علامت بنتے ہیں، ایک خاکے میں جس کا عنوان "ٹیلی فون آپریٹر" ہے وہ چہروں پر آنکھیں حذف کر دیتے ہیں اور کانوں کو سماعت کی علامت کے بطور اجاگر کرتے ہیں، جنہیں تزئین گیسوے سنوارتے ہیں، گویا کے آوازِ مجسم پیدا کرتے ہیں، جس میں ایک نازک سا جنبشِ لطیف کا احساس جھلکتا ہے،

اسی طرح "کچھ یلا رنگ" میں چاندی کا عنوان قابلِ غور ہے، اس خاکے کے پس منظر میں ایک عجیب سی مستانہ اور متوالی' فضا قائم ہے، جو گنگناتی ہے ــــ

جب بھی وہ اترتا ہے ساحلِ تصور پر ذہن میں خیالوں کے چاند چھوڑ جاتا ہے (تقدیم)

اور اسی چاند کو زدبل صاحب نے تمام خاکے پر پھیلا دیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ، ان کا قلم، ان کی سیاہی، ان کی تراش، تمام کی تمام اُن کے فن میں گم ہو جاتے ہیں، ان کی تخلیق میں صرف فن اور اس سے متشرح تصور باقی رہ جاتا ہے۔ یہ صورت حال اُن کی سطرفی خطاطی میں بہت زیادہ نمایاں ہے، دراصل' اُن کے مرمریں مجسمے "اللہ" کی خطاطی کے مشاہد نے اس حقیقت سے آشنا کیا کہ سورج، وہ زرد دائرہ نہیں ہے جو صبح کو مشرق سے نمودار ہوتا ہے۔ بلکہ وہ کرنیں ہیں، وہ دھوپ ہے۔ وہ اجالا ہے، وہ نمو ہے جو پو پھٹنے پر صبح کاذب کا مقدر ہوتے ہیں، جن سے زندگی پروان چڑھتی ہے۔ اور وجود کی خوشبو اقصلائے عالم میں پھیل جاتی ہے' اور دراصل یہی معنویت ہے، جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے میں گم ہوتی جاتی ہے۔ جسے صرف "فن" ہی مہیا کر سکتا ہے۔ جس کے بغیر زندگی بے رنگ ہے، بے فیض اور کبھی کبھی ناقابلِ برداشت۔

وہ رنگ جو زدبل صاحب کے فن نے، ذوقِ سلیم کے لیے مہیا کیے ہیں، خالص سائنسی اداروں میں بڑے خوشنما اور دل کش معلوم ہوتے ہیں، تیلور، میں" ھوالذی خلق السموات والارض "کا چمکدار" کُرہ"، کیا ہی خوبصورت معلوم ہوتا ہے، یہ سائنس کی ثقافت کو ثقافت میں ڈھال دیتا ہے، اسی طرح لاہور کے چند سائنسی اداروں میں یہ جنت نگاہ میسر ہے، کاش یہ فضا ملک کے تمام اداروں تک پھیل جائے۔

ہر چند کے زدبل صاحب نے اپنے خطاطی کے مجسموں میں، قلم اور سیاہی کی جگہ چھینی کی تراش، استعمال کی ہے۔ لیکن خطاطی کی نزاکتیں اپنی جگہ بحال رہی ہیں۔ وہ توازن اور آہنگ، جو نسخ، نستعلیق اور کوفی، میں ہے، ایک نئے انداز میں زدبل صاحب کے یہاں موجود ہے، انھوں نے حسنِ ازل کو الفاظ اور آہنگ کے بجائے سنگ و آہن میں دریافت کیا ہے۔ انھوں نے سنگریزوں کو کوہ نور، اور چوب پاروں کو شاخ طور بنانے کی سعی کی ہے اور دراصل پہل کی ہے۔ آیات کو جسامت دی ہے، انھیں سے متعارف کرایا ہے۔ ان کے ثقالت کو لطافت میں' اور کثافت کو نور میں ڈھال دیا ہے۔

دراصل فن جو وجود کا لطیف اور حسین ترین گوشہ ہے، فطری حرکات کے ردِ عمل کے طور پر شعور پہ آتا ہے، الہام اور ولولہ انگیزیاں، عالم امر سے کائنات میں اترتی رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے تعرفات (کل یوم ھو فی شان) کے مصداق، ہر وقت وارد ہوتے ہیں، احساس اور وجدان ان سے متاثر ہوتا ہے، مصور انھیں نقش و رنگ میں ڈھال دیتا ہے، مجسمہ ساز، انھیں جسم میں، شاعر شعر میں اور موسیقار موسیقی، ان "تعرفات" کو لباس فن دیتا ہے۔ قرآن اس سلسلے میں اعلیٰ ترین حیثیت رکھتا ہے کہ وہ اپنے لباس (الفاظ) کے ساتھ وارد ہوا ہے، مکمل، تمام کا تمام

آیات کا تجسیم کار

نذر زدبی

صمد انصاری

چنانچہ ایک دور کے شعر، مصوری، مجسمہ سازی اور موسیقی میں ایک رابطہ ملتا ہے، ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔
ایک زمانہ تھا کہ ہم دائروں کے دور میں تھے، عمارتیں، مجسمے، عبارتیں، راگ، سب کچھ دائروں سے متاثر تھے۔
و مبنیٰ عبارتیں، مدور عمارتیں، گول بازیاں۔ فن کے مختلف پر حاوی تھے۔ پھر دور خطوط کا آیا۔ جس میں
ہم اس وقت ہیں، پاپ میوزک، تجریدی آرٹ، سب اس کے مظاہر ہیں، اور شاید اگلا قدم نقطے کی
سمت بڑھے گا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانی تجسس کی کارفرمائی سے سرکل، دائروں میں، دائرے خطوط میں اور
خطوط نقطوں میں تحلیل ہوتے رہے ہیں۔ اور شاید ایک دن ؎

ایک نقطے میں سمٹ جائیں گے چہرے کے خطوط رنگ تصویر کا کاغذ پر بکھر جائے گا (قوسین)

اب فن اس انتشار کو کس طرح سنبھالتا ہے۔ یہ وقت ہی بتائے گا، لیکن زدبی صاحب کا فن اس سلیقے کا اظہار کر چکا
ہے، وہ خطوط سے نقطوں کی طرف مراجعت کرتا نظر آتا ہے، یہ رجحان ان کی کتاب "کچھ بلا رنگ" میں تلاش کیا
جا سکتا ہے۔ مثلاً ان کے خاکے FEMALE ALLUREMENT میں تمام خطوط اپنی تمام تر دلاویزوں
کے ساتھ اس کی نقطے کی طرف سمت کشا ہیں۔ جہاں حسن و عشق کے ملتے ہیں۔ اسی طرح
GENERATION CYCLE میں تمام خطوط اور دائرے، نومولود کے مقام مرکز پر مرتکز ہوتے ہیں۔
اسی طرح IMPEDIMENT میں تمام زاویئے، حُسنِ ازل کے نقطۂ اساس پر مجتمع ہوتے ہیں۔ اور
FUTILITY کا اختتام، بھنور کے مرکز پر ہوتا ہے (ا۔) کا خیال حل، جو ایک حسابی اشکال ہے۔
انسانی چشم کے مردمک کے مرکز میں ختم ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے — اور دور سے ایک مانوس آواز آتی ہے ؎

بنا کے ارض و سما کی قسم کلید مجھے مرے وجود کو مجھ پر سوال رکھا ہے

میں نے جو کچھ بھی اب تک عرض کیا ہے وہ زدبی صاحب کے فن کا ایک سطحی جائزہ ہے۔ اس کی گہرائیاں
تو اہلِ فن ہی بیان کر سکتے ہیں، لیکن یہ سطحی جائزہ بھی نامکمل رہ جائے گا، اگر میں زدبی صاحب کی ظاہری شخصیت
کے متعلق کچھ نہ کہوں — اور ان کے کے خطوط کی ان کے فن کے دائروں سے منسلک کرنے کا کوئی اہتمام نہ
کروں — وہ ایک خالص مذہبی خاندان اور مذہبی ماحول کے پروردہ یافتہ ہیں۔ ان کے خانوادے حفاظ اور قاریوں
کی آوازیں گونجتی رہی ہیں۔ ان کی شخصیت کے تار و پود میں۔ یہ رنگ ابھی تک موجود ہیں۔ اور شاید ان کی خطاطی
اسی رنگ کی اور اسی آہنگ کی بازگشت ہے، جسے ان کے فن نے جمال سے آراستہ کیا ہے، اپنے میں وہ ایک
قد آور سچے انسان نظر آتے ہیں۔ متوازن شخصیت، غور و فکر کی عادی آنکھیں، چہرے پر خاموش گہرائیاں
کم الفاظ اور زیادہ معنی — وہ اکثر فن کاروں کی طرح، منتشر نہیں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے فن اور اس میں اپنے
مقام سے آگاہ ہیں — ایسا معلوم ہوتا ہے ؎

اپنے عرفان کے نکھار سے ابھرتی ہوئی ذات خود نمائی کے تکلف کو مٹا دیتی ہے (صدف)

ان میں خود نمائی کا جذبہ کم ہے اور بہت ہی کم ہے۔ بالکل غیر محسوس۔ وہ آپ سے ملیں گے، آپ کے قریب
آئیں گے۔ لیکن آپ کو متاثر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کریں گے۔ فن کاروں کی ہمت افزائی میں وہ پیش پیش

نذرِ زوبی

نذیرِ زوبی

محمد اسحٰق شور

آزر زوبی

آزر زوبی کا خیال آتے ہی اشفاق احمد خاں، پروفیسر اثر، حفیظ رومانی، رمزو فوٹو گرافر، صغریٰ حیات، مسز ہمر کی لارنس کی پہاڑی
طرح زمین سے بہت بلند زوبی صاحب کے اسٹوڈیو میں اُن کی پینٹنگ کا ہی سلسلہ معلوم ہوتے۔ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، منٹو،
کاشمیری، مولانا صلاح الدین اور بشیر مشہیر کے مجسمے دیگر عریاں اور نیم عریاں مجسموں میں دیوتاؤں کے سمان اپنی اپنی ذات میں گم اسٹوڈیو
گوشوں اور دروبچوں میں خالی خالی آنکھوں سے لارنس کے چمن زادوں اور کچّی کلیوں کی مسکراہٹوں کو دیکھتے رہتے۔ ظہیر کاشمیری انگشتِ شہادت
نے والوں کو خبردار فرماتے، جوتے اتار کر آئیے یہ جائے ادب ہے۔

زوبی صاحب مہرلب نہایت پُروقار انداز میں جب پین یا بُرش اٹھاتے تو وہ بھی ان کی تخیّل کی طرح خود بخود اپنے اپنے زاویوں
سش کرنے لگتے۔ برش سے پہلے کلر، کلر سے پہلے برش کینوس یا پیپر پر کھیلنے لگتے۔ پینٹنگ ہو اسکیچ یا مٹی اپنی اپنی صورتیں پکڑ لیتے یوں
ہوتا جیسے انھیں عالمِ شہود میں آنا ہی تھا۔

عطا کیے فرمایا انھیں دیکھا کرو۔ کتابوں کی الماری کے پٹ کھول دیے فرمایا۔ یہ خداوندانِ علم و فن کے صحیفے ہیں۔ انھیں اپنی آنکھوں کا سُرمہ بنا لو۔

تقسیم سے پہلے مجھے حضرت احسان دانش متحدہ ہندوستان کے مشہور و معروف آرٹسٹ سرفراز صاحب کے اسٹوڈیو لے گئے۔ ان کا اسٹوڈیو میکلوڈ پبرز فارورڈ پبلسٹی کے نام سے تھا۔ کمرشل آرٹ میں ان کا ثانی دور دور تک نظر نہیں آتا تھا۔ سرفراز صاحب نے بکمال مہربانی اپنے اسٹوڈیو میں آنے کی اجازت دی۔ ان کی کاروباری مصروفیت اس کی متقاضی تھی ہی نہیں کہ اصلاح وغیرہ کے لیے وقت نکالیں۔ کچھ اناٹمی کی کتابیں عطا کیں اور کہا انھیں پیشِ نظر رکھو اور اناٹمی میں ملکہ پیدا کرو۔ تقسیم کے بعد وہ کراچی چلے گئے وہ کتابیں ہڈیوں کی مالا بن کر میرے گلے میں اب تک پڑی ہیں ۔

اس وقت میں روزنامہ "نوائے وقت" سے بصیغۂ ملازمت متعلق تھا۔ زوبی صاحب کا اسٹوڈیو سرو صنوبر کی چوٹیوں پر میرا پڑاؤ لارنس کے حاشیے پر۔ ریڈ کراس، فری میسن کلب، وکٹوریہ گیٹ، چڑیا گھر، سول لائن کا عقبی حصہ، مال روڈ کے کناروں کو چھوتا ہوا سیکڑوں کنال کے جھاڑ جھنکاڑ میں گھرا ہوا زمین کا یہ ٹکڑا، میرے مکان کا صحن اس کے عین وسط میں ایک مزار اور مسجد کا فرش۔ یوں مجھے میں مسجد یا مزار کے حجرے میں رہتا تھا یا مسجد میرے حجرے میں تھی۔ مزار پر اس دنیا سے بیزار لوگوں کے نعرے گونجتے تھے اذانیں ہوتی تھیں اور میرے حجرے پر ادیبوں اور شعرا کے ترانے۔

حضرت احسان دانش کے احباب، شاگرد، مداح، ادیب و شاعر، ہنوٹ کے دل دادگان کی محفلیں دن رات جمی رہتی تھیں۔ زوبی صاحب کبھی ان محفلوں کی جان تو کبھی میرِ محفل۔ یوسف ظفر، صابر دہلوی، شہرت بخاری، بقا نقوی، توقیر طاہر، چوہدری محمد حنیف، نوائے وقت کے بہت سے ایڈیٹر حضرات، ظہور عالم شہید، حبیب اللہ اوج، فرہاد زیدی، علی سفیان آفاقی، عرفان چغتائی، احمد اللہ حسینی الازہری طبیہ کالج کے پرنسپل حکیم حافظ جلیل احمد صاحب، صالح محمد صدیقی جیسے لکھنے والے اور خطاط آتے جاتے رہتے۔ یوسف ظفر، زاہد چودھری مختلف زمانوں میں یہیں راتیں بسر کرتے۔ تقسیمِ ملک کے وقت نوائے وقت کے بیشتر ایڈیٹر حضرات کرفیو کی وجہ سے یہیں اپنی راتیں جاگ جاگ کر گزارتے۔ ان محفلوں کے دامن زوبی صاحب کے اسٹوڈیو تک پھیل جاتے ۔

دو چار عالمی شہرت کے استادانِ فن جنھیں پاک و ہند کی روح یا جان کہیے ان کے اسٹوڈیو تک ہر کس و ناکس کی رسائی مشکل تھی۔ ان کی کارگاہیں اہرامِ مصر کی طرح ریگستان میں پاؤں گاڑے ہوئے تھیں۔ میرا اسکول تقسیم کی جمع تفریق سے گزر رہا تھا۔ زوبی صاحب نے ادیبوں اور شعرا کے مجموعوں، اخبارات کے سرورق، کتابوں کے ٹائٹل شاعرانہ جذب و کیف میں ڈوب ڈوب کر فنی سانچوں میں ڈھال کر ادب و فن کے نقیب ہونے کا ثبوت دیا۔

ماہنامہ "شعور" کا اجرا زوبی صاحب کے ذوقِ سلیم کی دستاویز ہے۔ اگر میں خطا نہیں کر رہا ہوں تو اُردو رسائل میں شائع ہونے والا یہ جریدہ ہے جو انتہائی ڈول آونیر اُردو ٹائپ میں مزین ہوتا تھا۔ یوں تو ملک کے ادبی پرچے اپنے اپنے معیار کے اعتبار سے آسمان سے باتیں کر رہے تھے لیکن شعور نے آسمان کو چھو لیا۔ پاک و ہند کے بڑے بڑے ادیبوں اور شعرا نے اس کی بقا کے لیے ذاتی طور پر دلچسپی لی۔ اپنے مضامین اور کلام سے اسے نوازا۔ زوبی صاحب نے حفظِ مراتب ان کرم فرماؤں کو بڑھ چڑھ کر داد دی۔ ان کے کلام کے ساتھ ان کی قلمی تصاویر ان کی تحریروں کے عنوان کا حصہ ہوتی تھیں۔ ان کے ادب پاروں کی روح کو اپنے موئے قلم سے نوک پلک عطا کر کے چار چاند لگائے۔ شعور کی ملکی اور غیر ملکی میگزین ڈائجسٹ کے ہم پلہ کہا جا سکتا ہے۔ شعور نہ جانے کیوں اپنے اوائل ہی میں اس جہاں سے اُٹھ گیا مگر اس کے پڑھنے اور دیکھنے

ان کے ہم نوالہ وہم پیالہ زندگی سے زیادہ عزیز دوست وارد ہوتے۔ زدبی صاحب کا ایپرن کھونٹی پر ٹانگ دیتے، ہم جیسے شاگرد پیشہ نگاہیں نیچی کرکے اپنے کانوں میں سیسہ پگھلا لیتے۔ اشفاق احمد خاں کی شگفتہ بیانی، پروفیسر اثر کی نرم گفتاری، منیر ہر کی اور صغری حیات کی مسکراہٹیں اور زدبی صاحب کے چبھتے ہوئے فقرے یہی حضرات سمجھتے تھے ایسا سماں پیدا کردیتے کہ لارنس کی رعنائیاں سمٹ کر اسٹوڈیو میں بکھر جاتی تھیں۔ پہاڑی کے درخت اسٹوڈیو میں جھانک جھانک کر اتنے ہنستے کہ ان کے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ پہاڑی کے دامن میں نونہالانِ چمن ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اسٹوڈیو میں دیکھنے کی کوشش میں کبھی مسکراتے کبھی دل گیر ہوجاتے۔

کبھی کبھی اسٹوڈیو دارالحرب میں تبدیل ہوجاتا۔ میری زندگی میں بنوٹ کا فن (قدیم فن جنگ) کا غلبہ رہا ہے۔ زدبی صاحب اپنے احباب میں میرا تعارف اس فن کے واسطے سے کراتے اور اسی وقت مظاہرہ کا اہتمام ہوجاتا۔ زدبی صاحب اس فن سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی ہمشیرہ کو اس کی تحصیل کے لیے آمادہ کرلیا۔ زبیدہ نے اس فن کو دینی فریضہ سمجھ کر حاصل کیا۔ زدبی صاحب یورپ میں اس فن کو روشناس کرانا چاہتے تھے۔ زبیدہ صاحبہ تو اس فن کو جاری نہ رکھ سکیں لیکن میری لڑکی شوکت حریم نے سیکڑوں مظاہرے کیے۔

زدبی صاحب نے بنوٹ کلب کا لیٹر ہیڈ یونہی بیٹھے بیٹھے باتیں کرتے ہوئے بنا ڈالا اور چند لائنوں میں قدیم آلاتِ حرب کو ایسا سمو دیا کہ دیکھنے سے آنکھوں میں تراوت اور قلب پر ان کی ہلاکت آفرینی کا تاثر زخم کی طرح ہرا ہوجاتا ہے۔

یورپ سے واپسی پر پنجاب یونیورسٹی نے زدبی صاحب کی تصاویر کی نمائش کا اہتمام کیا۔ یہ تیس چالیس پینٹنگز رنگ و روغن سے بے نیاز خاکوں پر مشتمل تھیں۔ ہر پینٹنگ اپنی اپنی ہیئت میں مسحور کن۔ نہ عارضِ گل رنگ، نہ بکھری ہوئی زلفیں نہ سینۂ سیمیں نہ صندلی بازو، ساقِ بلوریں نہ پلکوں سے جھلکتی صہبا۔ با ایں ہمہ ہر نقش، ہر خط، رنگ و نور سے معمور۔ پینٹنگ کے مرکزی خیال کے پس منظر میں کچھ نہیں مگر افق پر فضائیں رنگ بکھیر رہی ہیں۔ زمین لالہ و گل اُگل رہی ہے۔ ذرہ ذرہ محوِ سجود ہے۔ یہ سب کچھ زدبی صاحب کے اسلوب، فن کارانہ اپچ اور جمالیاتی مشاہدات کا مظہر ہے۔

۱۹۷۷ء میں بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن میں شکوہ وجواب شکوہ کو زدبی صاحب نے تصویری لباس میں پیش کیا۔ شکوہ کا ہر شعر تاریخی حالات وواقعات اور استدلال کی دستاویز ہے۔ زدبی صاحب نے ہر شعر کو اسی طرح تصویر کے سانچے میں ڈھالا جس طرح شکوہ حالات وواقعات سے مرصع ہے جوں کا توں ان شواہد کو اپنی تصاویر میں نوکِ قلم سے ثبت فرمایا۔ بس تقطیع کر لیجیے۔

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

زدبی صاحب کی خدمت میں شرفِ باریابی کب اور کیسے حاصل ہوا کچھ یاد نہیں۔ شاید کشاں کشاں میں خود ہی ان کی خدمت میں پہنچ گیا یا وہ خود ہی میری انگلی پکڑ کر اپنے اسٹوڈیو میں لے آئے۔ اسٹوڈیو میں قدم رکھتے ہی مجسموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ آسمانِ علم وفضل کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ اقلیم ادب کی ہر جہت ان کے دم سے منور ہے جس طرف جی چاہے نکل جاؤ کہیں بھی ٹھوکر نہیں کھاؤ گے۔

رنگ وروغن کی طرف دیکھ کر گویا ہوئے۔ یہ کائنات انہی سے عبارت ہے۔ ہر چیز کو طرح طرح سے دیکھو، بار بار دیکھو۔ ان میں کھو جاؤ پھر دیکھو تمھاری تخئیل کی پریاں آنکھ مچولی کھیلیں گی، روشنی پھیلے گی، سائے سمٹیں گے، پھول مسکرائیں گے کلیاں شرمائیں گی۔ یہ کم نگاہی برداشت کرتے ہیں۔ خود بھی بے رنگ ہوجاتے ہیں اور دوسروں کا بھی رنگ اُڑا دیتے ہیں۔

میں نے اسکیچ بک دکھائی۔ میری کامری ڈرائنگوں کو یونہی ہلکی ہلکی جنبشِ قلم سے زندگی بخش دی۔ چند تراشے بین ڈرائنگ کے

والوں کے لاشعور میں اب تک موجود ہے۔
موصوف خط وکتابت کی علت نہیں پالتے۔ سال میں دو چار چھپا السٹریشن اپنے احباب کو خیریت نامے کے طور پر ضرور بھیجتے رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں زدبی صاحب کے ایک مجھ سے زیادہ عزیز دوست سے سرِ راہ ملاقات ہوگئی۔ میں نے زدبی صاحب کی خیریت دریافت کی۔ انھوں نے چند توصیفی کلمات سے انھیں نوازا اور دل گیر انداز میں گویا ہوئے۔
"یار جب ہم کراچی جاتے ہیں وہ بچوں کی طرح ہمیں چڑاتا ہے جیسے بچے کھٹی میٹھی گولیاں چکھ کر چٹخارے لے لے کر دوسرے بچوں کو چڑایا کرتے ہیں۔"
سُنا ہے زدبی صاحب نے مصوری سیکھنے کے لیے اپنا گھر در چھوڑا، لاہور آئے۔ روشنی سے ناآشنا گلی محلوں میں رہے۔ آرٹ کے ہر شعبے میں پوری پوری دسترس حاصل کی۔ شہرت نے قدم چومے۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا لاہور گھر در، دوست احباب اور اپنے پرستاروں کو چھوڑ کر کراچی کا کیوں رُخ کیا؟ انھیں لارنس، شالامار، جہانگیر کا مقبرہ، قلعہ شاہی مسجد۔ مال روڈ۔ کافی ہاؤس۔ ٹی ہاؤس اور ہیرا منڈی یاد کرتا ہے۔

آیات کا تجسیم کار

(صفحہ ۱۸۰ سے آگے)

ہیں۔ کتنی ہی کتابوں کے سرورق، ان کے موئے قلم کے مرہونِ منت ہیں۔ "توسین" کی صورت گری، زدبی جیسا نہ کرنے کی ہے ـــ کیا سادگی ہے اور کیا فن کاری ـــ شائستگی اور جستجو ان کی شخصیت کے دو نمایاں پہلو ہیں۔ خوب سے خوب تر کی تلاش ان کا مطمحِ نظر ہے، اور یہ سفر جاری و ساری ہے ـــ

تراشتا ہوں جسے میں ہزار صدیوں سے
وہ کائنات، ابھی سنگِ جستجو میں ہے

(تقدیم)

اگر میں گزشتہ روز شہاب کے یہاں چار نوشی کے لیے نہ جاتا تو بہت افسوس ہوتا۔ وہ یوں کہ پھر میں تم سے نہ مل پاتا اور اس طرح پاکستانی فنون پر وہ مواد بھی نہ ملتا جس کی مجھے ضرورت تھی۔ مجھے یقین ہے کہ تم فن کار کی قسم یاد رکھو گے اور پھر صحافی بھی اپنے "کیل" کی منصوبہ بندی پسند کرے گا۔

۲۲ جنوری ۱۹۸۲ء ـــــــ نصیر اے۔ فاروقی

اکرام بریلوی

سمتھنگ ود آؤٹ کلر کے آئینے میں

نقش گری و نقاشی فطرتِ انسانی میں داخل ہے۔ تناور درختوں کی جھومتی شاخوں پر رہنے بسنے والے پسماندہ انسان نے جب موسمی شدائد اور خونخوار جانوروں کے خوف سے جان بچانے کی سعی و تلاش میں غاروں کو اپنی آماجگاہ بنایا، اور گھنے درختوں سے اتر کر تنگ و تاریک غاروں میں پناہ لی تو تنہائی اور اکیلے پن کے عالم میں، انھوں نے غاروں کے دیوار و آثار پر آڑی ترچھی، عمودی اور افقی لکیریں، اور لایعنی نقوش بنا کر اپنی خلّاقی کا اولین مظاہرہ کیا۔ اسی طرح ہزاروں سال پہلے، نقش گری اور نقاشی کی ابتدا ہوئی، اور یہی آڑی ترچھی، عمودی اور افقی لکیریں، علامتی نشانات، رمزی کنائے، خارجی اشارے، لایعنی نقوش، دور تک پھیلی ہوئی ریت پر سالوں کی آنکھ مچولی، بہتے پانی کی سبک لہریں، شفق شام کی گلابی، سرمئی بادلوں کی سبک خرامی اور ان گنت مبہم اشکال، ارتقا کے مراحل طے کرنے پر، فنونِ لطیفہ کی بنیاد اور اساس بنتے گئے۔

انسان کی طرح، آرٹ بھی کوئی جامد اور ساکت شے نہیں کہ جہاں ہے وہیں ٹھہرا ہے..... وہ تو زندگی کی طرح حرکت و نمو میں رچا ہوا ہے۔ علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ ساتھ جوں جوں ذہن کی جلا بڑھی، اس کا اثر احساس و تخیل، حسنِ ادا کی مختلف صورتوں اور فنی محرکات

پر بھی پڑا۔ اس طرح رموز و علائم کی توجیہہ و تشریح بدلی، اور نئی نئی خیالی اور الوکھی جذباتی حقیقتوں کی باز آفرینی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آج ایک طویل مدت گذرنے پر یہ صورت فن اپنی فنی باریکیوں، جمالیاتی حُسن، ایجاد و ایجاز اور رمز آفرینی کی بدولت نقش گری و نقاشی کی جوت جگانے میں کامیاب و کامگار رہے ــــــ، فطرت انسانی نے، ان سے معنی و مفاہیم پیدا کیے، ذہن و فکر نے نئی نئی صورتیں اختیار کیں، اظہار و ابلاغ کے نئے نئے پیرائے تلاش کیے اور رفتہ رفتہ یہی آڑی ترچھی، عمودی اور افقی لکیریں علامتی نشانات، رمزی کنائے، خارجی اشارے، لایعنی نقوش اور ان گنت مبہم اشکال فن و فنکار کی انفرادی خصوصیت اور ذاتی تشخص کی پہچان بن گئے۔ اور آج مائیکل اینجلو ہوں کہ پکاسو، ولکر رو ا ہوں کہ گویا، استاد اللہ بخش ہوں کہ عبدالرحمٰن چغتائی، صادقین ہوں کہ آذر زوبی، سب ہی کو انھیں لکیروں، انھیں خطوط کے آئینوں میں سمجھا اور پرکھا جاتا ہے۔

اس پس منظر اور اس تمہید کے پیش نظر، "سمتھنگ ود آوٹ کلر" آذر زوبی کی فنکارانہ صلاحیتوں کا مکمل مرقع نہیں کہ دو سو صفحات کی کتاب میں آذر زوبی کے فن اور اس کی خلاقانہ شخصیت کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہر نوع ان جاندار لکیروں، ان دلآویز خطوط کے خم و خم، ان کے مختلف زاویوں، اشاروں، کنایوں، گولائیوں، ابھاروں کے اٹھتے گرتے خم و پیچ کی جاذبیت اور اثر انگیزی، اپنے اندر بڑے سے بڑے مصوری کے نقاد (ہنسنانہ Art) کو چونکا دینے والی صلاحیت کی مظہر ہے۔ یہی نہیں، آذر زوبی کی مصوری، مجسمہ سازی، کندہ کاری، سنگ تراشی اور سراطراقی فن خطاطی سانس لیتی، حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بلکہ اپنے خالق کی ذہانت اور فطانت میں ڈوبی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زوبی کی ہمہ جہت، ہمہ جوا اور ہمہ رنگ شخصیت اس کتاب کی اشاعت، حسن کارکردگی کے اعلیٰ اعزاز سے بے نیاز، اپنی ذات میں وہ آب و رنگ پیدا و پنہاں رکھتی ہے جس نے اسے قومی اور بین الاقوامی شہرت کا حامل بنا رکھا ہے۔ اب اسے فطرت کی ستم ظریفی تصور کر لیجیے یا سماجی و ثقافتی ضرورت یا مجبوری کہ اظہار ذات اور تشہیر صفات کے لیے فی زمانہ کتاب کی اشاعت طباعت کو ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ آذر زوبی جیسے جید فنکار کو کتاب کی طباعت جیسے رسمی مرحلے سے گذرنے کے لیے اپنی جزوی فنی تخلیقات کو کتابی شکل دینا پڑی یا بے تکلف دوستوں اور فن شناسوں کے اصرار بسیار پر ایسا کرنا پڑا کہ ایسا کرنا لابدی قرار دیا جا چکا ہے۔

آذر زوبی نے لکیر جیسی بے بضاعت اور کم آمیز شے میں گوناگوں خوبیاں پیدا کر کے، اسے سادگی و پرکاری کے ذریعہ وہ حسن تنوع عطا کیا ہے کہ ان لکیروں میں رنگا رنگی، پھیلاؤ اور وسعت کی شان آگئی ہے۔ آذر زوبی نے ان لکیروں، آڑے ترچھے نقوش، خموں کے گھماؤ، گولائیوں کے زیر و بم، لباسوں کے گھیر اور پیچ اور منظر اور موقع کی گہرائی و گیرائی کا اعلیٰ ترین مظاہرہ اپنے شہکار مورل (MURAL) بیداری (AWAKENING) میں کیا ہے۔ اس مورل میں کم و بیش بیالیس [۴۲] انسانی اشکال مختلف زاویوں اور POSTURES میں نشستہ اور استادہ ہیں، جنھیں بڑے فنی رکھ رکھاؤ، حسن ترتیب اور آرائش جمال کا شعور رکھتے ہوئے بنایا گیا ہے کہ زندگی کے مختلف طبقات اور پیشوں کی نمائندگی، ان کے احساسات و محسوسات کی ترجمانی کے ساتھ، ان کے عمل اور ردعمل کی وضاحت اس طرح اور اس بھرپور انداز میں ہو جائے کہ فن کے تمام تقاضے بھی پورے ہو جائیں اور اتنے بڑے کینوس (CANVAS) پر اتنی بڑی سیاسی الجھن اور نفسیاتی کشمکش کی وجہ سے چہرے مہروں پر انہوں نے اور ان دیکھے وسوسوں اور عزم و بیداری کی جو کیفیات موجود ہیں، وہ بھی اس طرح آشکارا ہو جائیں کہ ان کی اثر انگیزی اور شدت میں نہ کوئی کمی آنے پائے اور نہ کسی قسم کی ثقالت اور بوجھل پن ہی محسوس ہونے پائے۔ اس مورل میں زندگی کی گہما گہمی، ٹیچرز (TEXTURES) کی رنگا رنگ بزم آرائی، جذبوں کا غیر معمولی التہاب، تاثرات کی بوقلمی، مختلف اور متضاد احساسات کی نرمی و گرمی، فارمز (FORMS) اور چہروں کے اتار چڑھاؤ کو جس چابکدستی اور فنی گرفت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، وہ بجائے خود بہت بڑا کارنامہ ہی نہیں بلکہ معجزۂ فن کی اعلیٰ ترین مثال بھی ہے ــــــ

نہ جانے کیوں اور کس وجہ سے اس فن پارے کو کتاب میں شامل نہیں کیا گیا ــــــ

آذر زوبی کی مصورانہ فن کاری زندگی اور ابدان سے عبارت ہے۔ زوبی کے ہاں زندگی اور تجسیم میں بس ایک ہی علامتی یا فلسفیانہ رشتہ دکھائی دیتا ہے۔ دراصل یہ رشتہ زندگی اور ابدان کے تضاد و تفاوت میں مضمر ہے۔ اجسام و ابدان ادلتے بدلتے اور مختلف شکلیں اختیار کرتے رہتے ہیں اور زندگی لامتناہی اور غیر مختتم حقیقت کی علامت کے طور پر جاری و ساری رہتی ہے۔ آذر زوبی زندگی کی بھرپور عکاسی کے لیے اپنے فن کے ذریعہ زندگی کو رنگ و آہنگ سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ زوبی کا فن اسے زندگی میں جھنجھلاہٹ اور کھولت کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ وہ روایتی مایوسی، اداسی، غمزدگی یا یاسیت کا پرچار نہیں کرتا بلکہ اس کا فن زندگی کی صحت مند امنگوں اور رنگوں سے عبارت ہے اس کے فن پاروں سے زندگی کی شعاعیں پھوٹتی اور کائنات کی شانہ آرائی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں پیش نظر کتاب کو ورق تا ورق دیکھ جائیے آپ کو ایک دیر کے علاوہ کوئی ایسا نقش ابھرتا دکھائی نہیں دے گا جس میں غم و اندوہ کا کرب یا مایوسی و غمزدگی کی تھکی تھکی اکتاہٹ کی جھلک نظر آئے۔ سوپر بھوک سے نڈھال ایک ایسی ماں کی ہے جو اپنے بچوں کو اپنی کوکھ سے اس لیے لگائے بیٹھی ہے کہ زندگی کی ہر ممکن خوشی انھیں دے سکے تاکہ بڑے ہو کر وہ زندگی کا وار سہنے اور جہد اللبقا کا راز سمجھنے کے قابل ہو جائیں اور اپنی زندگی مثبت اقدار کے مطابق استوار کر سکیں۔ اگر باریک بیں نظر سے دیکھا جائے تو زندگی کا یہ رُخ بھی امید کی خوشی سے خالی نہیں کہ اس میں بھی شب کی ظلمتوں سے صبح کے اجالے جھانک رہے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا طرز احساس ہے جسے کسی صورت متشائم نہیں کہا جا سکتا۔

آذر زوبی کی ایک اور خصوصیت زندگی میں نظم و ضبط کا ایک ایسا تصور پیش کرنا ہے جس سے زندگی میں پُروقار سنجیدگی اور کلاسیکی رچاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس تصور کو زوبی نے اپنے فن بلکہ اپنی روزمرّہ زندگی کے معمولات کا حصہ بنا لیا ہے اور اس طرح کہ اس تصور کے اپنانے سے اس کی فن کارانہ شخصیت میں کوئی تھکا دینے والا مصنوعی انداز یا میکانکی یکسانیت پیدا نہیں ہونے پاتی۔ آج کی بناوٹی مجلسی زندگی کے لیے اس کا یہ رویہ بڑا تسکین بخش اور حقیقت پسندانہ (REALISTIC) ہے کیوں کہ اس رویئے نے زوبی کو آج کی تیز رفتار اور منافقانہ زندگی سے تباہ کرنے اور جینے کا سلیقہ سکھا دیا ہے۔ غالباً اسی لیے اُس کی کوئی تصویر کوئی نقش تنہا تنہا اور زندگی سے الگ تھلگ اور اکیلا نظر نہیں آتا۔ رسم بسم اللہ سے لے کر ایک سو ستر (۱۷۰) تک دیکھ جائیے، کوئی تصویر اکیلی اور تنہا نظر نہیں آئے گی۔ اگر انسان انسان کے ساتھ نہیں تو مناظر قدرت یا پس منظر میں انسان ہے یا انسان مناظر قدرت و فطرت سے مصروف کلام ہے۔

آذر زوبی کی پن ڈرائنگز (PEN DRAWINGS)، اسکریپر بورڈ ڈرائنگز (SCRAPPER BOARD DRAWINGS)، مجسمہ سازی، کندہ کاری اور سنگ تراشی میں ایک چیز قدر مشترک کے طور پر حاوی نظر آتی ہے۔ اس قدر مشترک کو ذرا سی وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس کی ڈرائنگز میں مجسمہ سازی اور سنگ تراشی کی کیفیت جاری و ساری ہے اور مجسمہ سازی و سنگ تراشی میں ڈرائنگز کا خوبصورت امتزاج دکھائی دیتا ہے اور یہ بھی اپنی جگہ ایک عجیب و غریب اور دلکش حقیقت ہے کہ زوبی کی صورت فن کے ان تمام (بلکہ خطاطی میں بھی) میڈیمز (MEDIUMS) میں لکیروں کے خم و پیچ اور کلاسیکی پھیلاؤ کی سحر طرازی جلوہ ریز و جلوہ فگن ہے۔

ان فنی خصوصیات سے قطع نظر "سمتھنگ ود آوٹ کلر" اپنی سج دھج میں سادہ و پرکار رہتے ہوئے نہ صرف دیدہ زیب اور دلکش ہے بلکہ ترتیب و پیشکش کے اعتبار سے بھی جمیل و جلیل ہے۔ پن ڈرائنگز کی رسم بسم اللہ سے لے کر اسکریپر بورڈ ڈرائنگز، جنم کنڈلی، سوختہ فتنہ، موت سے پہلے (PRIMA DELLA MORTE) اور سنگ تراشی اور مجسمہ سازی تک آذر زوبی نے فن مصوری و صورت گری کے جوہر علام کی جس نم و نمو کے ساتھ نمائش کی ہے وہ بہت کم مصوروں کی فنی گرفت میں آپاتے ہیں۔ کتاب میں شامل پلیٹس (PLATES) کی تفصیل و تشریح کچھ اس طرح ہوتی ہے: پن ڈرائنگز چوبیس[۲۴]، اسکریپر بورڈ ڈرائنگز چودہ[۱۴]، جنم کنڈلی چودہ[۱۴]، سوختہ فتنہ گیارہ[۱۱]، موت سے پہلے پانچ (۵)

اکرام بریلوی   نذر زوبی   "سمتھنگ ود آرٹ کلر" کے آئینے میں

اسکلپچر (SCULPTURES) پندرہ[۱۵] ۔ اس طرح پوری کتاب تراسی[۸۳] فن پاروں سے مرصع اور مزین ہے ۔ بائیس[۲۲] صفحات پر مشتمل عشرت حسین کا تعارفی مضمون اور تتمہ کے طور محمد علی صدیقی (ARIEL) کا مختصر مگر جامع فلیپ اس کے علاوہ ہے ۔

اس کتاب کو دیکھ کر یہ حقیقت بہر نوع واضح ہو جاتی ہے کہ آذر زوبی کا فن مصوری، صورت گری، نقاشی، خطاطی، مجسمہ سازی اور سنگ تراشی سے گہرا بلکہ والہانہ لگاؤ ہے ۔ وہ اظہار فن کے سلسلے میں گہری دلچسپی، بھرپور محنت اور دیانتداری کا قائل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ "سمتھنگ ود آرٹ کلر"، مصوری، سنگ تراشی، مجسمہ سازی اور کندہ کاری میں یکساں طور پر فن کارانہ جلال و جمال اور آرائش جمال کا لازوال مرقع ہے اگرچہ اس میں آذر زوبی کی بعض معرکۃ الآرا فنی تخلیقات شامل نہیں ——— ●

آج جناب آزر زوبی سے کئی سالوں کے بعد ملاقات کا شرف حاصل ہوا، بس روح کی تسکین کا سامان ہوا ہے ۔ زوبی پاکستان میں جس کام میں لگے ہوئے ہیں، بس تعجب ہی ہوتا ہے ۔ ان کی ثقافت اور آرٹ میں جو CONTRIBUTION ہے وہ ایک روشنی کا مینار ہے ۔ ان کے ذاتی جہاد سے پاکستان کی آن قائم و دائم ہے ۔ میں کناڈا میں رہتا ہوں اور زوبی کے کام پر ہم سب فخر سے سر بلند رکھتے ہیں ۔ اب تو باقاعدگی سے اردو انٹرنیشنل میں ان کا کام شائع ہو رہا ہے ۔ خدا انھیں سلامت رکھے ۔

۲۷ر جون ۱۹۸۴ء ——————— انوار احمد مقیم ٹورنٹو (کینیڈا)

○

میرا زوبی بھائی سے ملنا میرے لیے عزت و خوشی کا باعث ہے ۔ وہ ایک عظیم شخص ہیں اور ان کا کام اپنے اندر عظمتیں سمیٹے ہوئے ہے ۔ وہ پاکستان کے لیے عزت کا سرمایہ ہیں ۔ اللہ ان کے کام میں برکت دے اور انھیں توفیق دے کہ وہ اپنا بے لوث کام جاری رکھیں ۔

۴۴ر اگست ۱۹۶۵ء ——————— محمد اسحاق ارشد

○

زوبی کا نگار خانہ دیکھا اور میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا کیوں کہ زوبی میرا بچپن کا ساتھی اور ہم وطن ہے ۔

۱۴ر اگست ۱۹۵۰ء ——————— سید اشرف کاظمی

طامود

زوبی کے کولمبس

(انٹرویو)

کہتے ہیں کہ ہر حساس ذہن اپنا اظہار چاہتا ہے۔ اظہار کی اسی خواہش نے فنونِ لطیفہ کو جنم دیا ہے۔ کہیں یہ اظہار الفاظ میں ہوتا ہے کہیں آواز میں، تو کہیں رنگوں میں، اٹلی کی اکیڈمیا دلی بیلے آرٹ سے پی ایچ ڈی کرنے والے آذر زوبی نے اپنے لیے صرف رنگ چنا۔ کیوں چنا اس کا جواب آذر زوبی کے پاس یہ ہے کہ "بس غلطی ہو گئی"۔

س: کب ہوئی یہ غلطی؟

ج: بچپن میں۔ بہت مار پڑی تھی۔ پہلی مرتبہ جب تصویر بنائی تھی۔

س: کیا بنایا تھا؟

ج: عورت

س: پھر کیا بنایا؟

ج: عورت۔

س : وجہ ؟

ج : جس سے پہلی مرتبہ متاثر ہوا وہ عورت تھی ۔

س: کون تھی وہ ؟

ج : میری ماں .... دوسری عورت جس سے متاثر ہوا وہ میری بہن تھی۔ تیسری بیٹی ۔

س: اور بیوی ؟

ج : یہ عورت کا بدترین روپ ہے ۔

س: آپ اپنے تجربے کی روشنی میں بات کر رہے ہیں ؟

ج : کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے، عورت ماں بہن اور بیٹی کے روپ میں قابل پرستش ہوتی ہے۔ اس کا ایک اور روپ ان سب سے اچھا ہوتا ہے۔ وہ ایک دوست کا، کہ اس میں وہ بیک وقت ماں بہن اور بیٹی تینوں کا روپ دھار لیتی ہے۔ لیکن جب وہ بیوی بن جاتی ہے تو ناقابل برداشت ہوتی ہے ۔

س: ایسا کیوں ہے، آپ نے سمجھنے کی کوشش کی ۔

ج : نہیں نہیں، یہ سمجھنے کی چیز نہیں جس نے عورت کو سمجھنے کی کوشش کی اس نے حماقت کی۔ اس کو FEEL کریں۔ اس کی خوشبو چاہے کڑوی ہی کیوں نہ ہو ۔

س: کڑوی خوشبو کی کیا مثال ہے آپ کے سامنے ...... ؟

ج : بیوی

س: بہت سے لوگوں کو بڑی پیاری ہوتی ہے ۔

ج : جھوٹ .... انہیں سچ بولنا نہیں آتا ۔

س: اچھا یہ بتایئے تعلیم کے متعلق کیا خیالات ہیں آپ کے ؟

ج : تعلیم دیتی کچھ نہیں۔ بگاڑ دیتی ہے۔ اصلی رنگ و روپ پر ملمع چڑھا دیتی ہے۔ بلکہ راکھ ڈال دیتی ہے ۔

س: کتنی راکھ پڑی آپ پر ؟

ج : بے پناہ۔ جبھی تو اپنے آپ کو نکالنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں ۔

س: کچھ کامیابی ہوئی ؟

ج : بہت مشکل ہے۔ بچپن سے یہ راکھ پڑتی رہی۔ ہم اتارنے کی کوشش کرتے رہے ہیں تو کچھ اور پڑ جاتی ہے۔ دراصل انسان کو اس تعلیم کی ضرورت ہی نہیں جو دی جا رہی ہے ۔ سارے تہذیبی عناصر اس تعلیم پر BASE کرتے ہیں۔ یہ جو شعور لاشعور کی Schooling کہتے ہیں۔ یہ سب غیر فطری ہے ۔

س: تعلیم پھر کیسی ہونی چاہیئے ؟

ج : عین فطری تقاضوں کے مطابق۔ اس وقت ہم ۹۹.۹ فیصد غیر فطری زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ دنیا SO CALLED ترقی تو بہت کر رہی ہے لیکن یہ ترقی تہذیب کے کنارے سے جا رہی ہے قرآن کریم جو اللہ کا کلام ہے اس میں لکھا ہے ۔

"ہم نے ہر چیز کو تیری بہتری اور آسانی کے لیے پیدا کیا ہے ۔"

ہم نے اسے رد کر کے اپنے لیے مشکلیں پیدا کرلی ہیں۔ ہر چیز کو بگاڑ کر مٹی پلید کردی ہے۔ اور زندگی کو وہ رنگ دے دیا ہے جو غیر فطری ہے کتنی عجیب بات ہے کہ جو لوگ اس SO CALLED تعلیم سے بچ گئے ہیں وہ عظیم لوگ ہیں۔

س: مثلاً ....؟

ج: بلھے شاہ .... وہ کہتا ہے "اس علم سے مجھے باز رکھو" اللہ کے پیارے اور درویش جو ہوتے ہیں وہ قابلِ تحسین ہیں۔

س: وہ علم کیا ہے جو فطرت کی طرف لوٹا دے۔

ج: لوگ اب اس سے کوسوں دور جا چکے ہیں اگر ہو سکے تو یہ مصنوعی لبادے پھینک دیں مگر یہ کینچلی اتارنا بہت مشکل ہے۔ اپنے آپ کو STUDY کریں۔

؎ اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

لیکن یہ تپسیا کی منزل ہے۔ بہت مشکل ہے پانچ منٹ ہم خاموش اپنے آپ سے باتیں کرنے نہیں بیٹھ سکتے اپنے آپ سے باتیں کرنا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا ہم نے اس سے بھی گریز کا طریقہ نکال لیا۔ اس میں وظیفہ بازی اور چلہ بازی شروع ہو گئی۔ یہ بھی اپنے آپ سے بچنے کی کوشش ہے۔ رسولِ اکرمؐ نماز میں بیٹھ کر اللہ میاں سے باتیں کرتے تھے۔ کوئی چلہ نہیں کاٹتے تھے۔ ان کا براہِ راست تعلق اللہ سے تھا۔ گوتم بدھ کی مثال لیں۔ وہ بھی خالقِ حقیقی سے تعلق میں من کے ساتھ الفاظ کا سہارا نہیں لیتا تھا۔ جس وقت یہ علم آ جائے یعنی عین فطری تقاضوں کے مطابق رشتہ قائم ہو جائے۔ اور اس میں سے "میں" نکل جائے۔ پھر اپنے آپ کو اس کی رضا پر چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ پھر نہ تو دنیا کی کسی شے سے نفرت ہوتی ہے نہ محبت' بلکہ سکون ہی سکون ہوتا ہے۔ جس کا اللہ میاں نے وعدہ کیا ہے۔ جو ہمارے لیے نعمت ہے۔ جس کی تلاش میں انسان غیر فطری ملمع چڑھا کر دوسری سمت چلا گیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ بہت دور نکل گیا ہے۔

س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے یہ منزلیں طے کرلی ہیں؟

ج: ایسی باتیں نہیں کہی جاتی۔ میں بس یہ کہوں گا کہ غیر فطری علم نے ہمیں ہر شے کی DIMENSION ناپنے پر لگا دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم گلاب اور نرگس کی اصلیت سے محفوظ ہوتے ہم نے اس کی ڈالیوں' کانٹوں' پتیوں اور سائز پر توجہ لگا دی ہے۔ اور ہم اس کے حسن سے دور چلے گئے۔

س: ابھی بھی آپ کی پینٹنگ میں زیادہ تر عورتیں ہوتی ہیں۔ وجہ؟

ج: میں نہیں کہوں گا کہ عورت خوب صورت ہوتی ہے۔ میں اسے خوبصورتی میں نہیں شمار کرتا شاعر اور نام نہاد عالم جو عورت کے حسن اور تناسب کی بات کرتا ہے۔ وہ عورت سے دور ہو جاتا ہے۔ وہ صرف DIMENSION کی بات کرتا ہے وہ اس کا قد دیکھتا ہے۔ ۵ فٹ ۵ انچ ہے۔ اس کے جزو کو دیکھتا ہے مجھے کل چاہیے جزو نہیں۔ مکمل عورت' اس کا حسن نہیں اور آج علم صرف جزو پر توجہ دیتا ہے۔ تفاوت سکھاتا ہے۔

س: مصوری میں آپ کس تحریک سے متاثر ہیں؟

ج: یہ تحریکیں جو ہیں' دراصل غیر فطری علم ہی کے مدارج ہیں۔ جب SO CALLED ذہنی ارتقاء ہوتا ہے وہ نظریات قائم کرتا ہے پھر کوئی اسے غلط ثابت کر دیتا ہے۔ پھر دوسرا نظریہ پیدا ہوتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد اسے بھی بکواس ثابت کر دیا جاتا ہے یہ سب جزو میں بھٹکنے سے ہوتا ہے۔ جب آپ کُل کی تلاش کرتے ہیں ایسا نہیں ہوتا۔ ایک زمانہ تھا جب انسان نے بولنا شروع کیا تھا تو الفاظ کی مشکل نہیں تھی۔ وہ اس وقت بھی اپنا مافی الضمیر دوسروں تک پہنچا دیتا تھا۔ پھر آوازوں کی ہیئت پیدا ہوئی۔ پھر ڈائلزائیشن پیدا ہوتا ہے اس نے اس شکل دی۔ اور حروف تہجی بنے پھر ڈکشنری بنتی چلی گئی۔ اب ہم الفاظ کا سہارا لے کر اپنا مطلب واضح کرنا چاہتے ہیں۔ مگر پھر بھی بہت کم حصہ دوسروں تک پہنچ پاتا ہے۔ بہت

حصہ ہم الفاظ اور آواز میں نہیں لا سکتے۔ اس کے لیے اس درویشانہ علم کی ضرورت ہے جو الفاظ کا سہارا نہیں لیتا۔

ــــــہ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔

س: آپ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے رنگوں کا سہارا تو نہیں لیتے، میرا مطلب اظہار سے ہے؟

ج: نہیں رنگوں سے بھی بات نہیں بنتی۔

س: پھر پینٹنگ کیوں کرتے ہیں؟

ج: تضیع اوقات ہے۔ وقت گزارنے کا بہانہ ہے لوگ سمجھتے ہیں میں افلاطون ہوں لیکن یہ سراسر تضیع اوقات ہے۔

س: کبھی چھوڑنے کی کوشش کی۔

ج: کئی دفعہ چھوڑا۔ مگر پھر واپس آگیا۔

س: زوبی صاحب کچھ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیے۔؟

ج: آپ پوچھئے؟

س: پیدا کہاں ہوئے؟

ج: قصور میں۔

س: وہی میرا سوہنا شہر قصور نی؟

ج: ہاں وہی جہاں کی میتھی، جوتی اور لوز جہاں بہت مشہور ہے۔

س: اب اس میں زوبی کو بھی شامل کر لیں؟

ج: مرضی آپ کی۔

س: کراچی کب آئے؟

ج: پہلی مرتبہ ۱۹۵۰ء میں آیا۔ پھر آتا جاتا رہا گیا۔

س: یعنی؟

ج: ۱۹۵۰ء میں آیا پھر لاہور چلا گیا۔ پھر آیا پھر چلا گیا۔

س: پھر یہاں پر مستقل قیام کب سے ہے؟

ج: تیسری مرتبہ جب کراچی آیا ۱۵ دسمبر ۱۹۵۴ء میں۔ تب سے مستقل قیام یہیں ہے۔

س: اسکول آف ڈیکور کیوں قائم کیا؟

ج: وقت گزاری کے بہانے ہیں سب سے پہلے ایک پبلشنگ ہاؤس بھی بنایا تھا۔ پریس بھی لگایا تھا اور ایک رسالہ بھی نکالا تھا شعور۔

س: پھر بند کیوں کر دیا؟

ج: یہاں لوگوں کو شعور کی ضرورت نہیں تھی۔

س: یہ اسکول بند کرنے کا ارادہ تو نہیں؟

ج: نہیں۔!

س: طلبہ آجاتے ہیں اچھی خاصی تعداد میں ؟

ج : ہاں بہت بلکہ دو طالبات تو حیدرآباد سے ہفتے میں دو دن لیکچر سننے آتی ہیں۔

س: پینٹنگ کس وقت کرتے ہیں آپ ؟

ج : پتہ نہیں ..... مجھے نہیں معلوم یہ کس وقت بن جاتی ہیں۔ دراصل اس سے آسان کوئی کام نہیں میرے لیے ۔

س: آپ کے بنائے ہوئے زیادہ تر مجسمے ادیبوں اور شعراء کے کیوں ہیں ؟

ج : ہر وقت انہی کا ساتھ رہتا تھا۔ ان میں سے کچھ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ یہ مجسمے ان کی زندگی میں بنائے گئے تھے۔ باقی بھی مرجائیں گے انشاءاللہ

قارئین ! بہت سے لوگ کہتے ہیں آذر زوبی درویش صفت ہے۔ اب آپ بھی اس کی باتوں سے اسی نتیجے پر پہنچیں تو جانبدار نہیں جانیے گا کہ ہم نے وہی کچھ لکھا ہے جو اس نے کہا۔ تصدیق کرنا ہو تو کراچی کے سینٹرل ہوٹل میں SCHOOL OF DECOR میں چلے جایئے۔ فن اور فنکار دونوں سے ملاقات ہوگی۔ اور خلوص آلودہ چائے کی ایک پیالی بھی ملے گی۔ تاکہ آپ فن کا اصلی ذائقہ چکھ سکیں۔ ●

کیسے؟
macleans
macleans
دانتوں کی مکمل ترین حفاظت!
8-3-87
ASIATIC

- زوبی کا شکوہ
- آزر کی تمثال گری
- لکیروں کا بادشاہ ـــــ زوبی
- علّامہ اقبال ـــــ آزرزوبی کی نظر میں

انتظاریہ

حکیم محمد سعید

زوبی کا شکوہ

فنونِ لطیفہ کی مختلف اصناف کو عام طور پر منفرد پیراہن میں دیکھا جاتا ہے کیوں کہ ان کی آزادانہ انفرادیت ہی ان کے لیے مختلف ہونے کا جواز ہے۔ اگر موسیقی یا بت تراشی کی گہرائیوں اور باریکیوں کو سمجھنے کے لیے تحریری وضاحتوں کی ضرورت ہوتی تو کیا ہوتا؟

ہر فن کار بہر حال کسی مخصوص محرک سے متاثر ہو کر اپنے فن کی حدود میں اپنے تاثرات کے اظہار کا مجاز ہے۔ ہر ادراکی محرک کسی فن کار کے لیے نقشِ فریادی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مرقعِ چغتائی اگر مرزا غالب کا مرہونِ منت ہے تو زوبی کا یہ تصویری عمل شاعرِ مشرق کے لیے خراجِ تحسین ہے۔

اردو ادب میں علامہ اقبال کے شکوہ کو وہی اہمیت حاصل ہے جو انگریزی ادب میں ملٹن کی تصنیف "فردوسِ گم شدہ" (پیراڈائز لاسٹ) کو، مگر "شکوہ" کا اپنا منفرد انداز ہے۔ یہ وہ نظم ہے جس کے ذریعے میں نے علامہ کا نامِ نامی پہلی مرتبہ سنا۔ میرے خیال میں یہ نظم جہاں مسلمانوں کو عظمتِ رفتہ کا احساس دلاتی ہے وہاں ان کے حال کی جانب بھی متوجہ کرتی ہے اور اس کے

ساتھ ان میں عزم و حوصلہ اور عرفانِ نفس بھی پیدا کرتی ہے۔

"شکوہ" کے آئینے میں مسلمان اپنے ماضی، حال اور مستقبل کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں تخیّل کی پرواز، بلندیِ خیال، معنی آفرینی اور شاعری کے جملہ محاسن علّامہ اقبال کی تمام انفرادی، فنّی اور تخلیقی خوبیوں کے ساتھ موجود ہیں۔

ایک مصوّر کے لیے اس سے بڑا چیلنج کیا ہو سکتا ہے کہ ایسی بلند خیالی اور معنی آفرینی کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرے۔ شاعری اور مصوّری دونوں فنونِ لطیفہ ہیں، دونوں کا اپنا اپنا جداگانہ مزاج ہے، دونوں کی اپنی اپنی حدود ہیں۔ ان دونوں فنونِ لطیفہ کا آمیزہ کامیابی کے ساتھ پیش کرنا واقعی مشکل کام ہے۔

زوبی نے فنِ مصوّری میں اپنے لیے ایک منفرد مقام حاصل کرنے کی جو کوشش کی ہے موجودہ مرقع اس کوشش کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے۔ زوبی کا پسندیدہ میڈیم "قلم اور روشنائی" ہے۔ رنگ و لہو کی دنیا میں اس عمل کی بے شمار پابندیاں ہیں اور ان پابندیوں کے دائرے میں رہتے ہوئے فن کاروں کو صرف قلم اور روشنائی سے اظہارِ خیال کرنا ہوتا ہے جو رنگ اور برش استعمال کرنے والے فن کار سے کلیتاً مختلف ہوتا ہے، مگر ان حد بندیوں کے باوجود "قلم اور روشنائی" کے عمل کی اپنی خوبیاں ہوتی ہیں اور ایک تجربے کار فن کار کے ہاتھ میں موقلم بھی گل فشانیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ "شکوہ" کو اس انداز میں تصویری پیراہن دینا زوبی ہی کا حصّہ ہے۔ میں زوبی کو عرصۂ دراز سے جانتا ہوں اور میرے دل میں اِن کی لگن اور اپنے فن سے محبّت کی قدر ہے تاہم

ع ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

وہ مصوّری ہی کیا جو وضاحت چاہے۔ زوبی کی کاوش آپ کے سامنے ہے۔ علّامہ اقبال کا منفرد اندازِ تخیّل و تکلّم بھی آپ کے سامنے ہے، فیصلہ آپ ہی کیجیے کہ شاعر اور مصوّر اس مرقع پر کہاں تک ہم آہنگ ہوئے ہیں۔

آذر زوبی ایک منفرد مصوّر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر مجسّمہ ساز بھی ہیں اور اس راہ میں بھی انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا خوب صورت اظہار کیا ہے۔ مصوّری اور مجسّمہ سازی دونوں کے مختلف تقاضوں کی تکمیل کے لیے جس وسعتِ ذہن اور مہارت و محنت کی ضرورت ہے وہ زوبی کا حصّہ ہے۔

کیا عجب کہ جو مقبولیت اقبال کے "شکوہ" کو ملی ہے وہی زوبی کی ان تصاویر کے حصّے میں بھی آجائے اور یہ زوبی کا شکوہ کار ثابت ہوں۔

نذرِ زوبی

مظفر علی سیّد

آزر کی تمثال گری

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں! — خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں — کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

قرۃ العین حیدر نے تیس ایک برس پہلے لکھا تھا کہ آزر زوبی بنیادی طور پر ایک مجسمہ ساز ہے۔ یہاں تک کہ اس کی "تصاویر کی اشکال نمک کا ستون معلوم ہوتی ہیں جنھوں نے مڑ کر دیکھا اور پتھروں میں تبدیل ہو گئیں۔"
اس کے تقریباً ربع صدی کے بعد عشرت حسین صاحب کو جو فنِ تعمیر سے وابستہ ہیں زوبی کے بنائے ہوئے مجسموں میں بھی ایک مصوّر کا موقلم کارفرما نظر آیا یہاں تک کہ چہروں کی سطح کے مقابلے میں اس کی دلچسپی چہروں کے خطوط میں کہیں زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ آج مڑ کر دیکھیں تو مشکل لگتا ہے کہ اس کی مصوّری، نقاشی، تزئین کاری، کتاب آرائی، معلّمی اور مجسمہ سازی میں سے کون سے کام کو اوّلیت دی جائے۔ شاید یہ سب خصائص مل جل کر ہی اس نئی شخصیت کی تشکیل کرتی ہیں جسے ہم آزر زوبی کے نام سے جانتے ہیں۔

یہ خصوصیت تخلیقی فن کاروں میں بالعموم پائی گئی ہے، چاہے کوئی اسے خوبی سمجھے یا خرابی قرار دے کہ وہ خال خال ہی یک فنی رہنے پر راضی ہوتے ہیں یعنی اپنے آپ کو کسی ایک میڈیم یا تخلیقی فن کے کسی ایک مظہر تک محدود نہیں رکھتے۔ وہ چیز جسے علوم کی دنیا میں خصوصی

مہارت اور صنعت و حرفت کے میدان میں تقسیم کار کہا جاتا ہے، فن کاروں کے لیے بہت کم قابلِ قبول ہوتی ہے۔ اس لیے کہ فنی تخیّل اپنی تجسیم کے لیے نت نئے سانچے اور چلتے انجانے پیکر تراشنا پسند کرتا ہے۔

تاہم اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کے مصوّروں، نقّاشوں اور تزئین کاروں کے درمیان آزر زوبی کا پہلا امتیاز یہی ہے کہ اس نے مجسّمہ سازی کے فن پر خاص توجہ صرف کی ہے۔ حتیٰ کہ ابھی تک اس میدان میں ہمارے یہاں اس کا کوئی مدِّ مقابل بلکہ متقابل بھی سامنے نہیں آیا۔ یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ جب اس نے اپنی نوجوانی میں ہی آزر کا نام اختیار کیا۔ (زوبی تو اس کے سٹوڈیو کا نام تھا جو بعد میں اس کے ساتھ منسّلک ہو گیا) تو گویا فنِ مجسّمہ سازی کو اپنی شناخت قرار دینے کا عہد کیا تھا۔ لیکن اب وہ مدّت سے اپنی تصویروں پر آزر زوبی کا مخلوط نام لکھتا ہے اور اکثر صرف زوبی کہہ کے یاد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی نئی شخصیت کے مختلف عوامل میں اس کی آذری (مجسّمہ سازی یا تمثال گری) قدرے دب کر رہ گئی ہے۔

اور اس میں حیران ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں۔ پاکستان میں ایک مجسّمہ ساز کے لیے سب سے بڑا مسئلہ تو اپنے وجود کو قائم رکھنے ہی کا ہو سکتا تھا۔ ایک مسلمان کے لیے بُت گری کی بجائے بت شکنی لازم سمجھی گئی ہے حالانکہ الحمرا میں قصر اللّیوث کے بنانے والے مسلمان ہی تھے اور یہ مسلمان کوزہ گر ہی تھے جو مٹّی کے برتنوں کے ساتھ مورتیاں بھی بنایا کرتے تھے۔ بُت گری کے لیے بُت پرستی لازم نہیں، البتہ بت شکنی کے لیے خود شکنی مزید لازم ہے ؂

ہر چند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

غرض یہ مسئلہ دینیات کے علاوہ شخصیات کا مسئلہ بھی ہے۔ مجسّمہ ساز اپنی شخصیت کو اسی طرح اپنے کرداروں کی رگ رگ میں پیوست کر دیتا ہے جیسے کوئی ڈراما نگار۔ وہ خود کبھی براہِ راست ہمارے سامنے نہیں آتا جب کہ مصوّری میں اپنی ذاتی شبیہ بنانے کی روایت موجود ہے اس لحاظ سے شاید فنِ تعمیر کو سب سے زیادہ غیر ذاتی فن قرار دیا جائے لیکن اس کے بعد یقیناً مجسّمہ سازی کا مرتبہ ماننا پڑے گا کہ یہاں بھی شخصی اسلوب اور تکنیکی مہارت کی شکل میں ہی فن کار کا تشخص اُبھرتا ہے۔

حیرانی کی بات اتنی البتہ ضرور ہے کہ آزر زوبی نے ۱۹۴۸ء سے لے کر جب اس نے لاہور میں ممتاز اردو ادیبوں کے چہروں کو قالب میں ڈھالنا شروع کیا تھا، مجسّمہ سازی کا فن کسی وقت بھی ترک نہیں کیا بلکہ شدید قدغن کے سامنے بھی رکھنے کی جگہ کنّی کاٹ کر گزرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے دریافت کیا کہ ہر چیز جسے سہ وسعتی ساخت میں بنایا جائے، چاہے چھوٹی ہو یا بڑی، ایک قسم کا مجسّمہ ہوتی ہے یعنی کوزہ بھی ایک قسم کا مجسّمہ ہے اور قائداعظم کا مزار بھی۔ کوزہ گری کی طرف تو خیر اس نے کبھی رغبت نہیں کی (اگرچہ یہ کام پکاسو تک نے کیا ہے) لیکن تعمیراتی کام اس نے "بیرونی تزئین کاری" کی شکل میں ضرور کیا ہے۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کے صحن میں اس نے جو مرکزی چبوترہ بنایا ہے، فنِ مجسّمہ سازی کی ایک حیرت کن توسیع نہیں تو کیا ہے؟ اس کے علاوہ اس نے خطّاطی کو بھی مجسّم کیا ہے جو عشرت حسین صاحب کے خیال میں اس کی ایجاد ہے۔ اس نے پتّھر، سیمنٹ، لکڑی اور تانبے کو خطِ نسخ کی گولائیاں اور مضبوطیاں دکھانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ پورٹ ٹرسٹ کے مرکزی چبوترے کے تین دائروں میں سب سے نچلے دائرے میں مختلف بحری جہازوں اور کشتیوں کے ماڈل جڑے ہیں۔ دوسرے دائرے میں آیاتِ قرآنی ترجمے کے ساتھ اُبھرے ہوئے حروف کی صورت میں متشکل ہیں اور سب سے اوپر اللہ کا نام نقش کیا ہے جو چاروں طرف سے برابر دکھائی دیتا ہے۔ مجموعی طور

پر یہ چبوترہ غیر تمثالی مجسمہ سازی کا ایک مرعوب کن نمونہ ہے لیکن اس کا مجموعی تاثر جو چبوترے کے گرد گھومنے پر مجبور کرتا ہے ایک ایسی وحدتِ فن کی مثال ہے جو آزر زوبی کے سوا شاید ہی کوئی پیش کر سکتا۔

چھوٹے پیمانے پر چوب تراشی میں اس کی خطاطی کے نمونے ہیں جنھیں ایک مسطح اور ہموار چوبی فریم میں برجستہ خطوط کی طرح جوڑا گیا ہے۔ ان میں سے پنجتن پاک کا ایک طغریٰ ہے جو پانچ ناموں کی انفرادی خصوصیات، ان کے باہمی ربط اور ان کی مجموعی وحدت کو ایک ایسے ہم آہنگ نقش کی صورت میں پیش کرتا ہے کہ کسی ایرانی خطاط کے لیے بھی قابلِ رشک ہو۔

بعض اوقات اس نے اپنی کسی ڈرائنگ یا تصویر کو مجسّمے کی شکل دے دی ہے ان میں سب سے ممتاز "ماں اور بچّہ" کی ایک شبیہ ہے جو کسی حد تک تجریدی ہونے کے باوجود، یا شاید اسی وجہ سے تصویر سے آزاد ہو کر اپنی ایک جداگانہ حیثیت قائم کرتی ہے۔ ماں اور بچّے کا آمنے سامنے ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہونا مجسّمے کی شکل میں ایک عجیب مدوّر قسم کی حرکت پیدا کرتا ہے اور اس کے باوجود دونوں تمثالیں اپنی اپنی جگہ مستحکم نظر آتی ہیں۔ ایسی نزاکت کے ساتھ ایسا استحکام ایک ماہرِ فن مجسمہ ساز ہی پیش کر سکتا ہے۔ اس خاص مجسّمے کی ایک خصوصیت اس کی نیم تجریدی ہیئت کش ہے جو اشکال کی حد تک عظیم برطانوی مجسمہ ساز ہنری مور کی یاد دلاتی ہے جس سے ۱۹۵۲ء میں آزر زوبی کی ملاقات اٹلی میں ہوئی تھی اور جس نے زوبی کے کام کو سراہا بھی تھا۔ لیکن ماں بچّے کی ایک دوسرے سے الگ رہتے ہوئے بہم پیوستگی غالباً مغرب کے کسی جدید مجسمہ ساز کے یہاں نہیں ملے گی۔ بعض تجریدی مجسّموں میں (خصوصاً اس چلبلی شبیہ میں جو زوبی کے سکول آف ڈیکور کے باہر نشان کے طور پر دھری ہے) ہنری مور کا اثر زیادہ نمایاں ہے لیکن یہ چلبلا ری اپنے یہاں کی چیز لگتی ہے۔

پھر بھی مجسمہ سازی کے فن میں آزر زوبی کا سب سے اہم کام وہ چہرے ہیں جو اس نے ۱۹۴۸ء میں بنانے شروع کیے تھے اور جن کا سلسلہ وقتاً فوقتاً رک رک کر چلتا ہوا، اب چالیس سے زیادہ چہروں تک جا پہنچا ہے۔ یہ کام اس نے ۱۹۵۰ء میں لاہور چھوڑنے سے پہلے بھی کیا، پھر اٹلی کے دو سالہ قیام میں کئی ایک چہرے وہاں کے بنائے اور اس کے بعد کراچی میں آباد ہونے کے بعد ان میں کئی ایک اہم اضافے ہوئے جو اب تک جاری ہیں۔ شروع کے کام پر ایک عمدہ تبصرہ سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری کے اردو ادب میں چھپا تھا اور اگرچہ اس کی پلاننگ اور اشاعت میں منٹو کا دخل ضرور ہوگا لیکن عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد حسن عسکری کی تحریر ہے۔ اس تبصرے میں یہ دلچسپ بات بھی ملتی ہے کہ تعلیم کے فارغ ہونے کے بعد جب آزر نے کمرشل آرٹ کے ساتھ گھر پر مجسمہ سازی کی مشق شروع کی تو محلّے والے بت بنانے پر معترض ہوئے اور جب مجسمہ ساز نے ان کی بات نہ مانی تو دھمکیاں وصول ہونے لگیں یہاں تک کہ غریب کو مکان بدلنا پڑا۔

عسکری صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "نئے مکان میں پہنچ کر انھیں ایک بڑی انوکھی بات سوجھی۔ وہ یہ کہ اپنے ہمعصر ادیبوں اور شاعروں کے مجسّمے بنائے جائیں۔" ان کے نزدیک "یہ بات بھی فنکار کے خلوص پر دلالت کرتی ہے کہ اس نے سب سے پہلے ایک ایسے طبقے کو نوازا جسے ملک کے سماجی نظام میں شایانِ شان مقام حاصل نہیں ہے (یہ ذکر ۱۹۴۵ء کا ہے ورنہ آج تو ماشاءاللہ کتنے ہی ادیب سرکاری درباری رتبوں تک پہنچ چکے ہیں اور جو نہیں پہنچے وہ بھی اپنی منزل سے کچھ زیادہ دور نہیں) بہرحال مجسمہ ساز کو اپنی تجویز پر عمل کے دوران" طرح طرح کی دقّتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اوّل تو یہی کہ فی الحال خرچ ہی خرچ ہے، کسی قسم کا مالی فائدہ نہیں۔ پھر ادیبوں کو مجسمہ بنوانے پر آمادہ کرنے میں بھی انھیں خاصی پریشانی اٹھانی پڑی۔ شروع شروع میں تو کسی نے ان کی بات

کو در خورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ کسی نے منظور بھی کیا تو سٹوڈیو پہنچنے میں ڈھیل کی اور آزر کو ہفتوں انتظار کرنا پڑا لیکن اس نے ہار نہیں مانی اور آخر بھاگ دوڑ کر کے دس بارہ مجسّمے اب تک مکمل کر ہی لیے۔ ابھی چالیس مجسّمے اور بنانے ہیں۔

یہاں بس اتنا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے کہ آزر کو صرف ایک بڑی انوکھی بات ہی نہیں سوجھی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کبھی پاکستان کی اپنی نیشنل آرٹ گیلری ہوگی اور اس میں ادیبوں کی تصویروں کے لیے بھی ایک گوشہ ہوگا، کیوں نہ تصاویر کی بجائے ایسی تماثیل تیار کی جائیں جو ان کے چہرے مہرے، خدوخال اور اطوار و کردار کو ایک سہ وسعتی شکل میں پیش کریں تاکہ دیکھنے والوں کے لیے ان کی شخصیت مجسّم ہو کر سامنے آئے۔ اس سلسلے میں جو تکلیفیں ادیبوں کے لاابالی پن کی وجہ سے پیش آئیں، شاید ان میں بعض لوگوں کا تذبذب بھی شامل ہو کہ پاکستان میں ہمارے مجسّمے کا کیا حشر ہوگا۔ چنانچہ آزر کو اب تک یاد ہے کہ ڈاکٹر تاثیر نے کئی ہفتے ٹالنے کے بعد ایک دن یہ کہہ دیا کہ تم ہماری شہرت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو (عبرت کا مقام ہے کہ اب تاثیر مرحوم کی اپنی شہرت تعارف کی محتاج ہو چکی ہے اور فائدہ آزر کو اب تک حاصل نہیں ہوا) چنانچہ آزر نے ان کا مجسّمہ بنانے کا خیال ہی چھوڑ دیا، بلکہ یہ تک کہہ دیا کہ اب تو آپ خود بھی چاہیں تو میں نہیں بناؤں گا۔ اس کے برعکس اس نے فیض اور منٹو، باری علیگ اور امتیاز علی تاج، عسکری اور ندیم، مفتی اور حفیظ ہوشیارپوری کے مجسّمے بنائے۔ پطرس اس زمانے میں زیادہ تر ملک سے باہر رہتے تھے اس لیے آزر کے ہاتھ نہیں لگے، راشد بھی لاہور میں نہیں تھے۔ تاجور یا صوفی تبسّم کی طرف معلوم نہیں خود آزر نے رغبت نہیں کی یا کوئی اور مانع درپیش ہوا۔ ان کے علاوہ ظہیر کاشمیری، احسان دانش، اشفاق احمد، صلاح الدین احمد، آغا بابر اور ایس۔ اے۔ رحمٰن کے مجسّمے انھوں نے لاہور ہی میں بنائے۔ مزید برآں چند ایک ادب دوست اور فن پرور قسم کے لوگوں کے بھی۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ قائداعظم کے انتقال کے بعد آزر کا کراچی آنا ہوا تو محترمہ فاطمہ جناح کے پیچھے پڑ کر مسافرت کی بےسروسامانی کے باوجود ان کا بھی چہرہ بنا کر چھوڑا۔ اس کا کہنا ہے کہ قائداعظم کا قدِ آدم مجسّمہ بنانا چاہتا تھا (بن جاتا تو سوچیے کتنی بڑی قیامت آجاتی۔ ایک ایسے ملک میں جہاں برسوں بعد کرنسی نوٹوں پر ان کی تصویر چھاپنے پر بھی اعتراض ہوا) بہرحال وہ مرحوم ہوگئے تو فاطمہ جناح کا چہرہ تیار کیا، یہ واقعہ سنہ ۱۹۵۵ء کا ہے اور اسے تاریخی لحاظ سے بھی یادگار سمجھنا چاہیے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ تقاضے کے باوجود یہ مجسّمہ محترمہ کو نہیں دیا گیا اور شاید اسی لیے محفوظ رہ گیا ورنہ ان کی وفات کے بعد اس کا سراغ بھی نہ ملتا جیسے اس پلاسٹر کی بنائی ہوئی اکثر شبیہوں کا جو اس نے لاہور میں تیار کی تھیں، کچھ پتہ نہیں چلتا۔

ایک آدھ اور سیاست داں کو چھوڑ کر، آزر نے لاہور میں اور بعد میں کراچی میں بھی زیادہ تر ادیبوں اور دانشوروں کے چہرے بنائے ہیں جو کسی نیشنل گیلری میں تو نہیں پہنچ سکے۔ نہ کسی کو وہاں پہنچانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن زیادہ تر ادیبوں کی طرف رغبت کی کیا وجہ تھی جب کہ ان پر توجہ سے کسی فائدے کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی یہ گیلری تو محض ایک ایسا خواب تھی جس کا واقعیت کی دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لاہور میں ملکہ وکٹوریا اور کرنل لارنس کے مجسّمے تو ہٹانے یا گرانے کی کوئی وجہ ہو سکتی تھی، پنجاب یونیورسٹی کے باہر پروفیسر وولنر کا مجسّمہ (جسے مولانا صلاح الدین احمد نے علم و دانش کا مجسمہ کہا) اور اس کے بالمقابل لاہور کے مشہور رفاہی کارکن سر گنگا رام کا مجسّمہ (جسے مسمار کرنے پر سعادت حسن منٹو نے ایک نہایت بلیغ سیاہ حاشیہ لکھا) باقی رہ جاتا تو کون سی قیامت آجاتی۔ اچھے لوگوں کی یادگار ہمارے درمیان اچھائی کی موجودگی کا مظہر ہوتی ہے اور یہ ایسی عوامی شخصیات نہ تھیں کہ بت پرستی کا امکان پیدا ہوتا۔ بہرحال یہ بات دلچسپ ہے کہ جب ایسے ایسے مجسّمے بت شکنی کے جوش کا شکار ہو رہے

تھے تو اسی شہر لاہور میں ایک آدمی زندہ آدمیوں کے مجسّمے بنا کر ان کی شخصیت کو محفوظ کر رہا تھا۔ اسی زمانے میں ایک ایشیائی نمائش کے نام پر مہاتما بدھ کے جو مجسّمے لاہور میوزیم سے دہلی بھیجے گئے تھے اور واپس نہیں کیے گئے تو کسی نے زور نہیں دیا۔ اُلٹے کئی ایک باقی ماندہ مجسموں کو تہمد بندھوا دیے گئے کہ حیا کا تقاضا یہی سمجھ میں آیا۔

کراچی میں آکر چند ایک سیاست دانوں کو چھوڑ کر جیسے بیگم لیاقت علی خاں، جناب حسین امام، مرزا ابوالحسن اصفہانی زیادہ تر ادیبوں اور دانشوروں پر توجہ رہی۔ چنانچہ شائستہ اکرام اللہ، جی الانہ، شان الحق حقی، ضیا جالندھری، ہاجرہ مسرور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر احسان رشید، مجنوں گورکھپوری، سراج الدین ظفر اور ہندوستان سے چند دنوں کے لیے آئی ہوئیں عصمت چغتائی کے چہرے تیار ہوئے (ان کے علاوہ چند ایک اور بھی جیسے احمد فراز اور جناب محمد علی صدیقی وغیرہ) قرۃ العین حیدر جب تک پاکستان میں رہیں، آزر کے قالب میں نہیں آئیں اگرچہ انھیں آزر کے نام اور کام سے گہری دلچسپی تھی۔ مجتبیٰ حسین مرحوم، آزر زوبی کے ساتھ "شعور" کی ادارت میں شریک تھے لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب اس کی دلچسپیوں کا محور طباعت اور اشاعت کی سرگرمیاں تھیں۔

ادیبوں کی طرف رغبت کا باعث پوچھا تھا۔ شاید یہ کشش اس لیے ہو کہ آزر زوبی کو ذوقِ ادب سے بہرہ ملا تھا اور یوں بھی اس وقت ادب اور ادیبوں کا خاصا چرچا تھا۔ لیکن اس نے ہر ادیب کی طرف توجہ نہیں کی۔ غالباً اس کا تعلق ادیبوں کے چہروں اور کھوپڑیوں کی ساخت اور چہرے پر کھنچی ہوئی وقت اور کشمکش کی لکیروں سے بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ عسکری نے ان دس بارہ چہروں کو جو ۱۹۵۰ء تک تیار ہوئے تھے کردار نگاری اور مشاہدے کا نمونہ قرار دیا ہے اور ان میں سے ایک منٹو کے ماتھے پر جو صلیب گڑی ہے۔ کیا اس سے منٹو کے فن کا کوئی تعلق نہیں؟ یہ درست ہے کہ بعض چہرے کیری کیچر کے قریب پہنچ جاتے ہیں جیسے ضیا جالندھری اور سراج الدین ظفر اور بعض میں شخصیت کا احترام شخصیت کی پیش کش پر چھایا ہوا سا لگتا ہے جیسے مولانا صلاح الدین احمد اور جسٹس ایس۔ اے رحمٰن۔ یہ پہلو سیاسی چہروں میں اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے اسوا محترمہ فاطمہ جناح کے، جن کے چہرے میں قائداعظم کی مماثلت تلاش کی گئی ہے۔ بعض چہروں سے مجسمہ ساز رعایت برتتا نظر آتا ہے جیسے ممتاز مفتی اور اشفاق احمد سے، اور فیض کا چہرہ تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی عاشق یا عاشقہ نے بنایا ہو۔ یہاں بت گری کا فن صنم سازی کے قریب پہنچ جاتا ہے جس میں کردار کی تنقید کا امکان بہت کم ہے۔ اسی طرح خواتین کے مجسموں میں بالعموم تنقیدی رویّہ معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ احمد علی اور سلیم الزماں صدیقی کے بالوں پر زیادہ توجہ صرف کی ہے لیکن مجموعی طور پر ان کے چہرے کیری کیچر نہیں بننے پائے۔ احسان دانش کے مجسّمے کا شمار حفیظ ہوشیار پوری کی طرح آزر کے شہکاروں میں ہونا چاہیے یہاں شخصیت کا اعتماد اور تجربہ حیات کا دباؤ برابر محسوس ہوتا ہے۔

عشرت حسین صاحب نے آزر کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بہت تھوڑے وقت میں کسی شخص کی حقیقی شباہت کو، اور اس کے اطوار کو اپنی گرفت میں لے آتا ہے۔ اس کی مثال انھوں نے عصمت چغتائی کے مجسّمے سے دی ہے جو محض چند گھنٹوں کے لیے آزر کے سٹوڈیو میں آئی تھیں اور جنھیں اس نے اپنی شاگردوں سے گفتگو کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس قسم کی کردار نگاری تو شوکت تھانوی مرحوم بھی کر لیا کرتے تھے یعنی تکیہ کلام اور کسی ایسی جسمانی حرکت کی تلاش جو عادت بن چکی ہو۔ آزر کا ذاتی کمال اس قسم کے سطحی مشاہدے سے زیادہ ان جگہوں پر ملتا ہے جہاں لگتا ہے کہ ابھی یہ چہرہ بول پڑے گا۔

یا ابھی یہ آنکھیں جھپکنے لگیں گی۔ پیش بینی کی یہ خصوصیت جو اس کی چند ایک تماثیل میں یقیناً موجود ہے چہرہ سازی کی معراج ہے، چاہے کردار نگاری سے اس کا کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ بات صرف مشاہدے سے پیدا نہیں ہو سکتی۔

لیکن آذر کے مجسموں کا سب سے کمزور پہلو مسالے کی ناپختگی ہے۔ وہ مٹی کے ماڈل بنا کر انھیں پلاسٹر کے قالب میں ڈھالتا ہے جو مجسمہ سازی کی اساسی تکنیک بھی لیکن اسے پائیداری نہیں بخش سکتی۔ اصل میں یہ خرابی اس کے فن کی نہیں، اس کے ذرائع کی محدودیت سے پیدا ہوئی ہے۔ شاکر علی جب نئے نئے پاکستان آئے تو سادہ گتے پر تصویریں بنایا کرتے تھے جن پر لگائے ہوئے رنگ ہوا کے کیمیائی عمل سے تڑخ جاتے ہیں چنانچہ ان کی بہت سی تصویریں اس بے سروسامانی کی نذر ہو گئیں۔

آذر زوبی نے پچھلے چالیس ایک برسوں میں تقریباً اتنے ہی مجسمے اس امید میں بنائے ہوں گے کہ کبھی تو ان کو سنگ و آہن میں ڈھالنے کا موقع ملے گا۔ لیکن وہ اپنی کچی حالت میں اسی کے پاس پڑے پڑے ٹوٹتے پھوٹتے رہے اور کسی ادارے کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ انھیں کوئی پائیدار شکل دلوا سکتا۔ اصل میں یہ مجسمے اور ان کے اکثر موضوعات ایسے ہیں کہ لاہور یا کراچی کے عجائب خانے میں رکھے جائیں۔ یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ آذر کے جیتے جی انھیں کسی مستحکم صورت میں منتقل کرا لیا جائے۔

ایک خواب آذر زوبی نے دیکھا تھا، اس نے تو جیسا کیسا بن پڑا اسے حقیقت کے روپ میں ڈھال دیا۔ لیکن انھیں پائیدار شکل اور مناسب مقام دینے کا خواب کون دیکھے اور کیسے اس کو پورا کرے؟

افکار فاؤنڈیشن کراچی

(ایک فلاحی ٹرسٹ)

افکار فاؤنڈیشن کے کثیر المقاصد ادبی منصوبوں میں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا فروغ، تحقیق اور نادر دستاویزات کی تلاش و ترتیب اور اشاعت، مستحق ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کے لیے بہبود فنڈ کا قیام، نونہالانِ قوم، خواتین اور نئی نسل کے تعمیری منصوبوں میں اشتراک و تعاون شامل ہے۔

افکار فاؤنڈیشن کے اراکین ٹرسٹ رفتار کی فراہمی کے بعد "بہبود فنڈ" کے جلد از جلد قیام کے لیے کوشاں ہیں۔ افکار کے قارئین، اردو کے بہی خواہوں اور تمام افکار دوستوں سے درخواست ہے کہ اس کار خیر میں حصہ لے کر شکر گزار فرمائیں اور زیادہ سے زیادہ عطیات بھیج کر اس منصوبے کی تکمیل میں ہاتھ بٹائیں۔

اردو رسالوں کی تاریخ میں افکار فاؤنڈیشن پہلا ٹرسٹ ہے جس نے ایک قلیل عرصے میں رفیقانِ افکار کے بھرپور تعاون سے کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

نذر زوبی

کو ترجیح دیتے ہیں؟

اس لئے کہ سپریم ہی نمبر وَن کوالٹی چائے ہے

روز بروز آپ جیسے باذوق لوگ زیادہ سے زیادہ سپریم ہی کو اپنا رہے ہیں، کیونکہ وہ معیاری چائے کے شائقین ہیں اور ملک میں دستیاب ہر چائے کی صحیح پہچان رکھتے ہیں۔ سپریم نہ صرف اعلیٰ معیار چائے ہے بلکہ رنگ، خوشبو اور ذائقے میں اپنے نام کی ضمانت ہے۔

۳۰ سے زائد منتخب پتیوں کا اعلیٰ امتزاج

سپریم دنیا بھر میں بہترین چائے کے باغات سے حاصل کردہ تیس سے زائد منتخب پتیوں کا اعلیٰ امتزاج ہے۔ ہر پتی بڑے احتیاط سے چنی جاتی ہے خصوصی مہارت سے بلینڈ کی جاتی ہے۔ اور معیار برقرار رکھنے کا مکمل خیال رکھا جاتا ہے۔ تاکہ آپ تک ہر بار وہی منفرد ذائقہ، رنگ اور خوشبو پہنچے جو سپریم کی پہچان ہے۔

نمبر وَن کوالٹی چائے کی پیالی۔

جب آپ سپریم چائے کا ایک پیک خریدتے ہیں تو گویا آپ وہی منفرد رنگ خوشبو اور ذائقہ حاصل کرتے ہیں جو آپ کے اعلیٰ ذوق کی مکمل تسکین کی ضمانت ہے۔ اگر آپ نے ابتک سپریم چائے نہیں پی تو آپ نے اب تک اس کو آزمایا ہی نہیں۔ آج ہی نمبر وَن کوالٹی سپریم کی ایک پیالی آزمائیے پھر آپ بھی یہی کہیں گے کہ یہ واقعی پاکستان میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی نمبر وَن کوالٹی چائے ہے۔

سپریم

نمبر 1 کوالٹی چائے

پاکستان میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی چائے

نذر زوبی

Hoechst

خاطر غزنوی

لکیروں کا بادشاہ زوبی

فنون کے ایک بہت بڑے نقاد کا کہنا ہے کہ "فن کا مقصد اولین حظ یا مسرت بخشنا ہے" محنت اور دکھوں سے بھرپور زندگی میں مسرت کا ایک لمحہ بھی بہت بڑا خزانہ ہے، مسرت بخشی کا یہ فریضہ فن کار پورا کرتا ہے۔

کسی فن پارے کے حسن اور اس کی مسرت بخشی اور فن پارے کی باریکیوں کو پانے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے دو پہلو ہیں۔ پہلا رخ تو وہ ہے جسے بڑے بڑے اہل دانش و بینش نے

"از دل خیزد و بر دل ریزد"

کی صورت میں پیش کیا۔ دوسرا پہلو کسی تخلیق کار کی تخلیق کو سمجھنے کے لیے اس کی تخلیق محسوسات و حسیات تک رسائی ہر کہ و مہ کے بس کی بات نہیں ہوتی اس کی مثال تو یوں ہے کہ تخلیق کار ایک اونچے پہاڑ پر کھڑا اپنے دلی جذبات کا اظہار چہرے، مو قلم، قلم یا آواز کے اتار چڑھاؤ کی صورت میں کر رہا ہوتا ہے۔ پہاڑ کے دامن میں کھڑا ناظر آنکھیں فنکار کی جانب جما کے اس کے دلی جذبات سمجھنے کا دعوی کرے تو یہ حماقت کے علاوہ کچھ نہ ہو گا۔ تخلیق کار کے جذبات و محسوسات کو پانے کے لیے ناظر کو

بلندیاں پاٹنی ہوں گی اور تخلیق کار کا قرب حاصل کرنا ہوگا، یہ قرب ہر شخص کا مقدر نہیں ہوتا یہی سبب ہے کہ جب بھی اور جس انداز میں بھی ناظر نے نقاد یا شارح بن کر فن کار کی تخلیقات کی شرح کرنے کی کوشش کی وہ کوشش یا اظہار اس کی اپنی ذہنی سطح کا پرتو ہوا، تخلیق کار کی سوچ اور اس کی حسیات کی بھول بھلیوں کی حقیقی ترجمانی کا سزاوار نہ ہوا۔ نقادوں اور شارحین نے ہر فن کار کی تخلیقات کے الگ الگ اور مختلف رنگ کے روپ دکھائے، گوناگوں تشریحات کیں۔ الگ الگ منظر دکھائے۔ پرتوں پہ پرتیں کھولیں لیکن یہ ساری باتیں فن کار کے فن پاروں کی یہ ساری تشریحات نقاد یا شارح کے اپنے اپنے دلوں کی آواز اور تشریح تھی۔

جب آزر زوبی کے فن کی بات آئی ہے تو نقاد یا شارح اطمینان کا سانس لیتا دکھائی دیتا ہے کہ اس کا فن "دل سے دل تک" کی کیفیات سے دوچار ہوتا ہے اور یہ بات میرے لیے بھی اطمینان اور تسکین کا باعث ہے کہ میں تو پہاڑ کے دامن کے ناظر کی صورت زوبی کے موقلم کی جنبشیں اپنے دل کے پردے پر رقم ہوتے محسوس کرتا ہوں، جیسے پہاڑ کا فن کار اپنا فن لے کر خود ہمارے پاس اتر آیا ہو اور فن پارے کے ساتھ اپنا قرب بھی ہمیں بخش رہا ہو۔

پھر بھی فن کار کی سوچ کی بلندیوں تک رسائی حاصل کرنے یا اس کا قرب حاصل کرنے کے نتیجے کے طور پر ناظر فن کار کا مزاج داں ہو سکتا ہے۔ مزاج دانی ہی وہ کلید ہے کہ ناظر یا نقاد فن کار کی افتادِ طبع اس کے رجحانات، اس کی پسند اور ناپسند اور اس کی محسوسات کو کسی حد تک محسوس کرنے کے قابل ہو سکتا ہے اور یوں محسوسات کے توسط سے فن پارے کی زبان سمجھتا ہے۔

آزر زوبی کے فن کو سمجھنے کے لیے اس کے مزاج کے نشیب و فراز کو جاننا ایک بنیادی ضرورت ہے۔ حاشا مجھے آزر زوبی کی مزاج دانی کا قطعی دعویٰ نہیں۔ لیکن میری فنونِ لطیفہ سے دیوانگی کی حد تک محبت نے مجھے بہت سے فن کاروں کا قرب بخشا، میں نے زین العابدین مرحوم کی شاگردی کا شرف حاصل کیا اور ایک شاگرد سے زیادہ ان کے دوست اور گھر کے فرد کا مرتبہ پایا۔ ایک کمترین فرد کی حیثیت سے ان کی خدمت کی اور ان کی مختصر لیکن بھرپور اور بامعنی سٹروکس (STROKES) یا خطوط کے معنی تلاش کرتا رہا، پھر چینی مصوری کی لکیروں کی کفایت شعاری اور سادگی میں مفہوم کی گونج سننے کے لیے چین کے شہروں میں جوگیوں کی طرح گھوما اور گھومتا گھومتا پیکنگ کے مصوروں کے بازاروں اور اکادمیوں۔ تھین جن کے منجمد دریا کے کنارے ایزل پر ابھرتے نقوش آنکھوں میں جذب کرتا، نانکنگ کے اودے پہاڑ کے دامن کی اودی فضاؤں کو پیتا۔ اوشی کے ستر جزیروں والی جھیل کے پہاڑی جزیروں کے حسن کو کاغذ پر نقش ہوتے دیکھتا، چین کی ایک زمینی جنت ہانگ چو کی جھیل کے کنارے شفتالو کے پھولوں کے درمیان "خنگھائی سلک" پر ریشم کی زندہ تصویروں کے فن سے لذت اندوز ہوتا شنگھائی کے دریا کے بند کے مصوری کے طالب علموں کو اساتذہ کے سامنے دوزانو بیٹھے دیکھ کر عقیدتوں کا حسن محسوس کرتا ہانگ کانگ پہنچا۔ جہاں کولون کی قدیم چینی بستی کے خطاط خطاطی کو عربی فارسی اردو کی خطاطی کی طرح حسن، نزاکت، جدت اور معنی بخشتے ہیں اور کم سے کم رنگوں، ایک ہی رنگ کے کئی پہلوؤں اور خطوط کی کفایت شعاری سے زندگی کی تصویروں کو زندگی بخشتے ہیں۔ ہانگ کانگ، سنگاپور اور کوالالمپور کے چینی مصوروں اور خطاطوں سے یہ پوچھتا کہ چینی اپنی تصویروں میں اس قدر کفایت کے باوجود اظہار کے تشفی اور واضح مفاہیم تو بخش دیتے ہیں لیکن خطاطی میں اتنی زیادہ سٹروکس، خطوط، لکیریں اور نقطے یکجا کر دیتے ہیں کہ لفظ تجرید کی انتہا بن جاتے ہیں لیکن اس تضاد کی گتھی آج تک کوئی نہ سلجھا سکا، غالباً الفاظ کے گنجلک پن کے ردِ عمل کے طور پہ مصوری آسان بن گئی۔

آزر کی مزاج دانی کا ذکر کرنے کے باوجود میں اس کی لکیروں کو اس کے مزاج کے بعض جانے پہچانے پہلوؤں سے ہم آہنگ تو کر سکتا ہوں، لیکن "دل دریا سمندر دوں ڈونگھے" ہوتے ہیں۔ میں اس کے مزاج کی کئی باریک لکیروں سے لطف اندوز ہونے کے باوجود اس کے سمندر دل کی گہرائیوں میں پڑی بند سیپیوں میں قیمتی، انمول، بے بہا موتی دیکھنے سے قطعاً معذور ہوں، وہ چینی مصوّروں کی طرح کم سے کم خطوط میں اظہار پر قادر ہے لیکن اس کی اپنی زندگی چینی خطاطوں کے اُلجھے ہوئے خطوط سے اُبھرتے ہوئے لفظ کی طرح ہے ان الفاظ کے معانی وہی تلاش کر سکتا ہے جو اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں تک غوطہ زن ہونے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

آزر ایک آزاد منش فن کار ہے اس کے مزاج کا یہ پہلو اس کے بچپن اور جوانی کا ایک جانا پہچانا پہلو ہے۔ وہ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا نہیں ہوا۔ اس لیے اُسے زندگی کے نشیب و فراز اور تلخ ترش دنوں بلکہ لمحوں تک کا شدید اور گہرا تجربہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بھوک کیا چیز ہے، غربت کیا ہوتی ہے، ایک چھوٹا سا گھر کیوں کر جنت یا جہنم بن سکتا ہے، ذہنی ہم آہنگی کیسے ہوتی ہے۔ وہ بچوں کے ہمکنے کی لذت اور مفہوم سے واقف ہے اور بچوں کی ہر جہتی محرومیوں کے کرب کو بھی جانتا ہے۔ بغل میں ایزل اٹھائے گلیوں گلیوں، شہر شہر اور دیس دیس پھر کر دنیا اور دنیا کی جزئیات دیکھنے والا دنیا کی کیتگیوں اور عالی ظرفیوں کے سلسلہ ہائے کوہ کی ہر پگڈنڈی پر گھوما ہے، آبلہ پائی کی لذتوں سے بھی آشنا ہے، دوستوں کی مہربانیوں اور دشمنوں کی عنایات سے بھی عہدہ برآ ہو چکا ہے، محبت کے سبھی مدارج بھی طے کر چکا ہے۔ سب رشتوں کے سب پہلوؤں کو چھو چکا ہے۔ وہ عشق کی تپش، جنون کے شعلوں، ہجر کی چلچلاتی دھوپ اور وصل کے شبنمی لمحوں کی ٹھنڈک کے چھتنار و تلخ زندگی کے طویل لیکن مختصر لمحے گزار چکا ہے۔

یہی اس کا مزاج ہے اور اسی مزاج کے سمندر کی ان دیکھی گہرائیوں میں پڑی منہ بند سیپیاں اور ان کے فن کی باریکیوں کے راز داں ہیں۔ ہم تو محض سطح پر تیرتی چند چیزیں دیکھنے کے اہل ہیں۔

آزر کا فن ڈرائنگ سے شروع ہوا "دنیا" جیسی عظیم روغنی رنگ کی تصویر سے گزر کر لارنس باغ کی پہاڑی پر جوگیوں کی طرح اسی مقام پر ڈیرہ جما کر تصویریں اور مجسمے بنائے جہاں تیس برس بعد صادقین نے علامہ اقبال کے اشعار کی تشریحی تصویریں بنائیں۔ گویا لارنس باغ کی پہاڑی ہی وہ کیل دستو تھا جس میں اس نے تصویر کشی کا بیج قیام پاکستان کے وقت ہی بو دیا تھا۔ پھر دنیا کے عظیم مصوّروں اور مجسمہ سازوں کے ملک اٹلی گیا جہاں لکیروں کی نزاکت کی پگڈنڈیوں کو چھانا۔ سنگ مرمر میں "ناتراشیدہ" صنم دیکھے جو مائیکل اینجلو کی دست برد سے بچ گئے تھے اس نے یورپ کی آزاد فضا میں جہاں فن لطیف کی بو باس رچی ہوئی ہے۔ سانس لی تو اسے انسان کے ان جذبات کا تعارف حاصل ہوا جنہیں ہمارے ملک میں دبانا ہی ہماری تہذیب کی بنیاد ہے۔ یورپی تہذیب میں اس نے فطری جذبات کے ان گونگے طوطوں کو آزادانہ بولتے سنا جو اس ملک میں محض "میاں مٹھو چوری کھاؤ" جیسی علامتیں صدیوں سے مقید ہے اور ان الفاظ کے حقیقی معنی کھو چکا ہے۔

اپنے ملک لوٹ کر ان علامتوں کو اس نے "گھوڑے" "دروازے" (67) "بچے" (3) "ماں" (61) "ماں بچہ" "پالتو پرندہ" (71) "محبت کا چکر" (79) "نسلی دائرہ" (99) "اندر کا شعلہ" (49، 55، 59، 61، 63) پلیٹ (89، 91، 105، 141) (151) "سلائی کی مشین" (153) "ٹیلی فون آپریٹر" (159) "چاندنی" (161) "بیٹھا پرندہ" (175) "فرار در قلعے" (43) "وحشی سوچ" (49) اور "ناہنسٹ" (45) جیسی تصویروں کی صورت میں قدیم و جدید انداز کو گھلا ملا کر پیش کیا۔

یہ علامتیں مفہوم کی لذتوں سے سرشار ہیں اور نزاکت کا حسن لیے ہوئے ہیں، یہ سب تصاویر لکیروں کی کفایت شعاری کا نمونہ ہیں جو چینی مصوّروں کی خصوصیت ہے، حالانکہ زوبی نے کسی سطح پر بھی چینی مصوّری کا اثر نہیں لیا۔ زوبی کی تصویروں کی لکیروں میں مثنوی گلزارِ نسیم کے اختصار کی لذّت ہے۔ اس اختصار میں چینی مصوّری کی تقلید یا اثر پذیری نہیں، اسے توارد کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ "ماں" "بچہ" "عورت اور گھوڑا" "زندگی کا دائرہ"، جیسی تصویریں ایک ہی رشتے میں پروئی ہوئی ہیں۔ خصوصی طور پر ماں اور بچہ پر آزر نے بے شمار اسکیچ بنائے ہیں۔ ایک موضوع پر اتنے فن پاروں کی تخلیق کا جواز کیا ہے؟ اس مقام پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ زمین پر اس کرۂ ارض پر انسانوں کی اکثریت کا جواز کیا ہے؟ یہ تو تخلیق کا عمل ہے بقول اقبال

کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

اور یوں ہر شخص اپنے کردار، اپنی شخصیت، اپنی صلاحیت، اپنی شکل و صورت، اپنی ہیئت، اپنے عمل اور کارکردگی، اپنے جینئس، اپنے حسن اور اپنے قبح کے ساتھ آتا ہے، تخلیق کا یہ عمل جاری رہتا ہے، یہی بات فن پارے کے حسن اور مقصدیت کی بنیاد ہے۔ ماں اور بچہ کے موضوع کے مختلف رنگ تراشے ہوئے ہیرے کے سیکڑوں پہلوؤں کی طرح ہے اور ہر پہلو اپنی تراش کے حسن کا خراج لیتا ہے۔

آزر زوبی نے لکیروں کی زبان میں اظہار کا فن اپنی مصوّری کے ابتدائی دور میں اپنایا۔ اٹلی سے واپسی کے بعد اس کی لکیروں میں جیسے اظہار کی روشنیاں سمٹ آئیں۔ یوں تو برّصغیر کے کئی اساتذہ نے لکیروں کا فن ایک ورثے کی حیثیت سے آئندہ آنے والی نسلوں کو بخشا، ان میں عبدالرحمٰن چغتائی، استاد اللہ بخش، سام کنکر وغیرہ اہم نام ہیں، لیکن زوبی نے اس شعبے کو اپنے انداز میں ڈھالا۔ وہ لکیر کا فقیر نہیں بنا۔ بلکہ لکیروں پر قابو پایا اور لکیروں کو بے تکلفی، روانی، معنی آفرینی اور تفہیم کی دولت بخشی۔ اس کی لکیریں بولتی ہیں۔ متحرک ہیں، متناسب ہیں۔ اٹلی سے واپسی کے بعد اس کی "کفن بردوش" انداز کی لکیروں کے سرورق "زندہ و باہوش" بن گئے، قبا پوشوں کی صورت میں ان تصویروں کے زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی۔ کہیں "چوراہا"، "الگ الگ راستے" "چٹانیں اور غم" "انتظار" "تقدیر" کہیں "اندر کا شعلہ" کہیں "بھیڑ" "ماضی اور مستقبل" اور کہیں پھیلاؤ کی صورت منظرِ عام پر آئے۔ زوبی نے اس انداز کو منفرد بنا دیا، پھر اس نے اپنی لکیروں میں پاکستان کے ہر خطّے کی ثقافتی روایاتی، عوامی، ادبی، کلاسیکی روایات کو دوام بخشا، اس نے علامہ اقبال اور ان کے کلام کو بھی لکیروں میں ڈھالا۔

آزر نے ان لکیروں سے حسیاتی لذّت اندوزی کی تخلیق بھی کی۔ اس کی زمانہ شناسی، رمز شناسی اور جزئیات شناسی کا حسن ایسے نازک اور باریک مقام پیدا کرتی ہے کہ جذبات کے سازینے کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں اور ایسے سُر پیدا ہوتے ہیں جن سے انسانی فطرت کے نغمے فضا کو مرتعش اور مترنّم بنا دیتے ہیں۔ جذبات کی لہریں ساحلوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر لکیروں کی قوت اور رموز کی تفہیم کا طوفان برپا کر دیتی ہیں۔ ایسی تصویروں میں نسوانی کشش (پلیٹ 75) تخلیق کے بعد (پلیٹ 73) ملاپ (77) قابلِ ذکر ہیں۔

آج کے پاکستان میں زوبی کی لکیروں نے ایسا تانا بانا بُن رکھا ہے جو اپنی بُنت کے حسن لافانی کا شاہکار ہے اور جو فن کی دنیا میں جغرافیائی لکیروں سے بلند تر ہو کر بین الاقوامی سطح پر زوبی کے حوالے سے پاکستان کی سربلندی اور بالادستی کا ثبوت ہے۔

نذر زوبی

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

علامہ اقبال آزر زوبی کی نظر میں

علامہ اقبال کی عظمت کا انحصار صرف اس بات پر نہیں کہ ادیبوں، ناقدوں اور محققوں نے انھیں اپنا موضوع بنایا اور گزشتہ آٹھ عشرے میں ان کے فکر و خیال کو اجاگر کرنے کے لیے ہزاروں مضامین، مقالات اور کتابیں لکھی گئیں، بلکہ موصوف کی سربلندی کا راز اس امر میں بھی پنہاں ہے کہ متعدد مصوّروں نے ان کے ارفع و اعلیٰ کلام کو رنگ و روغن خطوط اور دائروں کی مدد سے آفاقی بنا دیا ہے۔ ان فن کاروں نے کلامِ اقبال کی اس طرح تزئین کی کہ ایک طرف علامہ کے فکر و فن دلآویز و دلنشین انداز میں اجاگر ہوتے ہیں تو دوسری جانب یہ تصویرگری خود صنّاعی کا اعلیٰ نمونہ نظر آتی ہے۔

کلامِ اقبال کی تزئین کرنے والے مصوّروں میں پاکستان کے ہردل عزیز فن کار آزر زوبی بھی شامل ہیں۔ بین الاقوامی شہرت رکھنے والے زوبی کا اپنا رنگ اور نشان ہے۔ وہ محض مصوّر، خطّاط اور مجسّمہ ساز ہی نہیں، ادب آشنا بھی ہیں۔ شعر و نغمہ کی ماہیت پر انھیں جو عبور حاصل ہے اس کی نمایاں مثال "شعور" جیسا منفرد جریدہ ہے کہ جب نکلا تو آنکھوں کو خیرہ کر گیا اور بند ہوا تو دنیائے ادب سونی ہو گئی۔

ادب شناسی کا یہی فطری جذبہ تھا جس نے کلامِ اقبال کی آفاقیت کا احساس دلِ آزر میں جاگزیں کیا۔ انھوں نے اپنے انفرادی رنگ میں شاعرِ مشرق کے افکار کی تشریح کی ہے۔ ان کے بنائے ہوئے خاکے منفرد انداز سے مفکرِ پاکستان کے خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ زوبی کے خطوط میں بڑی ہمہ گیری، بڑا تنوع اور بڑی پنہائی ہے۔ ان کی ہر تصویر اقبال کے فکر و فن اور انداز و اسلوب کی غمّاز ہے۔

آزر زوبی کی کامیابی کی نمایاں وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ذہن و دل کو اس سطح سے ہم آہنگ کر دیا ہے جہاں خود شاعر کا تخلیقی سرچشمہ موجزن ہے۔ بلاریب یہ کام ادیبوں، نقّادوں اور محقّقوں کے کام کی نسبت زیادہ دقّت طلب اور صبر آزما ہے۔ اس لیے کہ ادیبوں نے تاریخی واقعات کے تناظر میں علّامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری کو نمایاں کیا ہے، نقّادوں نے فن کی کسوٹی پر کلامِ اقبال کو پرکھا ہے، محقّق نے تحقیق کا سہارا لے کر نامعلوم حقائقِ اقبال کو اجاگر کیا ہے۔ ان سب فن کاروں کا کام اپنی جگہ بڑی قدر و منزلت کا حامل ہے، ان سبھوں نے شاعرِ مشرق کو دوسروں سے روشناس کرانے کی گراں قدر کوشش سرانجام دی ہے۔ مخفی حالات و کوائف کا سراغ لگا کر اقبال شناسی کے فن میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے، لیکن جہاں تک آزر زوبی کا تعلق ہے، یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جائے گی کہ انھوں نے صرف سخن سنجی و سخن فہمی کا ثبوت ہی فراہم ہی نہیں کیا بلکہ اپنے آپ کو اس مقام تک لے گئے ہیں جہاں اقبال کی تخلیقی قوتیں مضمر ہیں۔ گویا زوبی نے اس تخلیقی سطح پر پہنچ کر اپنے آپ کو ذاتِ اقبال میں مدغم کر دیا ہے، ان کی روح میں تحلیل ہو جانے کی جدوجہد کی ہے، من و تو کے تصوّر کو یک لخت مٹا کر "ایک" ہو گئے ہیں۔

علّامہ اقبال سے ذہنی ہم آہنگی ہی کی بدولت زوبی نے ایسا شاہکار پیش کیا ہے جو "شرح" سے کہیں زیادہ بسیط، "تعارف" سے کہیں زیادہ وسیع، "تنقید" سے کہیں زیادہ ٹھوس اور "تحقیق" سے کہیں زیادہ ہمہ گیر ہے۔ ان کے شہ پاروں کا ہر ہر خط کلامِ اقبال کا اصلی ترجمان ہے۔ ان کے مرقّعوں کی ہر لکیر افکارِ اقبال کی صحیح عکّاس ہے، جو لطف و مزا، کیف و سرور اور ایقان و آگہی اشعارِ اقبال کے مطالعے کے دوران حاصل ہوتی ہے، بعینہٖ وہی کیفیت آزر زوبی کے حسین و جمیل خطوط کے مشاہدے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ حتّٰی کہ ان کی اثر آفرینی نغمہ و لے کے اثرات ہی کی طرح دیرپا اور مسحور کن ہوتی ہے۔

آزر زوبی نے کلامِ اقبال کی پنہائی میں غوطہ زن ہو کر معنی و مفہوم کے جو موتی نکالے اور انھیں جس فنکارانہ چابک دستی سے خطوط و دائرے میں پرو دیا ہے وہ ان کے عظیم مصوّر ہونے کی دلیل ہے۔ اس کی نمایاں مثال نظم "شکوہ" کی تزئین ہے۔

یہ نظم اردو شاعری میں انفرادی مقام کی حامل ہے۔ اس میں خدا سے خطاب کا ایک نیا اور انوکھا انداز ہے۔ اس میں حمد و ثنا کی مشرقی روایت سے انحراف کر کے ایسا طرزِ تکلّم اختیار کیا گیا ہے جس میں گھن گرج ہے، زور ہے، توانائی ہے، بیباکی ہے، انا ہے، احساسِ خودداری ہے، بندے کی شناخت ہے، جذبۂ تشخص کا اظہار ہے، رنج و ملال کی ترجمانی ہے، شکوہ و شکایت ہے، نظر انداز کیے جانے کا صدمہ و غم ہے۔ یہ وہ تاریخی نوعیت کی نظم ہے جسے علّامہ نے اپریل ۱۹۰۹ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں سنائی تھی۔ اسلامیہ کالج کے ریلیا ترہال میں موجود سارا مجمع شاعر کی سحر انگیز آواز اور کلام کی اثر آفرینی سے سراپا مسحور تھا اور جب "بانگِ درا" ستمبر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی تو نظم "شکوہ" پورے برِصغیر کے مسلمانوں کی آوازِ دل بن گئی۔ اس لیے کہ بقول عبدالقادر سروری۔

"اس میں جس شاعرانہ انداز سے مسلمانوں کی پستی کا گلہ خدا سے کیا گیا ہے، اس میں
الہام ربانی کی شان نظر آتی ہے"

ایسی الہامی نظم کے مفہوم کو موئے قلم سے ظاہر کرنا آزر زدبی کے کمالِ فن کی دلیل ہے۔ ان کی وسیع النظری اور فنکارانہ صلاحیت نے ہر بند کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر تصویر اپنی آواز کا جادو جگا رہی ہے۔ مثلاً نظم کا پہلا بند ہے۔

کیوں زیاں کار بنوں، سود فراموش رہوں　　　فکرِ فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں　　　ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

مفہوم یہ ہے کہ میں کب تک خاموش بیٹھا اپنی بربادی کا تماشا دیکھوں، کب تک اپنے حسین مستقبل سے غافل رہوں جب مجھے قوتِ گویائی حاصل ہے تو کیوں نہ اللہ سے شکوہ کروں اور روداد غم سناؤں۔

مذکورہ بند اور اس کے معنی و مطلب کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم آزر زدبی کے بنائے ہوئے اسکیچ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان چھ اشعار میں پنہاں اقبال کے جذبات، تفکرات، خواہشات اور خیالات زدبی کے نقش میں اس طرح حلول کر گئے ہیں کہ ہر خط، ہر لکیر اور ہر دائرہ نغمہ ڈھلے کی افرا تفری میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ شکوہ کرنے کا انداز، چہرے کا غم انگیز تاثر، آنکھوں میں پوشیدہ کرب عالم کی پرچھائیں، شہادت کی انگلی کی معنی آفرینی، عورت کے پس منظر میں تیرہ و تار اور درندہ صفت دنیا کا ہیولا۔ یہ سب کچھ وہی عناصر ظاہر کر رہا ہے جو اقبال کے ذہن میں جاگزیں ہے۔ زدبی نے خط و خال کے سہارے اسی عنصر کو زندگی سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

غرض "شکوہ" پر مبنی ہر اسکیچ زدبی کی ذہنی بالیدگی، تاریخی شعور، سخن فہمی، وسیع النظری اور فنکارانہ چابکدستی کا غماز ہے۔ ان کی اس کوشش نے اقبال شناسی کے فن کو فروغ دیا ہے اور عوام الناس کو شاعرِ مشرق کے آفاقی کلام سے قریب تر کر دیا ہے۔ یہ ان کا اردو ادب پر، اقبالیات پر اور اسلامی تاریخ پر بہت بڑا احسان ہے۔

افکار فاؤنڈیشن کراچی

"ایک فلاحی ٹرسٹ"

اردو رسالوں کی تاریخ میں پہلی بار اپنی نوعیت کے پہلے افکار فاؤنڈیشن نے بطور فلاحی ٹرسٹ یکم جنوری ۱۹۸۶ء سے اس کے بانی چیرمین صہبا لکھنوی اور سرپرست اعلیٰ جناب حکیم محمد سعید اور ملک کے اٹھارہ ممتاز دانشوروں، اہل قلم حضرات اور صاحبانِ علم و فن کی نگرانی میں اپنے نئے سفر کا آغاز کر دیا ہے۔

افکار فاؤنڈیشن کے کثیر المقاصد اور بنی منصوبوں میں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا فروغ، تحقیقی امور نادر دستاویزات کی تلاش و ترتیب اور اشاعت، مستحق ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کے لیے بہبود فنڈ کا قیام، نونہالانِ قوم، خواتین اور نئی نسل کے تعمیری منصوبوں میں اشتراک و تعاون شامل ہے۔ اس فاؤنڈیشن کی تمام تر کامیابی رفیقانِ افکار، محبانِ اردو اور علم و فن کی ترویج و ترقی میں گہری دلچسپی رکھنے والوں کے پُرخلوص تعاون پر منحصر ہے۔ یہ بات زور دے کر کہنے کی نہیں کہ کوئی ادارہ مالی استحکام کے بغیر اپنے تعمیری منصوبوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا لہٰذا افکار فاؤنڈیشن کے ٹرسٹیوں نے جو تجاویز منظور کی ہیں ان کی تفصیلات "تعارف نامہ" میں شائع کر دی گئی ہیں جو آپ ایک کارڈ لکھ کر منگوا سکتے ہیں۔

ان تجاویز کی رو سے "افکار فاؤنڈیشن" کے سرپرستوں کے لیے کم سے کم دس ہزار روپے، معاونین خصوصی کے لیے پانچ ہزار روپے مقرر کیے گئے ہیں جو دو قسطوں میں بھی ادا کیے جا سکتے ہیں۔ رفیقانِ افکار جو عطیہ بھی سہولت سے ادا فرمادیں گے قبول کر لیا جائے گا۔ ذیل کا فارم پُر کر کے بھی بھیجا جا سکتا ہے۔

میں افکار کی خدمات کا معترف ہوں اور مجھے افکار فاؤنڈیشن کے مقاصد سے اتفاق ہے
اس لیے بطور تعاون مبلغ ــــــــ روپے بذریعہ کراس چیک / بنک ڈرافٹ ارسال ہیں۔
مجھے افکار کے سرپرستوں / معاونینِ خصوصی / رفیقانِ افکار میں شامل فرمالیجیے۔

نام ــــــــــــــــ

مکمل پتا ــــــــــــــــ

ــــــــــــــــ

تاریخ ــــــــــــــــ

دستخط ــــــــــــــــ

فون: گھر ــــــــ فون: دفتر ــــــــ

افکار کی خاص اشاعتیں

ایک نظر میں

پہلا دور

۱۹۴۵ء : افکار کا اجراء
بھوپال سے

۱۹۴۸ء : لکھنؤ اردو کانفرنس نمبر
(پہلی یادگار اشاعت)

۱۹۴۹ء : بھوپال اردو کانفرنس نمبر

۱۹۴۹ء : بھیمڑی ادبی کانفرنس نمبر

دوسرا دور
(پاکستان میں)

۱۹۵۱ء : پہلا خاص نمبر
کراچی سے

۱۹۵۲ء : خاص نمبر

۱۹۵۳ء : افسانہ نمبر

۱۹۵۴ء : سالنامہ

۱۹۵۵ء : دس سالہ نمبر

۱۹۵۵ء : منٹو نمبر

۱۹۵۶ء : مجاز نمبر (دو ایڈیشن)

۱۹۵۸ء : سالگرہ نمبر

۱۹۵۸ء : آزادی نمبر

۱۹۵۹ء : رائٹرز گلڈ کنونشن نمبر

۱۹۵۹ء : افسانہ نمبر

۱۹۵۹ء : انقلاب نمبر

۱۹۶۰ء : سالنامہ

۱۹۶۰ء : کہانی نمبر

۳ اگست ۱۹۶۰ء کو
بابائے اردو ڈاکٹر مولوی
عبدالحق کی صدارت
میں افکار کی سولہویں
سالگرہ منائی گئی۔

۱۹۶۱ء : جوش نمبر
(پہلا ایڈیشن)

۱۹۶۱ء : انقلاب نمبر

۵ نومبر ۱۹۶۱ء کو
جشن جوش منایا گیا،
اور افکار نے ۱۵۰۰
ادیبوں کے اس یادگار
اجتماع میں افکار کا
"جوش نمبر" پیش کیا

۱۹۶۲ء : جوش نمبر
(دوسرا ایڈیشن باضافہ)

چھپتے چھپتے یہ اطلاع
ملی کہ کراچی یونیورسٹی
نے افکار کے "جوش نمبر"
کو بی اے (آنرز) اور
ایم اے اردو کے نصاب
میں شامل کر لیا ہے

۱۹۶۲ء : آزادی نمبر

۱۹۶۳ء : افسانہ نمبر

۱۹۶۳ء : حفیظ نمبر

۲۷ ستمبر ۱۹۶۳ء کو
زیر اہتمام پاکستان
رائٹرز گلڈ جشن حفیظ
منایا گیا اور کراچی کے
نمائندہ ادیبوں کے
اجتماع میں افکار نے
"حفیظ نمبر" پیش کیا

۱۹۶۴ء : افسانہ نمبر

۱۹۶۴ء : نئی تخلیق نمبر

۱۳ مئی ۱۹۶۴ء کو
جناب الطاف گوہر
کی صدارت میں
افکار کی بیسویں
سالگرہ منائی گئی

۱۹۶۵ء : فیض نمبر

۱۹۶۵ء : جنگ اور ادب نمبر

۱۹۶۶ء : غالب نمبر

۱۹۶۶ء : نئی تخلیق نمبر

۱۹۶۸ء : سالنامہ

۲۲ فروری ۱۹۶۸ء
کو جناب حکیم محمد سعید
دہلوی کی صدارت میں
افکار کی تیئسویں
سالگرہ منائی گئی

بیاد جوش
۱۹۸۲ء

بیاد فیض
۱۹۸۵ء

نذر اختر حسین رائے پوری ۱۹۸۶ء

۱۹۶۸ء : ڈراما نمبر

۱۹۶۸ء : انقلاب نمبر

۱۹۶۹ء : غالب نمبر

۱۹۶۹ء : اقبال نمبر

۱۹۷۰ء : جوبلی نمبر (۱۹۴۵-۱۹۷۰ء)

۱۹۷۵ء : ندیم نمبر

۱۹۷۵ء : امیر خسرو ایڈیشن

۱۹۷۷ء : کرشن چندر ایڈیشن

۱۹۷۷ء : نذر اقبال

۱۹۷۸ء : رومی ایڈیشن

۱۹۸۱ء : برطانیہ میں اردو ایڈیشن

[illegible]

If you want a quick and appetising lunch, come and try our A la Carte Restaurant. And take advantage of our new offer : lunch for five at the price of four.

We have laid out a variety of superb dishes, both Pakistani and Continental. The ambience is quiet and *relaxing*, the service speedy and efficient.

Hotel Midway House (Pvt.) Limited, Karachi Airport (Pakistan).
Phones : 480371-5. Telex : 25860 MHL PK. Cable : "MIDKAP". SITA : KHIVHMKL.
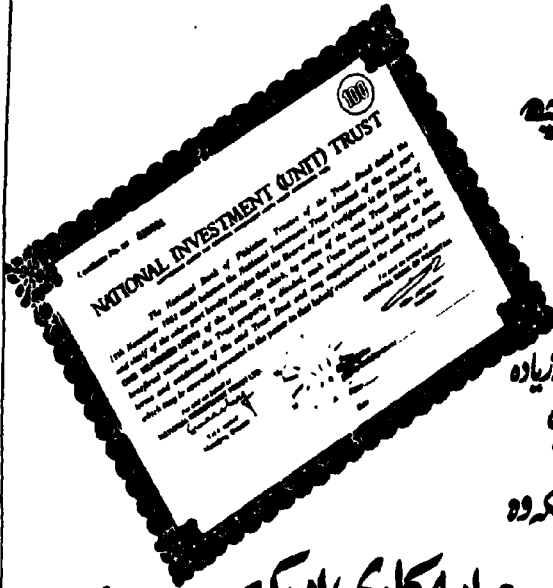
کیا یہ سچ ہے کہ کچھ

این آئی ٹی یونٹ

خریدار دوسروں سے زیادہ فائدے میں رہتے ہیں؟

جی ہاں کیونکہ وہ

مجموعی سرمایہ کاری اسکیم (CIP)

میں شامل ہوکر دوہرا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

- انہیں منافع کے بدلے اضافی یونٹ رعایتی قیمت (۱ روپیہ فی یونٹ کم) پر مل جاتے ہیں۔
- اس اسکیم کے تحت حاصل کردہ یونٹوں پر بھی آئندہ مالی سال میں انکم ٹیکس میں رعایت ملتی ہے۔ اس طرح بغیر کسی اضافی سرمایہ کاری کے انکم ٹیکس میں مستقل چھوٹ حاصل کی جاسکتی ہے

جو یونٹ خریدار مجموعی سرمایہ کاری اسکیم سے فائدہ اُٹھانا چاہیں وہ اپنے رجسٹریشن نمبر کے ساتھ ہمیں مالی سال کے اختتام یعنی ۳۰ جون سے پہلے مطلع کردیں۔

مزید معلومات کے لئے رابطہ قائم کیجیے۔

این آئی ٹی سرمایہ کاری کا قابل اعتماد ادارہ

نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ لمیٹڈ

PID-1-4-5/86

United

Announcing the opening of the first Computer Institute with IBM System/36.

Hands-On is the first computer training institute to install in-house IBM System/36 with multiple terminals. It fulfills the yawning gap which had arisen due to non-availability of personnel trained on mini & mainframe computers. Now you can train for mini & mainframe systems on the world's most popular computers. And can give yourself a career-building advantage.

In the field of micro-computers too Hands-On is pre-emminent. It is the most lavishly equipped institute with a large number of micro-computers. Manned by experienced & qualified teachers with highly innovative approach to training & tutoring.

In this stimulating environment you will find yourself growing by the week, and will discover abilities you never suspected you had.

For details please give us a visit.

Brings out the best in you

11 & 12 F, Dadabhoy Centre, Shara-e-Faisal, Karachi. Phones: 522059 – 526935, Telex: 24434 GAFAR PK.

محکمہ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، راولپنڈی
پی ای سی ہیو آرمی ایجوکیشن اور ایئر ہیڈکوارٹرز سے منظور شدہ

جاری شدہ ——— ۱۹۴۵ء
ٹیلیفون نمبر ——— ۲۱۴۰۷۹

سال ——— ۴۵ ● شمارہ ——— ۲۳۴

——— : مدیر : ———

صہبا لکھنوی

——— نمائندہ اعزازی ———

راشد نور

——— : زرِ سالانہ : ———

بیرونی ملکوں سے		پاکستان میں
۱۵ پونڈ ——— ۲۰ ڈالر		-/۸۰ روپے معمولی ڈاک سے
ہوائی جہاز سے ۲۰ پونڈ ۴۰ ڈالر		-/۱۲۰ روپے رجسٹری سے

فی شمارہ : آٹھ روپے

زیرِ اہتمام

کراچی

رابسن روڈ نزد اردو بازار

جوش نمبر • حفیظ نمبر • فیض نمبر • ندیم نمبر اور • نذر اختر حسین رائے پوری کے بعد

زندہ دوستی اور اعتراف عظمت کا نقیب

ماہنامہ **افکار** کراچی

پاکستان کے مایۂ ناز مصوّر، خطّاط اور مجسمہ ساز

آزر زوبی کے فکر و فن پر ایک لازوال پیش کش

شائع ہوگیا

چند لکھنے والے :- پروفیسر السانڈرو باؤسانی۔ جی الانا۔ پروفیسر محمد حسن عسکری۔ ممتاز مفتی۔ میرزا ادیب۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین۔ قرۃ العین حیدر۔ ڈاکٹر احسان رشید۔ اشفاق احمد۔ بانو قدسیہ۔ ڈاکٹر اسمٰعیل سعد۔ انور عنایت اللہ۔ شان الحق حقی۔ اکرام بریلوی۔ راغب مراد آبادی۔ محشر بدایونی۔ محمد علی صدیقی۔ شبنم رومانی۔ سحر انصاری۔ ڈاکٹر انور سدید۔ ڈاکٹر منیر الدین احمد۔ جوگندر پال۔ بشیر موجد۔ صمد انصاری اور دوسرے۔

- آرٹ پیپر پر زوبی کے دو درجن سے زائد فنی شاہکار (رنگین اور بلیک اینڈ وہائٹ)
- ہر مضمون زوبی کے حسین و دلکش اسکیچز سے مزیّن
- اردو رسالوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی **پہلی با تصویر پیش کش**

بہترین گیٹ اپ • آفسٹ طباعت • قیمت: ستّر روپے

مکتبۂ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی

ستمبر ۱۹۸۹ء کی تخلیقات

سرورق: موجد

افکار فاؤنڈیشن کراچی

ایک "فلاحی ٹرسٹ"

اردو رسالوں کی تاریخ میں پہلی بار اپنی نوعیت کے پہلے افکار فاؤنڈیشن نے بطور فلاحی ٹرسٹ یکم جنوری ۱۹۸۶ء سے اس کے بانی چیئرمین صہبا لکھنوی اور سرپرست اعلیٰ جناب حکیم محمد سعید اور ملک کے اٹھارہ ممتاز دانشوروں، اہل قلم حضرات اور صاحبانِ علم و فن کی نگرانی میں اپنے نئے سفر کا آغاز کردیا ہے۔

افکار فاؤنڈیشن کے کثیر المقاصد اوبی منصوبوں میں علمی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا فروغ، تحقیقی اور نادر دستاویزات کی تلاش و ترتیب اور اشاعت، مستحق ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کے لیے بہبود فنڈ کا قیام، نونہالان قوم، خواتین اور نئی نسل کے تعمیری منصوبوں میں اشتراک و تعاون شامل ہے۔ اس فاؤنڈیشن کی تمام تر کامیابی رفیقانِ افکار، محبانِ اردو اور علم و فن کی ترویج و ترقی میں گہری دلچسپی رکھنے والوں کے پُرخلوص تعاون پر منحصر ہے۔ یہ بات دہرانے کی نہیں کہ کوئی ادارہ مالی استحکام کے بغیر اپنے تعمیری منصوبوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا لہٰذا افکار فاؤنڈیشن کے ٹرسٹیوں نے جو تجاویز منظور کی ہیں ان کی تفصیلات "تعارف نامہ" میں شائع کردی گئی ہیں جو آپ ایک کارڈ لکھ کر منگوا سکتے ہیں۔

ان تجاویز کی رو سے "افکار فاؤنڈیشن" کے سرپرستوں کے لیے کم سے کم دس ہزار روپے، معاونین خصوصی کے لیے پانچ ہزار روپے مقرر کیے گئے ہیں جو دو قسطوں میں بھی ادا کیے جاسکتے ہیں۔ رفیقانِ افکار جو عطیہ بھی سہولت سے ادا فرمادیں گے قبول کرلیا جائے گا۔ ذیل کا فارم پُر کرکے بھی بھیجا جاسکتا ہے۔

میں افکار کی خدمات کا معترف ہوں اور مجھے افکار فاؤنڈیشن کے مقاصد سے اتفاق ہے
اس لیے بطور تعاون مبلغ ——— روپے بذریعہ کراس چیک / بنک ڈرافٹ ارسال ہیں۔
مجھے افکار کے سرپرستوں / معاونینِ خصوصی / رفیقانِ افکار میں شامل فرمالیجیے۔

نام ———————————

مکمل پتا ———————————

———————————

تاریخ ———————

دستخط ———————

فون: گھر ——————— فون: دفتر ———————

ادب کی جمہوریت، آزادخیالی اور فکری تجسّس

مولانا روم نے اپنے دور میں ادب کی جمہوریت کا پیغام دیتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

آمد بہار اے دوستاں منزل سوئے بستاں کنیم
گرد غریباں چمن خیمہ زنیدتا جولاں کنیم

ظاہر ہے کہ شاہیت کے اس زمانے میں جمہوریت کا وہ تصوّر نہ تھا جس نے آج ایک سیاسی فکر کی حیثیت اختیار کرلی ہے، لیکن ہر دور کی بڑی ادبی فکر کا جائزہ لیں، تو اس میں جمہور دوستی اور انسانی اقدار کی برتری کا وہ پیغام ملتا ہے جو جمہوریت کی روح ہے۔ اسی لیے ادب کی جمہوریت سیاسی تصورِ جمہوریت کی پیش رو اور اس سے بالاتر حیثیت رکھتی ہے۔ ذرا مولانا روم کی آواز پر پھر دھیان دیں، وہ دوسری جگہ کہتے ہیں کہ ؎

اے تشنگاں اے تشنگاں امروز سقّا می کنم
دمی خاک دان خشک را جنّت کنم کوثر کنم
اے بے کساں اے بے کساں جاءالفرج جاءالفرج
ہر خستۂ غم دیدہ را سلطان کنم سنجر کنم

ان اشعار میں جہاں ادب کے غایتی میلان کا اظہار ہوتا ہے، وہاں انسانی آرزومندی کے ساتھ ہر خستۂ غم کو، شاہوں جیسی زندگی تک لے جانے کے عمل سے، جمہوریت کی وہ سمت بھی متعین ہوتی ہے، جہاں جمہوریت صرف اقتدار کی کرسی کے لیے رایوں کے توڑ جوڑ کا نام نہیں بلکہ عوام کے بہتر ذہنی اور مادّی معیارِ زندگی کے لیے ایک مسلسل کوشش سے عبارت ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو جمہوریت کو نصب العین عطا کرتا اور اسے ان پُرفریب سازشوں سے الگ کرتا ہے جو کبھی ازدحامی نعروں اور کبھی تفریقی صورتوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں اور جمہوریت کا نام لے کر خود جمہوریت کی بیخ کنی میں مصروف ہیں، اگرچہ جمہوری مزاج سے میل نہ رکھنے والے عناصر خواہ ادب ہو یا سیاست اپنے مختلف بہروپوں میں اپنی روشِ گفتار سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیاسی جمہوریت کا دائرۂ کار رائے شماری یا زیادہ سے زیادہ رائے سازی تک محدود رہتا ہے، لیکن ادبی جمہوریت
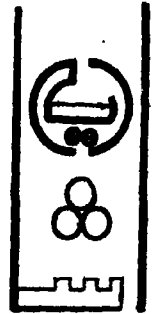
ے آگے بڑھ کر معلوم و نا معلوم کو متّصل کرتے ہوئے، جذبے اور خرد کی آمیزش سے ہر دور میں جمہوری آرزوؤں کو نیا اضطراب
ظہار عطا کرتی ہے۔

غالب نے غلطی ہائے مضامین کی شکایت کی تھی، لیکن ان غلطی ہائے مضامین کو صرف مروّجہ جمالیات یا قائم شدہ روایات کے
یں جانچنا غلط ہوگا۔ کیوں کہ پوری انسانی تاریخ اور عصری فکر کے ساتھ ساتھ مستقبل کے خواب بھی، ادب کے تصوّرِ جمہوریت
ں۔ چنانچہ وہ ادبی اظہار یا ادبی تنقید جو صرف ادب کی اندرونی ساخت سے سروکار رکھے اور اس اندرونی ساخت میں باہر کی دنیا
ں کو فراموش کردے، مزاجِ جمہوریت کے منافی ہے۔ چونکہ یہ 'اندر' اور 'باہر' لکھنے والے کی ذات سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی ہر
جمہوری تحریکات کے حوالے سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ایسے ملک میں جہاں جمہوریت کے راستے مسدود کردیئے جائیں، کبھی کسی
ے والے پر ملک سے باہر کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور کبھی بعض موثر لکھنے والوں کے اندرونِ ملک آنے پر پابندی لگادی
۔ اس کے باوجود ادب کے جمہوری تصوّرات کا سفر جاری رہتا ہے۔ کیونکہ ادب واقعات کی دنیا میں پروان چڑھتے ہوئے بھی
ت کو پیش کرتا ہے، وہ ذات، خطّے اور ملک کی خصوصیات کو جذب کرکے اپنے اندر اور باہر کے تعلّق کو ہمہ گیر جمہوری آرزوؤں
سے جانچتے ہوئے وجود میں آتی اور ان ہی سے روشنی حاصل کرتی ہے۔

انسان کو اس کے کاموں کے ذریعے ہی پہچانا جاتا ہے اور شاید اس سے بھی زیادہ اس رویّے سے جو وہ ہیئت اجتماعی کے ساتھ
تا ہے۔ ادیب کی انفرادیت کا ڈھول پیٹنے والے یہ نہیں جانتے کہ انسان اپنی فردیت میں (اور اس میں ادیب بھی شامل ہیں)
کے ذریعے مکمل ہوتا ہے بلکہ خود اس فردیت کی شناخت بھی دوسروں کے ارتباط و پیوستگی سے ہوتی ہے۔ انسان کی پوری
ہیئت اجتماعی سے قائم کردہ تعلّقات کا سلسلہ ہے۔ پھر افراد کی ان تعلقات کو زیادہ منصفانہ اور زیادہ بہتر شکل دینے
ں، جس سے پورے سماجی نظام کی صورت بدلتی ہے، انھیں وہ درجہ عطا کرتی ہے کہ وہ اپنے قائم شدہ ماحول کی جبریت کا
نے کے بجائے، اس کی نئی منزلوں کا تعین کرنے لگتے ہیں۔ انسان کا یہ وہ مثبت عمل ہے، جو اسے اس مشینی سماج کا پرزہ بننے کی جگہ
نفرادیت بخشتا ہے۔ مشینوں کے پہیوں میں کچلی ہوئی 'انفرادیت'، اب خود اپنے آپ کو بھی استوار کرتی اور مشینوں کو بھی انسان کا
تی ہے۔ وہ ادیب جو اپنی پوری شخصیت کے ساتھ اس عمل میں شریک ہوتے ہیں، اپنی ادبی تخلیقات میں نہ صرف جمہوری امنگوں کو
تے ہیں بلکہ اس ولولے، طاقت اور جذبے کے ترجمان بننے کے علاوہ جو زندگی کی صورتوں کی تبدیلی کے لیے ضروری ہے خود اپنی انفرادیت
ہنوں کا اضافہ کرتے اور اپنے ادب کے ذریعے نئے جمالیاتی اوصاف اور نیا تخلیقی اظہار وجود میں لاتے ہیں۔ اس کے برخلاف مشینی
غلام خود اپنی تخلیق کو ایک مشین سمجھ کر اس کے کل پرزوں اور ساخت کی دریافت کے کھیل میں مبتلا رہتے اور اپنے آپ یا دوسروں
دیتے ہیں۔ شاید یہ ان کی سمجھ سے باہر ہے کہ ادبی تخلیق کے اندر کا ہر جزو، کسی نہ کسی طور پر بیرونی دنیا سے منسلک ہے اور تخلیق کی
وحدت یا عدمِ وحدت، خود تخلیق کار کے باہر سے قائم کردہ رابطوں کا اظہار ہے۔ اس کے برخلاف ادبی صورتِ اظہار کو
نکر کے دور از کار فلسفیانہ بھول بھلیّوں میں الجھنے اور الجھانے والے بھی، دراصل ادب کی جمہوریت سے اسی قدر بیگانہ رہتے
وہ یہی سمجھتے ہیں کہ صحیح فکر صرف فلسفے یا سائنس کا وصفِ امتیازی ہے۔ حالانکہ ہر ادبی تخلیق جو محض نعروں کی تکرار یا قالبی
بتے اظہار پر مبنی ہونے کے بجائے، سماجی صورتِ حال کی نئی دریافت سے کام لیتی ہے، خود ایک ذہنی حرکت ہے اور اسے
حرکت کا نہایت قیمتی سرمایہ ہی نہیں، اس کا محرک بھی کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح جمہوریت کو خوش آمدید کہنے والے ان عناصر

سے بھی خبردار رہنے کی ضرورت ہے جو جمہوریت کو اس کے مزاج و منہاج سے نہیں، صرف اور صرف اس کے رایوں کے گنے جانے والے میں پہچانتے ہیں اور مخالفِ جمہوریت عناصر کو یکساں اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی پراگندہ ذہنی میں دراصل پرانے دمدموں کی گونج اور ان کی نئی آوازیں بھی پرانے تصورات ہی کی بازگشت ہیں، لیکن یہ وہ تصورات ہیں جو تاریخ کے کباڑخانے کا حصہ بن گئے ہیں ورنہ بعض قدیم سچائیاں آج بھی تازہ ہیں اور بعض نام نہاد جدتوں سے جدید تر۔ چنانچہ مذکورہ بالا حضرات کی جمہوریت، ادب جمہوریت نہیں جس کی جانب مولانا روم نے اشارہ کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سیاسی طور پر جمہوریت انتخاب کا عمل ہے اور اس انتخابی عمل کے تمام تقاضوں کو مدِنظر رکھنا چاہیے، لیکن اس انتخاب سے پہلے اور بعد، ادب کی جمہوریت میں خود ادیب کا اور آخری انتخاب یہی ہے کہ وہ "بال و پر یا من تنہا" کا قائل ہے یا اس پر یقین رکھتا ہے کہ "چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے" اسی نصب العین کے تحت وہ اپنی ہمدردی اور وابستگی کا تعین کرتا ہے۔

حالی نے بُرا شعر کہنے کی کوئی سزا ہو تو جہنم کو شاعروں سے بھرے جانے کی بات اٹھائی تھی، لیکن بُرے شعر کہنے سے بڑا جرم بُرے شعر یاد رکھنا اور انھیں پیش کرتے رہنا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ساختیات کے علم بردار ہوں یا اصطلاحات استعمال کے شائق، ادب کی معنویت سے واقف نہیں اور اس کے حسن و کیفیت کو گرد و پیش سے منسلک کرنا نہیں جانتے۔ ان اس کے ماحول و عصر کی آگہی اور مستقبل کی آرزومندی تخلیق کی آگ میں گھلتی ہیں اور ایک ایسی وحدت بن جاتی ہیں کہ جس سے پوری انسانیت کی راہیں روشن ہوتی ہیں، لیکن محض ادبی فکر کا کوئی جز وسلے بھاگنے یا صرف فنی آرائش پر توجہ دینے سے ادبی تخلیق کی حقیقی قدر و قیمت واضح حیرت یہ ہے کہ بعض شاعرانہ مہر مندی کو لفظی آرائش سمجھنے والے اپنی تائید میں آتش کا صرف ایک شعر پیش کرتے ہیں اور اس درجہ بدرجہ ناواقفانہ یا منافقانہ طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں جس کے ذریعے آتش نے شعری عمل کی وضاحت کی ہے۔ آتش کہتے ہیں کہ ؎

کھینچ دیتا ہے شبیہ شعر کا خاکا خیال   فکرِ رنگیں کام اس پر کرتی ہے پرداز کا
بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں   شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اسی طرح ادب میں حواس کی آمریت قائم کرنے کے خواہاں حضرات دراصل خیال کی جمہوریت سے خائف ہیں کیونکہ ادبی تخلیق کی ترتیب میں بظاہر خواہ کیسی ہی بے ترتیبی ہو اور کیفیات و اشارات کتنے ہی نامرتب ہوں، خیال کی منطقی گرفت اسے جمہوری کا امین بنائے رکھتی ہے۔ اسی لیے مخالفتِ جمہوریت کے مالیخولیا میں مبتلا منطق سے زیادہ بے منطقی اور معنی سے زیادہ بے معنویت کرتے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ فطرت یا مظاہرِ فطرت کے خالص احساس و ادراک میں بھی، انسانی سماج کے قائم کردہ اقدار کی جلوہ گری جا سکتی ہے اور بے نام کیفیات کو بھی نام دیا جا سکتا ہے، لیکن مزا اس وقت آتا ہے جب لایعنیت کے دعوے دار خود اپنی تشریح تخلیقات کو معنی پہنا کر اپنی ہی تردید کرتے نظر آتے ہیں۔ تجدید، ادب اور زندگی دونوں کی خصوصیت ہے۔ چنانچہ سماجی اقدار کو رواں رکھنے کے ساتھ ساتھ انھیں نئے تقاضوں کے سانچے میں ڈھالتے رہنا، جمہوریت کا فریضہ ہے۔ اسی طرح تخلیق جو مجموعی ذہنی حرکت کا حصہ ہیں، ادب کی جمہوریت کے لیے لازم ہیں۔ ادبی جدت اور تجدیدِ زندگی کی کوشش، دونوں ایک کی حلیف ہی نہیں، ایک ہی شاخ کے برگ و بار ہیں، لیکن جب جدت کے نام پر کم ہمتی اور بے مغزی، زندگی کی بہتری کی راہ رکاوٹ بن جائے تو اس کا منفی اور غیر جمہوری روپ نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف جب لکھنے والا اپنے پورے جو کے ساتھ، اپنی تہذیب، اپنے ماحول، اپنے خطے، اپنے ملک اور اپنی دنیا میں رہنے والے انسان کی ترجمانی کرتا ہے تو وہ سب

کی نمائندگی بھی کرتا ہے اور خواہ اس کا تعلق تیسری دنیا سے ہو اس کی اپنے معاشرے کو ذہنی اور مادی طور پر زیادہ بہتر بنانے کی کوشش، تاریخ پر اپنا نقش بھی ثبت کر جاتی ہے۔ شرط یہی ہے کہ وہ تجدیدِ زندگی کی خواہش کو اپنے وجود کی گہرائیوں تک محسوس کر سکتا ہو کہ اسی صورت میں اس کی تخلیق وسیع تر معنویت کی حامل بنتی ہے۔ غالب نے جب "فیضِ معنی سے خطِ ساغر راقم سرشار" کہا تھا تو "دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق" سے پہلے اس کی وضاحت بھی کر دی تھی۔ وہ "حسنِ فروغِ شمعِ سخن" کے لیے "دل گداختہ" پیدا کرنا ضروری سمجھتے تھے اور ان کی ادبی جمالیات "غم کو نہیں" انتعاشِ غم" کو محرک مان کر عرضِ حال کے وسیلے ڈھونڈھتی تھی۔ اسی لیے ان کے خوانِ گفتگو پر دل و جان کی میہمانی کا سامان ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ؎

مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی — ہوسِ غزل سرائی، تپشِ فسانہ خوانی
یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب — کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

وہ تبدیلی جو صنعتی طور پر ترقی یافتہ اور تیسری دنیا کے ترقی پذیر ملکوں میں رونما ہوئی اور ہو رہی ہے اپنے اندر بہت سے تضادات اور تصادمات بھی لیے ہوئے ہے۔ ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے صرف عصری آگہی کافی نہیں۔ اسے مستقبل کی ایک سمت دینا بھی ضروری ہے۔ اگرچہ یہ سمت ادب کی جمہوریت میں ہمیشہ سے نمایاں رہی ہے، لیکن اپنے اپنے حالات میں اس کی تعبیر بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ حالات کی ایک سے زیادہ تعبیریں ممکن ہیں اور ان ہی رنگا رنگ تعبیروں سے جمہوریت کی نشو و نما ہوتی ہے۔ کیوں کہ آزاد خیالی اور فکری تجسس فروغِ جمہوریت کے لیے ضروری ہیں۔ دنیا آج جیسی کچھ ہے، سب آج کے انسان کی بنائی ہوئی نہیں۔ یہ ماضی کی استبدادی و استحصالی تاریخ، سائنسی ایجادات، ٹکنالوجی اور اقتصادی رابطوں کی وضعیت اور سیاسی صورتِ حال کی توسیع بھی ہے۔ دورِ حاضر کی ذہنی اور سائنسی ترقی کو باقی رکھتے اور اسے آگے بڑھاتے ہوئے، انسان اور انسان کے رابطوں کو کیسے زیادہ منصفانہ اور بہتر صورت دی جا سکتی ہے، یہ آج کا اہم مسئلہ ہے۔ روایت پرستی، موافقیتِ وقت اور مستقبلِ انسانیت سے تعلق رکھنے والے کئی تصورات میں سے ہمیں اپنے حالات کے مطابق بہترین تصور کا انتخاب کرنا ہے۔ جو زیادہ سے زیادہ انسانوں کی خوشی اور معاشرے میں وسیع تبدیلی کے لیے زمین ہموار کر سکے۔ ادب کی جمہوریت، خود سیاسی جمہوریت کے لیے ایک اشارہ ہے اور تمام انسانوں کی بہبود کے ساتھ ساتھ ہمہ گیر ترقی کو مدِّ نظر رکھتی ہے۔ ادب کی جمہوریت، انسان اور انسانیت کا اثبات ہونے کے علاوہ زندگی کو وہ رُخ دیتی ہے جس میں نئی تخلیق کی آن بان ہے جس طرح ادب کی جمہوریت میں ولولۂ تازہ کاری ملتا ہے، اسی طرح سیاسی جمہوریت میں انسانوں کو یہ آزادی حاصل ہوتی ہے کہ سماجی نظام کو اپنی ضرورتوں اور اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر سکیں اور سماجی اداروں کی تشکیلِ نو کریں۔ سیاسی جمہوریت کو ادب کی جمہوریت سے توانائی ملتی ہے، اور ادب کی جمہوریت، سیاسی جمہوریت سے مستحکم ہوتی ہے۔ ہمارے آج کے حالات میں ادیبوں کو نہ صرف سیاسی جمہوریت کی بقا کے لیے کوشاں رہنا ہے بلکہ اس سیاسی جمہوریت کو ادب کی جمہوریت کے نصب العین سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اپنے ذہن کی تمام قوتوں کو بروئے کار لانا ہے۔

——— ڈاکٹر حنیف فوق
(مہمان مدیر)

۱۹۸۳ء کا ایک یادگار گروپ فوٹو

اردو مرکز کے زیر اہتمام لندن یونیورسٹی میں احمد فراز کے مجموعۂ کلام "بے آواز گلی کوچوں میں" کی تقریب اجراء کے موقع پر دائیں سے افتخار عارف۔ ڈاکٹر این میری شمل۔ فیض احمد فیض احمد فراز۔ محمد علی صدیقی اور شہرت بخاری

بلراج کومل

سیدہ نفیس حسن

نور بجنوری

جنوری ۱۹۶۹ء کا ایک یادگار گروپ فوٹو

مرکزی رائٹرز گلڈ کی مجلس عاملہ کے سالانہ اجلاس کے چند مندوبین نرائن گنج۔ کھلنا (سابق مشرقی پاکستان) میں پہلے اور دوسرے ای پی آئی ڈی سی کے میزبان، حسن حفیظ الرحمٰن، سکریٹری گلڈ (سابق مشرقی پاکستان) قلندر مومند خیبر میل پشاور کے ایڈیٹر، شوکت صدیقی (بیٹھے ہوئے دائیں سے) ایک صحافی، صہبا لکھنوی، عاذق الخیری، احمد ظفر اور سرشار صدیقی

نصر ملک

نعیم آروی

محسن بھوپالی

ادا جعفری

خود نوشت

(پانچویں قسط)

مہربان لمحے

بڑی حویلی میں گرمیوں کی دوپہر میرے لیے سب سے خوب صورت وقت ہوتا اور دلچسپ بھی۔ جب گرمی اور لو کی شدت سے بچنے کے لیے دالانوں کے پردے کھینچ دیے جاتے، خس خانوں میں پانی چھڑکا جاتا اور بوڑھی نوکرانی چھت سے لٹکے ہوئے پنکھے کی ڈوری کھینچنا شروع کر دیتی۔ بی بیاں چھوٹے بچوں کو سلا کر لڑکے لڑکیوں کو آرام کرنے کی ہدایت دیتیں اور خود بھی چوکیوں کے فرش یا پلنگ پر لیٹ کر سو جاتیں۔ نوکرانی کو بھی نیند آنے لگتی اور پنکھے کی جنبش میں وقفے بڑھتے جاتے۔ ایسے میں اکیلی میں یا کبھی ساتھی بھی ہوتے، چپکے سے باہر آ جاتی۔ اکیلی ہوتی تو چوبی سہ دری میں یا دھوپ کی سنہری چادر جو سامنے بچھی ہوتی اس کے کنارے سے تھوڑے فاصلے پر سائے میں بیٹھ جاتی اور شعر سوچتی یا کوئی کتاب پڑھتی۔ ساتھی ہوتے تو ہم زیادہ تر گھومتے رہتے۔ ایک چھت سے دوسری چھت اور ایک صحنچی سے دوسری صحنچی تک۔ بدایوں کے مئی جون کے مہینوں کی دھوپ اس زمانے میں ہمارے لیے اتنی فرحت بخش اور راحت افزا ہوتی کہ ہم ننگے پیر بھی ہشت پہلو ترشی ہوئی اینٹوں کے تپتے ہوئے فرش پر چل لیتے تھے۔ ان سنسان دوپہروں میں بڑی حویلی کی سب سے اونچی چھت کی گمٹی سے فاختہ کی آواز وقفوں سے آتی رہتی۔ میں اکیلی ہوتی تو اس وقت وہاں اس کی موجودگی کتنی طمانیت کا باعث بنتی۔ آواز کے رشتے۔ وہ اتنی پاس ہوتی جیسے صرف یہی نغمۂ مسرت مجھے سنانے کے لیے وہ بھی سب سے چھپ کر باہر آ نکلی ہے۔

اس آواز کی لہریں مجھے کتنے اجنبی جزیروں تک پہنچا دیتیں۔ کیسے کیسے جادو جگاتیں۔ دل خوشی سے سرشار ہو جاتا۔

آج اتنے سال یا شاید صدیاں ان بھید بھری دوپہروں کو بیتے گزر چکی ہیں۔ اب اس بچھڑے ہوئے دوست کی آواز بھی کہاں سننے کو ملتی ہے۔ ہاں اسلام آباد میں ایک گھر ایسا ملا تھا۔ اس گھر میں خواب گاہ کے سامنے ایک چھوٹا سا پختہ صحن تھا جس کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا اور گھنا بیری کا درخت تھا۔ اس درخت کی سب سے اونچی شاخ پر کبھی کبھی فاختہ آ کر بیٹھتی۔ پکارتی تو اس

کی آواز جیسے دل کے پار ہو جاتی۔

ع از کجا می آید ایں آواز دوست

اس آواز میں جادو تو اب بھی تھا، گریہ اداس، تنہا، دکھ بھری آواز پچھلے وقتوں میں نوید رستگاری اور پیام آشنائی کیسے بن جاتی تھی۔ بزرگ کہتے تھے، وقت وقت کی بات ہوتی ہے اور جادو برحق ہے۔ بات سچی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ آئینوں میں پرتو اور عکس کے زاویے بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی سامنے کبھی اوجھل۔ کبھی بولتے ہیں کبھی چپ رہتے ہیں۔ وہاں خوشبو تو یہاں شبنم۔ اس خاک دان میں آنے والی روح اپنے حصے کا جادو بھی ساتھ لے کر آتی ہے اور جہاں یہ طلسم ساتھ چھوڑ جائے، وہیں آدمی دم توڑ دیتا ہے۔ عمر چاہے کتنی ہی پائے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اثر پذیری کے مدارج بے شک الگ الگ ہیں اور اپنے اپنے۔

مجھے نثار یاد آ گئیں۔ نثار (عزیز بٹ) اس افسوں کی ایک جیتی جاگتی کتاب ہیں۔ انھیں پڑھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ میری عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں۔ جن دنوں ہم اسلام آباد میں رہے فون پر گھنٹوں باتیں ہوتیں اور ملاقات بھی تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز ضرور ہوتی۔ اس سے پہلے جب وہ راولپنڈی میں تھیں تو جلد ملنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا، لیکن سرکاری شہر میں جب بھی یکسانیت کا احساس بوجھل ہونے لگتا ہم دونوں نثار کے گھر پہنچ جاتے۔ اصغر بٹ خاموش طبع ہیں۔ ان کا ایک آدھ دلچسپ جملہ ان کی شرکت کا احساس دلانے کے لیے کافی ہوتا، لیکن نثار کے بے ساختہ قہقہے شب و روز کا سارا غبار دھو ڈالتے۔

ان کا شگفتہ چہرہ دیکھ کر، ان کے گونجتے ہوئے قہقہے سن کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ جھولی میں دوسروں کے بھی بہت سے غم سمیٹے ہوئے ہیں۔ کامیاب اور خوش رنگ زندگی بسر کرتی ہوئی ایک بے قرار اور بے چین روح۔ تخلیقی ادب عورت سے کچھ زیادہ ہی خراج طلب کرلیتا ہے کبھی کبھی ناقابل برداشت حد تک بھی۔ مثلاً ورجینیا وولف، سلویا پلاتھ اور اپنے ہی شہر میں سارا شگفتہ۔ اور بھی نام ہیں مگر گنائے کیسے جائیں۔ صدیوں کے اعمال نامے میں تو وہ لاتعداد بے نام خواتین بھی کہیں نہ کہیں موجود ہیں جو غبار وقت میں اپنی پہچان تلاش کرتی رہ گئیں۔ ہم تو خوش نصیبوں میں ہیں۔

نثار سے پہلی ملاقات لاہور میں ۱۹۴۲-۴۳ء میں ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ اپنے بھائی سرتاج عزیز کے ساتھ رہتی تھیں۔ سرتاج عزیز سے ہمارا ملنا جلنا ملٹری اکاؤنٹس کی ملازمت کے تعلق سے تھا۔ جو رفتہ رفتہ رشتۂ خلوص میں ڈھلتا چلا گیا تھا۔

اس وقت نثار کا پہلا ناول "نگری نگری پھرا مسافر" شائع ہو چکا تھا۔ ادھر میرا ناتا اپنی شاعری سے ٹوٹ چکا تھا اور میں ایک بے رحم احساس شکست سے دوچار تھی۔ اس لیے اس ملاقات کو کسی لحاظ سے بھی تخلیقی ادب کے حوالے سے نہیں کہا جا سکتا۔ بعد میں بے شک انھیں جڑوں سے اکھوے پھوٹے۔

سرتاج عزیز اور لالی دونوں نہایت اچھے دوست اور اچھے انسان ہیں۔ نثار میں اس وقت بڑی وجہ کشش ان کا شگفتہ مزاج تھا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ طویل اور تھکا دینے والی بیماری سے انھیں دنوں صحت یاب ہوئی تھیں۔ ان کے کسی بھی رویے سے اس گزری ہوئی بیماری کا کوئی نشان پتہ نہیں ملتا تھا۔ دیکھنے میں جسمانی طور پر بھی وہ قطعی صحت مند تھیں اور ذہنی توانائی کا ثبوت ان کا ناول تھا جو اسپتال میں قیام کے دوران لکھا گیا تھا اور اپنی طرز کی ایک کامیاب

تصنیف ہے۔

انھیں دنوں اصغر بٹ کے ساتھ ان کی شادی ہو گئی۔ پھر اصغر بٹ کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ دو تین سال بعد ہم لوگ بھی کراچی پہنچ گئے۔ اس شہر میں ان سے ملاقات گاہے گاہے ہو سکی۔ اس کی وجہ میں خود بھی نہیں جانتی۔

جن دنوں رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا وہ کراچی میں ہی تھیں۔ اس زمانے میں میرا پہلا شعری مجموعہ شائع ہو چکا تھا لیکن وہ بھی شاعری سے میری ان بن کا زمانہ تھا۔ پھر بھی ان جلسوں میں شریک ہوئی۔ نثار کے یہاں ان دنوں بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ اس لیے ان جلسوں میں ملاقات کے جو مواقع میسّر آتے وہ بھی نہیں ملے۔ پھر سلسلۂ روزگار نے ہم دونوں کو اسلام آباد پہنچا دیا۔

اسلام آباد میں ہمارے گھر بھی زیادہ دور نہیں تھے اور جب وہ گھر پہ نہیں ہوتیں تو امریکن سینٹر یا برٹش لائبریری میں ضرور مل جاتیں۔ نثار بیک وقت دو علاقوں میں رہتی ہیں۔ ایک میں دوستوں کو خوشیاں بانٹتی ہیں، رشتے داروں کا دکھ درد سمیٹتی ہیں اور دوسرا کتابوں کا علاقہ ہے جہاں سے وہ خود توانائی اور آسودگی حاصل کرتی ہیں۔ زندگی کے تمام بکھیڑوں اور الجھاووں سے دامن بچائے یا منہ موڑے بغیر نثار ہمیشہ کتابوں میں کھوئی ہوئی ملتی ہیں۔ لگتا ہے وہ صرف ادب ہی تخلیق نہیں کرتیں۔ انھوں نے اپنے لیے ایک روشن تر، حسین تر دنیا بھی تخلیق کر لی ہے۔ خدا کرے وہ اس سحر سے کبھی آزاد نہ ہوں۔

نثار کی یہ دنیا جس حد تک بھی کسی کو اس کی جھلک دکھائی دے سکے۔ ان کے قریبی دوستوں کے لیے بھی ایک جاذبیت رکھتی ہے۔ پڑھتی ہیں لیکن لفظوں سے کھیلتی نہیں۔ نمائش بھی نہیں کرتیں۔ لکھتی ہیں اور لکھتی رہتی ہیں۔ لیکن اپنی ادبی کاوشوں کی داد حاصل کرنے کے لیے کبھی انھوں نے کسی کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا اور یہ جیتے جاگتے لوگ حسّاس بھی بہت ہوتے ہیں۔

ان کا ناول "تے چراغ تے گلّے" طبع ہوا تو کسی رسالے میں اس کے بارے میں ایک افسانہ نگار کا تعصّب آمیز تنقیدی مضمون شائع ہوا جس کا تلخ لہجہ خود مضمون نگار کے بارے میں بہت کچھ بتا رہا تھا۔ نثار کے لیے یہ سوغات، اس کی جانب سے تھی جسے خلوص کا دعویٰ بھی رہا تھا۔ مضمون سب نے ہی پڑھا۔ مجھے بھی بُرا لگا۔ وہ بھی کچھ خاموش ہو گئیں۔

انھیں دنوں ایک شام ہم لوگ اسلام آباد کلب سے راول جھیل کی طرف پیدل جا رہے تھے۔ درختوں کے بیچ جو پگڈنڈیاں سی بنی ہوئی تھیں ان پر چلتے چلتے اس مضمون کا ذکر آ گیا۔ نثار کا چپ چپ ہونا دل کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ چنانچہ مضمون نگار کے لیے سزا لازم قرار پائی۔ اگاتھا کرسٹی کے ناول جو کبھی کبھی روزمرّہ کی فضول سی الجھنوں سے فرار کی خاطر پڑھے جاتے تھے ان کی رہنمائی میں یقین تھا کہ واردات کا سراغ کسی کو نہیں مل سکے گا اور جھیل کا پانی اپنی تمام متانت اور گہرائی کے ساتھ ممکنہ سہولت بھی پیش کر رہا تھا۔ پھر یہ سزا ذرا زیادہ سخت نظر آئی اور مجرم کا ہاتھ یا انگلی قلم کرنے کے طریقوں پہ غور کیا جانے لگا۔ اب ہم چاروں جھیل کے کنارے گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چہروں سے تمام آزردگی ڈھل چکی تھی بلکہ دھیمے دھیمے قہقہے بھی باتوں میں گھل مل گئے تھے۔

سوچا گیا کہ مجرم کا تعلق بہرحال ہمارے اپنے قبیلے سے ہے۔ سزا دینا ہے تو اس کے لیے یہی پُر فضا جگہ موزوں ہے جہاں اس وقت ہم لوگ موجود ہیں۔ بسنتی دھوپ اور ہواؤں کا خوش گوار لمس اور شگوفوں سے لدے ہوئے اشجار کی نکہت بیز سانسیں۔

ایسے ماحول میں مجرم کو بھی اس سزا پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بلکہ شاید وہ احسان مند بھی ہو۔

اچانک نثار کو آزادیٔ اظہار کا حق یاد آگیا۔ انھوں نے اعلان کیا۔

"مجرم کو معاف کیا جائے۔ اس کے لیے یہ سزا کافی ہے کہ جو ناول اسے قطعی پسند نہیں آیا وہ شروع سے آخر تک پڑھنا بھی پڑا اور محض ایک مضمون لکھنے کی خاطر۔ اب مزید سزا دینا انصاف سے بعید ہے۔"

ہم دونوں کی کوئی بات ایک دوسرے سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ اس کے باوجود نثار کبھی کبھی مجھ سے کہتیں "ادا بہن اس گھر کا کوئی ایک دروازہ ابھی تک میرے اوپر بند ہے"! اگر ایسا تھا تو بے ارادہ ہی تھا۔ پتہ نہیں انھیں یہ وہم کیوں ہوا۔ خود نثار کو دیکھنے اور سمجھنے کے سلسلے میں شاید میں کچھ زیادہ خوش گمان رہی اور اس لیے خوش بھی۔

نثار ویسے تو جمال ہی جمال ہیں، لیکن ہم دونوں نے ان کا جلال بھی دیکھا ہے۔ وہ اپنے اختلافِ رائے کے حق سے کبھی دست بردار نہیں ہوتیں۔ یہ ایک دعوت کا واقعہ ہے، مگر میں اس کی تفصیل کیوں یاد کروں۔ ایک آدھ اور موقع بھی ایسا آیا کہ جب اختلافِ رائے جلال کے سانچے میں ڈھل گیا۔ ہاں ایک بار وہ مجھ سے بھی خفا ہو گئیں، لیکن اس میں ان کے جلال کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ لہٰذا میں نے اس خفگی کو خفگی ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر انھیں یاد آیا کہ اس ناراضگی کی وجہ تو انھیں یاد ہی نہیں ہے۔

اب جو وہ لاہور میں ہیں اور میں کراچی آگئی ہوں تو انھیں مجھ سے شکایت رہتی ہے کہ میں خط کیوں نہیں لکھتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ خط لکھنا گویا دوری کا اعتراف کر لینا ہے۔

اسلام آباد کے جس گھر میں شاخِ سدرہ کی وساطت سے میری ملاقات گئے دنوں کی اس بھولی بسری آواز سے ہوئی تھی اس گھر کا انتخاب نثار اور حذرا (مختار مسعود) نے ہمارے لیے کیا تھا۔

سنہ ۱۹۶۱ء میں لاہور کے اسٹاف کالج سے جہاں نور پرنسپل کی حیثیت سے متعین تھے اچانک ہی ان کا تبادلہ وفاقی حکومت میں بہ حیثیت اسٹبلشمنٹ سکریٹری اسلام آباد ہو گیا تھا۔ تبادلہ بے شک نہایت اہم عہدے پر ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس تقرر کے لیے اکثر سینیئر افسران خواہش مند رہتے ہیں۔ نور کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ اسٹاف کالج میں خوش تھے۔ وہاں کا صاف ستھرا علمی اور تربیتی ماحول ان کے مزاج کے مطابق تھا جہاں نہ کسی قسم کی سیاست تھی نہ رقابت۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جس کی روزی کا وسیلہ اللہ تعالیٰ کی رضا سے صرف سرکاری ملازمت ہو اس کے پاس انکار یا انتخاب کا کوئی حق نہیں ہوتا، لیکن لاہور میں عامر ایچی سن کالج میں پڑھ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے میں اس تبادلے سے بڑی بد دل تھی۔ جناب غلام اسحٰق خاں اس زمانے میں وزیرِ خزانہ اور وزارتِ اسٹبلشمنٹ کے نگراں تھے۔ ابھی نور کو احکام نہیں ملے تھے کہ رات کو ساڑھے گیارہ بجے آغا ناصر کا اسلام آباد سے فون آیا۔ انھوں نے ریڈیو کی گیارہ بجے کی خبروں میں یہ فیصلہ سنا تھا۔ آغا ناصر اور صفیہ فون پر مبارکباد دے رہے تھے۔ نور حیران تھے اور میں عامر کی وجہ سے پریشان۔

نور نے مجھ سے کہا کہ سرکاری ملازمت میں تبادلے ہوا ہی کرتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ آخر میری فرمائش پہ وہ میرے ساتھ اسلام آباد چلنے پر رضامند ہو گئے کہ میں خود جناب غلام اسحٰق خاں کو اپنی صورتِ حال اور پریشانی بتاؤں گی۔

اگلی صبح میں نور کے ساتھ غلام اسحٰق خاں صاحب کے گھر گئی۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں جب غلام اسحٰق خاں صاحب چیئرمین واپڈا کے عہدے پر فائز تھے تو نور ممبر فنانس واپڈا تھے۔ ان کی بیگم سے بھی میری ملاقات تھی اور ان دونوں کی شفقتیں اور

محبتیں کئی سال بہت قریب سے ہمیں حاصل رہی تھیں۔
اسحٰق صاحب سگریٹ پیتے رہے، مسکراتے رہے اور میری فریاد سنتے رہے۔ فیصلہ اپنی جگہ قائم رہا۔ بے شک محبتیں اور شفقتیں بھی اپنی جگہ موجود رہیں۔
لاہور واپس آکر میں نے نور سے کہہ دیا کہ اس بار اسلام آباد میں رہنے کے لیے مکان کا انتخاب میں نہیں کروں گی۔ جو مکان وہ چاہیں خود ہی کرائے پر حاصل کر لیں۔ نور نے یہ فریضہ نثار اور عذرا کو سونپ دیا۔ دونوں اسلام آباد میں تھیں اور دونوں نے اس سلسلے میں نہ صرف تلاش و جستجو کا تھکا دینے والا کام کیا بلکہ جب میں سامان کے ساتھ اسلام آباد پہنچی تو اس مکان کو گھر بنانے میں بھی میری مدد کی۔ میں پیکنگ کے جھمیلوں سے تھکی ہوئی تھی اور اس تقرر سے ابھی تک خوش بھی نہیں تھی۔ سامان کردوں میں ادھر سے ادھر لایا لے جایا جا رہا تھا اور وہیں ایک کرسی پر میں بیٹھی ہوئی تھی۔
نثار لاہور گئی ہوئی تھیں۔ عذرا کام کرنے والوں کو ہدایات دے رہی تھیں۔ وہ مکان آرام دہ ہونے کے علاوہ خوبصورت بھی تھا، لیکن سچی بات ہے کہ اس وقت مجھے بالکل پسند نہیں آرہا تھا۔ سامنے میں عذرا نے آکر کہا۔
"ادا بہن آپ کا کمرہ میں نے تیار کروا دیا ہے۔"
میرے دل سے عذرا کے لیے دعائیں نکلیں۔ وہ آج بھی میرے لیے چھوٹی بہن کی طرح ہیں۔ نرم خو، نرم دل اور نرم گفتار عذرا دوستوں کے لیے سراپا خلوص و ایثار، شناساؤں کی دردمند اور غم گسار۔
مختار مسعود اس زمانے میں وزارت صحت کے سکریٹری تھے۔ ایک بار میں نے مختار مسعود سے کہا تھا۔
"آپ کو عذرا پر فخر کرنا چاہیے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ تصنیف، آپ کی نہیں ہے۔ ان کے مزاج اور رویوں کا تمام حسن اس گھر اور اس ماحول کی دین ہے جہاں انھوں نے آنکھ کھولی تھی۔ بلکہ میرے دل کی پوچھیے تو آپ کی جن تصانیف نے آپ کو صفِ اوّل کے مصنفین میں شامل کیا ہے اس میں بھی عذرا کا بڑا حصہ ہے۔"
اس پر وہ چونکے، مگر میرے دعوے میں مبالغہ نہیں تھا۔ عذرا ایک مثالی بیوی ہیں۔ لکھنے کے لیے جس گوشۂ سکون و فراغت کی آرزو دل میں ہوتی ہے وہ عذرا نے بہ ہر طور انھیں مہیا کیا ہے۔ نہ انھوں نے کبھی ان کے مقرر کردہ معمولات میں رخنہ آنے دیا نہ وہ کبھی ان کے وقت کی دعوے دار بنیں۔
مختار مسعود سے بھی ہم دونوں کو ہمیشہ قرب کا احساس رہا ہے۔ مزاجاً کاملیت پسند، لیکن دوستوں کے بہترین دوست ہیں۔ ہماری خاطر تو وہ اپنے اٹل روزمرّہ کے پروگراموں میں ترمیم بھی گوارا کرتے رہے ہیں۔ نور انھیں مردِ کامل کہتے ہیں۔ سچ یوں کہ نور ایک ہی سانس میں مختار مسعود کے ناقد بھی ہیں اور مدّاح بھی۔ یہ سب جانتے ہیں کہ وہ مدّاح زیادہ ہیں۔
زندگی کے میدانِ حشر میں مجھے اپنی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود دوستوں بلکہ شناساؤں کا بھی بے کراں خلوص شجرِ سایہ دار کی طرح ملا ہے۔ اسلام آباد میں اور بھی جوآئینہ تمثال دوست تھے اور ہیں ان سب کی یادیں گراں بہا سرمائے کی طرح میرے دل میں محفوظ ہیں اور صرف اسلام آباد ہی کیوں کہوں۔ دوستوں کے معاملے میں ہم اور نور دونوں اللہ کے فضل و کرم سے بہت خوش قسمت رہے ہیں۔
اب سوچتی ہوں کہ بچپن میں سب سے اتنی الگ تھلگ کیسے رہی۔ ایک محبت سے محرومی کا وہ کیسا انتقام تھا جو میں اپنی ہی

ذات سے لے رہی تھی۔ برسوں کوئی دوست نہیں، کوئی سہیلی نہیں۔ اس زمانے میں لوگوں کی رفاقت مجھے منظور ہی نہ تھی۔ دن کتابوں کی معیت میں گزرتا جنھیں اچھی طرح پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ شام پڑے باورچی خانے میں پیڑھی پر چپ چاپ بیٹھی ہوئی سی دھیان کی پُروائی کا دامن تھامے ہوئے، سامنے چولھے کی آگ سے اٹھتا ہوا گلابی دھواں اور توے سے اترتی ہوئی سنہری روٹیاں اور پکانے والی ملازمہ کی بے رنگ چوڑیوں کی رنگا رنگ کھنک، اور سامنے پیڑھی پر بیٹھی ہوئی ایک اکیلی لڑکی جو وقت کے جادوگر سے اپنا پتہ پوچھ رہی تھی۔

(خود نوشت کی نئی قسط بعنوان "آئینہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے" ملاحظہ کیجیے)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا غیر مطبوعہ افسانہ

داستانِ ہند باد

تقریباً تیس سال کے بعد ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری افسانوی دنیا میں واپس آئے ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک نامکمل افسانے "داستان ہند باد" کو جو سچے واقعات کا آئینہ دار ہے۔ نوک پلک سے سنوار کر بطور خاص افکار کے لیے عطا کیا ہے جسے ہم بصد فخر و مسرت اکتوبر ۱۹۸۹ء کے شمارے میں پیش کر رہے ہیں

جناب شان الحق حقی کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری

علمی و ادبی حلقوں میں یہ خبر دلچسپی اور مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے مشہور و ممتاز شاعر، ادیب، مترجم اور نظم و نثر کی کئی کتابوں کے مصنف جناب شان الحق حقی کو ان کی اعلیٰ ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک امریکی یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری عطا کی ہے۔

حقی صاحب بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں اور انھیں زبان و ادب کی گراں مایہ خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان بھی ستارۂ امتیاز کے اعزاز سے نواز چکی ہے۔ ادارۂ افکار ڈاکٹریٹ کے اعزاز پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

بلراج کومل

ہمارے شہر کی ایک نظم

ہمارے شہر کے بہت سے خوش لباس لوگ
بدخصال، مشتہر
نئی نرالی لذّتوں میں گھر گئے
عجیب شور ہے ہمارے چار سو
فروغِ تمکنت کے جوش میں
یہ لوگ مانگتے ہیں
کچھ کشادہ، سبز، شادماں
کسی برہنہ حال کی زمین اور
آسمان، کچھ زیادہ مہربان آسمان اور
تازہ تر
وسیع تر فراغتوں کی، لذّتوں کی فصل اور
ہمارے شہر کے پرانے دوستوں کی
دشمنوں کی
سب حدیں الجھ گئیں
جو کٹ گئے تھے کل
شجر وہ جل چکے
جو زہر گھل گیا ہوا میں
پھیلتا چلا گیا
کدورتوں کے، وحشتوں کے سلسلوں میں

چند لوگ جو عزیز تھے ہمیں
وہ ایک دوسرے کے ہاتھ سے
یہیں کہیں پہ قتل ہو گئے
وہ حرفِ اضطراب تھے
وہ محض حادثہ تھے یا
وہ محض بے مقام سے عدد!

یہ کیسا اتفاق ہے
کہ روز و شب یہاں پہ اب
سیاہ کار اجنبی فضا میں
تیرتی ہے ایک آبدیدہ آنکھ
تیرتا ہے ایک بند کان
ایک پھڑپھڑاتا لب
نحیف، ننھی سا ایک ہاتھ
ایک ادھ کٹا سا پاؤں
ایک عضوِ رائیگاں
حدِ نگاہ تک مگر
رواں دواں ہے خوش لباس کارواں

خاطر غزنوی

موت

——یہ پتّا
ہوائیں اُڑا لائی ہیں اس کو جانے کہاں سے
یہ بے بس، یہ بے جاں، یہ بے حس نزاکت
——یہ پتّا
کہ جس کا برہنہ بدن کہہ رہا ہے
کبھی وہ بھی سبز اطلسی پیرہن میں
جواں شاخساروں کی زینت رہا ہے
برستی رہی ہے بہاروں کی بوچھار اس کے بدن پر
مسرّت کا اظہار اس نے کیا تالیوں کی زباں میں
——یہ پتّا
کہ جس کی ہتھیلی پہ الجھی لکیریں ہیں
کہ جیسے کسی مُردہ انسان کی منسلک استخواں ہوں
کہ جن پر کہیں بھی نہ ہو گوشت اور پوست کا
ایک ذرّہ نشاں بھی
——یہ پتّا
یہ صرف ایک جالی —— یہ نقشِ خیالی
عمارت کا نقشہ
فقط ایک پنجرہ
جُڑی کھپچیاں ہیں
پرندہ کہاں ہے؟
یہ زندہ کہاں ہے!
فقط اس کی خالی ہتھیلی پہ اس کا مقدّر
لکیروں کی صورت رقم
اس کا نوحہ کناں ہے

o

اکبر حیدرآبادی

مکالمہ

قلوپطرہ سے زلیخا نے کہا
لاکھ معصوم سہی
لاکھ وفادار سہی
پیکرِ تسلیم و رضا لاکھ خود آزار سہی
مرد پھر مرد ہے
اپنی رعنائی و زیبائی و دلداری سے
رام کر لیتا ہے دل عورت کا

صاحبِ ادراک سہی
لاکھ خود بیں سہی خود سر سہی بیباک سہی
مرد پھر مرد ہے
عورت کے حضور
موم کی طرح پگھل جاتا ہے

سُن کے یہ بات
بڑی تمکنت و ناز کے ساتھ
قلوپطرہ نے کہا
صاحبِ سیف و قلم

(آکسفورڈ سے)

محسن بھوپالی

نظمانے

سخن شناس

رستہ چلتے ـــــ ایک گداگر
سامنے آیا تو،
میرے منہ سے فقرہ نکلا
بابا "معاف" کرو

اس نے قہر آلود نظر سے
مجھ کو دیکھا ـــــ اور کہا
میں نے تم سے کب مانگا تھا
گداگری میں عمر کٹی ہے
اب میں چہرے پڑھ لیتا ہوں!

مہربانم

وہ جب بھی کہیں مجھ کو ملتے تو کہتے
کوئی میرے لائق اگر کام ہو تو
میں حاضر ہوں بھائی

ایک دن میں نے اپنی ضرورت بتا دی
تو کھیسیں نکل آئیں
اور اس طرح جملے چبا کر وہ بولے
عجب ـــــ اتفاقات ـــــ ہیں کیا کہوں
کل سلامت میاں آئے تھے
ان کو میں دے چکا ہوں
ـــــ کوئی دوسرا میرے لائق اگر کام ہو تو
میں حاضر ہوں بھائی!

اشفاق حسین

محبت کی ایک نظم اپنے بیٹے کے نام

میں تمہاری آنکھوں سے
وہ زمانے دیکھوں گا
جو ابھی نہیں آئے

میں تمہارے پاؤں سے
تیز تیز بھاگوں گا
ایسی شاہراہوں پر
جو ابھی نگاہوں سے
مثلِ خواب اوجھل ہیں

میں تمہارے ہاتھوں سے
وہ پہاڑ چھو لوں گا
جس کو سوچ کر بھی اب
سانس پھول جاتی ہے

وہ پہاڑ وہ رستے
جن پہ تم کو جانا ہے
وہ نیا زمانہ ہے
اور وہ تمہارا ہے

میں کہ اُس زمانے کو
دیکھ بھی نہ پاؤں گا

لیکن اُس زمانے کی
ہر گھڑی کو ہر پل کو
میری آنکھیں دیکھیں گی
ان چمکتی آنکھوں سے
جو تمہاری آنکھیں ہیں

میں تمہاری آنکھوں میں
نور بن کے بستا ہوں
پیار بن کے رہتا ہوں
خواب بن کے زندہ ہوں

میرے سارے خوابوں کو
ان جمیل آنکھوں کے
ایک خاص گوشے میں
تم چھپا کے رکھ لینا
اور اگر کبھی یہ خواب
پھول بن کے مہکیں تو
ان کی خوشبوؤں میں تم
میرے نام کے سب حرف
احتیاط سے رکھنا!

(ٹورنٹو)

نوشاد نوری

مُہر

گردش کا کوئی ربط نہیں آسماں کے ساتھ
گردش ہو، آسمان ہو، دونوں گمان ہیں
اور آدمی کا ربط ہے گہرا گماں کے ساتھ

ایسی ہی بندشوں میں ہے دنیا بندھی ہوئی
بجلی کی موج زَد میں ہے ابرِ رواں کے ساتھ
وابستہ ہیں نخیل وحدی خواں و آب جو
اک عرصۂ قدیم سے دشتِ تپاں کے ساتھ
لیتی ہیں پینگ، گرم ہواؤں میں کونپلیں
شاخوں کی پور پور میں فصلِ خزاں کے ساتھ

آیت کوئی دلوں سے پچھوڑو خدا کے نام
پتھر سے پھول، ریت سے سبزہ، زمیں سے رس
کلمہ کوئی لہو سے اچھالو بقا کے نام

لوار مغانِ رقص، بگولوں سے دشت میں
کچھ ہدیہ نکہتوں کا لٹاؤ صبا کے نام
تھوڑی ضیا، روایت و تاریخ و رسم سے
کچھ دردِ دل خراش سمیٹو دعا کے نام
زرّیں عبا ملائے رکھو خرقہ پوش سے
لاؤ کوئی حدیث دریدہ قبا کے نام

ابرِ رواں میں برق کی حدّت بلا کی ہے
کس کس کو راس آتا ہے موسم شگفت کا
سچ ہے عمر پہ مُہر سی اب ہوا کی ہے [uncertain]

(بنگلہ دیش سے)

نسیم سیّد

نرسنگ ہومز

(وہ جگہ جہاں بوڑھے زندگی کے باقی ماندہ دن گزارتے ہیں)

وادیِ گل میں محبّت کا ثمر لگتے ہیں
ان کو باہر سے جو دیکھو۔ تو یہ گھر لگتے ہیں
یہ جو گھر جیسے نظر آتے ہیں۔ ویرانے ہیں
زندہ تابوت ہیں جن میں، وہ عزاخانے ہیں
آخرِ عمر کے مجرم، یہاں دن کاٹتے ہیں
باتیں کرتے ہیں یہ دیواروں سے دکھ بانٹتے ہیں
اپنے دن انگلی پہ دن رات گنا کرتے ہیں
جانے کس آس میں یہ در کو تکا کرتے ہیں
زندگی اجنبی چہروں میں جو بولاتی ہے
دور تلک گھیر کے وحشت انھیں لے جاتی ہے
صبح سے آس کی دہلیز پہ جا بیٹھتے ہیں
دن ڈھلے یاس کو چوکھٹ سے لگا دیتے ہیں

تھام کے ہاتھ ہواؤں کا چلا ہے کوئی
دل کو تنہائی سے بدتر بھی سزا ہے کوئی
جسم ہر عمر میں چاہت سے نمو پاتا ہے
ہو نہ رشتوں کی حرارت تو یہ مرجاتا ہے
آخری عمر دعاؤں کے ثمر چاہتی ہے
یہ تو بس ایک محبت کی نظر چاہتی ہے
اور یہ ایک محبّت کی نظر ہے مفقود
جس میں آوازیں ہوں بچّوں کی وہ گھر ہے مفقود
یا دپھر اوڑھا کرتی ہے جدھر جاتے ہیں
ٹوٹ کے مٹّی کے برتن سے بکھر جاتے ہیں
اپنی دیواروں کے قانون میں جینا ہے انھیں
جو کنواں کھودا تھا اب آپ ہی پینا ہے انھیں

اپنے ماضی کی طرف دیکھتے گھبراتے ہیں
مڑ کے بس دیکھا، کہ پتھر کے یہ ہو جاتے ہیں

(کینیڈا سے)

تاج سعید

رفتید ولے نہ از دلِ ما

شیر افضل جعفری

جعفری صاحب گزر گئے اور کہ گئے ہیں اداس
اردو پنجابی کی رانی لے بیٹھی بن باس!
جعفری صاحب سادہ منش تھے سب کے یار اور بیلی
وہ روٹھے اور ہیر سیال کی رخصت ہوئی سہیلی
وہ تھا جھنگ سیال کا بیٹا، مجھیوں کا رکھوالا
جس کے دل میں روشن اُلفت اور پیار کا ہالہ
نرم سجل کویتائیں اس کی دل پر چوٹ لگائیں
تاج پیا کن لفظوں سے اب یہ گلزار سجائیں

ایوب صابر

کومل دیس کا رہنے والا صابر روٹھ گیا
پشتو اور اردو کا سندر سنگم ٹوٹ گیا!
بچھڑ گیا وہ یار کہ جس کو جنتا سے تھا پیار
اسی پیار کے کارن اس کو چاہتا تھا سنسار
دلبر تھا دلدار تھا اپنا، دل والوں میں رہتا
اپنی دھن میں مست سدا وہ نظمیں غزلیں کہتا
اُس کا لہجہ اُس کی باتیں رہ رہ کر تڑپائیں
وہ نہ ملے تو اُس کو ڈھونڈنے کون سی نگری جائیں

اردو رسالوں کی تاریخ میں

پہلی بار

مشہور مصوّر، خطّاط اور مجسّمہ ساز

آزر زوبی

کے فنّی کمالات اور ۲۴ رنگین اور بلیک اینڈ وہائٹ
منفرد تصاویر کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

قیمت : سو (۱۰۰) روپے

نئے سالانہ ممبر :- ایک سو اسی (۱۸۰) روپے ذریعے منی آرڈر بھیج کر یہ لازوال پیش کش
رعایتی قیمت میں حاصل کر سکتے ہیں۔

فارغ بخاری

جب سے پہلو ہوا نے بدلا ہے — کس تکلّف سے غنچہ کھلتا ہے

ایسا یک رنگیوں کا دور ہے یہ — آئینوں کا بھی ایک چہرہ ہے

اُٹھ کے ساحل تک آ نہیں سکتی — کتنی بے درد موج دریا ہے

کتنی بے داغ چاندنی ہے مگر — کیا کوئی اس پہ سو بھی سکتا ہے

دنیا کتنی بدل گئی لیکن — اب بھی کانٹوں میں پھول کھِلتا ہے

جا کے گہرائیوں میں دیکھ ذرا — زور ان پانیوں میں کتنا ہے

اس بدن نے ہزار آنکھوں سے

میری بیچارگی کو دیکھا ہے

○

نور بجنوری

تتلیاں، پھول، دھنک، چاند ستارے مجھ میں
رنگ ہی رنگ ہیں بکھرے ہوئے سارے مجھ میں

دل نے بس ایک جھلک روزِ ازل دیکھی تھی
منعکس ہو گئے سب نقش تمہارے مجھ میں

برچھیاں لے کے نکل آئے وہیں خارِ جنوں
جب کبھی واماندگی نے پاؤں پسارے مجھ میں

پار لگ جاؤں! کہ چپ چاپ فنا ہو جاؤں!
کشتیاں مجھ میں، بھنور مجھ میں، کنارے مجھ میں

پھر کوئی جنّتِ گم گشتہ مجھے یاد آئی
پھر دمکنے لگے ٹوٹے ہوئے تارے مجھ میں

پھر خلاؤں میں کہیں ایک نشیمن چمکا
بال و پر پھر کسی طائر نے سنوارے مجھ میں

میں ہی کج فہم تھا، مجھ کو ہی نہ ادراک ہوا
معجزے اس نے تو دن رات اتارے مجھ میں

جوہر سعیدی

صرصر سے اختلاط، صبا کا نہ ہو سکا
جو چاہتے تھے ہم، وہ تماشا نہ ہو سکا

باطل شبِ فراق کا دعویٰ نہ ہو سکا
جلتے رہے چراغ ، اُجالا نہ ہو سکا

در در کی خاک چھاننے والی نگاہ پر
ظاہر کبھی، وہ نقشِ کفِ پا نہ ہو سکا

طوفاں نے آ کے راستے ہموار کر دیے
موجوں سے کارِ مشکلِ دریا نہ ہو سکا

ہم سے ملا تو بھول گیا اپنے آپ کو
اک ایسا آدمی، جو کسی کا نہ ہو سکا

ہم بھی حصارِ جلوۂ امروز میں رہے
اُن سے بھی آج وعدۂ فردا نہ ہو سکا

جوہر مشاہدات کی دنیا میں آج تک
پیدا حریفِ دیدۂ بینا نہ ہو سکا

محسن احسان

تھے کامیاب اتنے کہ ناکام ہم ہوئے
آغاز ہی میں محرمِ انجام ہم ہوئے

کاسہ بدست پہنچے نہ کس کس کے در پہ ہم
سب اہلیانِ شہر میں بدنام ہم ہوئے

جن پر کوئی چراغِ محبّت نہ جل سکا
اس شہرِ زندگی کے در و بام ہم ہوئے

جن سے کوئی تعلّقِ خاطر نہ تھا کبھی
ان مہ وشوں کے واسطے بدنام ہم ہوئے

ایمان کی رمق ہے نہ ایقان کی چمک
ہے مختصر کہ بندۂ اسلام ہم ہوئے

محسّن ہماری خاک بھی رزقِ ہوا ہوئی
یعنی غبارِ گردشِ ایّام ہم ہوئے

ڈاکٹر سعید اختر درّانی

چھاؤں زلفوں کی، کبھی رُخ کے اُجالے بخشے
تیرے پیکر نے ہر اک رُت کے حوالے بخشے

تیری آنکھوں نے بہاروں کے دریچے کھولے
تیرے گالوں نے سمن، ہونٹوں نے لالے بخشے

تھیں بہاروں میں کہاں ایسی دہکتی کلیاں
تیرے عارض نے انھیں رنگ نرالے بخشے

تیری آنکھوں نے درِ میکدہ جب باز کیا
تیرے ہونٹوں نے شرابوں کے پیالے بخشے

اخترِ زار نے صدمے سہے اتنے یا رب!
ہے دعا، اس کو تو اے بخشنے والے بخشے

(برمنگھم سے)

حفیظ شاہد

ہر حقیقت گمان لگتی ہے
زندگی امتحان لگتی ہے

میری تخیل کے پرندوں کی
کتنی اونچی اُڑان لگتی ہے

دھوپ کے دشت میں تری قربت
مجھ کو اک سائبان لگتی ہے

مجھ کو رکھتی ہے گردشوں میں مدا
یہ زمیں، آسمان لگتی ہے

ٹوٹی کشتی بھی گر خدا چاہے
خود کنارے سے آن لگتی ہے

زندگی جب عذاب ہو جائ
موت بھی مہربان لگتی ہے

مجھ کو ہر داستانِ غم شاہد
اپنی ہی داستان لگتی ہے

اقبال حیدری

فردوس لگے ہے نہ پری خانہ لگے ہے
یہ شہرِ گل اندام تو ویرانہ لگے ہے

ہم خاک نشینوں کے لیے اس کا تڑپنا
ہر چند حقیقت ہے پہ افسانہ لگے ہے

تم مجھ کو پکارو، میں صدا دیتا ہوں تم کو
خاموش بہت زیست کا کاشانہ لگے ہے

لگتا ہے کہ واعظ کو بھی نسبت ہے اسی سے
اندازِ سخن اس کا رقیبانہ لگے ہے

جو بادہ گساروں میں بھی شامل نہیں ان پر
الزامِ سبو، تہمتِ پیمانہ لگے ہے

یہ تازگیٔ رنگِ سخن حاصلِ جاں ہے
دکانِ مضامیں کہاں روزانہ لگے ہے

اقبالؔ ترا کام کوئی رکتے نہ دیکھا
تیرا تو بڑے لوگوں سے یارانہ لگے ہے

سہیل اختر

جب دلوں سے پیار کا بندھن جدا ہو جائے گا
دیکھ لینا آدمی خود ہی فنا ہو جائے گا

دل کے گوشے میں سجایا تھا جسے بت کی طرح
یہ نہ تھا معلوم اک دن وہ خدا ہو جائے گا

ایک پل کو بھی نہ سوچا تھا کہ ہم تم میں کبھی
دوریوں کا حائل ایسا سلسلہ ہو جائے گا

زندگی کے راستوں میں مَیں اگر بھٹکا کبھی
تیرے کوچے کی طرف ہر راستہ ہو جائے گا

میری نظریں اس کے پیکر سے لپٹ جائیں اگر
انگ انگ اُس شوخ کا رنگِ حنا ہو جائے گا

جس کی سانسیں میرے چہرے پر کبھی رقصاں رہیں
کیا خبر تھی اس سے اتنا فاصلہ ہو جائے گا

چاند چہروں کا تصور چھوڑیے ورنہ سہیلؔ
عرصۂ ہستی سراپا رت جگا ہو جائے گا

ڈاکٹر خالد سہیل

مارے گھر کی ہراک چیز بے گھروں کی طرح
مریر بچوں کی بے ربط خواہشوں کی طرح

مارے عہد کے ذی ہوش خانداں سوچیں
ہ دلدلوں کی طرح ہیں کہ ساحلوں کی طرح

دا ہوئے وہ گھروں سے تو یوں لگا سب کو
لک پڑے ہوں وہ آنکھوں سے آنسوؤں کی طرح

ہت سے لوگ دلوں کے قریب تھے پر اب
ھر گئے ہیں زمانے میں فاصلوں کی طرح

وایتوں کے اندھیروں میں ٹمٹماتے ہیں
وان نسل کے افکار جگنوؤں کی طرح

مانہ چھپتا ہے ان شاعروں سے اب خالد
شہرِ زیست میں آئے ہیں آئنوں کی طرح

(کنیڈا سے)

مصطفٰے اجمال

کیوں بوئے گل کو گل سے ہی نسبت نہیں رہی
کیا روح کو بدن کی ضرورت نہیں رہی

ہم بھی چراغِ بزم کی تھے روشنی کبھی
شاید نگاہِ شوق میں شدّت نہیں رہی

بدلے ہیں اتنے روپ کہ اب تو نگارِ فن
رنگوں کے امتزاج کی صورت نہیں رہی

اب دوستی کے نام سے ایمان اٹھ گیا
اب دشمنی کے نام سے وحشت نہیں رہی

گلشن کی جو علامت فصلِ بہار تھی
وہ حُسن، وہ نکھار، وہ نکہت نہیں رہی

بحرِ تفکرات میں آئے خوشی کی لہر
احساس میں وہ خوئے لطافت نہیں رہی

دل سے نکال دیجیے شبہات بھی جناب
بُت کو صنم کدے کی ضرورت نہیں رہی

(بحرین سے)

خورشید احمر

دشتِ مہتاب طلب یاد آیا
پھر وہی محشرِ شب یاد آیا

نام آیا تھا زباں پر اُس کا
مجھ کو پہلوئے ادب یاد آیا

پھر بہار آئی گلستاں کے قریب
یا ترا خندۂ لب یاد آیا

شمع کے گرد پتنگوں کا طواف
دیکھ کر اپنا نسب یاد آیا

ہم تو خاموش ہی رہتے لیکن
شیوۂ اہلِ غضب یاد آیا

جس سے ہوتا ہے تصوّر روشن
پھر وہ خورشید لقب یاد آیا

مشتاق احمد

کسی سے پھر کہیں دھوکا ہوا ہے
ستارا شام کا سہما ہوا ہے

ہوا ساکت، فضا خاموش، ہر سُو
عجب اک خوف سا پھیلا ہوا ہے

پرندہ صبح دم ہی گھونسلے سے
تلاشِ رزق میں نکلا ہوا ہے

ہمارے عہدِ بے عنواں کا انسان
خود اپنے آپ سے بچھڑا ہوا ہے

مجھے دیکھو کہ میں زندہ ہوں پھر بھی
جگر چھلنی ہے، دل ٹوٹا ہوا ہے

نعیم آروی

اٹھائی

اصل مسئلہ فیصلہ نہیں بلکہ اس پر عمل کرنے کا وہ ولولہ اور ارادہ ہے جو انسان کو اندر سے ہر دم اکساتا رکھتا ہے۔ فیصلہ تو میں ہمیشہ کر لیتا ہوں اور وقت پر ہی کرتا ہوں جو ذرا مشکل کام ہے، لیکن جب اس پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو ہر قسم کے تذبذب اور خوف کے بھنور میں پھنس جاتا ہوں اور نتائج کی تلاش میں مسئلے کی اہمیت اور شدّت دونوں کو بھلا بیٹھتا ہوں۔

انسان متضاد خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ کبھی کبھی سب کچھ برداشت کر لیتا ہے اور کبھی معمولی بات مشکل سے برداشت کر پاتا ہے۔ اگر ذات میں تھوڑی بہت خودداری کا رنگ بھرا ہو تو HUMILIATION کو سہہ لینا کوئی آسان کام نہیں خاص طور سے مجھ ایسے SELF CENTERD کے لیے تو یہ موت اور زندگی کا مسئلہ بن جاتا ہے اس لیے میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ آج کچھ نہ کچھ کر کے رہوں گا۔ آخر اپنی زندہ لاش کو پامال کرنے کی اجازت کب تک دوں گا۔

نئی اتھارٹی نے یہاں کا انتظام سنبھالتے ہی سب سے پہلے وہی کام کیا جسے سماجی زندگی میں بالعموم روایتی جبر کا نام دیا جاتا ہے۔ ہر ایک کی عزتِ نفس کو اتنا کچل دیا جائے کہ کوئی سر اٹھانے کے قابل نہ رہے کیوں کہ مسائل ہمیشہ سر اٹھانے سے جنم لیتے ہیں۔

کھڑکھڑاتی روٹا مشینیں اور چوڑے نالے کے بہتے ہوئے گندے پانی کے درمیان قدیم وضع کی عمارت کی دس اور بارہ سیڑھیوں کی پہلی اور دوسری قسطیں پھلانگتا کر جوں ہی اوپر پہنچا تو سیاہ نوٹس بورڈ پر آویزاں نئے اور تازہ حکم نامے کے سخت گیر لفظوں کے پھندے نے میری پتلی سی گردن کو اپنے حلقے میں کس لیا۔ وہی تحکمانہ لہجہ، وہی تمسخر اور تضحیک کے وہی گہرے نشتر دل میں اترتے ہوئے محسوس ہوئے۔ حکم نامے کے سیاہ غلیظ لفظوں کے بچھو ڈنک اٹھائے نوٹس بورڈ پر رینگ رہے تھے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ مجھ سے پہلے بھی یہاں آنے والوں نے اس حکم نامے کے ایک ایک لفظ اور نقطے کو دیکھا اور پڑھا ہوگا۔ الفاظ کے زہریلے ڈنک کو اپنے وجود کے رگ و ریشے میں محسوس کیا ہوگا، مگر شاید اب وہ خوف اور ذلت کے اتنے خوگر ہو چکے ہیں کہ تحکم کے اس ڈنک کو اُف کیے بغیر برداشت کر لیا ہوگا اور اپنے جھکے ہوئے کندھوں پر سر

ڈالے اپنے اپنے شعبوں میں چلے گئے ہوں گے۔ جواب دینا یا سر اٹھانا شاید انھوں نے سیکھا ہی نہیں یا پھر بھول گئے۔

نئی انچارج نے ادارے کا انتظام سنبھالنے کے فوراً بعد ملازمین کو نفسیاتی شاک پہنچانے کا جو پہلا کامیاب تجربہ کیا اس وہ بڑی حد تک کامیاب رہی۔ ادارے کا نیا چیف جو اپنے گھٹنے ہوئے سر، کوتاہ گردن اور بھدی ناک کے سبب طبعاً ضدی، سفاک اور خود غرض نظر آتا، اپنے مشیروں کے ساتھ پہلی میٹنگ میں گول گول دیدے گھماتے ہوئے چلایا۔

انچارج کو پوری بردباری کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہیے۔ قوت وہ اہم عنصر ہے جس کے ذریعے ہم چھوٹے بڑے ہدف کو آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں اور بتدریج کسی رکاوٹ کے بغیر اپنے اختیارات کا دائرہ وسیع کر سکتے ہیں۔ جو لوگ یہاں کام کرنے آتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان کا سر ہمارے تحکم کے بوجھ سے سرنگوں رہے۔ جو چیز راستے میں آجائے اسے ہٹا دینا ضرو

پہلی منزل کے تنگ و تاریک کوریڈور میں پہنچتا ہوں تو سب سے پہلے میری ملاقات ان تینوں سے ہوتی ہے جو ہر سوزمیہ سلام کا جواب جان بوجھ کر آہستگی اور بڑی لجاجت سے دیتے ہیں کہ کہیں ان کے ساتھ والے وسیع اور منقش ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھا ہوا چیف نہ سن لے اور ان پر کوئی نادیدہ عتاب نازل نہ ہو جائے۔ وہ ہمہ وقت سر جھکائے کام میں مصروف نظر آتے ہیں۔ صرف لنچ کے اوقات میں اٹھتے ہیں۔ باقی وقت وہ فائلوں میں غرق رہتے ہیں۔ کبھی کبھی جب سیلنگ کی گرم ہوا ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو وہ بے قابو ہو کر اپنے جسم اور چہرے سے پسینے کے قطرے پونچھنے لگتے ہیں۔ ان میں معمر شخص بہت دھیمے دھیمے لہجے میں بڑبڑاتا۔

"اُف خدایا۔ یہ گرمی تو مار ڈالے گی۔" پھر وہ بنیان اتار کر پسینے نچوڑتا اور پنکھے کی گرم ہوا کے سامنے سوکھنے کے لیے ٹانگ دیتا۔ اس دوران صرف قمیص پہنے رہتا۔ میری طرف چوری چھپے دیکھ کر کہتا۔

"اگر اس تنگ گلی میں (تنگ کوریڈور کو بند گلی کا نام دیتا ہے) مزید ایک پیڈسٹل فین لگا دیا جائے تو گرمی قا برداشت ہو جائے، پھر دیکھیے نا اس سے ہماری EFFICIENCY کتنی بڑھ جائے گی۔" دوسرا جملہ قدرے بلند آواز میں کرتا تاکہ اس کی یہ التجا کسی نہ کسی طرح نئی انچارج تک رسائی حاصل کرے۔ مگر یہ اس کی حسرت ہی رہی نئی انچارج کو کسی قسم شکوے سے کبھی کوئی دلچسپی نہ رہی۔

ٹھیک اس وقت میں لوہا گرم دیکھ کر ضرب لگاتا ہوں تو وہ مجھے اس طرح دیکھتا ہے جیسے میں اسے کنویں میں دھ دے رہا ہوں۔ اس کی بیوی بچوں کو دردر کی خاک چھاننے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ وہ میری بات سن کر بڑی عاجزی سے ہا جوڑ کر کہتا۔

"خدارا ہمارے حال پر رحم کرو۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ مکان بھی میرا اپنا نہیں ہے۔ چیف کسی کا قصور م کرنا جانتا ہی نہیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو بھائی۔"

ایک وہی نہیں۔ ادارے کا کوئی شخص اپنا یا کوئی اجتماعی مسئلہ نئی انچارج کے کمرے تک لے جانے کے لیے تیا نہیں۔ ان کے پاؤں کانپنے لگتے ہیں اور نگاہوں کے سامنے اندھیرا پھیل جاتا ہے۔

ادارے کے حالات دیکھ کر میرے اندر بغاوت اور نفرت کی آگ سلگتی رہتی، مگر مجھے اس صورت حال سے نج کے لیے کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا۔ جوں جوں حالات میرے قابو سے باہر نکلتے جا رہے ہیں، میرے اندر بھی ایک قسم

خوف پنجے مار کر بیٹھنے لگا ہے۔ اگر میرے دل میں بھی خوف کے جمنے کا عمل اسی طرح جاری رہا تو ایک نہ ایک دن نئی اتھارٹی کے خلاف بغاوت کی چنگاری بھی بجھ جائے گی جس نے اب تک مجھے اور بعد از اں دفتر کے بعض دوسرے اہلکاروں کو اچھے دن کی آمد کی امید دلا رکھی ہے۔

کوریڈور میں بیٹھے ہوئے صوابی کے پٹھان ٹائپسٹ کو دیکھ کر مجھے اندھیرے میں ہمیشہ روشنی کی ایک جھلک نظر آئی۔ دراز قد اور مضبوط جسم کا جمیل خان۔ اس کی کھردری انگلیوں کے دباؤ سے بعض اوقات ٹائپ رائٹر کے اسٹروکس ایک دوسرے پر چڑھ کر بیٹھ جاتے۔ اس کی آنکھیں کشادہ اور روشن تھیں۔ پاٹ دار آواز میں اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا ذکر کرتا تو مجھے ایک گونا اطمینان ہوتا۔ شاید جمیل خاں ہی ہمارے حالات بدلنے کا وسیلہ بن جائے۔

ایک دن جب میں نے اس سے احوال پوچھا تو اس نے بڑی بیزاری سے جواب دیا۔

"چھوڑو صاحب کیا خیریت دریت پوچھتا ہے۔ اتنے کم پیسوں میں کھلا کہاں گزارا ہوتا ہے۔ تہوار سر پر ہے۔ کب تک قرض سے کام چلے گا۔ بچے ملک جانے کے لیے الگ تنگ کر رہے ہیں۔ آٹھ سال ہو گئے۔ انکریمنٹ تک نہیں لگا۔ لعنت ہے ایسی زندگانی پر!"

میں نے لوہا گرم دیکھ کر ضرب لگائی "یہ نئی اتھارٹی اس طرح ماننے والی نہیں۔ کچھ کرنا ہوگا ورنہ ساری زندگی تیرہ سو روپے میں گزر جائے گی۔"

"پھر کیا کرے صاحب تم ہی کوئی راستہ بتاؤ۔"

"ایک ہی طریقہ ہے۔"

"وہ کیا صاحب؟"

"اتھارٹی سے کہا جائے وہ ہماری تنخواہوں میں اضافہ کرے۔ اگر وہ اپنے خاص خاص بندوں کو ترقی اور سہولتیں دے سکتا ہے تو پھر ہمیں کیوں نہیں دیتا۔ اس ادارے کی پوری عمارت ہمارے کندھوں پر کھڑی ہے۔"

"مگر اس سے بات کون کرے گا؟" اس کے پاٹ دار لہجے میں نادیدہ خوف کا عنصر رینگ آیا تھا۔

"ہم تم اور سارے لوگ۔ ہم سب ایکا کر کے اس سے بات کریں۔ وہ ہمیں اکٹھا دیکھ کر ہماری بات ضرور سنے گا۔"

"مشکل ہے صاحب ـــــ بہت مشکل، وہ دوسروں کی بات سنتا ہی کب ہے۔ صرف اپنی کہتا اور اپنی سناتا ہے۔ مغلظات الگ بکتا ہے۔ خنزیر کا بچہ۔"

"کوشش کرتے ہیں۔ شاید راستہ نکل آئے۔"

صاحب تم میری بات سنو، ہمارا ساتھ کوئی نہیں دے گا، چلیں گے سب ساتھ، مگر دروازے تک ہم صرف دو ہی رہ جائیں گے اور دو کو باہر نکالے جانے کا راستہ بہت آسان ہوگا۔

"اس طرح تو معاملہ حل نہیں ہوگا" میں نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

صاحب تم بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ اس طرح ہمارے حالات کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے مگر تم جو راستہ بتاتا ہے اس سے حالات زیادہ بگڑ جائیں گے۔ روکھی سوکھی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ مجھے تو معاف کرو صاحب۔ میری بڑی بچی کو خسرہ نکل آیا ہے اور وہ آج

کل سخت بیمار ہے "

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا ہے۔ درختوں کی موٹی موٹی شاخیں دھندلانے لگی ہیں۔ اس علاقے میں قدیم طرز کی بعض عمارتوں کے فٹ پاتھوں پر گھوڑے کی نال ٹھونکنے والے اپنے اوزاروں کے بکس سنبھال رہے ہیں۔ جب پرشور گندے نالے اور کھڑکھڑاتی مشینوں کے درمیان پرانی وضع کی پھیکی اور بے رنگ عمارت کی سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچوں گا۔ تو راستے کی ان تمام چیزوں سے مڈبھیڑ ہوگی۔ پیشاب زدہ فٹ پاتھ، درختوں کے گھنے جھنڈ اور گھوڑے کی بدبودار لید اور میں آج بھی ہمیشہ کی طرح دل میں بسی رہنے والی اداسی اور نفرت کی آگ کو دبائے معمول کے مطابق گزر جاؤں گا۔

سیڑھیوں کی پہلی قسط اداکرکے نیچے اترتا ہوں تو کالے رنگ سے روغن کیا ہوا وہ نوٹس بورڈ ایک بار پھر میری نگاہوں کے سامنے میرے سارے وجود کو للکارنے کے لیے موجود ہے۔ تازہ ترین حکمنامے کے بچھو ابھی تک ڈنک اٹھائے رینگ رہے ہیں۔

میں کچھ توقف کرنے کے بعد ادھر ادھر دیکھتا ہوں۔ بعض کمروں کی بتیاں ابھی تک جل رہی ہیں اور بعض شعبوں کے دروازوں پر تالے پڑ چکے ہیں۔ نسوار کی چٹکی لے کر چوکیدار دروازوں کے تالوں کو چیک کرتا ہوا میرے سامنے سے گزر چکا ہے۔ شاید میں اسی لمحے کے انتظار میں یہاں کھڑا ہوں۔ میں پھرتی سے نوٹس بورڈ پر جھپٹا مارتا ہوں اور تازہ حکمنامے کے بچھوؤں کا سر کچل کر اندھیرے میں سیڑھیاں اترجاتا ہوں۔

——

افکار فاؤنڈیشن کراچی

(ایک فلاحی ٹرسٹ)

افکار فاؤنڈیشن کے کثیر المقاصد ادبی منصوبوں میں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا فروغ، تحقیق اور نادر دستاویزات کی تلاش و ترتیب اور اشاعت، مستحق ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کے لیے بہبود فنڈ کا قیام، نونہالانِ قوم، خواتین اور نئی نسل کے تعمیری منصوبوں میں اشتراک و تعاون شامل ہے۔

افکار فاؤنڈیشن کے اراکین ٹرسٹ دفاتر کی فراہمی کے بعد "بہبود فنڈ" کے جلد از جلد قیام کے لیے کوشاں ہیں۔ افکار کے قارئین، اردو کے بہی خواہوں اور تمام افکار دوستوں سے درخواست ہے کہ اس کارِ خیر میں حصہ لے کر شکر گزار فرمائیں اور زیادہ سے زیادہ عطیات بھیج کر اس منصوبے کی تکمیل میں ہاتھ بٹائیں۔

اردو رسالوں کی تاریخ میں افکار فاؤنڈیشن پہلا ٹرسٹ ہے جس نے ایک قلیل عرصے میں رفیقانِ افکار کے بھرپور تعاون سے کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

رضوان صدیقی

کوئل

میرے دفتر کی پچھلی کھڑکی باہر لان پر کھلتی ہے جہاں ایک کھلے اور کشادہ میدان میں چاروں طرف بہت سے درخت کھڑے ہیں گھنے اور سایہ دار۔ دفتر کے سب سے پرانے ملازم حفیظ اللہ سوکنگی نے ایک بار بتایا تھا کہ شروع میں دفتر کا یہ حصہ بڑا ویران اور اجاڑ سا پڑا تھا۔ مگر بیگ صاحب نے جو یہاں ڈائرکٹر تھے انھوں نے اپنے زمانے میں اس دفتر پر بڑی توجہ دی۔ ان کو صفائی کا بڑا شوق تھا۔ انہی کی کوششوں سے دفتر کا یہ ویران سا حصہ آہستہ آہستہ ایک خوب صورت باغ کی شکل اختیار کر گیا۔ یہاں انھوں نے گھاس لگوائی اور درختوں کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے پودے لگوائے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے کئی مالی ملازم رکھے۔ سوکنگی نے بتایا تھا کہ بیس سال پہلے بھی یہ درخت اتنے پرانے تھے۔ ان درختوں میں پھول بھی کھلتے ہیں اور پھل بھی آتے ہیں۔ موسموں کی تبدیلی کے ساتھ ان پیڑوں میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ بعض درختوں کے پتّے پیلے ہو کر گر جاتے ہیں اور گرمیوں کی دوپہر میں یہ سوکھے پتّے ہوا کے ساتھ ساتھ کاریڈور میں عجیب سا ساز بجاتے ہوئے رینگتے پھرتے ہیں۔ بعض درخت بالکل ٹھنڈ منڈ ہو جاتے ہیں۔ آم کے پیڑوں میں مارچ اپریل میں بور آتی ہے۔ بعض میں نکولی، املی اور گولر آتے ہیں۔ یہ سب کچھ میں روزانہ دیکھتا تھا کہ مجھے اپنے دفتر کے پچھلے دروازے سے مسجد تک جانے کے لیے یہاں سے گزرنا پڑتا ہے بس چند منٹ کے لئے، لیکن پچھلے ایک ماہ سے یہ باغ میرے لیے بہت اہم ہو گیا ہے، صرف اس لیے کہ ان درختوں پر ایک کوئل آنے لگی ہے۔ عام طور پر وہ گیارہ بجے کے بعد آتی ہے اور اپنی مخصوص آواز میں کوکتی رہتی ہے۔ اس کی آواز میں جانے کیا ہے کہ میں بے چین ہو جاتا ہوں —— کوئل کی آواز میں ایک عجیب سا درد ہے —— اس کی آواز بے حد سریلی ہے۔ اس کی آواز میں بڑا لوچ اور موسیقیت ہے۔ شروع شروع میں تو کوئل کی آواز مجھے بہت بھلی لگی —— شاید اتنے قریب سے میں نے پہلی بار کوئل کی آواز سنی تھی —— پھر یوں ہوا کہ مجھے اس کا انتظار رہنے لگا۔ جب بھی اس کی آواز سنائی دیتی تو میں دفتر کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر لان پر آجاتا۔ میری بینائی میری سماعت کے ساتھ ساتھ آواز کا تعاقب کرتی —— مگر آواز کا منبع یعنی کوئل نظر نہیں آتی —— میں متعلقہ درخت کے نیچے کھڑے ہو کر سر اٹھائے ٹہنی ٹہنی، شاخ شاخ، گھنے پتّوں میں چھپی ہوئی کوئل کو تلاش کرتا رہتا —— ایک دو بار اس کی جھلک بھی نظر آتی، مگر میں اسے اس کے پورے وجود کے ساتھ کبھی نہ دیکھ سکا۔

تھک ہار کر میں نے اس کی تلاش ترک کر دی۔ یوں بھی دفتر کے چھوٹے ملازمین میری اس حرکت پر باتیں بنانے لگے تھے۔ پھر میں نے یوں کیا کہ پچھلی کھڑکی اور دروازہ بند کروا دیے، مگر اس کی مدھر اور سریلی آواز جانے کس کونے کھدرے در زیا دراڑ سے در آتی ـــــ اور مجھے بے چین کر جاتی۔

یہ کوئل کیا چاہتی ہے؟
اس قدر کیوں پریشان ہے،
کیا دکھ ہے اسے،
یہ رہتی کہاں ہے؟
یہاں آ کر کس سے فریاد کرتی ہے؟
کس سے احتجاج کرتی ہے ـــــ کیا پیغام دینا چاہتی ہے؟

دھیرے دھیرے میں اس کی آواز کا عادی ہو گیا۔ میں نے کھڑکی اور دروازے کھلوا دیے حالانکہ وہ جتنی دیر کوکتی رہتی میں بے چین رہتا۔ اب مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی آواز میں جو کچھ بھی ہے وہ محبت کے پیغام کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

محبت ـــــ جواب بے معنی ہو گئی ہے۔
محبت ـــــ جو اب نفرت کے اندھیروں میں چھپ گئی۔
نفرت ـــــ جو اب ہمارے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔

شہر کے حالات اور واقعات نے، لوگوں کی باتوں اور تبصروں نے، اخبارات کی سرخیوں اور جرائد کی خبروں نے زندگی پر سے اعتبار ختم کر دیا تھا۔ برسوں سے ساتھ رہنے والوں پر شک گزرتا تھا۔ اب پڑوسیوں سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ لسانی فسادات نے جذبات اور خیالات میں ایک ہیجان برپا کر رکھا تھا ـــــ ایسے میں خود کو یہ کہہ کر بہلاتے رہے کہ یہ سب انتخابی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے، بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا، لیکن اب الیکشن بھی ختم ہو چکے تھے ـــــ امن و آشتی کی باتیں کرنے والی جماعتیں نفرت کے ریلے میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی تھیں۔ سب مختلف دھڑوں میں بٹ گئے تھے ـــــ اور بڑے خوش تھے ـــــ ہم چند دوستوں کا ٹولہ ان حالات میں بڑا دل برداشتہ تھا ـــــ بلکہ خوف زدہ تھا ـــــ ہمارے اپنے بچے ہماری گرفت سے آزاد تھے ـــــ کالج اور یونیورسٹی کے حالات سن کر دل خون کے آنسو روتا رہتا تھا ـــــ ہم روزانہ شام باجی کے گھر جمع ہو کر حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے ـــــ اور رات ڈھلے اداس اداس اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ـــــ چوری، ڈکیتی، اغوا، قتل، لسانی فسادات، گروہی جھگڑے ـــــ دیہی اور شہری علاقوں کے مسائل، اخبارات کی سرخی بنتے رہے اور نتیجے کے طور پر نفرت کی آگ پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ یہ جون کا مہینہ تھا اور شہر شدید گرمی کا شکار تھا۔ ٹیلی ویژن کا خبرنامہ صرف اس لیے دیکھا جاتا تھا کہ موسم کی خبروں سے یہ اندازہ لگا سکیں کہ آج، کل کے مقابلے میں موسم کیسا رہا۔

دفتروں کا بھی یہی حال تھا ـــــ چودھری خدا بخش اور نیاز حسین کھوسو میرے پرانے ساتھی تھے ـــــ گو وہ نے

کیوں یہ اب بدل سے گئے تھے۔ بس دفتری باتیں ـــــ اخبارات کی سرخیوں پر طنزیہ تبصرے اور ہونٹوں پر معنوعی مسکراہٹ ـــــ گھر آؤ تو ـــــ اپارٹمنٹس کا کھنچا کھنچا ماحول، پرانے پڑوسی آپس میں کوئی بات ہی نہیں کرتے ـــــ ہیلو ـــــ اور بس۔

یہ ہم کس ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں۔ پہلے اپارٹمنٹس کی ہوم ایسوسی ایشن کے اجلاس میں فیصلہ ہوا تھا کہ لوگ اپنی گیلریوں میں کسی بھی سیاسی جماعت کا جھنڈا نہیں لگائیں گے اور نہ کسی امیدوار کو ہی یہاں انتخابی جلسہ کرنے دیں گے ـــــ لیکن اس فیصلے پر عمل نہیں ہوا۔ نوجوان لڑکوں نے الیکشن کے دوران وہ ہنگامہ کیا کہ خود میرا بیٹا میری مرضی کے خلاف گھر والوں کو اپنی پارٹی کے حق میں ووٹ ڈلوانے لے گیا۔ ایک دو بار اس کے دوستوں کا گروپ آیا، اور انکل انکل کہہ کر یہ لڑکے مجھ سے ایک اور پارٹی کے لیے چندہ لے گئے ـــــ میں ان دنوں خود کو کتنا بے بس محسوس کرتا تھا۔

ان دنوں میں نے اپنے پڑوسیوں سے مل کر انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ نفرت کی بنیاد پر اتحاد مناسب نہیں، سب نے یہ کہہ کر جواب کر دیا کہ ہم کیا کریں، لڑکے ہماری سنتے ہی نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ سید بشارت علی بھی چپ ہو کر بیٹھ گئے جو ہمارے محلّے کے بزرگ ہیں اور لوگ ان کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ انھوں نے عملی طور پر پاکستان بنانے میں بڑا حصّہ لیا تھا اور اکثر محفلوں میں تحریک پاکستان کے قصّے سنایا کرتے تھے ـــــ ایک دن ملے تو کہنے لگے کہ لڑکے بھی سچ کہتے ہیں ـــــ آخر یہ کیا کریں ـــــ کہاں جائیں ـــــ داخلے ان کو نہیں ملتے ـــــ نوکریاں ان کو نہیں ملتیں ـــــ آخر یہ کیا کریں؟

یہ بڑے تکلیف کے دن تھے ـــــ کہیں سکون نہ تھا ـــــ ٹی وی کے مزاحیہ پروگرام دیکھ کر بھی ہنسی نہ آتی تھی بس زندگی خالی خالی لگتی تھی ـــــ اداس اور بے معنی ـــــ ایسے میں اس کوئل کی آواز نے میرے اندر ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ کبھی کبھی کوئل کی آواز سے مجھے بڑی طمانیت حاصل ہوتی تھی جیسے کسی نیک بزرگ کا وعظ یا محبّ وطن رہنما کی تقریر سن کر قلبی سکون میسّر آتا ہے۔

اب میں صبح دفتر آ کر جلدی جلدی ضروری کام نمٹا دیتا ـــــ اور گیارہ بجے کے بعد فارغ ہو کر بیٹھ جاتا ـــــ اور جیسے ہی کوئل کی مدھر اور سریلی آواز سنائی دیتی میں گھومنے والی کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر سگریٹ کے دھوئیں اڑاتا رہتا۔ مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا ـــــ مجھے یوں محسوس ہوتا کہ یہ پیار کی آواز ہے اور یہ تنہا کوئل جگہ جگہ محبت کا پیغام پہنچاتی رہتی ہے یہ اور کہاں کہاں جاتی ہے؟ ـــــ کن کن علاقوں میں جا کر اپنی سریلی آواز میں محبّت کا درس دیتی ہے ـــــ اور جانے کتنے لوگ اس کی آواز سنتے ہیں، اس میں چھپے ہوئے پیغام کو سمجھتے ہیں۔

اب میں نے اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے بھی اس کوئل کا تذکرہ کرنا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں تو دوستوں نے ان سنی کر دی، لیکن وہ آہستہ آہستہ کوئل کے تذکرے میں دلچسپی لینے لگے ـــــ بعض میرا مذاق اڑاتے اور بعض دوست اور احباب سنجیدگی سے کوئل کے بارے میں میری باتیں سنتے۔

ایک دن سو لنگی میرے پاس آیا اور کہنے لگا صاحب! یہ کوئل کی آواز آپ سنتے ہیں۔

میں نے کہا، میں تو روز باقاعدگی کے ساتھ سنتا ہوں۔
سر! مجھے اس کی آواز بہت اچھی لگنے لگی ہے۔ ہمارے ادھر بہت دنوں بعد کوئل آئی ہے ——— میں نے محسوس کیا کہ سونگی کی باتوں میں پہلے جیسی تلخی نہ تھی بلکہ اس کی باتوں میں بڑی مٹھاس تھی۔ مجھے یوں لگا کہ سونگی کے لہجے میں ندامت ہے۔

اصل میں پچھلے دنوں اس نے مجھ سے بدتمیزی کی تھی۔ حالانکہ بات بھی ایسی کوئی خاص نہ تھی ——— ایک دن میں نے ایک خبر پڑھنے کے لیے اس سے ایک دن پہلے کا "ہلال پاکستان" مانگا ——— گو وہ میرا ماتحت تھا، مگر عجیب سے لہجے میں کہنے لگا سائیں! "ہلال پاکستان" تو سندھ کا اخبار ہے ——— آپ اسے پڑھ کر کیا کریں گے؟ مجھے اس کا لہجہ بڑا ناگوار گزرا ——— میں نے کہا، سونگی! تم کیسی باتیں کرتے ہو ——— کیا میں سندھ کا نہیں ہوں۔

کہنے لگا سائیں اس بات کو چھوڑو ——— یہ کہہ کر وہ چلا گیا ——— اس دن کے بعد سے وہ مجھ سے کتراتا رہتا تھا ——— آج آیا تو بڑی عزت سے بات کر رہا تھا۔ اسی دوران ڈاکٹر چیمہ میرے دفتر آ گئے ——— برابر کی مسجد کے قریب ان کا کلینک ہے۔ ظہر کے بعد میں اکثر ان کے کلینک چلا جاتا اور چند منٹ گپ شپ کر لیتا تھا ——— مگر کئی مہینوں سے ان کا رویّہ بھی بدل گیا تھا۔ اس لیے میں نے بھی جانا چھوڑ دیا۔ وہ دفتر آئے تو مجھے بڑا اچھا لگا۔

آئیے ——— آئیے چیمہ صاحب! آج کیسے راستہ بھول گئے۔

بھائی! تم نے کلینک آنا بند کر دیا، میں نے سوچا شاید آپ ناراض ہیں، آج ذرا فرصت ملی تو آپ کی طرف چلا آیا۔

بہت اچھا کیا آپ نے ——— آپ آئے تو بڑی خوشی ہوئی۔

اس دوران کوئل کی آواز پھر آنے لگی۔

چیمہ صاحب کہنے لگے ——— بھائی اس کوئل کی آواز بڑی کمال کی ہے اور آپ کے کمرے میں تو بہت صاف سنائی دیتی ہے جانے کیوں مجھے اس کی آواز بہت اچھی لگتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب! اس کوئل کی آواز نے تو مجھے پاگل کر رکھا ہے۔ بس یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ محبّت کے نغمے گاتی ہے۔

مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے بلکہ میں تو اکثر سوچتا ہوں کہ ہم انسانوں سے تو یہ پرندہ کہیں اچھا ہے جو پیار کی بولی بولتا ہے ——— کہ ہم بھی اس کی زبان سمجھنے لگے ہیں۔

اتنے میں چائے آ گئی ——— اور ہم چائے کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

چند دن پہلے کی بات ہے کہ دلدار خاں چوکیدار بھاگتا ہوا آیا ——— صاحب! صاحب ——— آپ کے دفتر کے پچھلے دروازے پر ایک کوئل زخمی پڑی ہے۔

کوئل ———!!

میں ایک دم کرسی سے اٹھا ——— دروازے سے باہر نکلا تو دیکھا کوئل گلاب کے پودے کے پاس پڑی ہے اور گہری گہری سانس لے رہی ہے۔ میں نے فوراً اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے اڑنے کے لیے پر پھڑپھڑائے، مگر وہ اڑ نہ سکی ——— میں نے لپک کر اسے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ مجھے ایک دم اس پر ٹوٹ کر پیار آیا ——— مجھے یوں لگا کہ یہ میری بیٹی ہے ——— میں ایک دم زخمی کوئل کو لے کر چیمہ کے کلینک کی طرف بھاگا ——— دلدار خاں میرے ساتھ ساتھ تھا ——— لان پار کرتے ہوئے سونگی پر

نظر پڑی تو وہ بھی ہمارے ساتھ ہو لیا ۔

کلینک پہنچ کر میں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ یہ وہی کوئل ہے اور زخمی ہے ـــــ شاید کوّوں نے اسے ٹھونگیں مار مار کر لہولہان کر دیا ہے ـــــ ڈاکٹر صاحب نے فوراً کمپاؤنڈر کو بلایا اور کوئل کو ڈریسنگ روم میں لے گئے ـــــ ہم لوگ باہر ہی ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگے ۔

ہم تینوں بہت پریشان تھے ۔ دلدار خاں تو باقاعدہ رومال سے بھر رہا تھا اور خود ہی خود کہتا چلا جا رہا تھا ۔

صاحب! یہ کوئل بڑا اچھا ہے ـــــ صاحب کوئل بڑا اچھا ہے ہم کو اس کا آواز بہت اچھا لگتا ہے ـــــ سوننگی بھی اداس تھا اور بار بار پوچھے جا رہا تھا ۔

سائیں! کوئل بچ جائے گی نا ـــــ کوئل ٹھیک ہو جائے گی نا ۔

اتنے میں ڈاکٹر صاحب آئے ۔

فکر کی کوئی بات نہیں، زخم بہت گہرا نہیں ہے ۔ ایک دو روز میں ٹھیک ہو جائے گی ۔

چیمہ صاحب اگر کوئل کو کچھ ہو گیا تو ـــــ میں واقعی جذباتی ہو گیا تھا ۔

آپ بالکل فکر نہ کریں ـــــ اب کوئل کو کچھ نہیں ہوگا ۔ کیونکہ ہم سب کو یہ بہت عزیز ہے ـــــ اس لیے ہم سب مل کر اس کی حفاظت کریں گے ۔ صاحب ہم ان کوّوں کو مار مار کر یہاں سے بھگائے گا، یہ خبیث لوگ اس کو بہت تنگ کرتا ہے ـــــ چوکیدار نے غصے سے کہا ۔

تم ٹھیک کہتے ہو، دلدار خاں! ان کوّوں اور چیلوں کو ہم مار دیں گے، ختم کر دیں گے ۔ سوننگی نے پرجوش لہجے میں کہا ۔

دیکھو سوننگی ان کو مارنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا ۔ انھیں ختم کرو گے تو دوسرے کوّے آجائیں گے اور پرندے آجائیں گے اور پھر یہ کہاں جائیں گے، کیسے جائیں گے، یہ بھی تو انہی درختوں میں رہتے ہیں ۔ ہم ان کوّوں اور چیلوں کو سمجھائیں گے کہ کوئل سے تم کیوں لڑتے ہو ـــــ اس بے چاری سے کس بات پر جھگڑتے ہو حالانکہ اس کا بھی وہی رنگ ہے جو تمھارا رنگ ہے ۔

مگر ہم کوّوں کو کیسے سمجھائے گا ـــــ دلدار چوکیدار نے پھر سوال کیا ۔ بھئی ہم سب ان چیل کوّوں کو بتائیں گے کہ کوئل کوّے اور چیلیں اور یہ کبوتر ایک ہی نسل کے پرندے ہیں ۔ ایک ہی باغ کے رہنے والے ہیں ۔ انھی درختوں کی ٹہنیوں پر بسیرا کرتے ہیں برسوں سے یہاں رہتے ہیں، کچھ یہیں پیدا ہوئے ہیں، کچھ دوسرے باغ سے اڑ کر یہاں آگئے ہیں اور پھر ان کی شکل و صورت بھی ملتی جلتی ہے ۔ ان کا اڑنا، چگنا اور رہنا سہنا ایک ہے ۔ ہاں اگر آواز الگ ہے یا زبان مختلف ہے تو کیا فرق پڑتا ہے ۔

وہ تو ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب ۔ مگر ہم ان پرندوں کو یہ باتیں کس طرح سمجھائے گا ـــــ کیسے بتلائے گا؟

ہاں یہ سوال اہم ہے ـــــ میں نے سرگوشی میں کہا ۔

ڈاکٹر چیمہ بھی چپ ہو گئے ۔

اب بھی اکثر دلدار خاں چوکیدار ہم سب سے یہ سوال پوچھتا رہتا ہے مگر ہم سب خاموش ہیں !!

لیکن کوئل آج بھی کوک رہی ہے !!

شاید، دلدار خاں چوکیدار کے سوال کا جواب دے رہی ہے !

سیّدہ نفیس حسن

میں، زندگی اور دنیا

طویل، ہموار اور پُرسکون سڑک ——

سایہ دار اور بلند قامت درخت ——

تم —— اور میں ——

میں اور تم !! ——

نہیں —— ہم ——

ہم کی اکائی زیادہ بہتر رہے گی۔

ہم اور کبھی نہ ختم ہونے والا سفر !!

لیکن —— اگلا موڑ —— اندیشہ —— واہمہ ——

شاید یہ موڑ آئے ہی نہیں ——

تو کیا یہ ممکن ہے؟ —— ممکن کیا نہیں ہے —— آؤ کہ ناممکن کو ممکن بنانے کی سعی کریں۔

یہ سایہ دار پرسکون اور ہموار سڑک !! ——

اور ہم ——

ہم جا کہاں رہے ہیں تمہیں کچھ پتہ ہے کہ یہ راستہ کس سمت کو جائے گا؟ ——

میری نظریں صرف سامنے کی سمت لگی ہیں اور تا حدِ نگاہ سڑک سیدھی ہموار اور سایہ دار ہے۔ ہر جانب سکون اور اطمینان ہے —— اور میرے قدموں میں تازگی ——

لیکن میرا دل —— میرا دل تو اندیشوں بھرا ہے —— اندیشے —— سڑک مجھے بھی سایہ دار اور پُرسکون لگ رہی ہے —— میرا تو دل بھی یہ چاہ رہا ہے۔ ذرا دیر کو رک کر کسی درخت کے سائے میں بیٹھ جاؤں۔ ہوا کی خنکی کو محسوس کروں۔ چاروں اور پھیلی ہوئی اس خوشبو کو اپنے میں جذب کر لوں۔ درختوں کے سائے کے سکون کو محسوس کروں۔

لیکن تم جلدی میں ہو۔ تم رکنا نہیں چاہتے اور مجھے تمہارا ساتھ دینا ہے۔ مجھے تمہارے ساتھ آگے جانا ہے۔ چلو ——

سیدہ نفیس حسن

میں، زندگی اور دنیا

پھر اندیشوں کے ناگ میرے سینے کو ڈستے ہیں کہ اگر اگلا موڑ جدائی ——

میں پھر کہتی ہوں اگلا موڑ —

ہماری راہ میں کوئی موڑ نہیں ——

تم مضبوط لہجے میں جواب دیتے ہو —— صرف سامنے نظر رکھو۔

میرا دل بہت نازک ہے چڑیا کی مانند ——

ہم کب تک چلیں گے —— ہمیشہ ——

ہماری منزل کہاں ہے ؟

راہ اور منزل سب یکساں ہے ——

تم نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں —— یہ راہ بھی منزل ہے جان ! ——

ہر بقا کا انجام فنا ہے ——

فنا ہی منزل ہے —— اندیشے راستوں کی راہوں کی پیداوار ہیں۔

ان لمحوں کا حسن اپنے میں اتارو ——

جو وقت گزر رہا ہے صرف اسے محسوس کرو۔ نہ پہلے کچھ تھا نہ بعد میں کچھ ہے —— ابھی سب کچھ ہے ——

میرا نرم و نازک ہاتھ تمہارے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں ہے !

میرا دل سہارا پاتا ہے —— !!

درختوں میں سرخ اور پیلے پھولوں کی بہتات ہے۔ گل مہر —— املتاس کے —— درختوں کے نیچے ڈھیروں پھول گرے ہیں —— یہ صبح کھلے تھے —— شام نیچے —— پیروں تلے ——

میرا دل —— پھر چڑیا کی مانند کپکپا جاتا ہے ——

یہ صبح کھلے تھے —— میں کپکپاتی آواز میں کہتی ہوں ——

تمہاری مضبوط آواز پھر مجھے سہارا دیتی ہے ——

ہاں یہ صبح کھلے تھے۔ ان کی زندگی ہی اتنی تھی ——

انھوں نے معراج پائی ——

کھلنے سے مرجھانے تک کے عمل سے بہرہ مند ہوئے ——

یہ خوب صورت پرسکون سڑک ——

تو ہم پیدا ہوئے اور مر گئے —— کیا معراج پائی ؟

سوال پھر میرے لبوں تک آیا ہی چاہتا ہے ——

کہ تم جواب دیتے ہو ——

ادھر دیکھو —— میری طرف ——

سیدہ نفیس حسن

میں، زندگی اور دنیا

تمہاری آنکھوں میں امیدوں کا ایک جہاں آباد ہے۔ قطار اندر قطار دیوں کی روشنی ——— یہ روشنی دھیرے دھیرے میرے دل میں اُترتی ہے ———

اور جواب بھی ——— میرے دل میں ———

یہ لمحے ہی تو جاوداں ہیں ——— یہ ابد ہے ———

یہ سب کچھ ہے ———

سامنے کھلی روشن پُرسکون سڑک ہے۔

میری زندگی ——— ہماری زندگی ———

نہ ابتدا ہے نہ انتہا ———

موجود سب کچھ ہے ——— جو ابھی ہے ——— وہ ابھی ہے ———

صرف آج ہے ———

نہ کل تھی ——— نہ کل ہے ———

میرا نرم و نازک ہاتھ تمہارے مضبوط ہاتھ میں ہے ———

یہ سوئی سوئی خوابناک شام ———

میں اور تم ——— نہیں ———

ہم ———

یہ طویل ہموار سایہ دار سڑک! ———

نصر ملک

بردہ فروش

"مائیبرٹ! اس سے ملو یہ فاطمہ ہے، ہماری نئی ملازمہ!"

لانڈری کے فورمین پاؤل نے اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس نے بھی میری مسکراہٹ کا جواب اگرچہ مسکراہٹ ہی سے دیا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ ہاتھ ملاتے ہوئے مائیبرٹ نے اس گرمجوشی کا کوئی اظہار نہیں کیا تھا جو روایتی طور پر ڈینش ایسے موقعوں پر کرتے ہیں ـــ "کیا تم یہاں کام شروع کرنے والی ہو؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں یہ آج سے تمہارے ہی ساتھ کام کرے گی۔ اسے مشین چلانے اور اس میں کپڑے ڈال کر دھونے وغیرہ کے بارے میں میں نے بتا دیا ہے ـــ میرے خیال میں یہ سمجھ بھی گئی ہے کہ اسے کیا کرنا ہے ـــ کیوں فاطمہ؟" پاؤل بولے جا رہا تھا اور مائیبرٹ مجھے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی کرتی جا رہی تھی ـــ "تمہیں فاطمہ کے ساتھ کام کرنے میں دشواری نہیں ہوگی یہ ڈینش اچھی طرح جانتی ہے ـــ لو اب دونوں کام کرو میں چلتا ہوں۔" فورمین نے یہ کہہ کر میرا شانہ تھپتھپایا اور وہاں سے چلا گیا۔

"کیا تم پاکستان سے ہو؟" فورمین کے جانے کے بعد مائیبرٹ نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں! میں پاکستانی ہوں" میں نے مختصر سا جواب دیتے ہوئے اس سے پوچھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

"پاؤل نے تمہیں تو بتا ہی دیا ہے، بس اس مشین پر کھڑی ہو جاؤ اور وقفے وقفے سے اس میں ضرورت کے مطابق کپڑے ڈالتی جاؤ۔ صابن ڈالتے وقت خیال رکھنا کہ وہ مقررہ مقدار سے زیادہ نہ ہو اور باہر نہ گرے اور بس ـــ کپڑے دھل کر خود بخود باہر آجائیں گے تم انھیں ان خالی ٹوکریوں میں ڈال کر ایک طرف رکھتی جانا ـــ استری کرنے والی عورتیں آئیں گی تو اٹھا کر لے جائیں گی۔ میری طرح تمہارا کام صرف یہی ہے کہ مشین کھڑی نہ ہونے پائے بس کپڑے ڈالتی جانا اور صابن کا خیال رکھنا ـــ آؤ میں تمہاری مدد کرتی ہوں ـــ" مائیبرٹ اتنی تنک مزاج نہیں تھی جتنا کہ میں نے اس سے ہاتھ ملاتے وقت اس کے بارے میں سوچا تھا۔ اس نے مشین میں کپڑے ـــ اور خاص مقدار میں صابن ڈال کر ایک بٹن دبا دیا۔ "یہ لو اب مشین سنبھالو اور ہاں بارہ بجے کھانے کا وقفہ ہوتا ہے تب تم یہ سرخ بٹن دبا کر مشین روک دینا ـــ کیا تم نے لانڈری کی کینٹین دیکھی ہے؟" اس نے بغور مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، پاؤل نے مجھے دکھا دی تھی۔" میں نے جواب دیا۔ اس کی تیز نگاہیں ابھی تک میرے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"میں اپنی مشین پر چلتی ہوں ـــ کوئی مشکل پیش آئے تو مجھے بلا لینا" وہ مجھے اسی طرح دیکھتی ہوئی اپنی مشین کی طرف چل گئی۔ میرا

اور اس کی مشین کے درمیان بمشکل کوئی دو میٹر کا فاصلہ ہو گا۔
بارہ بجنے میں ابھی کچھ منٹ باقی تھے کہ مائیبرٹ اپنی مشین بند کر کے میرے پاس آ گئی "تم کھانا کھانے نہیں جاؤ گی ؟" اس نے پوچھا۔
"کیوں نہیں، لیکن ابھی تو بارہ نہیں بجے آٹھ دس منٹ رہتے ہیں" میں نے جواب دیا۔
"ہاں، لیکن اب تم مشین بند کر کے ہاتھ وغیرہ صاف کر لو، میں کینٹین جا رہی ہوں ـــــ کھانے کا وقفہ صرف آدھ گھنٹے کا ہوتا ہے" وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی کینٹین کی طرف چل دی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بھی اپنی مشین بند کر دی، ہاتھ دھوئے اور اپنا "کھانے کا ڈبہ" لے کر کینٹین کی طرف چل دی۔
میں کینٹین میں داخل ہوئی تو کوئی بیس بائیس کارکن عورتیں میزوں پر بیٹھی اپنا اپنا کھانا کھا رہی تھیں ـــــ مرد محض چار پانچ ہی تھے۔ میں نے مائیبرٹ کو تلاش کرنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا وہ ایک کونے والی میز پر اکیلی بیٹھی پہلے ہی مجھے ہاتھ سے اشارہ کر رہی تھی۔ میں آگے بڑھ کر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنا کھانے والا ڈبہ کھول کر سامنے رکھ لیا۔
"کیا یہ پاکستانی کھانا ہے ؟" اس نے میرے کھانے کے اوپر قدرے جھک کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں! میں نے خود بنایا تھا ـــــ کیا تم کھاؤ گی ـــــ اس میں شاید مرچیں زیادہ ہو سکتی ہیں" میں نے اسے پیشکش کی۔
"نہیں نہیں، میں اپنا کھانا کھا چکی ہوں" ـــــ وہ اپنے سامنے پڑے ہوئے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔
"تم اگر کھانا چاہو تو یہ ہم دونوں کے لیے کافی ہے" میں نے ذرا تکلف سے کام لیتے ہوئے اپنی پیشکش کو دہرایا ـــــ مجھے معلوم تھا کہ سخت مرچوں والے کھانوں سے ڈینش ویسے ہی دامن بچاتے ہیں۔
"تم زور دیتی ہو تو میں تمہارا کھانا چکھ لیتی ہوں، کھاؤں گی اور کسی دن" اس نے یہ کہتے ہوئے میری آدھی چپاتی اٹھالی اور اس کے ایک لقمے سے میرے کھانے کے ڈبے سے پورا ایک کوفتہ اٹھا لیا اور ابھی منہ میں رکھتے ہی والی تھی کہ میں کانپ گئی ـــــ اوہ خدایا وہ ابھی چیخ اٹھے گی ـــــ یہ کم بخت مرچیں!
میں ابھی اس ڈر میں تھی کہ اس نے نوالہ منہ میں رکھ کر میری طرف یوں دیکھا کہ گویا کہہ رہی ہو ـــــ ایک کوفتہ اور لے لوں۔
"فاطمہ! تم اچھا کھانا بناتی ہو" مائیبرٹ بولی "اگر میں اپنا کھانا نہ کھا چکی ہوتی تو تمہارا ایک کوفتہ اور لیتی"۔
اسے یہ کیسے پتہ چلا کہ میں کوفتے کھا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں خیال آیا "شاید کسی پاکستانی گھرانے کو جانتی ہو" میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ بولی "میں اب چلتی ہوں تم آجانا" وہ اپنا کھانے کا ڈبہ اٹھا کر چل دی اور میں بھی کھانا کھانے کے بعد اپنی مشین پر پہنچ گئی۔
چھٹی ہوئی تو لانڈری سے نکلتے ہوئے میں مائیبرٹ کے پیچھے پیچھے ہو لی ـــــ وہ بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر وہ رک گئی تھی اور جب میں اس کے قریب پہنچی تو بولی ـــــ "کیا تمہیں بھی بس پکڑنی ہے ؟"
"ہاں! تم کون سی بس لو گی ؟" میں نے اس سے پوچھا۔
"سولہ نمبر والی" اس نے جواب دیا۔

"وہی تو میں نے بھی لینی ہے" میں نے کہا اور ہم دونوں بس اسٹاپ کی طرف چلنے لگے۔

بس کے اڈے پر ہمیں کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ بس آئی تو ہم دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ بھیڑ بھی زیادہ نہیں تھی۔ ہم ایک ہی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ رستہ بھر مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ پاکستانیوں کے بارے میں اس کی معلومات کافی وسیع تھی۔ اس نے میری شلوار اور خاص کر قمیص کے گلے اور نمونے کی کافی تعریف کی تھی۔ مائیبرٹ کا اسٹاپ مجھ سے دو اسٹاپ پہلے پڑتا تھا۔ اس کا اسٹاپ آیا تو وہ کل کام پر ملنے کا وعدہ کر کے خدا حافظ کہتی ہوئی بس سے نکل گئی۔

میں جب گھر پہنچی تو عابد مجھ سے پہلے ہی موجود تھا۔ وہ بھی ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا اور رات کو "پارٹ ٹائم" ٹیکسی بھی چلاتا تھا۔ میرے دروازہ کھولنے کی آہٹ سن کر اس نے ڈرائنگ روم ہی سے پوچھا —— "کام پر آج پہلا دن کیسا رہا ؟"

"کام تو بس کام تھا" میں نے جواب دیا اور اپنے کپڑے بدلنے کے لیے سونے والے کمرے کی طرف گئی۔

"میں سبزی لے آیا ہوں۔ سخت بھوک لگی ہوئی ہے، آج بہت کام کرنا پڑا —— ذرا جلدی سے کھانا بنا لو، میں ٹیلی ویژن پر خبریں دیکھ لوں گا۔" عابد ڈرائنگ روم ہی سے مجھے حکم دے رہا تھا۔

میں کپڑے بدل کر ڈرائنگ روم میں آ گئی تھی اور ابھی کرسی پر بیٹھنے والی تھی کہ اس نے مجھے چائے کا پانی رکھ دینے کو کہا۔ "مرتی کیا نہ کرتی"، یہ تو روزمرہ کا معمول تھا۔ ہماری شادی کو پانچ برس ہونے والے تھے۔ اسے اپنی تھکاوٹ کا تو احساس رہتا تھا اور مجھ سے فیکٹریوں میں کام کرانا ہماری مجبوری، اور پھر حکم چلانا اس کا ایسا حق تھا جو اس نے خود ہی حاصل کر رکھا تھا۔

دوسرے دن جب میں کام پر جانے لگی تو میں یہ سوچ کر کہ شاید مائیبرٹ بھی کھا لے، اپنے ڈبے میں دگنا کھانا رکھ لیا۔

میں بس میں سوار ہوئی تو دو اسٹاپ بعد مائیبرٹ بھی اسی بس میں سوار ہوتی دکھائی دی۔ وہ بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کر رہی تھی کہ میں نے اسے آواز دے کر متوجہ کیا "ادھر آ جاؤ"۔

"ہیلو فاطمہ —— صبح بخیر"، وہ میرے پہلو میں بیٹھتے ہوئے بولی —— "کہو کیسی ہو ؟"

"بس ٹھیک ہوں"، میں نے کہا۔

مائیبرٹ اور میں دوسرے مسافروں کی طرح نیم غنودگی کے عالم میں تھے اور کبھی کبھی آپس میں ایک آدھ بات بھی کر لیتے تھے۔

لانڈری میں جا کر ہم دونوں نے اپنی اپنی مشینیں چلا کر کپڑے دھونے شروع کر دیے اور بارہ بجے ہم دونوں اکٹھے ہی کینٹین گئے اور ایک ہی میز پر کھانا کھانے بیٹھ گئے —— "کیا آج تم میرے ساتھ کھانا نہیں کھاؤں گی ؟" میں نے اپنا کھانے کا ڈبہ کھولتے ہوئے مائیبرٹ سے پوچھا۔

"لاؤ تم بھی کیا کہو گی !" اس نے اپنا ڈبہ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا "آج کیا لائی ہو ؟"

مائیبرٹ بڑے مزے سے کھانا کھا رہی تھی اور میری حیرانگی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں آج چپاتیوں کے ساتھ بھنڈیاں لائی تھی، اور خدا گواہ مائیبرٹ کھانے میں مجھ سے تیز تھی —— "کیا تمہیں پاکستانی کھانے پسند ہیں ؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں تھے" اس نے لقمہ اٹھاتے ہوئے مختصر سا جواب دیا اور بولی "ہم باتیں زیادہ کر رہے ہیں۔ دیکھو وقت کم رہ گیا ہے"

کھانے کے بعد ہم دونوں پھر اپنی اپنی مشینوں پر چلے گئے اور پھر کام ختم کرتے ہی گھر جانے کے لیے بس اسٹاپ کی طرف چل دیے۔ اب ہمارا یہ روزمرہ کا معمول بن گیا تھا۔ ہم اکٹھے کام پر آتے اور واپس بھی اکٹھے ہی جاتے۔ مجھے وہ کافی دلچسپ اور پیاری

لگنے لگی تھی۔

مجھے لانڈری میں کام کرتے ہوئے ایک ماہ ہونے کو تھا۔ ایک روز میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر پڑے ـــــ میں نے پوچھا تو وہ بولی ـــــ "پچھلی کئی راتوں سے ٹھیک طرح سو نہیں پا رہی ہوں۔" میں نے سوچا شاید اس کا اپنے خاوند یا یار سے جھگڑا رہتا ہوگا ـــــ عابد مجھے ڈینش لڑکے لڑکیوں کے اکثر قصے سناتا رہتا تھا کہ یہ لوگ ایک دوسرے کے لیے ایسے ہی ہوتے ہیں، جیسے جوتا ـــــ جب چاہا بدل لیا اور تکلیف دینے لگے تو اٹھا کر پھینک دیا اور نیا لے آئے ـــــ"

میں نے مائیبرٹ سے زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا ـــــ "اپنا دکھ وہی جانتا ہے جو جھیلتا ہے۔"

میں نے ایک مرتبہ مائیبرٹ کو اپنے گھر مدعو کرنا چاہا تو اس نے مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے دی "میں اکیلی رہتی ہوں، تم ایک دن میرے ہاں کیوں نہیں آجاتی ہو؟"

"اچھا اگر تمہاری خواہش یہی ہے تو میں ایک دن فرور تمہارے ہاں آؤں گی۔" میں نے اس کی دعوت قبول کرتے ہوئے کہا۔

آج جمعہ تھا اور عابد کو فیکٹری کے کام کے بعد شام کو ٹیکسی چلانا تھی۔ میں نے سوچا کل "ویک اینڈ" ہے کیوں نہ گھر جاتے ہوئے آج مائیبرٹ کے ہاں ہوتی جاؤں ـــــ آخر دعوت تو اس نے دے ہی رکھی تھی ـــــ میں نے مائیبرٹ سے بات کی تو اس نے فوراً ہی ہاں کہہ دی "کیوں نہیں، اس سے بہتر اور کیا ہوگا؟"

کام کرنے کے بعد ہم نے حسب معمول بس پکڑی اور مائیبرٹ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ رستے میں کچھ چپ چاپ سی تھی۔

بس سے اتر کر ہمیں کچھ زیادہ دیر چلنا نہیں پڑا تھا۔ مائیبرٹ کا فلیٹ نیرو برو گید میں ایک پرانی عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔ جونہی ہم سیڑھیاں چڑھ کر اس میں داخل ہوئے۔ مائیبرٹ نے بڑے خلوص سے میرا اوور کوٹ اترواتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا اور ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ـــــ "چلو، بیٹھو، میں پانی گرم کرتی ہوں ـــــ تم چائے پیو گی یا کافی؟"

"چائے"، میں نے جواب دیا اور آگے بڑھ کر ڈرائنگ روم میں پڑے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

اب میں نے جو کمرے کا جائزہ لیا تو حیران رہ گئی۔ ٹیلی ویژن کے اوپر پڑی ہوئی ایک فریم شدہ رنگین تصویر میں ایک پاکستانی جوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اٹھ کر ابھی اسے قریب سے دیکھ ہی رہی تھی کہ مائیبرٹ چولہے پر پانی رکھ کر آگئی ـــــ "کیا دیکھ رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ارے مائیبرٹ! یہ تصویر میں شلوار قمیص پہنے ہوئے تو تم ہی ہو ـــــ سچ بتاؤ یہ مونچھوں والا کون ہے ـــــ ہے نا کوئی پاکستانی؟"

اب تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس کا کوئی یار ہوگا۔

"یہ تھا میرا شوہر ـــــ اکرم" وہ میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیا مطلب تمہارا شوہر تھا؟"، میں نے پوچھا۔ مجھے اپنے خاوند عابد کی بتائی ہوئی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔

"میں تمہیں بتاتی ہوں فاطمہ" اس نے ٹیلی ویژن پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ہماری شادی سے چند دن بعد کی تصویر ہے۔ یہاں اسی گھر میں میری ایک سہیلی نے اتاری تھی۔" باورچی خانے میں چائے کا پانی ابلنے لگا تھا "میں آکر بتاتی ہوں" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

اس نے چائے کا ٹرے میز پر رکھ کر پیالیوں میں چائے انڈیلتے ہوئے پوچھا۔ "کتنی چینی لوگی؟"

"بس ایک چمچہ کافی ہے" میں نے کہا۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی" مائیرٹ نے چائے میں چینی ملاتے ہوئے کہنا شروع کیا ——— "اکرم اور میں پانچ سال پہلے ایک کلب میں ایک دوسرے سے ملے تھے۔ مجھے وہ رات آج بھی اچھی طرح یاد ہے ——— جب اکرم کلب میں داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی اپنے لیے وہسکی کا ایک جام خریدا اور بار کے قریب ہی کھڑا ہو کر اس کی چسکیاں لینے لگا ——— میں بھی اپنی ایک سہیلی کے ساتھ وہیں کھڑی تھی۔ ہم بیئر پی رہے تھے۔ موسیقی اپنے شباب پر تھی ——— کلب میں لڑکے لڑکیاں ہر بات سے بے خبر "یہ رات ہماری ہے" کی دھن پر یوں محوِ رقص تھے کہ گویا انہیں صبح کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی غرض ہی نہیں تھی ——— میری اور اکرم کی جونہی نگاہیں چار ہوئیں اس نے مسکراتے ہوئے مجھے رقص کی دعوت دے دی اور میرے سر کی ہلکی سی اقراری جنبش پر اس نے میری کمر میں اپنا بازو ڈال کر اپنی وہسکی کا گلاس ایک میز پر رکھ دیا اور میرے ساتھ رقص کرنے لگا۔ جب تک موسیقی جاری رہی ہم رقص کرتے رہے اور پھر موسیقی کے وقفے میں ہم ایک میز پر جا بیٹھے۔ ہمارے ساتھ ایک سہیلی بھی تھی ——— اکرم نے اپنا تعارف کرایا۔ اس کی باتیں پرلطف تھیں۔ وہ ہمیں طرح طرح کے لطیفے سناتا اور ہنساتا رہا ——— اس نے ہمارے بیئر پینے کو بھی اپنے مذاق کا نشانہ بناتے ہوئے ہمارے لیے بھی وہسکی کا آرڈر دے دیا ——— "اب تم اسکول گرلز تو ہو نہیں" مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے چیئرز کرتے ہوئے کہا تھا ——— مجھے وہ بہت اچھا لگا اور میرے خیال میں وہ بھی مجھ میں کافی دلچسپی لے رہا تھا ——— وہ لوہے کے ایک کارخانے میں ملازم تھا، لیکن اپنے لباس، بات چیت اور رکھ رکھاؤ سے مجھے وہ کسی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ دکھائی دیتا تھا ——— ہم دونوں کو ایک دوسرے کے لیے یوں دلچسپی کا اظہار کرتے دیکھ کر میری سہیلی نے مجھے کہنی ماری اور "تمہارے بھاگ جاگے" کہہ کر اس نے ہم سے رخصت چاہی۔ اسے اپنی بوڑھی ماں کے ہاں جانا تھا، ویسے بھی کلب اب بند ہونے والا تھا ——— اکرم اور میں ابھی بیٹھے ہی ہوئے تھے کہ میں نے اپنا جام ختم کرتے ہوئے اس سے اجازت لینا چاہی، لیکن اس کے اصرار پر ایک جام اور پینے کے لیے رک گئی اور پھر جب ہم دونوں نے اپنے اپنے جام ختم کیے تو اکرم نے مجھے اپنے ساتھ آنے کی دعوت دے دی۔ میں نے قدرے تکلف کا اظہار کیا تو میرے ساتھ میرے ہاں آنے کا خیال پیش کر دیا۔ "اس میں تو تمہیں اعتراض نہیں ہوگا" اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا ——— میں نے قدرے توقف کے بعد اسے "محض چائے کی پیالی" کے لیے اپنے ساتھ آنے کی دعوت دے دی۔"

"فاطمہ اگر تم برا نہ مانو تو میں ایک سگریٹ سلگا لوں۔" مائیرٹ نے ایک کونے میں پڑی سگریٹ کی ڈبیہ اور ماچس اٹھاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اسے پہلے کبھی سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا "کبھی کبھی یہ بہت تسکین دیتے ہیں" اس نے سگریٹ سلگا کر ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی" مائیرٹ پھر بولی "اکرم کو میں نے "چائے کی پیالی" کی دعوت دی تھی، لیکن مجھے اگلی صبح اسے ناشتہ بھی کرانا پڑا۔ ہم نے وہ سارا دن شہر میں اکٹھے گھومتے گزارا اور پھر شام کو اگلے "ویک اینڈ" کے دوران اسی کلب میں ملنے کا وعدہ کر کے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا ——— ہماری ویک اینڈ ملاقاتوں کا سلسلہ کوئی دو تین ماہ جاری رہا۔ اس دوران میں کبھی میں اور کبھی اکرم ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے رہے۔ کبھی وہ میرے ہاں رات بسر کرتا تو کبھی میں صبح سویرے اس کے ہاں بستر کی سلوٹیں ٹھیک کر رہی ہوتی۔ وقت بڑی خوش اسلوبی سے گزر رہا تھا ——— ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے۔" مائیرٹ نے

اپنی بات سناتے ہوئے غالباً پہلی بار چائے کی چسکی لی تھی جب کہ میں اپنی چائے کی پیالی کبھی کی خالی کر چکی تھی ـــــــ اس نے میری پیالی میں چائے ڈالتے ہوئے پوچھا کہ اگر مجھے بھوک لگ رہی ہو تو وہ کچھ سینڈوچ بنا لے۔

”نہیں، کھانے کی اتنی جلدی بھی کیا ہے؟“ میں نے چائے میں چینی ملاتے ہوئے اسے اپنی بات جاری رکھنے کو کہا۔

”ہاں! ایک دن اکرم نے مجھے اپنے ساتھ شادی کرنے کی دعوت دے دی۔ میں نے اس بارے میں کچھ سوچنے کے لیے اس سے مہلت مانگی تو وہ مان گیا ـــــــ اسی عرصے میں وہ میرے گھر پر کئی مرتبہ میری ماں سے بھی مل چکا تھا۔ میرا باپ میرے بچپن میں ہی اگرچہ میری ماں کو چھوڑ گیا تھا، لیکن وہ زندگی بھر مجھ سے پیار کرتا رہا ـــــــ اس کی موت بھی ایک عجیب پر درد کہانی ہے۔ بیچارہ ہر وقت نشے میں رہتا تھا۔ اگرچہ اس نے ایک اور عورت کے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا لیکن اسے اس بات کا ـــ دکھ سرطان کی طرح کھاتا رہا کہ میری ماں نے اسے گھر سے کیوں نکال دیا تھا۔ ہاں تو میں تمہیں اکرم کے بارے میں بتا رہی تھی“، مائیبرٹ نے ایک سگریٹ اور سلگایا اور ـــــ دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے بولی ـــــ ”اکرم کی طرف سے اب شادی کا اصرار بڑھنے لگا تھا اور اس نے یہ بھی تجویز پیش کر دی کہ ہم دونوں اکٹھے ہی ایک مکان میں کیوں نہ رہیں ـــــــ اکرم نے ویسٹربرو کے علاقے میں ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا اور میرے پاس وہی فلیٹ تھا ـــــــ جس میں میں اب رہ رہی ہوں۔ ایک ساتھ رہنے والی اکرم کی بات میں نے مان لی اور وہ میرے یہاں منتقل ہو گیا۔ دن میں وہ اپنے کام پر چلا جاتا اور میں اپنے کالج ـــــ ہمارا وقت اچھا گزر رہا تھا ـــــ ویک اینڈ میں ہم شہر گھومنے چلے جاتے اور جمعہ و ہفتہ کی راتیں مختلف کلبوں میں رنگ رلیاں مناتے رہتے۔“

مائیبرٹ اب مسلسل بولے جا رہی تھی اور مجھے یوں لگا کہ وہ اپنی مکمل کہانی سنانے کے لیے بے چین ہے اور شاید اسے اپنی بپتا کے اظہار کا آج ہی موقع ملا ہے۔ خود میری دلچسپی بھی تجسس کی حد تک بڑھ گئی تھی۔

”اکرم مجھے پاکستان میں اپنے خاندان کے متعلق بتاتا رہتا تھا۔ میرے خیال میں وہ ایک اچھے گھرانے سے تھا۔ وہ خود بھی تو یہی کہا کرتا تھا۔ اس کا باپ ایک جاگیردار تھا اور ماں کو گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اس کے دو بھائی اور ایک بہن بھی تھی، وہ سب سے چھوٹا تھا ایک دن میری ماں ہمارے گھر آئی تو باتوں باتوں میں اس نے بھی ہمیں شادی کر لینے کی ترغیب دینی شروع کر دی، اب تو اکرم اور مچل گیا۔ میں بھی کالج میں اپنے امتحان سے فارغ ہو چکی تھی۔ ہم نے شادی کر لینے کا فیصلہ کر لیا اور پھر اتوار کے روز اکرم، میں میری ماں اور میری چند جاننے والی کالج کی سہیلیاں گرجا گھر پہنچ گئیں جہاں پادری نے اکرم اور مجھے میاں بیوی کے بندھن میں باندھتے ہوئے ایک دوسرے کو قانونی ازدواجی حقوق دے دیے ـــــ ہم نے اس کے سامنے ایک دوسرے سے زندگی بھر وفا اور پیار کرنے کا عہد کیا اور ہنسی خوشی واپس گھر آ گئے“ ـــــ مائیبرٹ کہتے کہتے رک گئی ”دیکھو فاطمہ مجھے اب بھوک لگ رہی ہے، آؤ پہلے ایک ایک ”سینڈوچ“ کھا لیں ـــــ باقی قصہ پھر سناتی ہوں ـــــ کہیں تم بور تو نہیں ہو رہی ہو؟“ وہ اٹھی اور فریج سے سینڈوچ نکال کر گرم کرنے لگی ـــ ”سنو مائیبرٹ میرے لیے کھانا نہ بنانا ـــــ میں گھر جا کر کھاؤں گی، عابد بھی آج لیٹ آئے گا، وہ ٹیکسی چلا رہا ہے اور پھر مجھے ابھی کوئی خاص بھوک بھی نہیں“ ـــــ میں نے کہا۔ اتنی دیر میں وہ سینڈوچ گرم بھی کر لائی تھی ـــــ ”ہاں تو سنو!“ اس نے سینڈوچ کا نوالہ لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”شادی سے پہلے جتنا بھی عرصہ میں اکرم کے ساتھ رہی میں مانع حمل گولیاں استعمال کرتی رہی، لیکن ـــــ پھر اکرم ہی کے

کہنے پیران کا استعمال ترک کر دیا۔ ہم دونوں ہی کو "والدین" بننے کی بڑی خواہش تھی جو ہماری شادی کے ٹھیک دس ماہ ـــــ بعد پوری ہو گئی ـــــ وہ کرسمس کی رات تھی شہر میں چراغاں کا سماں تھا لوگوں نے اپنے اپنے گھروں میں رنگ برنگے قمقمے اور موم بتیاں روشن کر رکھی تھیں اور گرجا گھروں میں خصوصی عبادتوں کے لیے گھڑیال بج رہے تھے۔ ایک بجے کے قریب مجھے بچے کی پیدائش کے آثار محسوس ہونے لگے۔ میں نے اکرم کو بتایا تو وہ ایک طرح سے اچھل پڑا ـــــ "میرے دیس پاکستان کا بانی محمد علی جناح بھی تو آج ہی پیدا ہوا تھا۔" اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ آج عیسیٰ مسیح کا جنم دن تھا ـــــ اکرم کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ ہم نے ٹیکسی منگوائی اور ہسپتال کے لیے روانہ ہو گئے ـــــ علی الصبح، نور سحر کی نمو کے ساتھ ہی میں نے ایک بچی کو جنم دیا اور اکرم جب اسے دیکھنے میرے کمرے میں آیا تو میں نے اپنے پہلو میں پڑی ہوئی بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے باپ بن جانے پر مبارک باد دی ـــــ "ہم اس کا نام مریم رکھیں گے۔" ـــــ میں نے کہا۔ "عیسیٰ ابن مریم" ہی کا تو جنم دن ہے۔ وہ کچھ لمحوں کے لیے خاموش رہا اور پھر بولا "ہاں مریم خوب صورت نام ہے۔" میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ اداس سا لگ رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اسے بیٹے کی بڑی خواہش تھی، مگر اس میں میرا کیا قصور تھا ـــــ وہ کچھ گھنٹے میرے پاس رہا اور پھر شام کو جب مجھے ملنے آیا تو اس کے ساتھ ایک ملّا بھی تھا۔ اس ملّا نے بچی کے کان میں کوئی راگ الاپنا شروع کیا تو وہ ننھی معصوم بلبلا اٹھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں تو اکرم نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ایک اسلامی رسم ہے۔ جو پوری کرنی ضروری ہے ـــــ ملّا نے اپنا کام ختم کیا اور ایک طرح سے مجھے گھورتا ہوا چلا گیا ـــــ اکرم یوں تو میرے پاس سارا دن ہسپتال میں رہا، لیکن مجھے اس کے چہرے پر وہ خوشی دکھائی نہیں دی جو ایک باپ کے چہرے پر ہونی چاہیے تھی۔" مائیبرٹ اپنی بات سنا رہی تھی اور میز پر پڑا ہوا اس کا دوسرا "سینڈوچ" کبھی کا ٹھنڈا ہو چکا تھا اور میری اپنی بھوک تو کبھی کی مر چکی تھی۔

مائیبرٹ نے ایک اور سگرٹ سلگایا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی ـــــ "تین دن بعد جب اکرم اور میں مریم کو ساتھ لے کر ہسپتال سے گھر پہنچے تو گھر کا ماحول ہی عجیب تھا ـــــ ڈرائنگ روم میں بیئر کی خالی بوتلیں یہاں وہاں بکھری پڑی تھیں اور باورچی خانے میں دھونے والے برتنوں کا ڈھیر لگا تھا ـــــ اکرم شاید بھانپ گیا تھا "معاف کرنا مائیبرٹ" اس نے کہا اور صفائی کرنے میں لگ گیا۔ ننھی مریم کو بستر پر لٹا کر اپنی تھکاوٹ کے باوجود میں بھی گھر کی صفائی میں اس کی مدد کرنے لگی ـــــ شام ہو گئی تھی ہم نے مل کر کھانا بنایا اور کھانے کے بعد مریم کو دودھ پلانے لگی تو اکرم یہ کہہ کر بستر پر چلا گیا کہ ـــــ "صبح اسے جلدی کام پر جانا ہے" میں نے بھی کوئی توجہ نہ دی ـــــ اب اکرم ـــــ اپنے ویک اینڈ کے مشاغل بھول گیا تھا اور میں اس میں اس اچانک تبدیلی پر حیران تھی۔ اکرم نے شام کو دیر سے گھر آنا اور صبح جلدی کام پر جانا شروع کر دیا تھا اور ہاں اس نے اب گھر پہ شراب پینا بند کر دیا تھا۔ وہ ملّا جو اکرم کے ساتھ ایک بار ہسپتال آیا تھا کبھی کبھی ہمارے ہاں آتا جاتا رہتا تھا اور ہفتے اور اتوار کے روز تو وہ ہمارے ہاں آ کر یوں گھنٹوں بیٹھا رہتا جیسے اسے واپس نہیں جانا۔ وہ اکرم کے ساتھ نہ جانے کیا باتیں کرتا رہتا کہ اس کے جانے کے بعد اکرم نہ صرف اداس رہتا بلکہ اکثر بستر پہ لیٹا چھت کو گھورتا رہتا اور اگر میں اسے خوش کرنے کے لیے دل لگی کرتی تو وہ مجھ سے الجھ جاتا۔ ایک دن کسی بات پر وہ مجھ سے یہاں تک الجھ بیٹھا کہ اس نے مجھے تھپڑ دے مارا۔ مریم اب دو سال کی ہو چکی تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے مریم کو بیچ میں لاتے ہوئے اپنے دل کی بات کھول دی ـــــ "مریم کی

پرورش اسلامی طریقے سے ہوگی ہم مسلمان ہیں،" گویا وہ فیصلہ کر چکا تھا ——— میں نے بات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ میں نہ تو مسیحیت پر یقین رکھتی ہوں اور نہ ہی کسی اور مذہب پر، اور جس طرح کا وہ خود مسلمان ہے اسے اس مسلمانی کو برقرار رکھنے کا مکمل اختیار ہے ۔"

مائیبرٹ نے پہلو بدلا اور ٹھنڈی چائے کی چسکی لیتے ہوئے پھر بولی ——— "ایک شام اکرم نے مجھے ایک طرح سے حکم دیا کہ کل سے مریم "کنڈر گارٹن" نہیں جائے گی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس شام وہ ملا بھی ہمارے ہاں آیا ہوا تھا۔ میں نے اس کے سامنے اکرم کے ساتھ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا، لیکن جب دوسری صبح جب میں مریم کو "کنڈر گارٹن" لے جانے کے لیے تیار کرنے لگی تو وہ ایک طرح سے مجھ پر جھپٹ پڑا ——— "کمینی میں نے کل جو کہہ دیا تھا کہ مریم "کنڈر گارٹن" نہیں جائے گی۔ وہ بچی کو میرے ہاتھوں سے چھینتے ہوئے غرایا ——— "لیکن کیوں ؟" ——— میں نے بھی ذرا تیز لہجے میں پوچھا تو اس نے مجھے ایک لات جھاڑ دی ——— "تمھیں وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گا ——— تم خود گھر پر اس کی نگہداشت اور پرورش کرو گی ——— اب اگر تم نے اسے "کنڈر گارٹن" لے جانے کی کوشش کی تو بس یہ جان لو کہ میں پاکستانی ہوں، پاکستانی ——— ڈینش نہیں ہوں !" ——— اس نے ایک طرح سے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ میں نے اس سے پہلے اسے اس طرح آپے سے باہر نہیں دیکھا تھا ——— مائیبرٹ کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا ——— "فاطمہ تم بھی سوچتی ہو گی کہ میں کیا قصہ سنانے لگ گئی" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، نہیں مائیبرٹ مجھے بتاؤ کہ پھر کیا ہوا" میں نے ایک طرح سے اسے کریدتے ہوئے کہا، تو وہ بولی ——— "میں اگرچہ مریم کو اس کے بعد "کنڈر گارٹن" تو نہ لے جا سکی، لیکن سوچتی رہی کہ اکرم کو دن بدن کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اب اس نے اپنی ملازمت بھی چھوڑ دی تھی اور محض بے روزگاری الاؤنس پر ہمارا گزارا ہو رہا تھا۔ اب وہ گھر پر ہی رہنے لگا تھا ——— بات بات پر الجھنا اور جھگڑے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا اب اس کی عادت بنتی جا رہی تھی۔ میں نے پاکستانی کھانے بنانا بھی اس سے سیکھا تھا، وہی کھانے جو اسے بہت پسند ہوا کرتے تھے اب وہ ان میں نقص نکالا کرتا تھا ——— میرے لیے یہ ماحول سوائے گھٹن کے اور کچھ بھی نہیں رہا تھا ——— میں اگر مریم کو ساتھ لے کر کبھی باہر جانے لگتی تو وہ منع کر دیتا یا پھر خود بھی ساتھ ہو لیتا ——— وہ مریم کو کسی طرح خود سے دور نہیں ہونے دیتا تھا اور بے شک اسے بہت پیار کرنے لگا تھا۔ اب وہ اردو کے بھی کچھ جملے بولنے لگی تھی اور اکرم کو اس بات کی بہت خوشی تھی۔" مائیبرٹ اب مسلسل بولے جا رہی تھی اور میں مجسمہ بنے سنتی جا رہی تھی ——— ہم دونوں ہی چائے اور کھانا بھول چکے تھے۔ ہاں مائیبرٹ اب سگرٹ پر سگرٹ پھونکے جا رہی تھی ——— "اکرم کے ساتھ اگرچہ میرا گزر مشکل ہوتا جا رہا تھا، لیکن میں پھر بھی کوشش کرتی رہی کہ کسی طرح ہمارے پیار کے گزرے ہوئے دن لوٹ آئیں۔ مجھے یہ بھی ڈر رہتا تھا کہ اکرم نہ جانے کب میرے پیار کے اظہار کو بھی غلط سمجھ لے ——— وہ ملا اب اگرچہ ہمارے ہاں تو کبھی کبھار ہی آتا تھا، لیکن اکرم اسے دن میں کم از کم ایک بار ضرور فون کیا کرتا تھا ——— ایک بار وہ آیا تو اکرم نے زور دیتے ہوئے اسے رات کے لیے بھی ٹھہرا لیا ——— مجھے اس سے کچھ نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ اکرم سے باتیں کرتا ہوا مریم کو گود میں لے لیتا اور کنکھیوں سے مجھے دیکھتا رہتا ——— وہ اس رات تو ہمارے ہاں رہا، لیکن صبح سویرے ہی ناشتہ کیے بغیر چلا گیا ——— اس کے جانے کے بعد اکرم مجھ پر برس پڑا کہ میں دیر تک سوتی رہی اور ——— "معزز مہمان" ناشتہ کیے بغیر چلا گیا۔ میرا کہنا تھا کہ میں سوئی ہی کب تھی جو بیدار ہوتی۔ وہی چند منٹ اور صبر نہ کر سکا اور چلتا بنا" دوسرا اکرم، مریم کو ساتھ لے کر باہر جانے لگا تو میں پوچھ بیٹھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے ؟ اس نے کوئی جواب دیے بغیر مریم کو ساتھ لیا،

اور چلا گیا ــــــ وہ دونوں شام کو گھر واپس آئے تو میں نے اکرم سے پوچھا کہ وہ کہاں تھے۔ مجھے ننھی مریم پر ترس آرہا تھا اور فاطمہ سچ پوچھو تو پہلی بار میرے دل میں اکرم کے لیے بھی نفرت پھوٹ پڑی تھی ــــــ "میں ذرا پاکستانی سفارت خانہ چلا گیا تھا" اس نے بتایا ــــــ "مجھے اپنے پاسپورٹ کے سلسلے میں کام تھا" میں نے کچھ زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

مائیبرٹ نے پیکٹ سے سگرٹ نکالا اور اسے سلگانے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سگرٹ سلگا کر اس نے ایک لمبا کش لیا اور بولی ــــــ "ایک دن میری ماں نے مجھے فون کیا ــــــ وہ بڑی سخت بیمار تھی اور مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ میں نے اکرم سے بات کی تو اس نے مجھے ماں کے پاس جانے کا مشورہ دیا ــــــ میری ماں ہلسنگور میں رہتی تھی۔ میں نے مریم کو بھی ساتھ لے جانا چاہا تو اکرم نے یہ کہہ کر ــــــ "ماں کی تیمارداری کرو گی یا مریم کو سنبھالو گی" ــــــ مریم کو میرے ساتھ جانے سے روک دیا ــــــ جب اسے راضی کرنا ممکن نہ رہا تو میں اکیلی ہی ماں کے پاس چلی گئی ــــــ مجھے دیکھ کر وہ خوش تو ہوئی، لیکن اسے افسوس تھا کہ مریم کیوں ساتھ نہیں آئی ــــــ میری ماں کافی کمزور تھی اور بستر سے اٹھنے میں بھی اسے مشکل کا سامنا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں رات اسی کے ہاں ٹھہر سکوں ــــــ میں نے اکرم کو فون کر کے ماں کی خواہش کے بارے میں بتایا تو اس نے فوراً ہی اجازت دے دی "تمھیں ماں کی دیکھ بھال کرنی ہی چاہیے ــــــ مریم کا فکر نہ کرو ــــــ میں اس کا خیال رکھوں گا ــــــ اور ہاں دیکھو کل ویک اینڈ ہے اور ویسے بھی ہمیں کچھ کرنا تو ہے نہیں ــــــ تم ہفتہ اور اتوار وہیں ماں کے پاس رہو ــــــ اتوار کی شام کو واپس آجانا" ــــــ وہ بہت ہی مہربان لگ رہا تھا اور اس کی آواز میں شیرینی بھی تھی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے مریم کا خیال رکھنے کو کہتے ہوئے اتوار کی شام واپس لوٹ آنے کو بتایا ــــــ فاطمہ یہ میری بدقسمتی کا فیصلہ تھا ــــــ کاش میں ماں کے پاس نہ رکتی" یہ کہتے ہوئے مائیبرٹ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ــــــ "اتوار کے روز میں نے اکرم کو فون کر کے بتانا چاہا کہ میں واپس گھر آرہی ہوں، لیکن جب میں نے فون کیا تو وہاں کوئی جواب دینے والا نہیں تھا ــــــ میں نے سمجھا وہ باپ بیٹی کہیں باہر گئے ہوں گے۔ میں نے اپنی ماں کو خدا حافظ کہا اور ریل گاڑی پکڑ کر واپس گھر آگئی ــــــ دروازے پر گھنٹی بجائی تو بھی کوئی جواب نہیں تھا ــــــ میں نے دروازہ کھولا اور گھر میں داخل جو ہوئی تو وہاں کا نقشہ دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے ــــــ پورے گھر میں سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا ــــــ ننھی مریم کا کمرہ تو یوں لگ رہا تھا گویا وہاں چور صفائی کر گئے تھے ــــــ میں پاگلوں کی طرح اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور اکرم و مریم کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں، پولیس کو فون کروں یا نہ کروں، ابھی کوئی دس پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ دروازے پر گھنٹی بجی۔ میں نے سمجھا اکرم اور مریم ہوں گے ــــــ دیوانہ وار آگے بڑھ کر میں نے دروازہ جو کھولا تو سامنے وہی ملاّ کھڑا تھا جو اکرم کے پاس آتا رہتا تھا ــــــ اس کی صورت دیکھتے ہی میں نے اسے اندر نہ بلانے کا فیصلہ کر لیا ــــــ "اکرم گھر پر نہیں ہے" میں نے اسے بتایا ــــــ "ہاں مجھے معلوم ہے" وہ بولا "میں تمھیں یہی تو بتلانے آیا ہوں کہ اکرم اور مریم کل ہفتے کے روز پاکستان چلے گئے" ــــــ زمین میرے پاؤں تلے سے کھسک رہی تھی اور میں ایک طرح سے چکرا کر دروازے کی دہلیز سے لگ گئی تھی ــــــ "اچھا میں چلتا ہوں" اس نے کہا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے پوچھتی کہ مجھے بتائے بغیر اکرم مریم کو ساتھ لے کر کیسے چلا گیا اور اس نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ ــــــ لیکن مجھے یہ سب کچھ پوچھنے کا موقع ہی نہ ملا ــــــ وہ ملاّ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر جا چکا تھا ــــــ فاطمہ! مائیبرٹ نے رکتی ہوئی سانس اور بڑھتی ہوئی ہچکیوں کے ساتھ مجھے مخاطب کرتے ہوئے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا ــــــ "مریم کو مجھ سے جدا ہوئے دو سال ہونے کو ہیں" ــــــ

میں نے محسوس کیا اس کے ہاتھ برف کی مانند ٹھنڈے تھے ۔ ایش ٹرے میں پڑا ہوا سگرٹ کا ٹکڑا ویسے ہی دھواں دے رہا تھا ——— میں نے اکرم اور مریم کو تلاش کرنے میں ہر ممکن کوشش کر دیکھی ہے ——— وہ لاہور کا رہنے والا تھا ، میں ایک مرتبہ لاہور بھی جا چکی ہوں ۔ وہاں نہ تو پولیس نے میری مدد کی اور نہ ہی کسی اور نے ۔ میں دفتروں ، پولیس کے تھانوں اور گلیوں میں مہینہ بھر خوار ہو کر واپس لوٹ آئی ۔ اکرم جاتے ہوئے اپنے تمام نشان مٹا گیا تھا اور وہ تصویر جو ٹیلی ویژن کے ساتھ پڑی ہوئی دیکھ رہی ہو بس یہی ایک باقی ہے ——— یہ سونے کے کمرے میں الماری کے اوپر دھری رہتی تھی شاید اس لیے اکرم کے ہاتھوں سے بچ گئی ——— وہ تو ننھی مریم کا فوٹو البم بھی ساتھ لے گیا ہے ——— میں اکرم کے سوا یہاں کسی اور پاکستانی کو جانتی ہی نہیں ۔ اس نے کبھی مجھے کسی سے ملایا ہی نہیں تھا ۔ وہ تو بس اپنی ہی دنیا کا تھا ۔ میں نے یہاں کئی پاکستانی دوکانوں اور دوسرے پاکستانیوں کو بھی یہ تصویر دکھائی ہے ، ان میں سے کوئی بھی تو اسے پہچانتا نہیں " ——— مائیبرٹ اب زار و قطار رو رہی تھی اور اس کے آنسو میرے ہاتھوں پر گرنے لگے تھے ———

" فاطمہ ! وہ ملّا جو ہمارے گھر آیا کرتا تھا میں اس کی تلاش میں ہر جمعہ کو کئی بار مسلمانوں کی مسجد بھی گئی ہوں ، لیکن مریم کے " اغوا " کے بعد میں نے اسے کبھی دیکھا ہی نہیں ——— " تمہیں بتاؤ میں کیا کروں اگر مر جاؤں ؟ " مائیبرٹ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ——— " کیا تم میری مدد نہیں کر سکتی ہو ——— تم تو کئی پاکستانیوں کو جانتی ہو گی ——— کسی سے پتہ کر دیکھو شاید اس ملّا ہی کے بارے میں کچھ اتہ پتہ چل جائے " ——— مائیبرٹ کے پھر آنسو گرنے لگے تھے اور خود میرے ہونٹ بھی کانپ رہے تھے ——— میں اسے کس طرح بتاتی کہ جس آگ میں وہ جل رہی ہے ممتا کی وہاں چتا مجھے بھی تو جلا رہی ہے ——— عابد نے بھی ہمارے دونوں بچّوں کو پاکستان بھجوا دیا تھا ۔ اس کے خیال میں ہماری ساری کمائی یہاں ڈنمارک میں ان کے اخراجات پورے کرنے پر اٹھ جاتی تھی ——— میری خاموشی کو توڑتے ہوئے مائیبرٹ بولی ——— " فاطمہ ! مجھے یقین ہے کہ تم میری ضرور مدد کر سکتی ہو " اب میرا وہاں دم گھٹنے لگا تھا میری آنکھوں کے سامنے میرے اپنے بچّوں کی تصویریں آ گئی تھیں اور اس سے پہلے کہ میرے آنسو ان تصویروں کو دھندلا دیتے میں نے مائیبرٹ کو تسلّی دیتے ہوئے اس سے اجازت چاہی ——— اپنا اوور کوٹ اٹھایا اور گھر لوٹ آئی ۔

عابد مجھ سے پہلے گھر آ چکا تھا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھا دن بھر کی کمائی ہوئی اپنی رقم گن رہا تھا ——— مجھے وہ ایک " بردہ فروش " لگ رہا تھا جو اپنے ہی بچّوں کو فروخت کر آیا ہو ۔

(کوپن ہیگن سے)

فرحانہ رضوی

جینے کے دکھ

تجھ کو جینا ہے تو ہنستے ہوئے جینا ہوگا
مسکراتے ہوئے اس زہر کو پینا ہوگا (شور)

میں کالج کینٹین کے آگے سیڑھیوں پر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اگر سامنے درخت پر بیٹھی چڑیا کی تین ٹانگیں ہوتیں اور سامنے گراؤنڈ میں جو لڑکی کھیل رہی ہے اس کے دم ہوتی تو کھیلتے ہوئے دُم اچھلتی اور کتنا اچھا لگتا اور اگر سارے ہی انسانوں کے دُم ہوتی تو سب کیسے لگتے؟ ... لیکن باوجود کوشش الٹی سیدھی باتیں سوچ کر بھی مجھے ہنسی نہیں آرہی تھی ..... اتنے میں وہ موٹر لگی وہیل چیئر (WHEEL CHAIR) پر تیسری بار میرے سامنے سے گزرا اور میں نے بے ساختہ ہلو کہہ دیا۔ وہ شاید اسی انتظار میں تھا۔ میری توجہ دیکھی تو فوراً آ گیا ..... ہائے، مجھے سام (SAM) کہتے ہیں۔ اچھا نام ہے۔ میں نے کہا۔ تم فارغ ہو۔ اس نے پوچھا، ہاں! میری کلاس ہو رہی ہے مگر فارغ ہوں ... کلاس میں کیوں نہیں گئیں؟ میرے خیال میں اس کا سوال فضول تھا، مگر سنجیدگی سے کہا۔ میری کلاس اس وقت آرٹ ڈور ہے اور مجھ سے اتنا سامان ..... "میرے ہاتھ پر چڑھا پلاسٹر اور پاس پڑی CRICH "بیساکھی" اس نے خود ہی دیکھ لی۔ میں نے فائن آرٹس کے بورڈ اور رنگوں کے ڈبے دکھاتے ہوئے کہا۔ یہ سب اٹھا کے مجھ سے سیڑھیاں نہیں اُتری جاتیں۔ لفٹ سے نیچے آؤ تو گھوم کے جانا پڑتا ہے، میں تھک جاتی ہوں۔ تمہیں آرٹ ڈور کلاس اچھی لگتی ہے؟ ہاں! مگر نہیں اس لیے کہ مجھ سے پتھر پہ یا نیچے نہیں بیٹھا جاتا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تفصیل بتائی۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں ڈپریشن ہے اور تم اداس ہو۔ پتہ نہیں۔ میں نے بیزاری سے کہا۔ اس نے میرا بورڈ اور رنگوں کا ڈبہ اٹھایا اور کینٹین میں سامنے کی طرف جاکے میز پر رکھ دیا۔ میں بھی گھوم کے آئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ وہیل چیئر پہ بیٹھا رہا۔

تمہیں ڈپریشن نہیں ہوتا۔ میں نے اچانک ہی بے ارادہ پوچھ لیا اور اپنے سوال پر پچھتانے لگی .....! مجھے جب بھی ڈپریشن ہوتا ہے تو لطیفوں کی کتابیں پڑھتا ہوں، سمندر کے کنارے چلا جاتا ہوں اور بچوں سے کھیلتا ہوں سام نے اطمینان سے کہا۔ میرا موڈ ٹھیک ہوگیا اور اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگی۔ تمہاری کوئی سہیلی نہیں۔ سام نے پوچھا ... بہت ساری ہیں مگر سب ہائی اسکول میں پڑھتی ہیں۔ سام ہنسنے لگا اور ہنسی روک کے پوچھا۔ تمہاری عمر کتنی

ہے؟ سولہ سال کے بعد لڑکیوں کی عمر نہیں پوچھتے۔ میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا اور میں سولہ سال کی ہو چکی ہوں۔ تمہاری عمر کتنی ہے؟ میں بیس سال پہلے بیس سال کا تھا۔ تم نے اتنی لمبی زندگی کیسے گزار لی۔ میں نے دوبارہ بے ساختہ پوچھا، پھر کہا، معافی چاہتی ہوں، مگر تمہیں پتہ ہے نا! میں ڈیپرس "DEPRESS" ہوں۔ میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے اپنے فضول سوالوں کا جواز پیش کیا۔ مجھے معلوم ہے بیس سال پہلے میں بھی ایسا ہی تھا اور معافی کی کوئی بات نہیں ہے، تم تو بہت دلچسپ اور اچھی لڑکی ہو۔ تمہیں کیسے پتہ کہ میں اچھی ہوں۔ تمہاری باتوں اور شکل سے تم بہت پیاری ہو۔ میرے گھر میں آئینہ ہے۔ میں نے اسے اطلاع دی۔ سام دوبارہ ہنسنے لگا۔

تم بیس سال پہلے کیا کرتے تھے؟ میں پائلٹ تھا پھر ویت نام کی جنگ میں بھیج دیا گیا اور جنگ میں جانے والے ایسے ہو جاتے ہیں۔ اس نے اپنی معذوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دکھ سے کہا۔ پھر میں نے اسے غور سے دیکھا وہ عام امریکیوں ایسا لمبا تھا۔ جوانی میں خوب صورت ہوگا، لیکن اب وہ وہیل چیئر سے اٹھ کے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بارودی سرنگ پھٹ جانے سے ایسا ہوا۔ اس نے بتایا۔ یہ جنگیں کب ختم ہوں گی۔ انسان انسانوں پر ظلم ڈھانا کب چھوڑیں گے؟ میں دوبارہ اداس ہونے لگی۔ اچھی لڑکی اداس مت ہو۔ اس نے بڑے پیار سے کہنا شروع کیا۔ زندگی گزارنا بہت آسان ہے۔ تم تو تصویریں بناتی ہو، دیکھو کائنات میں کیسے خوب صورت رنگ ہیں، آسمان پودے، چاند اور سورج، دنیا کتنی مکمل اور خوب صورت ہے۔ میں کچھ زیادہ مذہبی آدمی نہیں ہوں۔ چرچ نہیں جاتا۔ بائبل بھی کبھی کبھار پڑھتا ہوں، مگر میں اللہ کی بنائی ہوئی کائنات کو سمجھتا اور پڑھتا ہوں۔ بڑی خوب صورت اور معصوم ہے، مجھے ہنستے ہوئے لوگ اچھے لگتے ہیں۔ تم جب وہاں بیٹھی تھیں تو فطرت کا حصہ نہیں لگ رہی تھیں۔ تم مجھے فلاسفر لگتے ہو۔ میں ہنسی، پہلی بار ...... اور تم مجھے کھلاڑی ..... مگر میں اب کھیل نہیں سکتی۔ شطرنج کھیلا کرو مجھے شطرنج سمیت سارے "اِن ڈور" کھیل آتے ہیں۔ میں نے فخر سے کہا۔ میں نے کہا تھا نا۔ تم اچھی کھلاڑی لگتی ہو، تو زندگی بھی ایک کھیل ہے، اسے بھی اچھی طرح کھیلنا چاہیے۔ تم نے کلاس نہیں لی تھی تو گھر چلی جاتیں۔ میرے پاس گاڑی ہے، مگر میں اس وقت بہت غصے میں تھی، الٹی سیدھی گاڑی چلاتی تو جرمانہ ہو جاتا —— بلا وجہ! —— اس کا مطلب ہے حقیقت پسند ہو۔ بہت اچھے، تو تم اپنا موڈ ٹھیک کر رہی تھیں؟ ..... ہاں! چائے پیو گی، پھر وہ کالی چائے لے آیا۔ بغیر دودھ اور شکر کی چائے پینے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔

سام تمہیں اپنے ایکسیڈنٹ کے بعد دنیا کیسی لگی——؟ طویل عرصے کے بعد جب میں اسپتال کی دنیا سے باہر آیا تو جنگ بند ہو چکی تھی اور سب کچھ بدل چکا تھا—— میں بھی—— میری منگیتر کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے دو بچے تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ سب سے بہت دور چلا جاؤں، پھر سوچا اس طرح میں اور اکیلا ہو جاؤں گا—— میں نے سب سے دوستی کر لی—— اپنی منگیتر کے شوہر اور اس کے بچوں سے بھی —— تھوڑی دیر میں کچھ بول ہی نہیں سکی۔ اتنی دیر میں ایک پونی ٹیل والا لڑکا سامنے والی میز پر آ گیا—— سنو سام —— میں نے سرگوشی کی۔ اگر اس لڑکے کے دم ہوتی —— کیا مطلب؟—— سام نے اس کیفیت سے باہر آتے ہوئے پوچھا۔ تم سوچو! ہم سب ایسے چلتے ہیں۔ میں نے دو انگلیاں میز پر چلائیں، اگر ہمارے سب کے دُمیں ہوتیں ——

کہیں تم ڈارون کی تھیوری سے تو متاثر نہیں ہو ـــــــ وہ ہنسا ـــــــ میں تمہیں شکل سے ایسی نظر آتی ہوں ـــــــ میں نے بُرا مانتے ہوئے کہا ـــــــ اور سنو سام میں نفسیاتی، فلسفیانہ اور معاشرتی گفتگو میں فرائیڈ، افلاطون، کارل مارکس اور ہاں کنفیوشس ـــــــ وہ جلاوطن چینی ـــــــ سام نے پوچھا۔ ہاں ہاں وہی۔ میں کسی کا ذکر پسند نہیں کرتی ـــــــ کیوں؟ ـــــــ میرے اپنے خیالات ذرا مختلف ہیں اور اعلیٰ ـــــــ سام نے ہنستے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

I KNOW YOU ARE TRYING TO MAKE ME FEEL BETTER.

اور تم مجھے اس کیفیت سے باہر لے آئیں۔ I DID میں اچھلی ـــــــ تمہیں پتہ ہے انسان اتنا اسپیشل کیوں ہے۔ اس لیے کہ وہ دوسرے کے احساسات کو سمجھتا ہے اور مدد کرتا ہے۔ تم بہت اچھی اور دلچسپ لڑکی ہو ـــــــ اور تم یقیناً اسپیشل، سام تم پیدائشی دوست ہو ـــــــ ارے باتوں میں پتہ ہی نہیں چلا اور سام کی اسپیشل بس FORHANDICAPS آگئی ـــــــ اور ہاں کبھی اس طرف آج کی طرح اکیلی مت بیٹھنا۔ یہ نصیحت کر کے سام چلا گیا۔

اس کے بعد میں نے بہت مرتبہ آؤٹ ڈور کلاس میں پتھر پہ بیٹھ کے پھول اور پتے بنائے۔ اپنے پسندیدہ دُموں والے انسانی کارٹون بنائے، اچھّے نمبر لیے، اداس ہوئی اور ہنسی بھی ـــــــ سام کو اور اس کی کالی چلائے کو یاد کیا، لیکن سام مجھے دوبارہ نہیں ملا ـــــــ لیکن اچھّے دوستوں کی فہرست میں وہ سرِ فہرست ہے اور ہر اچھّے منظر کو دیکھتے ہوئے سمندر کے کنارے ٹہلتے ہوئے، بچّوں کی باتیں ENJOY کرتے ہوئے مجھے جب بھی یاد آتا ہے سام کی ہدایت پر میں اس کے اور اس جیسے دوسرے انسانوں کے سکون کے لیے فوراً دعا مانگ لیتی ہوں ـــــــ!

میر حسین علی امام

بوڑھا ایکسرے مین

میرے سامنے ہزارہا مریض یونہی روزانہ لائے جاتے ہیں۔ جھلسے ہوئے جسم لیے۔ کسی کی ہڈی ٹوٹی ہوئی، کوئی کھانستے ہوئے، کوئی کراہتے ہوئے۔ کسی کی ماں روتے ہوئے حال بتاتی ہے، کسی کی بیوی منہ میں دوپٹہ رکھتے ہوئے رک رک کر کیفیت بیان کرتی ہے، کسی کا بھائی، کسی کا باپ اور کوئی بیٹا بوڑھے باپ کے مرض کا حال سناتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ماں کی ممتا، باپ کی شفقت، بیوی کی شوہر کے لیے محبت، شوہر کی بیوی کے لیے چاہت، بیٹے، بیٹیوں کی والدین کے لیے فکر، میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ میری زندگی کی چار دہائیاں انہی مشینوں کو چلاتے ہوئے گذر گئی ہیں۔ مریض بدل گئے۔ ڈاکٹر بدل گئے۔ ہسپتال بدل گئے۔ مگر مجھے یوں لگتا ہے کہ میں انہی مشینوں کا حصہ ہوں، بے جان ساحصہ۔ جسے مریض کی تکلیف یا تیماردار کے جذبات کا کوئی احساس نہیں ہوتا ہے۔ میرے پاس آنے والے مریض جو زندگی پا گئے وہ مجھے بھول گئے اور جو انتقال کر گئے، ان کے رشتے دار انھیں بھول گئے تو مجھے کیا یاد رکھیں گے؟

یہ میری اس سے پہلی ملاقات تھی۔ اس بوڑھے میں کوئی کشش، طاقت ایسی تھی کہ میں کھینچتا چلا گیا۔ شاید اس لیے بھی کہ افسانے کے لیے اس کی زندگی سے کوئی مواد مل جائے۔ جب بھی میں اپنے ڈاکٹر دوست کے پاس ہسپتال جاتا تو اس بوڑھے ایکسرے مین سے ضرور ملتا اور اس کی باتیں دلچسپی سے سنتا۔ کہتے ہیں کہ بوڑھوں کے دوست وہی بن سکتے ہیں جو ان کی باتیں سن سکیں۔ پس میں اس کی باتیں سنتا اور دوستی قائم ہوتی گئی۔ ایک دن جب اسے فرصت ملی تو کہنے لگا "تمہیں معلوم ہے کہ ہسپتال کے فرعون کون ہوتے ہیں؟" میں ہنس پڑا اور اس کی طرف سوالیہ لہجہ بنا کر پوچھا "فرعون اور وہ بھی سرکاری ہسپتال میں!" میری یہ بات اسے بری لگی۔ تھا تو بوڑھا۔ فوراً ناراض اور جذباتی ہو گیا۔ کہنے لگا "ہاں! ہسپتال بھی ایک ریاست ہے۔ اس کے فرعون۔ نرس، ڈسپنسر، لیب ٹیکنیشین، ایکسرے ٹیکنیشین یہاں تک کہ جمعدار، دائی، وارڈ بوائے وغیرہ ہوتے ہیں، بلکہ فرعون بنا دیے جاتے ہیں۔ مریض ان سب کی رعایا ہے۔ تیماردار ان کی رعایا ہیں۔ جب ان کا دل چاہے تیماردار اور مریض سے اچھا سلوک کریں۔ ورنہ برا سلوک تو فراعنۂ ہسپتال ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں۔ ہسپتال ہی پر کیا موقوف، ہر دفتر، ہر شعبۂ زندگی میں فرعون موجود ہیں۔" میں اس کی یہ گفتگو سن کر سنجیدہ سا ہو گیا۔ میں نے اس سے دریافت کیا "فرعونوں میں ڈاکٹرز، اسپیشلسٹ وغیرہ

کو تم نے کیوں شامل نہیں کیا؟ وہ میری یہ بات سُن کر یوں ہنس پڑا جیسے کسی بچے نے کوئی دلچسپ سوال پوچھا ہو
لگا "ڈاکٹر، اسپیشلسٹ وغیرہ قربانان ہیں۔ ان کی منزل سرکاری ہسپتال نہیں۔ یہ خود بعد میں ہسپتال کھولتا
کا درجہ دیتے ہیں۔ بزنس میں ہسپتال مینجمنٹ کو داخل کرتے ہیں۔ سرکاری ہسپتال میں تو یہ ٹائم پاس کرنے، راک
اپنی شہرت قائم رکھنے، سماجی طور پر ممتاز ہونے آتے ہیں۔ مریض اور تیماردار تو ہم ایکسرے، لیب ٹیکنیشین، ڈسر
نرسوں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صرف دوائیں لکھ دیتے ہیں اور تمہیں معلوم ہے کہ لکھی ہوئی تحریر کو عملو
پہنانا کتنا مشکل ہے۔"

میں سوچنے لگا۔ قیام پاکستان کے بعد میں لکھی گئی قرارداد مقاصد کا اسلامی نظام اب تک نہیں آیا۔ ۱۹۷۳ء
آئین میں سرکاری زبان کے طور پر اردو کا عملاً نفاذ اب تک نہیں ہو سکا۔

یہ میری اس سے دوسری تفصیلی ملاقات تھی۔ اتنے میں میرا ڈاکٹر دوست آگیا۔ بوڑھا ایکسرے مین چلا گیا۔
ڈاکٹر سے اس کی بابت دریافت کیا تو وہ ہنس کر کہنے لگا "ریٹائرمنٹ قریب ہے۔ اس لیے ایسی باتیں کرتا ہے۔
ہے کہ ڈاکٹری کا بڑا جنون تھا ڈاکٹر نہیں بن سکا اس لیے عمر بھر ڈاکٹروں کے گلے شکوے کرتا رہا ہے اور مریضوں سے
سے پیش آتا ہے۔

جب میری اس سے تیسری ملاقات ہوئی تو پوچھنے لگا کہ "آپ کیا کرتے ہیں؟" میں نے کہا "افسانے لکھتا
کہانیاں جمع کرتا ہوں۔" یہ سن کر وہ ہنس پڑا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا "گویا آپ بھی ایکسرے مین یا ریڈیو گرافر ہیں
مریض کے جسم کا طبی معائنہ کرتے ہیں اور آپ معاشرے کا طبی معائنہ؟ اس کے یہ الفاظ سن کر ایک لمحے کے لیے
میں پڑ گیا کہ یہ حقیقت ہے کہ نہیں۔ کتنے ادیب معاشرے کے ایکسرے لیتے ہیں اور اس کا علاج کرنے کے لیے بیماری تلا
اور کتنے جان بوجھ کر ایکسرے شیٹ کو ڈارک کر دیتے ہیں یا دوسرے مریض کی شیٹ دے دیتے ہیں۔ وہ پوچھنے لگا
سوچنے لگے ہو، کیا ادیب ایکسرے مین نہیں ہوتا ہے؟" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اقرار کیا کہ "ہاں ہم
مین ہیں۔"

اگلی ملاقات میں وہ نہایت کمزور اور نحیف دکھائی دینے لگا۔ جیسے اندر کوئی بیماری لگ گئی ہو۔ میں نے
کی خیریت دریافت کی تو کہنے لگا "زندگی میں ہزاروں مریضوں کو بتلایا کہ تمہارے سینے میں سوراخ ہے یا گرد
پتھری، معدے میں سرطان ہے۔ اب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تمہیں کیا بیماری ہے؟ آپ ادیب ہیں۔ سوچیے جو
جوانی سے ریٹائرمنٹ تک ساری زندگی ہسپتال میں گزار دے۔ اسے تو بیماریوں کا گھر ہونا چاہیے۔" میں نے ا
کیا۔ آپ کی تو ہسپتال میں عزت ہے۔ سینئر کارکن ہیں۔ بڑے سے بڑا ڈاکٹر آپ کا احترام کرتا ہے۔ تمام طبی سہ
آپ یہاں سے لے سکتے ہیں۔ یہ سن کر وہ چپ ہو گیا اور اٹھ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں میگزین دیکھنے لگا
آخر اکتا کر گھر واپس آگیا۔

کئی مہینوں کے بعد جب ہسپتال سے گزر ہوا تو دل چاہا کہ بوڑھے ایکسرے مین سے مل لیا جائے جو ادیب کو
ایکسرے مین میں شمار کرتا ہے اور ادب کو معاشرے کا ایکسرے خیال کرتا ہے۔ جب ایکسرے ڈیپارٹمنٹ پہنچا تو ا

میر حسین علی امام — **منظر** — **بوڑھا ایکسرے مین**

سولہ سترہ برس کا نوخیز لڑکا مشین کی صفائی ستھرائی کر رہا تھا۔ میں نے ایک دوسرے ٹیکنیشین سے پوچھا فلاں ایکسرے مین کدھر ہے میری یہ بات سن کر وہ لڑکا مشین کی صفائی کرتے کرتے رک سا گیا لیکن بوکھلاہٹ میں مشین سے ٹکرا گیا۔ دوسرے ایکسرے مین نے کہا "جی۔ وہ انتقال کر گئے۔ یہ انہی کا لڑکا ہے"۔ یہ کہہ کر وہ اسے ڈانٹنے لگا "اندھے ہو گئے ہو۔ اگر مشین کو کچھ نقصان ہو جائے تو تمہاری عمر بھر کی تنخواہ سے بھی یہ مشین خرید نہیں سکتے۔ احتیاط سے کام کرو"۔ لڑکا "ہاں جناب" کہہ کر احتیاط سے کام کرنے لگا۔ مجھے یوں لگا کہ احتیاط سے کام کرتے کرتے یہ بھی باپ کی طرح اس مشین پر ساری عمر گزار دے گا۔

باپ کی مشین بند ہو گئی۔ بیٹے کی مشین نے کام شروع کر دیا۔ باپ، بیٹا، سب انسان مشینیں ہیں۔ شاید سبھی ایکسرے مشینیں ہیں۔ میں نے سوچوں کا تسلسل توڑتے ہوئے اپنے ڈاکٹر دوست کے متعلق دریافت کیا تو اس نے رکھائی سے جواب دیا۔۔۔ "انھوں نے پرائیویٹ کلینک کھول لیا ہے اور نیا پلانٹ لے لیا ہے" اور مجھے ایڈریس لکھ کر دے دیا۔ دوست کا ایڈریس بھی میرے پاس محفوظ ہے، ہمیشہ سوچتا ہوں کہ کلینک جاؤں، دوست بھی اصرار کرتا کہ اس کی نئی کلینک دیکھنے آؤں، پلانٹ دیکھوں، لیکن ایکسرے کا سن کر وہ بوڑھا ایکسرے مین یاد آ جاتا ہے اور میں ایکسرے ڈیپارٹمنٹ، کلینک سے دانستہ منہ موڑ لیتا ہوں۔

طیّبہ فرح ناز

اخروٹ کا درخت

اور پھر ایک دن بہت تیز آندھی چلی اور سارے پتّے بکھر گئے۔
یہ آندھیاں ہمیشہ اکتوبر کے مہینے میں چلا کرتی تھیں۔ اکثر اوقات صرف ایک ہی آندھی کے طوفان میں پورا درخت
پتوں سے خالی ہو جاتا تھا۔ اپنے پیارے درخت کی باہنوں سے لپٹ کر یہ منظر میں نے بارہا دیکھا۔
اونچے پربتوں کی اس وادی میں ہی تو میں نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اخروٹ کے اس درخت سے میری وابستگی میری
زندگی ہی کے برابر تھی۔
محبتوں کے اپنے اپنے رنگ ہوتے ہیں اور اپنی اپنی دھوپ چھاؤں۔
امی کہتی ہیں۔ تم چھوٹی ہی تھیں تو اسی درخت کے نیچے خاص طور پر کھیلا کرتی تھیں۔
اور ابو کہتے ہیں۔ میں تمہیں بلاتا رہتا کہ بیٹا اب اندر آجاؤ شام ہو گئی۔ مگر تم تو ایسی مگن نظر آتیں گویا کچھ سنا ہی نہ ہو۔
محبت کیا ہے؟
تمام بڑے شاعر اور ادیب اسے کھوجتے ہی رہے ہیں۔ مگر پتہ نہیں چلتا۔ سردیاں بہت جلد آجایا کرتی تھیں۔ شام
بہت سویرے ہی ہو جاتی۔ موسم زیادہ سرد ہونے لگتا تو اسکولوں میں دو مہینے کی چھٹیاں ہو جاتیں۔
ہمارے بہت سے رشتے دار گرم علاقوں میں رہتے تھے۔
سب سامان گاڑیوں میں پہنچا دیا جاتا۔ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا کہ جب گھر کے افراد کا بغور جائزہ لیا جاتا تو ہم غائب ملتے۔
میں ہمیشہ اپنے درخت سے لپٹی روتی ہوئی ملا کرتی تھی۔ جانے کیوں ایسے ہوتا۔ اخروٹ کے اس درخت نے میرے
دل میں کہیں اپنی جڑیں پھیلا لی تھیں۔
میں بہت جلد واپس آؤں گی میں کہتی۔
سنا ہے۔ محبت بے زبان ہوتی ہے۔ اس کا کوئی نام بھی نہیں ہوتا۔
مجھے یاد ہے۔ ہم جیسے ہی گھر واپس پہنچے۔ میں دوڑ کر اس کا رخ کرتی۔ یوں محسوس ہوتا کہ جیسے وہ اپنی نئی کونپلوں کے ساتھ
میرا انتظار کر رہا ہوتا۔

میں نے تمہارا نام تمہارے درخت پر کھود دیا ہے۔ بھیا نے مجھ سے کہا تھا۔ مجھے یہ سن کر بہت تکلیف ہوئی تھی، مگر جب
میں دوڑ کر صحن میں پہنچی تو مجھے یوں لگا جیسے میرا درخت میرا ہو جانے پر بہت خوش ہو۔
بہار آتی، کونپلیں پتے بن جاتیں اور بور آنے لگتا سبز گچھوں کی شکل میں۔ گرمیوں کے آتے ہی بور گر جاتا اور چھوٹے
چھوٹے سبز اخروٹ نظر آنے لگتے۔
پتوں اور اخروٹوں سے لدا ہوا میرا درخت کسی دلہن کی مانند لگتا۔ یہی وہ دن ہوتے تھے جب میں سارا
دن وہیں کھیلتی رہتی تھی۔
اندھیرا ہو جاتا۔ امی بول جاتیں۔
بیٹا اب اندر آ جاؤ، دیر ہو گئی۔
پہاڑوں کا اندھیرا بھی بہت گہرا اور روشنی بھی بہت گہری ہوتی ہے۔ ہمارے گھر میں گلاب کے بھی بہت سے پودے
تھے۔ ان پر بہت سارے گلاب بھی ہر وقت کھلے رہتے تھے۔
میدانی علاقوں میں چھٹیاں ہوتیں تو ہمارے ڈھیر سارے کزن آ جاتے۔ ہم سب مل کر ان گلابوں کو توڑ لیتے اور
اپنے سبز اخروٹ کے ساتھ ایک پھول بھی سجا دیتے۔
خالو ہنستے ہنستے تھک جاتے۔
بھئی کمال ہے، تم نے تو سب کو ساتھ ملا لیا۔
ملتے کیسے نہیں۔ محبت تو وہ خوشبو ہے کہ جب پھیلتی ہے تو سب کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے ؎

رات کی رانی کا جھونکا یا کسی کی یاد تھی۔
دیر تک آنگن میرے احساس کا مہکا رہا
آج پھر شبنم کے قطروں نے بجایا جل ترنگ
آج پھر دامن مری آواز کا بھیگا رہا۔

اخروٹ کی شاخیں پھیلتی چلی گئیں۔ وہ اب ایک تناور درخت تھا۔
ابّا اس دورافتادہ پہاڑی علاقے میں علم کی روشنی پھیلانے اس وقت آئے تھے جب یہاں آنے کو کوئی تیار
نہ تھا۔ یہاں کے باسی بھی یہاں سے نئے شہروں میں منتقل ہو رہے تھے۔
ان کے بال اب سفید ہو گئے تھے۔ محبتیں بانٹتے عمر گزر گئی تھی۔ وقت پر لگا کر گزر گیا تھا۔
ایسا نہیں ہونا چاہیے، پر ایسا ہوتا ہے۔
اور ہمیں جانا تھا۔ اب یہاں سے۔
بھری گرمیوں کی دوپہر تھی۔ میرا درخت اس دن بہت دیر تک روتا رہا۔ جانے کیوں ایسے ہوا۔ پہلے ایسے ہی ہوا تھا
پھر یوں ہوا کہ:۔
پھر اس دن بہت تیز آندھی چلی اور سارے پتے جھڑ گئے۔

محمد خالد اختر • نکہت بریلوی • اکرام بریلوی

نئی کتابیں

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

جدید اردو شاعری
۱۸۵۷ء سے ۱۹۳۹ء تک
(پی۔ایچ۔ڈی کے تحقیقی مقالے کا خاکہ)

مصنف : فیض احمد فیض
دریافت و تحقیق : پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی
صفحات : ۱۹ • قیمت : ساٹھ روپے
ناشر: ادارہ ادب و تنقید ۸۸۔سمن آباد لاہور

۱۹۳۹ء کی بات ہے فیض تب ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ سعادت حسن منٹو تب جوان کا طالب علم تھا اس زمانے کی ایک دلچسپ واردات لکھی ہے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے ڈین صاحب کو انگریزی میں ایک عرضداشت بھیجی کہ ان کو مندرج کردہ خاکے کے مطابق جدید اردو شاعری پر پی۔ایچ۔ڈی کا تھیسس پیش کرنے کی منظوری دی جائے۔ ساڑھے پانچ ماہ کے بعد یونیورسٹی کے اسسٹنٹ رجسٹرار صاحب کی طرف سے جواباً چھٹی آئی کہ ملفوف چھپے ہوئے فارم پر درخواست دو۔ فیض نے تعمیل کی۔ چھپے ہوئے فارم کو پُر کیا۔ اپنے تعلیمی اور دیگر کوائف پیش کیے۔ ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر جو ان دنوں ایم۔اے۔او کالج کے پرنسپل تھے ان کے نوٹ کے ساتھ یہ فارم پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار کو بھیجا گیا۔ تاثیر صاحب کا نوٹ تھا۔ درخواست دہندہ نے میری نگرانی میں یہ کام کیا ہے، جو کام اب تک انھوں نے کیا ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے اہل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام جب مکمل ہو جائے گا تو انسانی علوم میں گرانقدر اضافے کا موجب ہو گا۔ درخواست مع خاکہ عربی فارسی کے بورڈ آف اسٹڈیز کی میٹنگ میں ۲۲ فروری ۱۹۴۰ء کو پیش ہوئی۔ بورڈ کے بقراطوں نے بحث کے بعد یہ رائے دی کہ یہ موضوع بہت پھیلا ہوا ہے۔ اس لیے انھیں یعنی فیض کو اس مقالے کو مفید بنانے کی خاطر یونیورسٹی کے اردو لیکچرر سے تبادلہ خیالات کر کے دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت ہے۔ پندرہ سولہ دن بعد یہ معاملہ اکیڈمک کونسل کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے روبرو رکھا گیا۔ اس نے بورڈ کے فیصلے سے اتفاق کیا اور پھر چند دن بعد اکیڈمک کونسل نے بھی۔ یہ نہیں معلوم کہ فیض صاحب پنجاب یونیورسٹی کے اردو لیکچرر حافظ محمود شیرانی سے ملے یا نہیں۔ غالباً اس عجیب و غریب فیصلے سے بددل ہو کر فیض نے پی۔ایچ۔ڈی پر ہی لعنت بھیجی اور

تھیسس جو وہ لکھنا چاہتے تھے کبھی لکھا گیا (یونیورسٹی کے بقراطوں کی حماقت اور کج فہمی پر حیرت ہوتی ہے)۔

اس سارے قصے کی ایک فائل پروفیسر عبادت کو خوش قسمتی سے ردی کاغذات کے ایسے ڈھیر میں مل گئی جو پھینکوایا جانے والا تھا۔ انہوں نے اسے کچھ دوسری اہم فائلوں کے ساتھ محفوظ کر لیا۔ عبادت صاحب نے ان نادر اور دلچسپ تحریروں کو ایک فل اسکیپ تقطیع کی خوشنما کتاب کی صورت میں چھپوا کر ایک اہم تحقیقی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

فیض کے عاشقوں اور پرستاروں کے لیے یہ کتاب (جو سیدھے ہاتھ سے اردو میں ہے اور الٹے ہاتھ سے انگریزی میں) ایک انمول خزانہ ثابت ہوگی۔ یہ دکھ ضرور ہوتا ہے کہ ہم ایک بڑے شاعر اور نثر نگار کی لکھی ہوئی ایک خوبصورت کتاب سے محروم رہے۔ یہ سب چند بقراطوں کی نالائقی یا شاید حسد سے ہوا۔

برایں عقل و دانش بباید گریست

——— محمد خالد اختر

آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی
(تنقیدی و تحقیقی مقالہ)

مصنف: شبیہ الحسن
صفحات: ۱۹۲ • قیمت: ساٹھ روپے
ناشر: سفینہ پبلی کیشنز ۲۵۳۔ ایف۔ رحمان پورہ۔ لاہور

سید آل رضا ایک مسلم الثبوت خوش نوا، خوش فکر اور زبان و بیان پر کامل دسترس رکھنے والے شاعر تھے اور علامہ آرزو لکھنوی کے ہونہار شاگردوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ان کے مرثیوں کے نئے رنگ و آہنگ نے نہ صرف مقبولیت حاصل کی بلکہ جدید مرثیہ گوئیوں نے ان کے مرثیوں کی خصوصیات سے خاطر خواہ استفادہ بھی کیا لیکن اس صنف میں ان کی شہرت اور مقبولیت نے اہلِ نقد و نظر کو ان کے بنیادی فنِ غزل گوئی کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا جب کہ ان کی غزل بیسویں صدی کے دبستانِ لکھنؤ کے طرزِ نو کی نمائندہ غزل ہے اور وہ چیز جسے تغزل کہا جاتا ہے سید آل رضا کی غزل کا خاصہ۔ انھوں نے غزل کی جملہ نزاکتوں اور نفاستوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے زبان کی صحت اور بیان کی ندرت کا جو مظاہرہ کیا ہے آرزو لکھنوی کے بعد شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ شبیہ الحسن نے اپنے مقالے کے لیے سید آل رضا کے فنِ غزل گوئی کا موضوع منتخب کر کے بڑا کام کیا ہے جس کی حقیقتاً بہت ضرورت تھی۔ سید شبیہ الحسن نے بلاشبہ اپنے مقالے کو ہر اعتبار سے مکمل اور بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے واقعی بڑی محنت کے ساتھ آل رضا کے حسب نسب، حالاتِ زندگی پر تفصیل سے مواد فراہم کرنے کے بعد ان کے علم و ادراک، ان کی صلاحیتوں اور ان کی غزل کا بالاستیعاب جائزہ لیتے ہوئے نہایت ذہانت کے ساتھ اس کے رنگ، روپ کو نکھارا ہے۔ سید شبیہ الحسن کی یہ کتاب ادب میں ایک اہم اضافہ ہے اور اب اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے رہنمائی کا کام دے گی۔ پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے بجا طور پر شبیہ الحسن کے اس کام کو سراہا ہے۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے دیباچے میں اور سید ہاشم رضا نے جائزے کے عنوان سے بہت تفصیل کے ساتھ سید آل رضا کے فکر و فن پر فاضلانہ روشنی ڈالی ہے۔ کتاب سلیقے سے چھپی ہے۔

——— نکہت بریلوی

حرفے چند
(مقدموں کا مجموعہ)

مصنف: جمیل الدین عالی
صفحات: ۵۲۲ • قیمت: سو روپے
ناشر: انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

جمیل الدین عالی اس دور کی ایک نامی گرامی ادبی شخصیت مانے جاتے ہیں اور ہر کوئی ان کے نام اور کام سے واقف ہے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر وہ فائز رہے اور ۱۹۵۹ء میں جب ایوب خاں کا دورِ حکومت تھا انھوں نے پاکستان رائٹرز گلڈ قائم کیا۔ ایک طویل عرصے تک وہ گلڈ کے سکریٹری اور پھر سکریٹری جنرل رہے۔ انجمن ترقی اردو کو بھی زندہ اور فعال رکھنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے اور اب بھی بہت حد تک اس کے روحِ رواں ہیں۔ گزشتہ چھبیس برس سے ان کا ہفتے وار کالم روزنامہ "جنگ" میں چھپ رہا ہے جس کے گوناگوں موضوعات اہلِ شعور پڑھنے والوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ انھوں نے نثر کی صنف میں بے شمار لکھا ہے مگر بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں۔ شاعری میں دوہے کا فن ان سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ جہاں کہیں جدید ادب میں دوہے کی بات ہوتی ہے پہلا نام عالی کا ہی ذہن میں اُبھرتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ان کے ایک سو چار مقدموں کا مجموعہ ہے جو مصنف نے انجمن کی شائع کردہ علمی، تحقیقی اور ادبی کتابوں کے لیے لکھے۔ ان کے مقدموں سے پچھلے پچیس چھبیس سال میں انجمن کے عالیشان اشاعتی کام کا بھی پتہ ملتا ہے۔ یہ مقدمے سرسری اور رسمی انداز میں نہیں لکھے گئے۔ ان میں سے ہر ایک کی ایک علمی حیثیت ہے اور وہ اصل تصنیف یا تالیف کا کماحقہ تعارف کراتے ہیں۔ یہ کہنا البتہ بعید از انصاف نہ ہوگا کہ مرحوم مولوی عبدالحق کے بیان کا لطف ان میں ڈھونڈھے سے نہیں ملتا۔

یہ کتاب ستھرے دیدہ زیب ٹائپ میں چھپی ہے اور مشفق خواجہ کا سیر حاصل توصیفی مقدمہ بذاتِ خود ایک تنقیدی اور تعارفی شہ پارہ ہے۔ ——— محمد خالد اختر

جگن ناتھ آزاد۔ ایک مطالعہ
(فن اور شخصیت)

مرتب : محمد ایوب واقف
صفحات : ۳۵۴ ۔ قیمت : ۴۵ پینتالیس روپے
ناشر : ماڈرن پبلشرز، نئی دہلی

جگن ناتھ آزاد ایک پُرگو شاعر، شائستہ فکر نثر نگار اور اقبالیات کے شیدائی کی حیثیت سے نہ صرف بر صغیر کی حد تک مشہور و معروف ہیں بلکہ ان کی شہرت اب بر صغیر کی حدود سے باہر مغربی ممالک کے بیشتر ان شہروں تک پہنچ چکی ہے جہاں اردو زبان اور شعر و ادب کا چرچا ہے۔ آزاد کا شمار بلاشبہ ان سدا بہار اہلِ قلم میں نمایاں ہے جو کبھی تھکتے نہیں اور جن کے ہاں تخلیق کے سوتے کبھی نہیں سوکھتے۔ نثر و نظم میں اب تک آزاد کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں شاعری، تنقیدی اور تحقیقی مضامین، سفرنامے اور اقبالیات پر قابلِ قدر تصانیف شامل ہیں۔

جگن ناتھ آزاد اپنی ادبی منزلت اور خدمات کے لیے بجا طور پر اس کے مستحق ہیں کہ ان پر بھرپور کام کیا جائے۔ محمد ایوب واقف نے اس کام کی ابتدا کی ہے۔ انھوں نے شخصیت، شاعری، نثر نگاری، اقبالیات کے عنوانات کے تحت جگن ناتھ آزاد پر لکھے گئے تقریباً تیس مضامین اور پانچ مختلف انٹرویوز مرتب کرکے کتاب شائع کر دی ہے۔ ان مضامین کے لکھنے والوں میں سید احتشام حسین، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر گیان چند، ڈاکٹر قمر رئیس، خواجہ غلام السیدین، رام لال اور ڈاکٹر ملک زادہ منظور وغیرہ شامل ہیں۔

محمد ایوب واقف مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے کام کی بنیاد رکھ دی ہے جو ضروری اور ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ یقیناً اس کے ذریعے جگن ناتھ آزاد اور ان کے فن کو سمجھنے سمجھانے میں خاصی سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ کتاب آئندہ تحقیق

کام کرنے والوں کی بھی رہبری کا فریضہ انجام دے گی۔

——————— نکہت بریلوی

نظام رنگ
(ادبی خاکہ)

مصنّف : ڈاکٹر اسلم فرخی
صفحات : ۱۱۷ ● قیمت : تیس روپے
ناشر : احسن مطبوعات ب ۱۵۵/۵ گلشن اقبال کراچی

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کے بارے میں سیکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور آئندہ بھی شائع ہوتی رہیں گی۔ لیکن بزرگانِ دین، اولیا اللہؒ اور صوفیا کرام کے بارے میں ہمارے ہاں بالعموم بندھے ٹکے پرانے انداز پر ہی کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں اور اب تک اسی ڈگر پر لکھنے والے گامزن ہیں۔ ان میں موضوعی شخصیت کے حالاتِ زندگی، حسب نسب، کرامات اور معجزات کے بیان پر خاص طور پر توجہ مرکوز رکھی جاتی ہے۔ حالانکہ موجودہ سائنسی دور کی نوجوان نسل ان باتوں سے قائل ہوتی ہے نہ دلچسپی لیتی ہے ڈاکٹر اسلم فرخی ہمارے دور کے معتبر محقق اور ہوشمند نقاد ہیں۔ انھوں نے آج کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت عقیدت مندی کے ساتھ بالکل نئی طرز پر حضرت نظام الدین اولیاؒ کا خاکہ رقم کیا ہے۔ اَن دیکھی شخصیت کا خاکہ لکھنا، خاکہ نگاری کے ضمن میں اپنی نوعیت کا پہلا کام کیا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کام کی انجام دہی میں ڈاکٹر اسلم فرخی نے خیالات و تصورات پر انحصار نہیں کیا ہے بلکہ پوری داستان مصدقہ حقائق پر مبنی ہے۔ کوئی واقعہ کوئی صورتِ حال ایسی نہیں ملتی جو مستند نہ ہو۔ زبان کی سادگی اور بیان میں ادبی چاشنی نے "نظام رنگ" کو ہر سطح کے قاری کے لیے دلچسپ، پُراثر اور دلکش بنا دیا ہے۔ کتاب بڑی نفاست کے ساتھ شائع کی گئی ہے اور قیمت مناسب ہے۔

——————— نکہت بریلوی

خوشبو کے جزیرے
(افسانے)

مصنّفہ : شکیلہ رفیق
صفحات : ۱۵۹ ● قیمت : ساٹھ روپے
ناشر : نفیس اکیڈمی، اردو بازار کراچی

افسانہ، اردو ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو اپنی ہیئت اور مواد کے متوازن امتزاج سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ افسانہ روایتی ہو یا علامتی اور تجریدی، اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ افسانہ نگار، کہانی کی ایک کچی پکی شکل کو قصّے کی بنیاد بنا کر تخلیقی ہیئت کا تعین کرتا ہے۔ روایتی اسلوب (CONVENTIONAL PATTERN) میں افسانہ لکھنے والا واضح اور دل نشین انداز میں کہانی کا تانا بانا بنتا چلا جاتا ہے۔ شکیلہ رفیق نے افسانہ نگاری کے لیے اسی واضح اور دل نشین انداز کو اپنایا ہے۔ ان کی کہانیوں کا مابہ الامتیاز وصف یہ ہے کہ وہ روز مرّہ کے واقعات اور عام زندگی کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتی ہیں۔ وہ جو کچھ اپنے آس پاس دیکھتی ہیں اسی کو بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ افسانے کے قالب میں ڈھال لیتی ہیں۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ افسانہ لکھنے کے ڈھنگ سے اچھی طرح واقف ہیں اور یہ فنّی مہارت انھوں نے مسلسل ریاضت سے حاصل کی ہے۔ وہ کوئی نئی لکھنے والی نہیں، برسوں سے لکھ رہی ہیں۔ زیرِ نظر افسانوی مجموعے سے قبل ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "کچھ دیر پہلے نیند سے" منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ اس طرح "خوشبو کے جزیرے" ان کا دوسرا افسانوی انتخاب ہے جس میں تیرہ افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں شکیلہ رفیق نے بڑی سنجیدگی اور فنّی مہارت کے ساتھ ان موضوعات اور سماجی الجھنوں کی نشان دہی کی ہے جو معاشرے کو دیمک بن کر اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہی ہیں۔ ان افسانوں کا بیانیہ انداز اپنے اندر اتنی کشش رکھتا ہے کہ قاری ان افسانوں کو ختم

سکے بغیر کتاب ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتا۔ کتاب کو عالمی شہرت کے مصوّرہ صادقین کے فن پارے سے مزیّن کیا گیا ہے، جس سے اس افسانوی مجموعے کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

——— اکرام بریلوی

خاموش تماشائی

(مزاحیہ مضامین)

مصنّف: ظفر عمر زبیری

صفحات: ۲۰۰ قیمت: تیس روپے

ناشر: عالیہ کتاب محل، بی-۳۹ علامہ اقبال ٹاؤن شمالی ناظم آباد، کراچی ۳۳

پروفیسر یا پرنسپل ظفر عمر زبیری (جن کا پولیس آفیسر اور جاسوسی ناولوں کے شہرۂ آفاق مصنّف مرحوم ظفر عمر بی-اے علیگ سے کوئی تعلق نہیں۔ ماسوا اس کے کہ دونوں نے علی گڑھ میں پڑھا) کراچی کی ایک جانی پہچانی دل آویز شخصیت ہیں۔ ابتدا میں انہوں نے سیاسیات، تاریخ عالم اور تاریخِ اسلام پر چند نہایت سنجیدہ نصابی کتابیں لکھیں (اور اب بھی اس سے باز نہیں آئے)، مگر ان کے اندر ایک نہایت ہی چلبلا، شوخ و شنگ مزاح نگار رونکا بیٹھا تھا جس کو وہ دبا نہ سکے اور جو اس پُرلطف کتاب میں کھل کر سامنے آیا ہے۔

خاموش تماشائی میں باتیں، یادیں، بہریں کے عنوانات کے تحت کل پچیس مضامین ہیں سب کے سب مزے دار، دلچسپ اور پڑھے جانے کے لائق، ان میں سے بیشتر پہلے پہل افکار، فنون، پنچ، اردو ڈائجسٹ میں چھپ چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ایک مدت کے بعد ایک واقعی اچھی مزاح کی کتاب ہمارے ہاتھ آئی ہے اور ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ ظفر عمر زبیری منجھی ہوئی شگفتہ نثر لکھتے ہیں اور ان کے ایک طویل مضمون "یادیں علی گڑھ کی" کو پڑھ کر تو مجھے اپنے محبوب مزاح نگار مرحوم عظیم بیگ چغتائی کے مزاح کی یاد تازہ ہو گئی۔ علی گڑھ کی زندگی کے بارے میں اس سے بڑھ کر شوخ تحریر شاذ ہی میری نظر سے گزری ہو۔ احمد ندیم قاسمی نے ان مضامین کی شگفتگی کو مسحور کن کہا ہے۔ اور میں اس شگفتگی کو جاں بخش کہوں گا۔ ہمارے ادب میں ایک تازہ ہوا کا جھونکا۔

کتابت، طباعت معیاری ہے اور قیمت اتنی ساری مسرت کے لیے بہت ہی کم۔

——— محمد خالد اختر

یارانِ محفل

محفل

(چند خطوط)

رفعت مرتضیٰ

(فلوریڈا)

جولائی کے شمارے میں مجتبیٰ حسین صاحب کا مضمون "گردشِ رنگِ چمن - ایک مطالعہ" اس شمارے کا حاصل ہے۔ تحسین و تنقید سخن شناس کا لطف ہی اور ہوتا ہے۔ جس طرح انھوں نے اس مضمون میں زیرِ تنقید ناول کے ساتھ ساتھ مس حیدر کے دوسرے ناولوں کا جستہ جستہ ذکر اور حوالہ دیتے ہوئے ان کے فن کا احاطہ کیا ہے وہ بجائے خود ایک دلچسپ دستاویز ہے۔ عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ ادیب کے دروازے پر بہت سے قاری اس کا تنقید نگار ہی بھیجتا ہے اور ایک عام قاری کو وہی کتابیں جو وہ پہلے بھی پڑھ چکا ہو۔ ایک بار پھر اٹھانے پر مائل کرتا ہے۔ پروفیسر صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے تنقید نگاری کرتے ہوئے آڑی ٹیڑھی نامانوس اور مستعار ترکیبوں اور ثقیل اور مشکل سے سمجھ میں آنے والے طویل جملوں سے کبھی اپنی تحریر کو محترم بنانے کی کوشش نہیں کی۔ ادب میں زبان و بیان کی خوب صورتی پر اگر انھیں اصرار تھا تو خود ان کی اپنی تحریریں اس کی مثال ہیں۔ یہ مضمون بجائے خود ایک ایسی پرلطف تحریر ہے جس میں مواد اور ہیئت دونوں ہی خوب صورت ہیں۔

امریکہ سے طلعت اشارت کی غزل اور امریکہ ہی سے زاہد سعید زاہد کی غزل، دونوں ہی بہت عمدہ ہیں۔ زاہد صاحب کی پوری غزل لطف لیے سادگی و پرکاری کی خوب صورت مثال ہے ؎

موسموں کی کس طرح دے گا خبر
جو پرندہ ڈال سے اڑتا نہیں

بہت عمدہ!!

کیپٹل ہل دیسے ہی چپ چاپ اور خاموش ہے۔ کوئی ادب دوست نظر نواز ملیوں نہیں۔ کبھی لائبریری جانے کے لیے نکلوں تو نور تھرٹی سکس (۴۳۶) پر کاروں کا ہجوم دس منٹ کے راستے کو گھنٹہ بھر پر پھیلا دیتا ہے۔ ڈزنی ورلڈ کی زیارت کو آئے ٹورسٹوں کا ہجوم ہے جو ڈزنی کی گرانی سے بچنے کے لیے آس پاس کے شہروں میں ٹھکانے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ کبھی لائبریری کے نیلے شیشوں کے اس طرف نظر جائے تو نیچے سڑک پر رینگتے ہوئے کاروں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کوئی ماتمی جلوس جا رہا ہو۔

گرمی کی شدت سے مرجھائے ہوئے چہرے اور کسی معجزے کی امید میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھی گاڑی بان بجائے خود ایک دلدوز نظارہ ہے۔ مگر فلوریڈا بس یہی نہیں۔ آج سے سو برس پہلے تک یہاں کوئی ایسی بات نہ تھی جو کسی تاجر کو، کسی انڈسٹری کو اپنی طرف متوجہ کرتی۔ چند مقامی لوگوں کی ہی محبت اور محنت کا نتیجہ ہے کہ یہ ریاست ایک معمولی ناقابلِ توجہ قطعۂ زمین کے اپیج سے نکل کر اس مقام تک پہنچی جو آج اسے حاصل ہے۔ فلوریڈا اس وقت بھی خوب صورت تھا جب یہاں ابھی ترقی کے قدم نہیں پڑے تھے اور آج بھی خوب صورت۔ ایک اپنے ہی انداز میں یہاں سیکڑوں کی تعداد میں جھیلیں ہیں، پارک ہیں، اور عمدہ پلاننگ ہے جس نے اس کو بجائے خود ایک بڑا پارک بنا دیا ہے۔ اٹلانٹک اور گلف کوسٹ کی کشش ایک MAGNET کی طرح لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بزنس، تجارت اور کامرس کے فروغ سے قطع نظر اس ریاست کے ہر شہر کا ایک اپنا تشخص اور کردار ہے جو خود اپنی جگہ دلچسپ۔ نتیجہ یہ کہ ہر سیاح جو ابن بطوطہ کی روح رکھتا ہو کھنچتا چلا آتا ہے۔

مرتضیٰ اور بچے خیریت سے ہیں۔ ان کی جانب سے آداب و سلام۔

عابد جعفری

(ٹورنٹو۔ کینیڈا)

"افکار" پابندیٔ وقت کے ساتھ مسلسل مل رہا ہے۔ آپ کی محبتوں اور عنایتوں کا بدل اس عہد میں ممکن نہیں۔ ہماری کوئی ادبی محفل آپ اور افکار کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ یہاں کے اہلِ قلم آپ کو یاد کرتے ہیں۔ افکار آپ کی خیریت کی اطلاع ہر مہینے پہنچا دیتا ہے۔ اللہ آپ کو بخیر و عافیت رکھے۔

افکار میں اداجعفری صاحبہ کی خود نوشت مختلف اور متاثر کن ہے۔ مگر ان ساری خود نوشت، تخلیقات کا ایک سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اردو ادب کی تاریخ خود بخود مرتب ہوتی جا رہی ہے اور ہم جیسے ادب کے ادنیٰ طالب علم اس سے استفادہ کرتے جا رہے ہیں۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین کی بے وقت رحلت کی اطلاع ہمارے لیے بڑے دکھ کا سبب بنی۔ محمد علی صدیقی صاحب کا اشاریہ مجتبیٰ حسین صاحب کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ اپنی اس تحریر میں صدیقی صاحب نے جن جذبات کا اظہار فرمایا ہے وہ قابلِ قدر ہیں۔ محمد علی صدیقی صاحب جنھیں ہم علی بھائی کہتے ہیں ایک صاحبِ طرز تنقید نگار ہی نہیں بلکہ ایک پُرخلوص شخصیت کے مالک ہیں۔ دو سال قبل جب میں کراچی گیا تھا تو علی بھائی نے اپنی قیام گاہ پر ایک خوب صورت تقریب کا اہتمام کیا تھا جہاں بہت سے احباب اور بزرگوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ تقریب آج بھی یاد ہے اور علی بھائی کا خلوص بھی۔

اسی طرح اردو کے نامور شاعر نقاش کاظمی نے بھی اپنی قیام گاہ پر ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا جس میں جون ایلیا صاحب، محسن بھوپالی صاحب، زاہدہ حنا صاحبہ، نکہت بریلوی صاحب، راشد نور اور دوسرے بہت سے اہلِ قلم سے ملاقات ہوئی تھی۔ خاص طور پر ناصر زیدی صاحب بڑی محبت سے ملے تھے۔ افسوس کہ یہاں کے ادبی ہنگاموں اور فکرِ روزگار نے اتنی مہلت نہ دی کہ میں ان احباب کو شکرگزاری کے خطوط لکھ پاتا۔ مگر میرا دل ان کے خلوص اور محبتوں کا گواہ ہے۔ امید ہے یہ احباب مجھے اپنی محبتوں میں یاد رکھیں گے۔ جون کے افکار کو کئی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پہلی اہم بات تو یہ ہے کہ

اس میں تابش بھائی کی غزل شامل ہے۔ تابش بھائی امریکہ اور کینیڈا میں قیام کے دوران نئے لکھنے والوں کے دلوں پر عنایتوں اور محبتوں کے ایسے نقش چھوڑ گئے ہیں جو ہمیشہ منوّر رہیں گے اور ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

اختر سعید خاں کی غزل پسند آئی خاص طور پر ؎

اس موسم میں اپنے سوا کیا چاک گریباں کوئی نہیں　　کل تک تو دیوارِ چمن پر لکھے ہوئے تھے نام بہت
سارے قصے مہروفا کے دل سے محو ہوئے لیکن　　جب بھی کوئی کسی سے بچھڑا یاد آیا اک نام بہت

بہت پسند آئے۔

وفا براہی کے اشعار ؎

زمیں سے کیا اگائیں گے وہ سورج　　جو نا واقف ہیں پیغامِ سحر سے
بشارت کون دے کوہِ ندا کی　　کہاں ابھرا کوئی گردِ سفر سے

بڑا اچھا تاثر چھوڑتے ہیں۔ ان اشعار میں تازگی محسوس ہوتی ہے۔

یوسف حسن کے یہ دو اشعار ؎

کسی نے بات نہ پوچھی مرے اجالوں کی　　مری قمیص کا کالر جو بے کلف نکلا
پھر اپنی خاک کی سچائی سر اٹھانے لگی　　پھر ایک لشکرِ اوہام صف بہ صف نکلا

تازہ فکر کے آئینہ دار ہیں۔

ان کے علاوہ جو اشعار بہت پسند آئے وہ یہ ہیں ؎

غیر کی طرح اجنبی بن کر　　عمر بھر اپنے گھر رہا ہوں میں　　(احمد نیاس)
کبھی رکیں گی ہوائیں، کبھی بجھیں گے چراغ　　چلے چلو یہ تماشا تو رات بھر ہوگا　　(اعزاز افضل)
بہت دنوں سے کنارے رکا ہوا پانی　　فصیلِ شہر میں اکثر شگاف کرتا ہے　　(سہیل غازی پوری)
شاخ ٹوٹی تو پوچھتے ہیں لوگ　　شاخ سے گر گئے ثمر کیسے　　(علی احمد قمر)

ان کے علاوہ بھی کئی اچھی غزلیں ہیں۔ غرض یہ کہ غزلوں کا سلیکشن بڑا معیاری ہے۔

نظموں میں منیب الرحمٰن (اجنبی بن کر رہے)، اور حسن حمیدی (تاریخ کی عدالت) بہت پسند آئیں۔ نقاش کاظمی کے "اردو ہائیکو" پسند آئے۔ ماہ طلعت زاہدی کی نظم (حضورِ عدل) مجتبیٰ حسین صاحب کی بے وقت رحلت پر بڑے جذباتی انداز میں کہی گئی ہے۔ افسانوں میں ڈاکٹر فہیم اعظمی کا افسانہ (انکم ٹیکس)، یوسف ناظم کا طنزیہ (خدا یاد آیا) اور کوکب جمیل کا افسانہ (غیر ملکی لڑکی) عمدہ تحریریں ہیں۔ غرض یہ کہ زیرِ نظر شمارہ ہر اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

رائٹرز فورم آف پاکستانی کینیڈینز کی سرگرمیاں حسب دستور جاری ہیں۔ حال ہی میں ہم نے کئی اچھے جلسے منعقد کیے جس میں یہاں کے اہلِ قلم نے بھرپور انداز میں حصہ لیا۔ ان میں مشاعرے، ادبی جلسے اور سیمینار سب ہی کچھ شامل ہیں۔ اسی طرح کینیڈین ایسوسی ایشن آف پاکستانی میڈیا جو کہ صحافیوں کی جماعت ہے کے زیرِ اہتمام بھی کئی ادبی اور ثقافتی جلسے منعقد کیے گئے۔ غرض یہ کہ یہاں کی ادبی سرگرمیاں جاری و ساری ہیں۔

میری جانب سے نکہت بریلوی صاحب اور احباب کو سلام کہیے گا۔

عطا جالندھری

(برمنگھم)

ماہ جولائی کے شمارے میں جناب محسن بھوپالی صاحب کی محبت اور نظرِ عنایت پر شکر گزار ہوں انہوں نے میری افکار کے جون کے شمارے میں مطبوعہ غزل کی پسندیدگی کے اظہار کے ساتھ ساتھ غزل کے دوسرے شعر کے پہلے مصرعے پر میری توجہ مبذول کرائی ہے۔ میرے بھائی دراصل اس مصرعے میں تصحیح کو میں نے "صبح" کے وزن پر ہی باندھا تھا لیکن شمع اور خانہ ویراں کے درمیان کا لفظ "غم" یا تو سہوِ کتابت سے اور یا میری فروگذاشت سے چھپنے سے رہ گیا جس کی وجہ سے یہ ابہام پیدا ہوا۔ اس کو شمع خانہ ویراں کی بجائے شمع غم خانۂ ویراں پڑھا جائے۔ بہرحال محسن صاحب کی اس کرم فرمائی کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

جگن ناتھ آزاد

جموں (کشمیر)

کراچی میں آپ سے ملاقات ہوئی، خوشی ہوئی۔ لیکن آپ کو بیمار دیکھا اس سے دل اداس ہوا۔ خدا آپ کو کامل صحت عطا کرے! آپ محنت بہت کرتے ہیں اپنی صحت کا خیال رکھیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔

جون کا شمارہ علامہ مجتبیٰ حسین مرحوم کے متعلق محمد علی صدیقی کا اداریہ (یا اشاریہ) بہت عمدہ ہے۔ اہم نکات سے لبریز ہے۔ بار بار پڑھنے کی تحریر ہے۔

ڈاکٹر محمود الرحمٰن کا مضمون بھی پسند آیا۔ ماضی کے جھروکوں سے وہ بہت کچھ نکال کے لے آئے ہیں۔ ایک منفرد مضمون ہے۔

ابھی مجتبیٰ حسین پر بہت کچھ لکھا جائے گا۔ میری بھی ان سے دو ملاقاتیں ہوئیں کوئٹہ میں۔ ایک عبدالرزاق خاور کے مکان پر اور دوسری بار یوں کہ میں ان سے ملنے بولان یونیورسٹی گیا۔ بہت دیر ان سے باتیں رہیں۔ وہ تو علم کا سمندر تھے۔

رضا الجبار کی کہانی اپنے ساتھ بہالے گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی ایسے افسانہ نگار موجود ہیں جو کہانی میں کہانی پن کی موجودگی ضروری سمجھتے ہیں۔

امید کہ "گہوارۂ علم و ہنر" کی دو جلدیں موصول ہو گئی ہوں گی۔ آپ کے تبصرہ دیکھنے کا اشتیاق ہے۔

مشفق خواجہ

(کراچی)

ساقی کی نظم "بستا دو ہیجڑا" آٹھ مرتبہ پڑھی۔ پہلی مرتبہ تو میں اس کی نغمگی میں گم ہو گیا۔ الفاظ صرف اصوات کی صورت میں سامنے آئے۔ ایسے گھر دسے لفظوں میں ایسا رس پہلے دیکھنے میں نہیں آیا۔ نظم کے الفاظ آنکھوں کے راستے نہیں، کانوں کے راستے ذہن تک پہنچے۔ دوسری مرتبہ نظم پڑھی تو احساس ہوا جیسے کوئی تصویر دیکھ رہا ہوں "مستانہ" کا سراپا، اس کی مکمل شخصیت آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ تیسری مرتبہ نظم پڑھی تو الفاظ بادل کی طرح چھٹ گئے اور معانی کا سورج طلوع ہوا۔ اس کے بعد یہ نظم مجھ پر اسی طرح اتری جس طرح شاعر پر اتری تھی۔ اس نے مجھے بار بار پڑھنا عجیب نظم ہے کہ پہلا پانچ مصرعے نظم کے مفہوم کے ساتھ ہیں

اشتیاق پیدا کرتے ہیں۔ اس کے بعد پڑھنے والا مسکراتا ہے، ہنستا ہے اور نظم کے خاتمے پر آنکھیں اشکبار ہوجاتی ہیں۔ طربیہ فضا کو یکایک المیہ فضا میں تبدیل کردینا، شاعری نہیں، ماورائے شعر ہے۔ غضب کی نظم ہے۔

فیروز عابد
(کلکتہ)

افکار بہت پابندی سے مل رہا ہے۔ جولائی کا شمارہ آج ہی ملا۔ کہانی کی اشاعت کا بہت بہت شکریہ!
خود نوشت کا یہ سلسلہ خدا کرے ہمیشہ قائم رہے۔ ریسرچ اسکالروں اور ہم جیسے قارئین کے لیے یہ بہت کام کی چیز ہے۔ ادا جعفری صاحبہ کی خود نوشت کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے ابھی تو بات گھر آنگن تک ہے۔ خود نوشت کی اگلی قسطوں میں ہمیں اور بھی بہت کچھ ملے گا۔
اعزاز افضل صاحب کی تصویریں بھیج چکا ہوں۔ جلد ہی ان کی کوئی تازہ تصویر بھیج دوں گا۔ یہ جان کر آپ کو خوشی ہوگی کہ پروفیسر اعزاز افضل کو حکومت مغربی بنگال نے ریاستی پبلک سروس کمیشن کا ممبر مقرر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے نئے عہدے کی ذمے داری قبول کرلی ہے۔

اختر جمال
(اسلام آباد)

افکار پابندی سے مل رہا ہے۔ ادا بہن کی آپ بیتی کا سلسلہ خاص طور سے بہت پسند آیا۔
ان دنوں چھٹیاں ہیں اور آپ کے لیے کوئی چیز لکھوں گی۔ احسن سلام کہتے ہیں۔ گزشتہ ماہ وہ بہت بیمار رہے اب خدا کے فضل سے اچھے ہیں۔

ترسیلِ زر اپنے بینک کے ذریعے کیجئے۔

محفوظ بھی اور باکفایت بھی

فوری ترسیل کے لئے

نیشنل بینک آف پاکستان

کی شاخیں ملک کے قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں میں موجود ہیں۔

اور درج ذیل مرکزوں میں "فیکس" کی سہولت بھی حاصل ہے۔

ان مرکزوں کے درمیان ترسیلِ زر کے سلسلے میں آپ کے ارشاد کی تعمیل پلک جھپکتے میں ہو جاتی ہے۔

DOMESTIC FAX stations and their call numbers.

No.	Station	Number	No.	Station	Number
1)	Islamabad	814987	7)	Peshawar	72553
2)	Lahore	321100	8)	Multan	33570
3)	Gujranwala	41297	9)	Faisalabad	22784
4)	Hyderabad	20168			
5)	H O Karachi	2417697			
6)	Quetta	75205			

FOREIGN FAX stations and their call numbers:

No.	Station	Number	No.	Station	Number
1)	Newyork	004-212-344-8828	7)	Bahrain OBU	00-973-274411 & 244186
2)	London	00-44-1-638-7869	8)	Hongkong	00-852-5-8451703
3)	Knightsbridge	00-44-1-235-4705	9)	Kowloon	00-852-3-691780
4)	Glasgow	00-44-41-331-1081	10)	Tokyo	00-81-3-502-0359
5)	Manchester	00-44-61-835-1049	11)	Seoul	00-82-2-734-5817
6)	Frankfurt	00-49-69-74-8161	12)	Beijing	00-86-1-500-3228

بینک الجزیرہ کی تمام شاخوں میں فیکس کی سہولت موجود ہے۔

ہیڈ آفس، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی پاکستان

ٹیلی فون: ۲۴۳۹۶۸۰-۱۰ لائنز، ۲۴۱۳۰۴۱-۵ لائنز۔ ٹیلیکس: ۲۴۳۴۴-۸۰۷۸-۲۳۶۳۳-۲۳۴۲۳-۰۲۱ این بی پی-پاک

United

PID-1-13/89

افکار

آجکل ڈنٹونک کا بول بالا ہے
بڑوں کا آزمودہ
بچوں کا پسندیدہ
دانتوں کا صحت و زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ڈنٹونک کا اعلیٰ معیار برقرار رکھنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ بہترین
ادویات، ماہرین کی خدمات اور جدید ترین آلات کی مدد سے ہر مرحلے پر ڈنٹونک کی جانچ پڑتال ہماری فرض شناسی کی ایک ایسی
روشن مثال ہے جو کسی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں۔
ALA CHEMICALS P.O.BOX.2110 KARACHI-18

پاکستان ٹوبیکو کمپنی...
سگریٹ کی
میں پیش رو
معیار
مثال
GOLD LEAF
CAPSTAN
20
PAKISTAN TOBACCO
PTC
COMPANY LIMITED

جاری شدہ ——— ۱۹۴۵ء

ٹیلیفون نمبر ——— ۲۱۴۰۷۹

افکار

سال ——— ۴۵ • شمارہ ——— ۲۳۵

——— : مدیر : ———

صہبا لکھنوی

——— نمائندہ اعزازی ———

راشد نور

——— : زرِ سالانہ : ———

پاکستان میں	بیرونی ملکوں سے
۸۰/- روپے معمولی ڈاک سے	۱۵ پونڈ ——— ۲۰ ڈالر
۱۲۰/- روپے رجسٹری سے	ہوائی جہاز سے ۲۰ پونڈ ۴۰ ڈالر

فی شمارہ : آٹھ روپے

زیرِ اہتمام

کراچی

رابسن روڈ نزد اردو بازار

الائیڈ بینک

اقتصادی ترقی میں
سرگرم شریکِ کار

"ساتھیو! وقت آگیا ہے کہ
پاکستان میں معجزے رونما ہوں"

— محترمہ بے نظیر بھٹو

اور پوری قوم کو جس معجزے کا بے چینی کے ساتھ انتظار ہے۔ اسے اقتصادی شعبے میں رونما ہونا ہے ہمارے سارے مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ ہم ایک جست لگا کر آگے بڑھ جائیں۔

الائیڈ بینک ان تمام صنعت کاروں، زراعت پیشہ لوگوں اور تاجروں کو مالی سہولتیں فراہم کرنے کے عہد کا پابند ہے۔ جو ملک کو ہمہ گیر ترقی کی نئی منزلوں تک پہنچانے کی جدوجہد میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔

PID - Islamabad

شعر و حکمت

اکتوبر ۱۹۸۹ء کی تخلیقات

سرپرست: موجد

آج عظیم شاعروں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی ہے!

"سر! ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں"

"سوال کیجیے۔ پوچھیے نہیں"

"اچھا سر! بتلائیے اردو میں کیا صرف تین شاعر رہ گئے ہیں"

"یعنی؟"

"یعنی۔ غالب، اقبال، فیض"

"مطلب کیا ہے تمہارا۔ سمجھا نہیں"

"سر اخباروں میں، رسالوں میں جتنے مضامین چھپتے ہیں ان میں ان تین شاعروں کا ذکر ہوتا ہے"

"اچھا"

"تو پھر آپ ہم لوگوں کو میر، سودا، آتش، انیس، مومن کیوں پڑھاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ تمام شاعر بڑے ہیں، مگر ان کا تو کوئی نام نہیں لیتا۔ آپ کہتے ہیں کہ حسرت سے لے کر فراق تک اردو غزل گوئی کا سب سے بڑا دور گزرا ہے۔ مگر ان شعرا کا ذکر کون کرتا ہے؟"

یہ مکالمہ چلتا رہا اور میں نے درجے میں اس پر گفتگو چھیڑ دی۔ یہ سوال ایک طالب علم نے کیا تھا اور سوال کچھ ایسا بے جا بھی نہیں تھا۔ آج عظیم شاعروں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی ہے۔ یہ بھی عظیم۔ وہ بھی عظیم۔ تنقید میں ہر گروہ اپنے پسندیدہ شعرا کی عظمتوں کے تمغے لگائے ہوئے ہے جو بہت جلد "زنگ آلود" ہو جاتے ہیں۔

ادب کی طرف ویسے بھی توجہ کم ہوتی جا رہی ہے، مگر اس نا قدانہ جود و کرم کی بارش سے ادب کے طلبہ بہت الجھن میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس ناقد کی رائے کو صحیح سمجھیں۔

ایک اور سوال ان کے دماغوں کو پراگندہ کرتا ہے۔ کیا بڑا شاعر صرف اپنے دور میں بڑا ہوتا ہے، اس کے بعد اس کی بڑائی ختم ہو جاتی ہے؟ جیسا میر اپنے دور میں بڑے تھے

اور اب اس دور میں فیض بڑے ہیں، لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب، اقبال اور فیض مختلف ادوار کے شاعر ہیں، ان کا ایک ساتھ نام کیوں لیا جاتا ہے۔ کیا صرف اس لیے کہ اوّل الذکر دو شاعر اپنے اپنے دور میں بڑے تھے یا اس کے نمائندہ تھے اور فیض عہد حاضر کے نمائندہ ہیں۔ باقی اللہ اللہ خیر سلّا۔ سودا، نظیر، میر حسن، مصحفی، آتش، انیس، مومن کوئی قابل ذکر شاعر نہیں ہیں۔ ایک بات اور غالب اور اقبال میں تو خیر لب دیکھیے، فارسی تراکیب اور فلسفیانہ فکر کی وجہ سے کچھ مماثلت پائی جاتی ہے۔ مگر فیض اور ان دونوں شاعروں میں کون سی اور کتنی مماثلت پائی جاتی ہے۔ فیض کی شاعری کے حسن سے انکار نہیں۔ ان کے یہاں دکھ کی آواز جس طرح دھیمے دھیمے سروں میں نوحہ کناں ہے۔ وہ ان کے کسی ہم عصر کے یہاں نہیں ملتی۔ راشد ٹکنیکل اور میکینکل ہیں۔ فکری تصنع کتنے کرتب دکھا سکتا ہے وہ راشد کے یہاں دیکھ لیجیے —— "آدمی سے ڈرتے ہو، آدمی تو ہم بھی ہیں"۔ فیض اس دھندلکے کی سرگوشی ہیں جس سے آج نوعِ انسانی نکلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مسئلہ فیض کی اہمیت سے اختلاف کا نہیں ہے (اور تنقید میں اگر سنجیدگی سے اختلاف کیا بھی جائے تو کوئی ہرج نہیں) بات تنقیدی معیارات کے گڈمڈ ہو جانے کی ہے۔ غالب اور فیض میں کسی قسم کی مزاجی ہم آہنگی نہیں ہے —— قاتل —— جلّاد —— مقتل، دار و رسن کے الفاظ سے یا انسان دوستی کے رجحان سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ یہ الفاظ یا انسان دوستی کس اچھے شاعر کے یہاں نہیں ہے!!! مزید برآں غالب اور اقبال نے بڑے وسیع پیمانے پر شاعری کی ہے۔ فیض کی شاعری میں یہ وسعت یہ توانائی، یہ کائناتی گرفت یا فن کارانہ پختگی نہیں ہے۔ جب غالب یہ کہتا ہے۔

ع کوئی بتاؤ کہ وہ زلف خم بہ خم کیا ہے

یا ع ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یا ع کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے

اور اقبال پوچھتا ہے۔

عالم آب و خاک و باد، سرِّ نہاں ہے تو کہ میں

یا ع مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

یا ع باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں

تو یہ ایک بالکل دوسرے کرّے کی آواز ہے۔ فیض کا یہاں گذر نہیں۔ اُن کے مزاج میں مابعدالطبیعاتی سوالات کی گنجائش نہیں ملتی۔ اسی سلسلے میں ایک بات اور غور طلب ہے وہ یہ کہ دو مختلف مزاج اور مختلف صنف میں کہنے والے شعرا کے مابین کیا تقابل ممکن ہے؟ مثلاً میر حسن اور مصحفی کے مابین "مصحفی غزل گو ہیں اور میر حسن مثنوی نگار"۔ ظاہر سی بات ہے کہ پہلی نظر میں یہ سوال ہی بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ دونوں میں تقابل اور موازنے کا سوال

بمشکل ہی پیدا ہوتا ہے۔ مزاج کا فرق ہے۔ صنف کا فرق ہے۔ طریق کار اور اظہار کا فرق ہے۔ مصحفی کے یہاں ایجاز اور تعمیم کا حُسن ہے جب کہ میر حسن کے یہاں حُسنِ اظہار اور حُسنِ بیان ہے۔ بادی النظر میں جیسا کہ عرض کر چکا دونوں کے مابین کسی قسم کی مماثلت نہیں پائی جاتی ہے لیکن مختلف شعرا کے درمیان خواہ وہ کسی میلانِ طبع یا میدان یا دور کے شاعر ہوں ایک ایک بات دریافت طلب ہے۔ وہ یہ کہ اُن میں قوت شعر گوئی کتنی ہے۔ وہ اپنی شعری جہت میں کتنے بڑے ہیں اور کیا درجہ رکھتے ہیں؟ اکبر الہ آبادی کا میدان اور میلان شعر گوئی بہت مختلف ہے۔ طنز اور مزاح کے شاعر ہیں، لیکن جب ان پر گفتگو کی جائے گی تو صرف انھیں شعرا سے ان کا تقابل نہیں کیا جائے گا جو مزاح یا طنز نگار ہیں۔ وہ اپنی قوت شعر گوئی، قافیہ شناسی اور فن کاری میں اردو کے بڑے شعرا کے زمرے میں ہیں۔ دو مختلف مزاج کے شعرا کے مابین "قوتِ شعر گوئی" کے لحاظ سے تقابل ممکن ہے۔ اس تقابل کے مسئلے پر غور کرتے رہنے سے تنقیدی معیار کے بہت سے فیصلے سچے اور بہت سے جھوٹے ثابت ہو سکتے ہیں۔

بہرحال بات یہ کہنی تھی کہ ہمارے یہاں تنقیدی ماہروں نے کچھ کم "فساد" برپا کیا ہے جو آج اس قسم کے مضامین سے ہمارے طلبا اور اردو شاعری کے پڑھنے والوں کو اور الجھایا جا رہا ہے۔

بات جب غزل کی ہوگی۔ خاص طور سے اس دور کے غزل کی تو حسرت، یگانہ، فانی، اصغر جگر اور فراق کا تذکرہ ناگزیر ہوگا۔ ادھر ادھر سے چند شعر نکال کر واہ واہ کر دینے سے بات نہیں بنتی۔ زیادہ نہیں کوئی دس غزلیں بھی جگر کی طرح کہہ دے تو اہم شعرا میں اس کا شمار ہو سکتا ہے۔

آخر میں ایک بات اور ـــــ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عصرِ حاضر کا شعورِ خاص یا جدید حسیت جگر یا ان کے معاصرین کے یہاں نہیں ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو، لیکن کیا شعورِ خاص اور جدید حسیت کہہ کر ہی شاعری کا کام تمام کیا جا سکتا ہے؟ کیا شاعری میں کوئی عنصر ایسا نہیں ہوتا جو جدید اور قدیم کی دیواروں کو توڑ کر شاعر کو ہر دور میں اہم بناتا ہے۔ میر کی آواز ـــــ غالب کی ہے نہ اقبال کی اور نہ فیض کی۔ ان کے اسلوب میں کچھ "پرانا پن" بھی ہے ـــــ مگر!!

اس "مگر" پر انتہائی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے تاکہ شعرا پر تنقید کرتے ہوئے توازن ہاتھ سے نہ جانے پائے ـــــ اور اس غریب طالب علم نے جو سوال کیا تھا اس کو کوئی تسلی بخش جواب مل سکے۔

ـــــ پروفیسر مجتبیٰ حسین

(مہمان مدیر)

(پروفیسر مجتبیٰ حسین کا تحریر کردہ آخری اشاریہ)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

مرتضیٰ برلاس

اشفاق حسین

پنہاں

بلقیس اعظم النساء
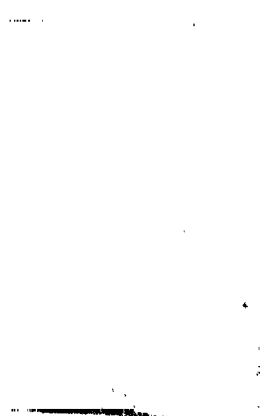
محمود واجد

عابد جعفری

رب نواز مائل

سیّد ثروت حمی

ڈاکٹر صباحت عاصم

ادا جعفری

خود نوشت

(چھٹی قسط)

آئینہ روبرو ہے جو ہر گاں اُٹھائیے

ابھی تک یاد ہے مجھ کو
کہ جب چلنا مرے پیروں نے سیکھا تھا
مرے پیروں میں زنجیریں تھیں
زنجیریں، جنھیں آسائشِ تہذیب اور پازیب کہتے تھے۔

ڈیوڑھی والا پھاٹک کے اندر اسلاف کی بنائی ہوئی ایک خود آشنا اور خود ساختہ دنیا آباد تھی - اس خاندان کی لڑکیاں بڑے بوجھل نصیب قسّامِ ازل سے لے کر آئی تھیں۔ سنا تھا کہ ایک زمانے میں تو اس گھر کی لڑکیوں کا بزرگ خواتین کی معیّت میں اور ہزار پردوں کے ساتھ بھی گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھنا ممنوع تھا۔ کسی رشتے دار کے گھر تک نہیں جاسکتی تھیں۔ برادری کے جو لوگ پھاٹک سے باہر رہتے تھے ان کا آنا جانا رہتا تھا، لیکن گھر کی لڑکیاں صرف ان کی لڑکیوں کے نام سے واقف ہوتیں اور بس۔ صورت آشنا ہونا ممکن نہیں تھا۔ شادی ہو جاتی تو ملاقات ہوتی۔ غیر خاندان کی خواتین جب گھر میں آتیں تو کنواریوں کے لیے ان سے بھی پردہ لازم تھا۔ خواہ کتنی ہی عمر ہو چکی ہو ان کا شمار بہرحال لڑکیوں میں ہوتا۔ صرف نو عمر بچیوں کو آزادی سے سانس لینا نصیب تھا۔ وہ بھی کے دن۔ میں جن دنوں کو یاد کر رہی ہوں اس وقت بھی اس خاندان میں غیر شادی شدہ معمّر خواتین موجود تھیں۔ ایک تو میری اپنی خالہ تھیں۔ جس چہار دیواری کے اندر وہ پیدا ہوئیں وہی ان کی کل کائنات تھی۔ ان آنکھوں نے فصیل نما دیواروں اور آنگن پر تنے ہوئے آسمان کے شامیانے کا ایک محدود ٹکڑا ہی ساری عمر دیکھا۔ پتہ نہیں ان آنکھوں میں کبھی کوئی خواب بھی آیا یا وہ بھی ان کی دسترس سے دور ہی رہا۔ کبھی محرومیوں سے نجات کتابوں کے وسیلے سے بھی مل جاتی ہے۔ ان کے لیے یہ در بھی بند تھا۔

یہ عجیب فیصلے تھے کہ شادی صرف خاندان کے اندر ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے بھی بہت سی شرائط موجود تھیں
ان میں سے ایک کڑی شرط گھر داماد کی تھی۔ زمینوں اور جاگیرداروں والے لوگ تھے۔ وراثت پر عورت کا شرعی حق تسلیم شدہ
تھا لیکن پھر پورے زندگی بھر وہ کوئی حق نہیں رکھتی تھی۔ غیر شادی شدہ خاتون اس معاشرے میں اپنی کوئی رائے، کوئی
حیثیت، کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی جیتی جاگتی زندگی سے دست برداری کا یہ محضر نامہ اَن دیکھی روشنائی سے لکھا لکھایا
دست بہ دست چلا آ رہا تھا۔ وہ تو اس پر اپنے دستخط ثبت کرنے کی بھی مجاز نہیں تھی۔
وہ بی بیاں واقعی چراغِ خانہ تھیں۔ طاق میں رکھے ہوئے دیے کو اپنے ہی اجالے کے لیے کسی اور ہاتھ کا منتظر رہنا
پڑتا ہے کہ جب چاہا جلا لیا جس کو چاہا بجھا دیا اور پھر بجھے ہوئے چراغ کی بساط ہی کیا ہوتی ہے۔ وہ آنسو جو آنکھ سے دل
میں ٹپکا کس نے دیکھا ہے!
اس پھاٹک کے اندر شادی شدہ خواتین کا مقام بھی قابلِ رشک نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بھی اپنی زندگی کا اثبات
اپنے میکے کی روایتوں اور رواجوں پر قربان کرنے پر مجبور تھیں۔ شادی کے بعد بیٹیوں کو رخصت کرنا گوارا نہیں کیا جاتا تھا۔
بے شک داماد کی عزت ہمیشہ کی جاتی اور مدارات بھی۔
ایک عظیم گھرانے کی قدیم روایات کے سامنے اپنا ایک علیحدہ گھر بسانے کی آرزو دم توڑ دیتی ہوگی یا شاید اگلے
وقتوں میں یہ آرزو پیدا ہی نہ ہوتی ہو۔ وہاں تو سامانِ نمود و نمائش، زیور اور قیمتی لباس ہی کو ایک مکمل زندگی کا
درجہ حاصل تھا۔ یہ تمام آسائشیں مہیا ہوتیں۔ خدمت کے لیے خادمائیں موجود تھیں۔ خواتین کی محدود ضروریاتِ زندگی
اسی طریقے سے پوری ہوتیں۔ خریداری کے لیے کپڑوں کے تھان بزاز کی دوکان سے منگوا کر پسند کیے جاتے تھے۔ زیورات
سیٹھ منشی کی نگرانی میں گھر آ جاتے۔ سنار خود ڈیوڑھی میں آ کر زیورات کے ڈیزائن اور نگینوں کے بارے میں ہدایات
حاصل کرتا۔
اس پھاٹک کے اندر بزرگ خواتین کا اپنا ایک دائرہ کار تھا اور وہ اس میں مگن رہتی تھیں۔ گھر اور برادری کے
اندر ان کا مرتبہ مسلّم تھا۔ رشتے داروں میں عزّت حاصل تھی۔ برادری میں کہیں ساس بہو یا نند بھاوج کی چپقلش ہوتی تو
منصفی کے لیے بی بیاں یہیں آتیں اور ان فیصلوں کو قبول بھی کیا جاتا۔ یہ بھی ایک اَن لکھا قانون تھا اور اگلے وقتوں
سے چلا آ رہا تھا۔ غرض ہر کام خاندان کی روایت اور وقار کے مطابق انجام پا رہا تھا اور ایسا نسل در نسل ہوتا چلا آیا تھا۔
خواتین کے لیے دل بہلانے کے اور بھی مشغلے موجود تھے۔ منگنی، شادی، چھٹی چلّے کے علاوہ عقیقہ، بسم اللہ، آمین،
گود بھرائی، کن چھیدن وغیرہ کی تقاریب بڑے اہتمام سے منعقد ہوتیں۔ نائن ہفتوں پہلے گھر گھر بلاوا دینے جاتی۔ تقریب
کی رونق کئی کئی دن رہتی۔ مراثنیں ڈھولک پر گیت گاتیں۔ ولادت کے موقع پر دنوں زچہ گیریاں گائی جاتیں جن کے بول
بہت دلچسپ ہوتے تھے۔
مردوں کے مشاغل اور ان کی دنیا سے الگ یہ زنان خانے کی زندگی تھی۔ محدود اور محفوظ، مسرور و مغموم جس
کے اصول و ضوابط طے شدہ تھے۔ بیٹے جوان ہو جاتے تو ماؤں کو ان کے سامنے لب کشائی کا حوصلہ نہ ہوتا اور شاید پرانے
وقتوں میں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی ہوگی۔ خواتین یہ ہر طور اور بہر حال زمانے کی دست برد سے حصار در حصار

محفوظ و مامون تھیں۔

گرم موسموں کی آندھیوں سے بچاؤ کے لیے ذیلداریں اتنی اونچی کردی گئی تھیں کہ تازہ ہواؤں کا گزر ممکن نہیں رہا تھا۔ دھوپ کی شدت سے محفوظ رکھنے کے لیے دروازے دریچے مقفل ہوئے تو نگاہیں چاندنی کے لمس سے بھی محروم ہوئیں۔ جب تک احساسِ محرومی نہیں تھا زندگی آسان رہی۔ سہل کٹ گئی اور یہی اس صورت حال کا سب سے خوش گوار پہلو تھا

؏ روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

اپنی ہی روایات کے تانے بانے میں جکڑے ہوئے اس گھرانے میں زندگی بسر کرنے کے آداب طے شدہ تھے۔ یہ فیصلے بزرگوں نے کیے تھے جو قرنوں سے بغیر کسی تامل قبول کیے جا رہے تھے، لیکن وقت کی رفتار جاری تھی۔ منظر تبدیل ہو رہے تھے اور لاشعوری طور پر رفتہ رفتہ اس خاندان کی سوچ بھی تغیر قبول کر رہی تھی۔ تاش، پچیسی، گنجفہ وغیرہ سے دلچسپی کم ہو رہی تھی۔ مقدمے بازی اور رعیت پر احکام صادر کرنے کے علاوہ اپنے اختیار اور دوسروں کی مجبوری کے نظارے بھی اپنی کشش کھوتے جا رہے تھے۔

میرے ہوش سنبھالنے تک ٹونک والوں کی محدود دنیا اور بدایوں شہر میں قابلِ فہم تبدیلیاں آچکی تھیں۔ اب یہ برداشت کر لیا گیا تھا کہ لڑکے علی گڑھ جا کر انگریزی تعلیم حاصل کریں، لیکن کسی بھی محکمے میں کسی بھی عہدے پر ملازمت کا تصور اس خاندان کے لیے قطعی ناقابلِ قبول تھا۔ بے شک جائداد موجود تھی لیکن اب سوچتی ہوں کہ اس پر جو فخر و ناز تھا وہ اس جائداد سے کہیں زیادہ تھا۔

لڑکیوں کے لیے اسکول کالج کے تمام دروازے ابھی تک بند تھے۔ خواتین قرآن مجید کے بعد اردو پڑھنا لکھنا سیکھ لیتی تھیں اور ان کے لیے گویا حصولِ علم کے تمام مراحل طے ہو جاتے تھے۔ گھر کے مرد تعلیم یافتہ بھی تھے، وقت کے تقاضوں کو سمجھتے بھی تھے، لیکن جو خاندانی خود ساختہ بے لچک اصول تھے ان کی پاسداری بہرحال فرض تھی۔

بدایوں دل والوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ وہاں کے صوفیا اور علما کے تذکرے موجود رہیں۔ شاعری تو بدایوں کی مٹی میں گندھی ہوئی تھی۔ اس شہر کے ناخواندہ لوگ بھی شعر کی تاثیر سے آشنا تھے۔ شہر میں عام مشاعرے بھی منعقد ہوتے رہتے تھے۔

ٹونک والا پھاٹک کے اندر کبھی کوئی محفلِ مشاعرہ منعقد نہیں ہوئی، لیکن شعر و ادب کا ذوق اس خاندان میں بھی کم نہیں تھا۔ نانا کے پاس ادبی رسائل بھی آتے تھے اور مردانہ کوٹھی میں اہلِ علم اور اہلِ سخن کی دعوتیں بھی ہوتیں۔ دوسرے شہروں سے جو شعرا بدایوں آتے ان کی پذیرائی بہت عزت و تکریم سے کی جاتی۔ مجھے یاد ہے کہ نانا کی کوٹھی میں ساغر نظامی یا جگر مرادآبادی کے ترنم کی لہریں سامعہ نواز ہوتیں تو بی بیاں بند دروازوں کے پیچھے اشعار سننے کے لیے اکٹھی ہو جاتیں۔ ایسے مواقع پر مجھے طیب اور صدیق پر کیا کیا رشک آتا۔ کئی دن تک وہ ان محفلوں کا آنکھوں دیکھا حال سنا سنا کر لڑکیوں کو شدید احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتے۔

بدایوں کے کئی گھرانوں کے مرد رفتہ رفتہ روزگار کے سلسلے میں علی گڑھ، الہ آباد وغیرہ دوسرے شہروں میں مقیم ہوئے تو بلاندی کی نکتہ چیں نگاہوں سے دوری ان کی لڑکیوں کے حق میں نعمت ثابت ہوئی۔ اپنے شہر کے نیم تاریک نیم روشن گھٹے ہوئے ماحول سے نجات ملی تو انھیں لڑکیوں کی تعلیم معیوب نہیں نظر آئی، لیکن ابھی تک ایسے خوش نصیب لوگ بہت کم تھے۔

زندگی کے احکامات کو کچھ مدّت کے لیے ٹالا جا سکتا ہے، لیکن قطعی مسترد کر دینا ممکن ہی نہیں ہے۔ وقت کی بلند آہنگ دستک تو بندی خانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ہوا یہ کہ اندھیروں کی عادی آنکھیں اب دیکھنا سیکھ رہی تھیں۔ حالانکہ یہ آسان نہیں تھا، لیکن اب عورت اپنی زندگی خود بھی جینا چاہتی تھی۔ اس بے جان ہیولے میں شعور کی چنگاری جنم لے چکی تھی۔ یہ صورت حال پہلے سے زیادہ المناک تھی۔

زمانہ بہت بدل چکا تھا، لیکن میرے چھوٹے ماموں جو وکیل تھے اور جائداد وزمین کے بکھیڑوں سے اکتا کر حیدرآباد دکن چلے گئے تھے اور اپنی زندگی اور اپنی مرضی کے مطابق بسر کرنا چاہتے تھے اپنی بیوی اور اکلوتی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جانے پر اب بھی قادر نہیں تھے۔ میری یہ ممانی ایک رشتے سے میری خالہ بھی تھیں اور خاندان کے دستور کے مطابق اپنے میکے کے گھر میں رہتی تھیں۔ ان کی بیٹی زہرہ میری ہم عمر تھی۔ زہرہ بے حد حسّاس، ذہین اور خاموش طبع لڑکی تھی۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ وہ اس بھرے پُرے آسائشوں والے گھر میں کن محرومیوں کا شکار تھی۔ مجھے تو میری ماں نے ڈوبنے سے بچا لیا تھا۔ میرے لیے خوش رہنے اور زندگی سے ہم سخن ہونے کے وسیلے پورے خاندان کی مخالفت مول لے کر بھی فراہم کر دیے تھے۔ زہرہ کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکا کیوں کہ خود اس کی والدہ کو یہ احساس تھا کہ زہرہ کے والد نے پردیس میں ملازمت کا پیشہ اختیار کر کے اس خاندان کے وقار کو زک پہنچائی تھی۔ حالانکہ انھوں نے کالج میں تدریس کے قابلِ قدر شعبے سے وابستگی اختیار کی تھی۔ وہ سال بھر کے بعد ایک مہینے کے لیے بدایوں آتے اور ہر مرتبہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش میں ناکام ہو کر واپس چلے جاتے تھے۔ ادھر ممانی اپنے ہی دکھوں کو بہلانے اور بھلانے میں مصروف و مبتلا رہتیں۔ اُدھر زہرہ اپنے آپ کو ایک عجیب بے پناہ احساسِ کمتری کی لہروں کے سپرد کرتی چلی گئی۔

ممانی سارا سارا دن میز پوش، پلنگ پوش اور تکیے کے غلافوں پر پھول پتیاں کاڑھتی رہتیں۔ ان کپڑوں کو وہ کبھی برت نہ سکیں۔ بے رنگ زندگی میں ریشم کے دھاگوں سے رنگ بھرنے کی کوشش میں صندوق بھرتے چلے گئے۔ بڑے آرزو مند لہجے میں کہا کرتیں:۔

"جب میں تمہارے ماموں کے پاس جا کر رہوں گی تو اپنے گھر کو ہر رنگ کے اصلی اور نقلی پھولوں سے سجا دوں گی"۔

خوش رنگ مخمل پر کچے ریشم یا سنہری روپہلی سلما ستاروں سے کشیدہ کاری کرتیں۔ کبھی کوئی منظر بنتا، کبھی کوئی شعر لکھا ہوتا۔ پھر مخمل کے ان ٹکڑوں کو فریم کرواتیں۔ یہ سب اہتمام وہ اپنے گھر کی آرائش کے لیے کر رہی تھیں۔ وہ گھر جہاں اپنی تمنّاؤں کے مطابق وہ کبھی نہیں جا سکیں۔

اپنے ان بہلاووں کی مصروفیات میں انھیں یہ احساس ہی نہیں ہو سکا کہ امید و بیم کے جس دوراہے پر انھوں نے اپنی جوان ہوتی ہوئی لڑکی کو کھڑا کر دیا ہے وہاں سے اس عمر میں اگر آگے جانے کی راہ نہ ملے تو واپسی کا بھی کوئی راستہ نہیں رہتا۔ امّی بیوہ ہوئیں تو ان کے پاس عہدِ گزشتہ کی بازیافت کا کوئی خواب بھی نہیں رہ گیا تھا۔ انھوں نے اپنی بے آس زندگی کو اپنے بچّوں کی راہوں سے کانٹے چننے کے لیے وقف کر دیا اور میری ممانی کو ان کی امیدوں نے لہو لہان کیا۔

یہ نظم میں نے اسی زمانے میں لکھی تھی ؎

بیزاری

زیست اک خوابِ طرب ناک و فسوں ساز سہی
رس بھرے نغموں کی اک دل نشیں آواز سہی
فرشِ مخمل بھی، زر و سیم کی جھنکار بھی ہے
جنّتِ دید بھی ہے، عشرتِ گفتار بھی ہے
چشمِ سرشار کا اعجاز سہی
زیست اک خوابِ طرب ناک و فسوں ساز سہی
قہر ہے اُف یہ تسلسل، یہ تواتر، یہ جمود
یہ خموشی، یہ تسلّی، یہ گراں بارِ سکوت
شوق کو رخصتِ پرواز نہیں
رفعتِ روح کا در باز نہیں
جسم آسودہ سہی، روح مگر ہے بے تاب
ایک بے نام تغیّر کے لیے
درد کی ٹیس سہی، لذّتِ جاوید نہیں
نغمہ، امید نہیں
قہر ہے اُف یہ تسلسل، یہ تواتر، یہ جمود
سوچتی ہوں کہ کوئی حجلہ، تاریک ہے کیا
یہ گراں بارِ تسلسل
یہ حیاتِ جامد
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کوئی روزن بھی نہیں، کوئی دریچہ بھی نہیں
ایک دنیا ہے کہ ہے تیرہ و محدود و اداس
نور و نکہت سے گریزاں، مہ و انجم سے نفور
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کاش پڑ جائے کہیں ایک خراش ـــــ ایک شگاف
غم کے ہاتھوں ہی سہی
اور بھولے سے کبھی
کوئی آوارہ سی، چنچل سی کرن آنکلے

ایک لمحے کے لیے
میرے تاریک گھروندے میں اجالا ہو جائے۔

میں ان دنوں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پرائیویٹ طور پر دینے کی تیاری کر رہی تھی جب زہرہ اعصابی شکست و ریخت کا شکار ہوئی۔ زہرہ اکلوتی بیٹی تھی۔ ماں باپ کی آرزوؤں اور امیدوں کا آخری ستارہ خلاؤں میں گم ہو رہا تھا اور سب بے بس تھے۔ اسی زمانے میں اس کی منگنی بھی کر دی گئی کہ شاید اس سہارے وہ زندگی کو قبول کر لے اور پھر وہ بیماری دنیا سے گزر گئی۔ اس کے منگیتر کے ساتھ اس کی خالہ زاد بہن کی شادی کر دی گئی۔ یہ ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے۔

برسوں بعد میری یہ ممانی اپنے شوہر کے گھر گئیں لیکن خالی ہاتھ۔ دل بھی خالی تھا کہ اب اس میں اجالے کی کوئی کرن نہیں تھی۔ اس وقت گئیں جب اجازت دینے والے اس دنیا میں نہیں رہے تھے اور کلاہِ خسروی اور نازِ کج کلاہی دونوں پر وقت کی گرد جم چکی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری چند سال انہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ اپنے گھر میں بسر کیے۔

سرکاری ملازمت سے وابستہ تو میرے والد بھی رہے، لیکن ان کا تعلق ذاتی طور پر ٹونک والا پھاٹک کی زندگی سے اتنا قریبی نہیں تھا کہ ان کی ملازمت اس خاندان کے لیے توہین یا ناراضگی کا سبب بنتی۔ لہٰذا امّی کو کبھی کبھی کچھ دن کے لیے ان کے پاس جا کر رہنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ میرے والد خود پھاٹک کے اندر رہنے کے لیے کبھی نہیں آئے۔

یہ وہ ماحول تھا جہاں میں نے شعر کہے اور چھپوائے بھی۔ برِصغیر میں اس قسم کے حالات کم و بیش ہر گھرانے کی خواتین پر گزرے ہیں اور مدتوں۔ صرف زنداں کا طول و عرض مختلف تھا۔ جو خاندان خود اپنی نگاہوں میں جتنا زیادہ معتبر تھا خواتین پر اتنی ہی زیادہ پابندیاں تھیں۔

زر، زمین اور زن تینوں کی حقیقت ایک ہی تھی۔ ملکیت۔ تینوں کا ذکر بھی ایک ہی سانس میں ہوتا رہا ہے۔

جب میری شاعری کی ابتدا ہوئی اسی زمانے میں چند خواتین کا کلام رسائل میں شائع ہو رہا تھا۔ تین نام مجھے یاد ہیں۔ حیا لکھنوی، صفیہ شمیم ملیح آبادی اور نجمہ تصدق حسین۔ اور بھی کئی نام ہوں گے جنھیں بھول گئی ہوں یا جن کا کلام میری نگاہ سے نہیں گزرا تھا۔ صفیہ شمیم سے قیامِ پاکستان کے بعد راولپنڈی میں گاہے گاہے ملاقات ہوئی۔

یہاں اہمیت صرف ناموں کی نہیں۔ اہم بات تو یہ ہے کہ بند لبوں نے جرأتِ سخن کی ـــــ شدید حبس میں سانس لینے کی کاوش، بسیط خلا میں سوچنے کی صلاحیت ـــــ بے شک یہ صدائے احتجاج نہیں تھی، لیکن اہم بات یہی ہے کہ ان تمام خواتین کا تعلق روایتی مشرقی گھر آنگن سے تھا۔

اور میں ـــــ میں اپنی شاعری کو اس ماحول اور اس عصر سے بغاوت کہنا تو چاہتی ہوں، مگر کہہ نہیں سکتی۔ بغاوت اجازت کی تابع نہیں ہوا کرتی۔ مجھے اپنی ماں کی اجازت حاصل تھی۔ شاید یہی احساسِ ممنونیت تھا کہ میں آج تک تھکی نہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ طویل مدت تک عورت کے سفرِ حیات کی داستان پوری دنیا میں کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ مجھے انیسویں صدی کی خواتین کے کچھ اشعار یاد آ رہے ہیں۔ دکھ اپنے اپنے عہد کے حوالے سے ہیں، مگر کتنے جانے پہچانے۔

روس کی شاعرہ کیرولینا پاولووا (KAROLINA PAWLOVA) ۱۸۰۷-۹۳ء کہتی ہے ؎

"مجھے جینے کو صرف آدھی زندگی ملی
مجھے آقا ملا
جب کہ ضرورت ایک دوست کی تھی
صرف شبہ ؟
اور میں کتنی شدّت سے یقین کی آرزومند ہوں
لیکن امید، اعتماد اور محبّت کی قیمت
مجھ پر آشکارا ہو گئی"

فن لینڈ کی شاعرہ لیرن پیراسکی (LARIN PARASKEE) ۱۸۳۳-۱۹۰۴ء کہتی ہے ؎

"کیا مجھے ربِّ کائنات نے بنایا ؟
کیا میں اسی کی تخلیق ہوں ؟"

اور انگلستان کی مشہور ناول نگار اور شاعرہ ایملی برانٹے (EMILY BRONTE) ۱۸۰۸-۴۸ء کہہ رہی تھی ؎

"میں چلوں گی، لیکن پرانے سورماؤں کے نقشِ قدم پر نہیں
اور نہ بلند اخلاقیات کے راستوں پر
اور نہ ان چہروں کے درمیان جن کی شناخت ادھوری ہے
(اور جو گزرے ہوئے زمانوں کی تاریخ کے دھندلے ہیولے ہیں)"

اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی غیر روایتی اور غیر معمولی شاعرہ ایملی ڈکنسن (EMILY DICKINSON) ۱۸۳۰-۸۶ء، جسے شعر کہنے اور جینے کے لیے انیسویں صدی ملی تھی، لیکن جس کے اشعار کو شہرت بیسویں صدی میں حاصل ہوئی۔ سوچ رہی تھی ؎

"میں اتنی بھوکی تھی
کہ میں پیدا ہی نہیں ہو سکی"

(خود نوشت کی نئی قسط بعنوان "روشنی کی لکیر" آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے)

جمیل ملک

روشن لفظوں کا لہو

خون میں ہیں تر بتر لفظوں کے چاند
کون پڑھ سکتا ہے اس تحریر کو
جب تک انسانوں کا خوابیدہ ضمیر
ایک گہرے گھاؤ سے پُرخوں نہ ہو
جانے کب بولے گا یہ روشن لہو
جو امانت ہے کھلے اوراق پر
اس طرح رکھا ہوا ہے طاق پر
منتظر ہے جیسے اس طوفان کا
جب کھُلے گی یوں عدالت راہ میں
لفظ بولیں گے شہادت گاہ میں
جب کھرا کھوٹا جدا ہو جائے گا
کالے لفظوں کی اندھیری رات کا
ختم سارا سلسلہ ہو جائے گا
روشنی کے لفظ جی اُٹھیں گے پھر
اور ایسے دُھل کے نکلے گی فضا
تا ابد پھر خوں نہ ہو گا لفظ کا
جگمگا اٹھیں گے یہ ارض و سما

○

عرفانہ عزیز

نم گرفتہ فصیل

سرشکِ گلگوں کی نم گرفتہ فصیل پر

طیرِ ناصبوری

مآلِ پرواز دیکھتا ہے

کنارِ گل میں گداز دل کا

غموں کا آغاز دیکھتا ہے

نظر کے گلرنگ دائروں میں اسیر ہے

لالہ زارِ ہستی

حیات افروز سرخ بلّور کی ہے مشعل

چراغ آسا ہیں زرد لمحے

درِ فلک سے لہو ہے جاری

گراں ہے دل پر بہار کا حرفِ غمگساری

فضا میں تحلیل ہو رہا ہے

کوئی چمن زار کہر آسا

گلاب یادوں کے کھِل گئے ہیں

فلک کا نیلم پگھل رہا ہے

وفورِ گریہ میں ڈھل رہا ہے

خلاؤں میں گم شدہ زمانہ

نگارِ گیتی سے کہہ رہی ہے کوئی فسانہ

صبا کے خوش رنگ پیرہن کی جمیل خوشبو

ہوئے ہیں طاقِ قمر پہ روشن

وفا کی دیرینہ آرزو کے سفید ابرو

لباسِ ہستی بدل رہے ہیں دمکتے آنسو

ہر ایک سو رقص کر رہے ہیں گزشتہ لمحوں کے سنگریزے

دعا کا چشمہ اُبل رہا ہے

کینیڈا سے۔

○

الیاس عشقی

راگ رنگ

(دوہے)

جو لَے کا رہو راگ کا، جانے سیہ سفید
چھپا نہ اس سے رہ سکے، بول بانٹ کا بھید

رُت بسنت میں پھول یوں اپنی باس لٹائیں
سچّے سُرن کے زمزمے جیسے بکھرتے جائیں

رُت بسنت کی چاندنی، یوں تو ہے بے رنگ
برسائے نَو رنگ جب گائے کوئی سارنگ

کیا کیا من میں بھاؤ نا گھُٹ گھُٹ کر رہ جائے
گذرا راگ کا وقت اور ساز نہیں مل پائے

سچّا سُر اس کو ملے، جس کے اچھّے بھاگ
ویسے اپنی بین پر، اپنا اپنا راگ

ادیب سہیل

کلاشنکوف کلچر

کل کی بات ہے
خوشبو کی پہچان کی خاطر
چاول کے ہم "باسمتی" رکھتے تھے نام
کھیتوں کی مینڈوں سے گزر ہو جاتا تو
اس کے بدن کی خوشبو سے بھرتا تھا ہر شخص مشام

آج عجب طُرفہ ہے حال
کھیتوں کی یہ پریاں جب منڈی میں روپے کھاتی ہیں
کوئی "کلاشنکوف" کوئی "کرنیل دھماکہ"
رکھ دیتا ہے اس کا نام
جس کا تصوّر بھر دیتا ہے ذہنوں میں بارود کی بو
جس کے دھیان سے حُسن کے پَر زرے اُڑتے ہیں شہراہوں پر

جن بچّوں کو علم کی دولت جان سے پیاری ہوتی تھی
اور تفاخر کا سرمایہ
کتب بھری الماری ساری ہوتی تھی
ان بچّوں کے ہاتھ کلاشنکوف پہ ہر پل رہتے ہیں
بات بات پہ اک دوجے کے گھر کا دیا بجھ جاتا ہے

بچّو! تم بلھے[1]، سچل[2]، رحمان[3] کی فکر کے وارث ہو
تم پر فرض ان کی اعلیٰ قدروں کی امانت داری ہے
بچّو! تمھارے ہاتھ کی شوبھا پھول، کتابیں اور قلم
زیب نہیں دیتے ہیں اس میں پیارو، دستی بم

O

---

[1] بلھے شاہ [2] سچل سرمست [3] رحمان بابا

اشفاق حسین

اونچی عمارتوں کے محلّے میں

جہاں میں ہوں
یہ رستہ میں نے تصویروں میں دیکھا تھا
یہ ساتوں رنگ میں ڈوبی ہوئی سڑکیں
اور ان سڑکوں پہ چلتے لوگ
یوں لگتا تھا جیسے
مٹھیوں میں ان کی
خوشحالی کے جگنو قید ہیں
اپنی خوشی سے
ان کے چہرے مسکراتے
روشنی سے
زندگی سے
یہ تصویریں چھپی تھیں پہلی دنیا کے رسالوں میں
میں ان تصویروں کے ہر اک زاویے کو
دیکھتا رہتا تھا حیرت سے
یہ تصویریں سبھی تھیں
میرے خوابوں میں
خیالوں میں
مگر میں آج
اس دنیا میں

اس اونچی عمارت کے محلّے میں
بہت گندے سے اک "سب وے" کے پاس
حیراں کھڑا ہوں
برابر میں مرے
اک زندگی سے خالی چہرے والا فن کار
بجاتا ہے گٹار
میں موسیقی کے فن کی داد دوں
یا اُس کے خالی ہاتھ میں
اپنے پرانے خواب کی تعبیر دے دوں ؟
میں اس کو پہلی دنیا کے رسالوں میں چھپی تصویر دے دوں ؟

(ٹورنٹو سے)

۞

عابد جعفری

اب بھی زندہ ہوں میں

ان ہی اونچی عمارات کی قید میں
عظمتوں کی گواہی میں کل تم جنھیں
تا فلک کھینچ کر لے گئے تھے کہ اب
فنِ تعمیر کی انتہا تم سے ہے

اب بھی زندہ ہوں میں

میرا سارا بدن
سنگ ہائے شکستہ میں پیوست ہے
ان عمارات کی سب چھتیں
فرش سے آملیں
اب تو ہر سمت ملبے کے انبار ہیں
اور اسی گرد کی تہہ میں ساکت پڑا
سانس لیتا ہوں میں
اب بھی چوبِ بدن سے ہے تارِ نفس منسلک
اب بھی آنکھوں میں ٹوٹی ہوئی آس ہے
دوستو! زندہ درگور ہوتا ہوں میں
آؤ ادراکِ تسخیرِ انساں کرو

(ٹورنٹو۔ کینیڈا)

رشید منظر

دو نظمیں

دستک

عجیب رات تھی
ماحول بھی عجیب سا تھا
تھکن سے چور تھا جسم اور دماغ بوجھل تھا
نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی میں سویا تھا
اچانک ایسا لگا جیسے کوئی آیا ہے
سرہانے آ کے کھڑا ہے جگا رہا ہے مجھے
کھلی جو آنکھ تو دیکھا کہ ایسا کچھ بھی نہ تھا
غلط خیال تھا یا میرے دل کی دستک تھی۔

○

خواہشوں کا شجر

خواہشیں دل میں اک شجر کی طرح
شاخ در شاخ پھیل جاتی ہیں
اور پھر آمدِ بہار کے بعد
کونپلیں پھوٹتی ہیں ان میں کئی
گھونسلے شاخ پر لگاتے ہیں
آ کے امید کے پرندے بھی
یہ ہے فصلِ بہار کا قصّہ
آ گئی جب خزاں تو کچھ بھی نہیں
خشک پتّے ہیں جا بجا بکھرے
اور ویرانیوں کا پہرہ ہے
رت بدلنے کی منتظر ہے فضا
ہاں! مگر اس کے باوجود ابھی
ایستادہ ہے خواہشوں کا شجر
جس کے سائے میں جیسے بے پروا
زندگی اب بھی مسکراتی ہے!!

(لندن سے)

رب نواز مائل

اُس کو آواز دوں

اُس کو آواز دوں کس گھڑی
جب سفر ختم ہونے کو ہے
فرق کیا دل جلا یا بُجھا
اُس کو آواز دوں کس گھڑی
خواہشیں سر دتر آئینے کا نشاں
لب سِلے، پاؤں سُن ایسا ہی اک جہاں
اُس کو آواز دوں کس گھڑی
موجۂ نہر کیا کچھ کہے، کب سنوں
الاماں سائے کے بھی جو رہوں

○

نوید جمیل

نایاب

محبّت سے میں ہوں
محبّت سے تو ہے
محبّت سے ارض و سما ہیں
ازل سے ابد تک
سبھی کچھ ہے لیکن
محبّت کی وادی کے وہ بسنے والے
اگر اُن کو دیکھیں
تو ہر سمت خوشبو کی صورت بکھرتے چلے جا رہے ہیں

مگر خود
کہیں بھی نہیں ہیں
کہیں بھی نہیں ہیں ۔

○

Announcing the opening of the first Computer Institute with IBM System/36.

Hands-On is the first computer training institute to install in-house IBM System/36 with multiple terminals. It fulfills the yawning gap which had arisen due to non-availability of personnel trained on mini & mainframe computers. Now you can train for mini & mainframe systems on the world's most popular computers. And can give yourself a career-building advantage.

In the field of micro-computers too Hands-On is pre-emminent. It is the most lavishly equipped institute with a large number of micro-computers. Manned by experienced & qualified teachers with highly innovative approach to training & tutoring.

In this stimulating environment you will find yourself growing by the week, and will discover abilities you never suspected you had.

For details please give us a visit.

Brings out the best in you

11 & 12 F, Dadabhoy Centre, Shara-e-Faisal, Karachi. Phones: 522059 - 526935, Telex: 24434 GAFAR PK.

مرتضیٰ برلاس

کتاب سادہ رہے گی کب تک کہیں تو آغازِ باب ہوگا
جنھوں نے بستی اُجاڑ ڈالی کبھی تو ان کا حساب ہوگا

سحر کی خوشیاں منانے والو سحر کے تیور بتا رہے ہیں
ابھی تو اتنی گھٹن بڑھے گی کہ سانس لینا عذاب ہوگا

وہ دن گئے جب ہر اک ستم کو ادائے محبوب کہہ کے خوش تھے
اٹھی جو اب کوئی اینٹ ہم پر تو اس کا پتھّر جواب ہوگا

سکوتِ صحرا میں بسنے والو ذرا رُتوں کا مزاج سمجھو
جو آج کا دن سکوں سے گذرا تو کل کا موسم خراب ہوگا

نہیں کہ یہ صرف شاعری ہے غزل میں تاریخِ بے حسی ہے
جو آج شعروں میں کہہ رہا ہوں یہ کل شریکِ نصاب ہوگا

○

صابر ظفر

کب ضرورت ہمیں تمہاری نہ تھی
عرض ہم نے مگر گزاری نہ تھی

سو دریچے تھے دل کے، پر تم نے
کوئی سیڑھی اِدھر اتاری نہ تھی

تمہیں ملنا، تمہیں نہیں ملنا
کوئی حالت بھی اختیاری نہ تھی

دہر کی اتنی رنگا رنگی میں
ایک تصویر بھی ہماری نہ تھی

کون سا دن پہاڑ جیسا نہ تھا
کون سی رات ہم پہ بھاری نہ تھی

نین وہ دل کا چین ہوجاتے
اور تو کوئی بے قراری نہ تھی

ہم تری آن پہ نثار نہ ہوں
زندگی ہم کو اتنی پیاری نہ تھی

صبرِ ایوبؑ پر یقیں تھا ظفر
اپنے مسلک میں آہ و زاری نہ تھی

حزیں لدھیانوی

آرزوؤں کا جال اچھا ہے
دیکھنے میں تو حال اچھا ہے
خشک زمینوں کو جو نمو دیں
ان موجوں کا مآل اچھا ہے
دھوپ میں رہ کے جو سائے بانٹے
وہ رستے کا نہال اچھا ہے
اس دھرتی پر بننے والی
خلدِ بریں کا خیال اچھا ہے
جو نہ پنپنے دے پودوں کو
اس چھاؤں کا کال اچھا ہے
سب، ہر سال یہی کہتے ہیں
آنے والا سال اچھا ہے
جس نے کیں جمہور کی باتیں
میرا وہ اقبال اچھا ہے
ذرّے سے کیسے تارا بنے تم
تم ہی کہو، یہ سوال اچھا ہے
ظالم لوگ حزیں کہتے ہیں
شاعر صرف نڈھال اچھا ہے

مظفر حنفی

آدھی رات، کھلی کھڑکی، بے نور مکان، ہوا
پردوں کی چیرہ دستی پر بدا وسان ہوا
تین سپاہی، جیسے لاوارث مُردے، دس مزدور
گھور اندھیرا، پھٹتا بادل، قبرستان، ہوا
گُل بُل گُل دُل امتحان کا کمرہ بچوّں سے
برفیلا موسم، پنچھی، چٹیل میدان، ہوا
اپنا آنگن اپنے پن سے عاری ہو جیسے
جیسے پردیسی کرنیں، جیسے مہمان ہوا
گلشن گلشن سنتے تھے، کل دیکھ لیا جا کر
کچھ مُرجھائی کلیاں، مُٹھّی بھر بے جان ہوا
مٹّی سوندھی ہو جاتی ہے میری قربت سے
میں آوارہ بادل ہوں، میری پہچان ہوا
تنکے کی مانند اُڑا کر پھینکا آج کہاں
یار مظفرؔ کل تک تھی اپنی رتھ بان ہوا

پروفیسر ضیا علیگ

وہ غم جو آنکھ میں پلتے ہیں آنسوؤں کی طرح
ہم ان کا جشن مناتے ہیں رُت جگوں کی طرح

مری وفا کے تقاضے۔ مری انا کے چراغ
مرے خیال میں روشن ہیں جگنوؤں کی طرح

اب ان کا ذکر بھی کرنے سے فائدہ کیا ہے
وہ قربتیں جو نظر آئیں فاصلوں کی طرح

جو ملنے آئے ہو۔ آؤ۔ ملو کھلے دل سے
ہمارے ذہن ہیں شفاف آئینوں کی طرح

چٹک گئے جو بہاروں کے نام پر غنچے
عزیز ہیں وہ ہمیں دل کی دھڑکنوں کی طرح

مزاجِ نکہتِ گل کو ضیا وہ کیا سمجھیں
جو لوگ رنگ بدلتے ہیں موسموں کی طرح

○

اعزاز افضل

دل تھے دلوں میں جذبۂ جہد و عمل نہ تھا
شاخیں ہری بھری تھیں مگر پھول پھل نہ تھا

چہروں پہ دور تک کوئی ردِّ عمل نہ تھا
سر کٹ رہے تھے اور جبینوں پہ بل نہ تھا

موقعے سے جھوٹ بول کے وہ داد لے گیا
میری زباں پہ سچ تھا مگر برمحل نہ تھا

ہم خود ہی چاہتے تھے ذرا دل لگی رہے
غم ایسا مسئلہ تو نہ تھا جس کا حل نہ تھا

اے آگہی یہ کون سی منزل جنوں کی ہے
پہلے ترے دماغ میں اتنا خلل نہ تھا

ہم خود ہی تیرے درد کا سودا نہ کر سکے
کیا تیری بے رخی تھی کہ اس کا بدل نہ تھا

افضل وہ شاعروں کے زمانے بھی یاد ہیں
محفل میں کون تھا جو حریفِ غزل نہ تھا

پنہاں

بلقیس اعظم النساء

شاید وہ مری خاک سے اک شمع بنالے
جب چاہے بجھا دے مجھے جب چاہے جلالے

کچھ اتنی محبت ہے کہ بس اس کا چلے تو
وہ طاق میں گڑیا کی طرح مجھ کو سجالے

جو ریت کی مانند بکھر جاتی ہے اکثر
پتّھر سی وہ اطراف نہ دیوار اٹھالے

ڈرتی ہوں کہ پھیلے نہ کہیں دل میں اندھیرا
رہنے دو مرے ذہن میں کچھ خواب اُجالے

پھر شدّت جذبات سے مغلوب ہے پنہاں
جاں حرف میں ڈھلتی ہو تو کیا دل کو سنبھالے

○

چوتھی سمت قدم اٹھتے تھے لوٹ کے گھر تو جانا تھا
جھوٹا تھا یا سچا قصّہ اُس کو تو دہرانا تھا

پتّھر کھاتے بھوکے پیاسے شہر نا پرساں میں جئیں
یہ تعبیر ہے اس منزل کی جس کا خواب سُہانا تھا

طوق و سلاسل زنداں ہیں اور سوچوں پر بھی پہرے ہیں
میرے جنوں کی بات نہ پوچھو وہ تو ایک بہانا تھا

سینچا لہو سے جس کو ہمیشہ پل میں وہ گلشن بکھرا ہے
اندھی لوٹ میں کون بتائے کس کا کون نشانا تھا

آپ تو اس کو مانیں نہ مانیں لیکن یہی حقیقت ہے
صرف انھیں نے زخم دیے ہیں جن سے کچھ یارانا تھا

کل اعظم کو دیکھا تھا مت پوچھو کہ کس حال میں تھی
اس کا رویہ بدلا بدلا ہر غم سے بیگانا تھا

ڈاکٹر صباحت عاصم

چاند کے سائے مرے گھر میں اٹھا لائی ہے
روشنی کی بھی اندھیروں سے شناسائی ہے
کھو گیا تیرے خیالات میں ایسا جاناں
جشنِ تنہائی میں ہے جشن میں تنہائی ہے
فکر بھی غیر ہوئی دل سے بھی ایمان گیا
ایک چھوٹی سی خطا کی یہ سزا پائی ہے
ہو گیا جیسے مکمل مری ہستی کا خلا
یہ صدا لوٹ کے پھر اپنی طرف آئی ہے
میری تہذیب مجھے روک رہی ہے تجھ سے
تیرا ملنا بھی مرے واسطے رسوائی ہے
اس کو مشکل ہے مرا جاننا عاصم مجھ میں
اس کی آنکھوں سے زیادہ کہیں گہرائی ہے

(لندن سے)

عبدالاحد ساز

یار احباب سے لینے نہ سہارے جانا
دل جو گھبرائے، سمندر کے کنارے جانا
ڈوبتے لمحوں کی تنہائی میں یاد آتا ہے
گرمیٔ بزم کی دھڑکن کو ابھارے جانا
تجھ کو آیا نہ اسیروں کی صدائیں سننا
ہم سے چھوٹا نہ ترے در پہ پکارے جانا
کج روی کیا، کہ گزر جانا ہی ٹھہرا جو مآل
کادِلے، خوش قدمے، بادِ بہارے جانا
ضبط درگاہِ محبت کے قرینوں میں نہیں
گھر آنکھوں میں اُمڈ آئیں تو وارے جانا
ندرتِ فن کا تقاضہ ہے خلا آرائی،
ہوں جہاں چاند نہ سورج نہ ستارے جانا
فن کی جانب ترے سر ہے مگر اک نسل کا فرض
ایک اک حرف اسے سانس اتارے جانا

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

داستانِ ہندباد

تقریباً تیس سال کے بعد ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری افسانوی دنیا میں واپس آئے ہیں۔ انھوں نے اپنے نامکمل افسانے "داستانِ ہندباد" کو نوک پلک سے سنوار کر بطور خاص "افکار" کے لیے عنایت کیا ہے جسے ہم بصد فخر و مسرت پیش کر رہے ہیں۔ اس افسانے کو پڑھتے وقت لگتا ہے یہ سچے واقعات پر مبنی ہے اگرچہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کا اقرار نہیں کیا ہے۔ (صہبا)

مجھے یہ سن کر دلی افسوس ہوا کہ سیف اللہ ہندباد اس دنیا میں نہیں رہے۔ گزشتہ حج کے موقع پر مدینہ منورہ میں ان کا یک بیک انتقال ہو گیا۔ ان کی ذات سے ایک ایسی ناقابلِ فراموش اور ناقابلِ یقین یاد وابستہ ہے کہ اسے قلمبند کیے بنا نہیں رہا جاتا۔

ان سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ شام کے وقت میں گھر میں بیٹھا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ باہر نکل کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نامعلوم شخص مدراسی تہمد باندھے، سر پر جالی دار سفید ٹوپی اوڑھے کاندھے پر چارخانے کا رومال لٹکائے، تنبیہ الغافلین قسم کا عصا تھامے، منہ پر داڑھی کی جھالر لگائے کھڑا ہے۔ وضع قطع اور لب و لہجے سے ہی سمجھ گیا کہ اس کا تعلق جنوبی ہندوستان سے ہے۔ اسے بھی اطمینان ہوا کہ میں وہی شخص ہوں جس کی اسے تلاش ہے۔ میں نے اسے اندر بلا کر پاس بٹھایا اور پوچھا آپ کون ہیں اور کیسے آئے؟

جواب ملا ـــــ "میرا نام سیف اللہ ہندباد ہے۔ مالابار کے شہر کالی کٹ کا رہنے والا ہوں، مصیبت زدہ ہوں، دو بار کوشش کی کہ دفتر میں آپ سے ملوں، لیکن چپراسی نے اجازت نہ دی، مجبوراً گھر پر آپ کو زحمت دینے آ گیا۔ اس جسارت کے لیے معافی خواہ ہوں۔"

میں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا "کوئی مضائقہ نہیں، جو کہنا ہے بے تکلف کہیں۔" میری خندہ پیشانی سے سیف اللہ کو کچھ اطمینان ہوا تو مجھے یوں مخاطب کیا "جناب میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔ میں ایک محتاج مہاجر بلا وجہ تہرا بلی

میں مبتلا ہوں۔ میری داستان بڑی دردناک ہے، لیکن اسے سُن کر کیا کیجیے گا۔ سال بھر کی تگ و دو کے بعد اس قابل ہوا ہوں کہ محنت مزدوری سے اہل و عیال کا پیٹ پال سکوں۔ البتہ بچّوں کی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکا اگر آپ کی توجہ سے ان کے داخلے اور وظیفے کا بندوبست ہو جائے تو عمر بھر احسان مند رہوں گا۔"

اس وقت وزارت تعلیم سے میرا تعلق تھا۔ سیکڑوں مستحق افراد کی ملازمتوں اور وظیفوں کا کارِ خیر میں نے انجام دیا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا "یہ معمولی سی بات ہے آپ خاطر جمع رکھیں، آپ کے بچّوں کی تعلیم کا انتظام ہو جائے گا۔ اب یہ بتلائیں کہ آپ مالابار سے اٹھ کر کراچی کیوں آئے اور بیٹھے بٹھائے یہ پریشانی کیوں مول لی؟"

سیف اللہ نے پہلے تو میرے حق میں دعا کی اور پھر آب دیدہ ہو کر کہا "حضرت میں اپنا حال کسی کو نہیں سناتا کیونکہ سننے والے اسے دیوانے کا افسانہ سمجھتے ہیں۔ یوں تو اس شہر میں بیشتر مہاجر اپنے کو بادشاہوں، نوابوں اور سوداگروں کی اولاد بتلاتے ہیں اور اس لنکا میں جسے دیکھیے باون گز کا ہے، پھر سچ بولنے والا موت مرے یا نہ مرے۔ میری داستان تو ایسی عجیب ہے کہ سب اسے مجذوب کی بڑ سمجھتے ہیں اور میں نے بھی اسے زبان پر لانا چھوڑ دیا۔ آپ کی مہربانی اور اصرار سے حوصلہ ہوا تو خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرتا ہوں۔"

سیف اللہ کی عمر چالیس سال سے زیادہ نہ تھی اور خستہ حالی کے باوجود اس کے انداز سے خلوص اور وقار عیاں تھا۔ کوئی وجہ نہیں کہ میں اسے غلط گو سمجھتا۔ زندگی میں بہتوں کا حال دیکھا اور سنا، لیکن سیف اللہ کی آپ بیتی سب سے نرالی تھی۔ کہنے لگے "جناب والا آپ تو جانتے ہیں کہ مالابار میں جو عرب نسل کے لوگ آباد ہیں وہ "موپلا" کہلاتے ہیں، میں بھی اسی قوم کا فرد ہوں جب کہ میری والدہ عمان کی رہنے والی تھیں اور اس نسبت سے میری مادری زبان عربی ہے۔ ہمارے خاندان کا پیشہ پشتوں سے سوداگری تھا اور میرے والد شیخ کریم اللہ نے کالی کٹ سے سیلون مال درآمد برآمد کر کے خاصی دولت جمع کی اور چین سے بسر کی۔ وہ دین اسلام کے ایسے شیدائی تھے کہ تحریک خلافت کے موقع پر "موپلا" بغاوت میں پیش پیش رہے اور اس کی پاداش میں انگریزوں کے ظلم و ستم سہے۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو "دارالاسلام" میں رہنا چاہیے خواہ وہاں تکلیف میں گزارہ کیوں نہ ہو۔ ہماری زبان میں ضرب المثل ہے کہ "دارالکفر کے حلوے سے دارالاسلام کا خُرما بہتر" اس تربیت کا اثر یہ ہوا کہ میں جوانی میں مسلم لیگ کا سرگرم رکن اور تحریک پاکستان کا علم بردار بن گیا۔ میرے جذبۂ جہاد کو ہمارے خاندانی پیر حضرت کرامت الٰہی نے ایسی ہوا دی کہ والد کے انتقال کے بعد کاروبار کے بجائے میرا زیادہ وقت سیاست کی نذر ہو گیا اور وہ بھی اس طرح کہ جمع پونجی جلسہ جلوسوں کے اہتمام اور لیڈران کرام کی پذیرائی پر صرف ہونے لگی۔ خیر چند سال کے بعد جب پاکستان وجود میں آیا تو ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کالی کٹ کے گلی کوچوں میں ہم نے چراغاں کیا۔ اسلامی پرچم سے در و دیوار کو سجایا، مسجدوں کے طاق بھرے یار و اغیار کو دعوتیں کھلائیں اور شکرانے کی نمازیں ہفتوں مہینوں پڑھیں۔

جب سال دو سال گزر گئے تو پیر و مرشد کرامت الٰہی نے کہا "عزیزو یہ کیسی عجیب بات ہے کہ پاکستان کی خیر خبر ہم تک نہیں پہنچتی اور نہ ہم اس مملکت خداداد کا حال معلوم کرتے ہیں۔ کیا ہماری جد و جہد کا مقصد یہی تھا۔ ہزار میل دور "دارالایمان" کی تشکیل کے بعد کافرستان میں بیٹھے چمڑے اور سوکھی چھالیوں کی تجارت کرتے رہیں۔ یہ رویّہ تو

مشیتِ ایزدی کے منافی ہے۔ اگر تم لوگ مانو تو میں بہ نفسِ نفیس وہاں جا کر حالات کا جائزہ لوں اور لوٹ کر تمھیں آگاہ کروں پھر تم فیصلہ کر سکتے ہو کہ ہجرت میں نفع ہے یا نقصان۔

یہ مشورہ مجھے اور میرے ہم خیالوں کو جی جان سے بھایا اور ہم نے چندہ کر کے اپنے پیر کے سفر کا ایسا انتظام کیا کہ وہ فریضۂ حج ادا کر کے واپسی پر کراچی ٹھہر جائیں۔ یہ ۱۹۵۰ء کا ذکر ہے۔ مرشد رخصت ہوئے اور کوئی چھ ماہ بعد خوش وخرم لوٹے غول در غول ہم ساحلِ سمندر پر ان کے استقبال کے لیے گئے تو کیا دیکھا کہ وہ سر پر جناح کیپ اوڑھے، حجازی چغہ پہنے پاک سرزمین شاد باد کا ترانہ الاپ رہے ہیں۔ بس ہم سمجھ گئے کہ پیر کرامت الٰہی کا سفر کامیاب رہا۔ اس کی تفصیل رات کی دعوت کے بعد انھوں نے کچھ اس طرح سنائی "حمد وثنا اس ربِّ کریم کی جس نے مجھ حقیر کو بیک وقت بیت اللہ اور بیت الاسلام پاکستان کی زیارت سے سرفراز فرمایا۔ حج کا فیض عام تو سب کے لیے جاری ہے اور آپ میں سے چند نے مکّہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا دیدار کیا ہے۔ البتہ اس خطّۂ پاک کی قدم بوسی شاید آپ میں سے کسی نے اب تک نہیں کی۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ یوں سمجھو کہ عروس البلاد ہے۔ یہاں بیک وقت ایک سمندر یعنی تین ندیوں یعنی (۱) حب (۲) لیاری (۳) ملیر کا سنگم ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے کہ ان ندیوں کا پانی خشک ہو گیا اور صرف برسات کے وقت ان میں جوش آتا ہے۔ پہاڑیوں کا قد وقت کے ساتھ کم ہو گیا، لیکن ان کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے اور میوے میں فقط ایک میوہ یعنی کھجور گویا ہم خرما وہم ثواب! اور جانوروں میں فقط ایک اونٹ جو بے روک ٹوک سڑکوں پر دن دہاڑے پھرتا ہے۔ کیا یہ دونوں اسلامی ثقافت کی علامت نہیں ہیں اور سنو جب حاجیوں کا جہاز جس پر میں سوار تھا کراچی کے ساحل پر پہنچا تو "اللہ اکبر" کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ ایک جمِ غفیر نے ہمارا استقبال کیا اور ہر مسافر کو پھولوں کے ہار پہنائے۔ پھر ہمیں حج کیمپ لے گئے اور کئی دن ہماری ضیافت کا انتظام کیا۔ شہر کی سیر کو جب بھی نکلا تو اخوت، مساوات کا عجب تماشا دیکھا۔ لوگ کوٹھیوں میں رہتے ہوں یا جھونپڑیوں میں، بوقتِ نماز بلا تمیز خرد وکلاں ومنصب ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایسا معاشرہ ترتیب دے رہے ہیں کہ اگر امیر اس دنیا میں آرام کریں تو غریب جنّت میں چین کریں۔ کس کی مجال کہ علانیہ شراب نوشی، قمار بازی اور حرام کاری میں ملوث ہو، البتہ جو پس پردہ ان گناہوں کے مرتکب ہوں وہ قہرِ خداوندی سے کب تک بچیں گے۔

پیر کرامت الٰہی نے یہ بھی بتایا کہ اسلام سندھ کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور بارہ سو سال بعد اگر اسی سرزمین کو لوٹ رہا ہے تو یہ اللہ کی مصلحت ہے۔ غرض یہ تقریر ایسی ولولہ انگیز تھی کہ ہم نے ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔ جب شہر میں یہ خبر پھیلی تو ہندو سناسائیوں اور برادری کے بڑے بوڑھوں نے بہت منع کیا۔ سب نے کہا کہ یہاں تو ہر طرح امن و امان ہے۔ نہ کوئی دنگا نہ فساد۔ صدیوں کی جما جمی کو اکھاڑ کر پردیس کیوں جاتے ہو، لیکن ہم نے کسی کی نہ سنی اور جواب دیا کہ ہجرت برحق ہے اور اگر راس نہ آئی تو پھر لوٹ آئیں گے۔ یہ کہہ کر ہم نے رختِ سفر باندھا۔ بیوی بچوں کو ساتھ لیا۔ انٹی میں جتنی رقم چھپا سکتے تھے محفوظ کی اور ہر چہ بادا باد کہہ کر سفینہ سمندر میں ڈال دیا۔

بعد از خرابیٔ بسیار جب سارنگ نے مژدہ سنایا کہ کراچی کا ساحل نظر آ رہا ہے تو ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی بیتابی سے ہم جہاز کے عرشے کی طرف جھپٹے اور سجدے میں گر پڑے۔ جہاز کشاں کشاں کنارے آ لگا اور ہم سب بوریا بستر لیے نیچے اترآئے، لیکن یہ کیا بات تھی کہ نہ تو ہمارے استقبال کے لیے کوئی جمع تھا نہ کوئی شادیانہ بجا رہا تھا اور نہ پھولوں کے

بار کہیں نظر آتے تھے۔ حتیٰ کہ "پیر کرامت الٰہی" جو مہینوں پہلے ہماری پیشوائی کے لیے کراچی پہنچ چکے تھے۔ اس وقت حدِّ نظر سے بھی دور تھے۔ باز پرس کے لیے پولیس اور کسٹم کے عملے کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ اس صورت میں ہماری پریشانی کا اندازہ آپ خوب لگا سکتے ہیں۔ جسے دیکھیے حقارت سے ہمیں دیکھتا اور کہتا "بے چارے مہاجر ہیں خدا ان پر رحم کرے"۔ جب ہم نے انھیں اپنے جوشِ ایمان کا قصہ سنایا تو وہ خوب ہنسے اور فرمایا! "اللہ آپ کو جزائے خیر دے گا۔"

یہ ماجرا دیکھ کر ہم نے دل کو بہلایا کہ شیخ کرامت الٰہی کو ہمارے آنے کی اطلاع نہیں ملی ورنہ کیسے ممکن ہے کہ وہ نہ آتے اور ہمارے استقبال کا معقول انتظام نہ کرتے۔ مناسب یہی ہے کہ کسی مسافر خانے میں قیام کریں۔ پھر انھیں تلاش کر کے بود و باش نیز معاش و روزگار کی صورت نکالیں۔ یہ منصوبہ بنا کر قلیوں سے کہا کہ ہم کسی مسافر خانے میں جانا چاہتے ہیں۔ وہ بولے شہر میں ایک جگہ "مولوی کا مسافر خانہ" کے نام سے مشہور ہے مگر اب وہاں ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔ تم سب کسی ہوٹل میں پڑ رہو تو اچھا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ پوچھا کون سا ہوٹل مناسب ہوگا۔ کسی ہمدرد قلی نے مشورہ دیا کہ تم مالابار سے آئے ہو تو "مالابار ہوٹل" ہی میں فروکش ہو جو کم خرچ بالانشین کے مصداق ہے۔ بالانشین تو کہنے کی بات ہے۔ دراصل یہ لیاری کے زیریں علاقے میں دھوبی گھاٹ کے پاس وقوع پذیر تھا۔ چند بوسیدہ کوٹھریوں کے اس ہوٹل میں افتاں و ہراساں ہم پڑ رہے اور پتھرائی ہوئی آنکھ سے آس پاس کے چٹیل ویرانے کو تکنے لگے۔

ایک دو دن میں جب سفر کی تھکن دور ہوئی تو ہم نے دل کو سمجھایا کہ شکر کرو کہ منزلِ مراد کو پہنچے۔ نیت نیک ہو تو وقت کے ساتھ مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ ہاتھ پاؤں ہلاؤ، لوگوں سے ملو جلو، ایسا بھی کیا ہے۔ کاروبار کی شکل نکل آئے تو سب مسائل حل ہو جائیں گے، لیکن سب سے پہلے شہر کی سیر کرو اور پیر و مرشد کا پتہ چلاؤ۔

یہ تہیہ کر کے ہم آٹھ دس آدمی شہر کی طرف چل پڑے اور اسے ویسا ہی پر رونق پایا جیسے مدراس کو۔ فرق یہ کہ وہاں اہلِ ہنود کی گہما گہمی تھی تو یہاں برادرانِ اسلام کا بول بالا تھا۔ اس نظارے سے طبیعت بشاش ہوئی اور ہم کشاں کشاں اس محلے کی طرف چلے جہاں وزرائے کرام کی کوٹھیاں تھیں ——— سبز پرچم اور ——— پولیس کی گارڈ ——— ان کی نشان دہی کرتی تھیں اور ان کے اطراف درختوں کے ایسے جھرمٹ کہ بے اختیار مالابار کے سبزہ زار یاد آ گئے۔ سوچا کہ لگے ہاتھوں معمارانِ پاکستان سے معانقے کا ثواب حاصل کریں لیکن یا منظہرالعجائب، پولیس کے سنتری نے ڈپٹ کر پوچھا "تم لوگ کون ہو اور غول بنا کر یہاں کیوں آئے ہو! ہم نے مدعا عرض کیا تو وہ بے اعتنائی سے بولا، ایک تو وزیر صاحب کوٹھی پر ہیں نہیں، اور اگر ہوں بھی تو وہ تم سے نہیں ملیں گے۔ جو کہنا ہو وہ وزارت آباد کاری میں ہی جا کر کہو۔ یہ سن کر مجھے طیش آیا اور بولا "ہمیں نہ وزیر سے کچھ مانگنا ہے نہ وزارت سے کچھ لینا ہے۔ ہم تو صرف خلافتِ راشدہ کے جانشینوں کے دیدار کے لیے آئے ہیں۔"

سنتری اس گفتگو کو خاک نہ سمجھا اور چلا کر پکارا "او شیخا آ دیکھ تو سہی یہ کون لوگ ہیں۔ شاید مظاہرہ کرنے آئے ہیں۔"

چاق و چوبند سپاہی شیخا نے آواز لگائی "اے مہاجرو، جانتے نہیں کہ دفعہ ۱۴۴ کے مطابق تمھارا چالان ہو سکتا

ہے، خیریت چاہتے ہو تو چلتے بنو۔"

اس تنبیہہ سے ہم لوگ سہم گئے اور حیران و پریشان واپس چل پڑے۔ دوپہر کی دھوپ میں حی نڈھال ہو رہا تھا اور پیاس سے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ سوچا تھا کہ وزیر کے باغ میں تھوڑی دیر آرام کریں گے اور شربت نہیں تو آبِ خنک سے تو مزدر تواضع ہو گی ——— "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ——" اتنے میں ایک مسجد نظر آئی تو خیال آیا کہ اس میں پناہ لیں اور عصر کی نماز کے بعد بازار کا رخ کریں، لیکن مسجد کے دروازے پر قفل جڑا تھا اور معلوم ہوا کہ نماز کے وقت کھلتا ہے۔

غرض ہر روز اسی قسم کے تماشے دیکھنے میں آتے رہے اور میرے ساتھی بد دل ہونے لگے۔ میں انھیں لاکھ سمجھاتا کہ نوزائیدہ ملک ہے اس میں نظم و ضبط قائم ہوتے کچھ وقت لگے گا۔ یقین محکم رکھو اور ہمت نہ ہارو۔ بس دعا کرو کہ پیر کرامت الٰہی مل جائیں تو ان کی ہدایت مشعلِ راہ کا کام دے گی، لیکن افسوس چند ہفتوں کے انتظار کے بعد یہ آرزو بھی ختم ہو گئی۔ ایک روز "مالابار ہوٹل" والوں نے عجیب واقعہ سنایا۔

ہماری خستہ حالی پر انھیں رحم آیا تو وہ پیر کرامت الٰہی کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے تھے۔ انھیں معلوم ہوا دو ماہ قبل وہ چند پٹھانوں کے ساتھ صوبہ سرحد چلے گئے تھے۔ وہ جگہ ایسی دشوار گزار ہے کہ نہ وہاں ڈاک جاتی ہے اور نہ وہاں کوئی پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ہمارے ہوش اڑ گئے اور میرے بیشتر رفیقوں نے مالابار لوٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارے ویزا کی میعاد ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ان سب نے مجھے بہت سمجھایا کہ دیارِ غیر میں تن تنہا اور بے روزگار کیا کرو گے! ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے جہاں سے آئے تھے وہیں چلے چلو۔ میری بیوی نے بھی منت سماجت کی، لیکن میری غیرت نے قبول نہیں کیا۔ میں کس منہ سے کالی کٹ جا کر کہتا کہ دار الاسلام میں میرے لیے جگہ نہیں تھی اور میرا دعوٰے محض دیوانے کا خواب تھا۔ غرض وہ قافلہ دار الحرب کی طرف پلٹا اور اکیلا میں یہیں رہ پڑا۔ میری جمع پونجی ختم ہونے پر آ گئی اور کسب معاش کا مشکل مسئلہ درپیش ہوا۔ کوئی ہنر مجھے نہ آتا تھا اور تعلیم بھی پرانے انداز کی ہوئی تھی۔ تجارت کا جو تجربہ تھا وہ یہاں کے لیے سود مند نہ تھا۔ ان دقتوں کا جائزہ لے کر ہوٹل والوں نے مشورہ دیا کہ فی الحال بیاری میں سب کی طرح جھونپڑا ڈال لو اور محنت مزدوری کی سوچو۔ آگے اللہ کوئی بہتر صورت نکالے گا۔ میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ کسی نے بندرگاہ لے جا کر حمّال کی جگہ دلا دی۔ قصہ مختصر ایک سال سے دن بھر سامان ڈھو کر حلال کی روزی کماتا اور جھونپڑی میں روکھی سوکھی کھا کر الحمد للہ کرتا ہوں۔ مجھے کوئی شکایت نہیں کیوں کہ میرا ایمان راسخ ہے۔ البتہ میری بیوی اپنی قسمت کو روتی اور اسی فکر میں گھلی جاتی ہے کہ ہمارے تین بچوں کا کیا ہو گا۔ میں اس قابل نہیں کہ ان کی تعلیم کا انتظام کر سکوں اور اسی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

سیٹ اللہ ہندباد کے حالِ زار سے میرا دل بھر آیا اور میں نے ہر طرح کا دلاسا دے کر وعدہ کیا کہ ان کے فرزندوں کی تعلیم کا فوری بندوبست کروں گا۔ اس کے بعد میں نے کہا "گو آپ کی سرگزشت دردناک ہے، لیکن ہزاروں لاکھوں مہاجر اس سے کہیں زیادہ مصیبت سے گزرے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ لوگوں کو آپ کی بات پر یقین نہیں آتا ہے؟" اس سوال پر وہ کچھ جھینپ ہوئے اور جواب دیا "حضرت، آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میرے نام کے ساتھ "ہندباد" کیوں لگا ہوا ہے"

دراصل اس کی وجہِ تسمیہ کی طرف میرا ذہن نہیں گیا تھا۔

سیف اللہ نے تشریح کی "الف لیلہ کی داستان میں سندباد کا قصّہ تو آپ نے ضرور پڑھا اور سنا ہوگا۔ تو پھر آپ کو یاد ہوگا کہ اس کا یار وفادار ہندباد تھا۔ وہی میرے جدّ امجد تھے۔"

یہ سن کر میں کرسی سے اچھل پڑا اور اس کا منہ دیکھنے لگا کہ اچھا خاصا آدمی کس خبط میں مبتلا ہوگیا۔ سیف اللہ کے خبط پر میرا شبہ یقین کی حد تک پہنچ گیا۔ جب اس نے کہا "آپ کو یقین نہ آئے گا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ سندباد کا وارث ابھی باقی ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ سلطانِ اودھ میں گرا۔ عدن کے قریب ایک گمنام جزیرہ "الشمس" کا وہ حاکم ہے اور شیخ "الشمس" کے نام سے معروف ہے۔ اپنے مورث کے چھوڑے ہوئے خزانوں سے وہ مالا مال ہے۔"

سیف اللہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "میں کبھی اس کا تحریری ثبوت پیش کروں گا۔ اس وقت مجھے اجازت دیں۔"

میں نے سیف اللہ کو اگلے ہفتے دفتر میں آنے کی تاکید کی۔ اس دوران میں، میں نے اپنے دوست امتیاز محمد خاں ناظم تعلیم کراچی سے کہہ کر مارش روڈ اسکول میں بچّوں کے داخلے کا پرچہ منگوا لیا۔ اور نسروان جی مہتہ سے تیس روپے ماہوار وظیفے کا وعدہ لے لیا۔ حسنِ اتفاق کہ میرے ایک دوست آدم خاں ان دنوں پورٹ ماسٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے سیف اللہ کو ایک ساحلی جہاز پر "ہیڈ خلاصی" کی جگہ دے دی۔ ہفتے بھر بعد جب سیف اللہ کو میں نے بیک وقت یہ تینوں کاغذ دے دیے تو وہ خوشی سے رو پڑے اور میں بھی آبدیدہ ہوگیا۔

اس واقعے کو بیس سال گزر گئے اور میرے ذہن سے سیف اللہ کی شکل مٹ گئی اور نہ کسی سے ان کا ذکر سنا۔ اس اثنا میں، میں بیشتر پاکستان سے باہر رہا اور یہاں کے لیل و نہار سے بے خبر سا ہو گیا۔ "نکلے وہ میکدے سے تو دنیا بدل گئی"۔ جب جہاں گشتی کا دور ختم کرکے کراچی لوٹا تو عافیت خانہ نشینی میں نظر آئی۔ "تا حریفانِ دغا را بجہاں کم بینم" جن دوستوں کو زمیں کھا گئی یا حالات کا سیلاب بہالے گیا، ان کی یاد کس کس عنوان سے آتی ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ وقت نے کسی اندھی گلی میں لا کھڑا کیا ہے۔ ٹیلی فون پر کوئی پہچانی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے تو حافظہ ماضی کے مدھم خطوط کو مشکل اجاگر کرتا اور اس آواز کو خدوخال عطا کرتا ہے۔ دو سال قبل ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ فون پر کسی نے مجھے پوچھا اور جب میں نے اپنی موجودگی کا اقرار کیا تو یوں مخاطب ہوا "ڈاکٹر صاحب، میں آپ کا دیرینہ احسان مند ہوں۔ معلوم نہیں آپ کو یاد ہوگا یا نہیں۔ مجھے سیف اللہ ہندباد کہتے ہیں۔"

"ہندباد" اس ایک لفظ نے وہ ساری تفصیل یاد دلا دی جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ اس تعلق سے ہی میرا ذہن سندباد، الف لیلیٰ، ہارون الرشید، شہرزاد، اور خدا جانے کہاں کہاں پہنچا۔ میں فرطِ شوق سے بول اٹھا "جی ہاں آپ مجھے خوب یاد ہیں۔ کہیے کیا کرتے اور کہاں رہتے ہیں؟"

سیف اللہ نے جواب دیا "اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میرے حالات بہت بہتر ہیں۔ اور اگر اجازت دیں تو مل کر زبانی سناؤں۔ آپ کی واپسی کی اطلاع حال ہی میں کسی اخبار میں پڑھی تو ملنے کو دل بے چین ہوا۔ آج آپ کا فون نمبر

ملا۔ اگر چہ سمجھا کر کوئی وقت مقرر کریں تو حاضر خدمت ہولوں۔

میں نے گھر کا پتہ سمجھا کر کہا۔ پرسوں شام کو تشریف لائیے اور اتنا تو کہیے کہ آپ ابھی غلامی کے غلامی ہیں یا کچھ بہتری کا سامان ہوا اور رہائش دھوبی گھاٹ میں ہے یا کوئی اور جگہ مل گئی۔

جواب میں فون ایک قہقہے سے گونج اٹھا! "قبلہ آپ کو یقین نہ آئے گا مگر حقیقت یہ ہے میں "ساحل سمندر" پر "قصر الشمس" میں رہتا ہوں جو عرف عام میں "سندباد پیلس" کہلاتا ہے۔ زبانی عرض کروں گا کہ "شیخ" سے میری ملاقات کس طرح ہوئی اور انھوں نے کس طرح مجھے اس محل کا داروغہ مقرر کیا۔

سیف اللہ خدا حافظ کہہ کر خاموش ہو گئے اور میں ہکا بکا ریسیور کو دیکھتا رہ گیا۔ پہلے تو میں نے اسے سیف اللہ کے پاگل پن پر محمول کیا، لیکن جب کسی نے "سندباد پیلس" کے وجود کی تصدیق کی اور اس کے در و دیوار کا نقشہ کھینچا تو میں وسوسے میں پڑ گیا اور بیقراری سے سیف اللہ کی ملاقات کا انتظار کرنے لگا۔ یہ باور کرنا ناممکن تھا کہ سندباد اور ہندباد نے پھر سے "اوتار" لیا ہے یا اس کے وارث بارہ سو سال بعد باقی ہیں۔ دو دن تک میں نے "الف لیلیٰ" کی ورق گردانی کی اور سندباد کے سات سفروں کا حال حرف بہ حرف پڑھ ڈالا، تاکہ سیف اللہ پر بوقت ضرورت جرح کر سکوں۔

دو دن بعد سر شام میں لان میں جا بیٹھا اور ملازم کو دروازے پر تعینات کر دیا کہ اگر کوئی تہبند پوش عصا بردار بزرگ مجھے پوچھتے آئیں تو بلا تامل اندر آنے دے۔ تھوڑی دیر میں ملازم نے خبر کی کہ ایک بڑی سی موٹر سے دو عرب نمودار ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ وردی میں ملبوس ایک نوکر بڑا سا خوان لیے چلا آتا ہے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پیر مرد اور ایک جوان سال دونوں عربی سج دھج بنائے ہاتھوں میں تسبیح کی مالا لیے میری جانب آ رہے ہیں اور ان کے نقش قدم پر ایک سلیقہ مند خدمت گار بڑا سا طشت سر پر رکھے جس پر کلابتو کا خوان پوش ڈھکا ہے، چل رہا ہے۔ بس ایک نظر میں مجھے سیف اللہ کے ترقی درجات کا یقین ہو گیا اور میں ان کے معانقے کے لیے بڑھا تو وہ خوشی سے باغ باغ ہو گئے۔ بار بار کہتے کہ پاکستان میں آپ میرے پہلے سرپرست ہیں اور میں نے دعاؤں میں ہمیشہ آپ کو یاد کیا ہے۔ اپنے فرزند اکبر سلیم اللہ کو ملانے لایا ہوں۔ غرض خیر و عافیت کی رسمی باتوں اور مشروبات کی خاطر تواضع کے بعد میں نے بلا تکلف کہا: "میں نے تماشا گاہ عالم میں بہت کچھ دیکھا، اور سنا، لیکن آپ کی سرگزشت سب سے نرالی ہے۔ اگر فرصت ہو اور مناسب سمجھیں تو سنائیں کہ پچھلی ملاقات کے بعد آپ کی زندگی میں یہ خوش آیند تبدیلی کیسے ہوئی؟"

یہ مقولہ کہ "حقیقت افسانے سے زیادہ عجیب ہوتی ہے" سیف اللہ ہندباد کی رام کہانی سے سچ ثابت ہو گیا۔

آپ کی توجہ سے جب میں "بیڈ غلامی" بن گیا اور تینوں لڑکوں کی تعلیم کا انتظام ہو گیا تو میں نے "السید"
پر کرانے کا گھر لے لیا اور کوئی دس سال مہر و شکر کے ساتھ وقت گزار دیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۲ء کا آغاز ہوا اور
بلکہ میری قسمت کا ستارہ چمکا۔ میں حسب معمول صبح کے وقت کہاں سے پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کسی شاہی مہمان
کے استقبال کا [illegible] زنجیروں کے پہرے، پولیس کی گارد، نیوی کا بینڈ، افسروں کی قطاریں یعنی وہ منظر

جس کی آرزو نادانی میں میں نے پاکستان آتے وقت کی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ "جزیرۃ الشمس" کے سلطان کی آمد آمد ہے اور ان کا خوب صورت جہاز لنگر انداز ہو چکا ہے۔ ایک کان نے یہ مژدہ سنا اور دوسرے میں آوازِ غیب آئی کہ لے تیری آزمائش کا وقت ختم ہوا۔ جس سندباد کی تجھے تلاش تھی وہ بالآخر خود منظرِ عام پر آ گیا جس طرح ہو اس سے تعارف پیدا کر تاکہ تیری نحوست کا دور ختم ہو اور مراد دل بر آئے۔

اتنے میں سلامی کی توپیں دغیں اور پاکستان کا قومی ترانہ بجنے لگا اور ایک پُر وقار جواں مرد اطلس و کم خواب کی قبا اوڑھے دستار میں الماس و عقیق کے گوشے لپیٹے، ایک ہاتھ میں شکرا اور دوسرے میں طلائی تلوار لیے نمودار ہوا اور اس کے ارد گرد عرب شیوخ اور مسلح سپاہیوں کا غول ہٹو بچو کا شور مچاتا رواں دواں تھا یہ تماشا دیکھ کر پہلے تو میں کچھ سہما، لیکن پھر کچھ سوچا کہ اپنی مادری زبان عربی سے کام لینے کا یہی موقع ہے چنانچہ میں نے بآوازِ بلند کسی عربی قصیدے کا ایک شعر پڑھا اور یا حبیبی مرحبا کہا جس سے خوش آمدید کا مفہوم نکلتا تھا اسے سن کر شیخ اور اس کے حواری تعجب سے میری طرف متوجہ ہوئے۔ شاید انھیں مجھ پر کسی مجذوب کا گمان ہوا۔ پاکستانی محافظین نے میرا منھ بند کرنے کی کوشش کی لیکن میں باز نہ آیا اور پکار کر عربی میں بولا کہ "اے شیخ الکبیر میں تیرے دیدار کے سوا اور کسی چیز کا طالب نہیں، وہ بھی اس لیے کہ تیرے جدِ امجد ثابت بن ہاشم سندی المعروف سندباد اور میرے مورثِ اعلیٰ رفیق بن امیر المعروف "ہندباد" قریبی دوست تھے۔ اس تقریر نے شیخ کو لمحے بھر کے لیے متحیر کر دیا اور اس نے اپنے افسرِ خاص سے آہستہ سے کچھ کہا۔ اس نے مجھے ساتھ ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور جب یہ جلوس موٹروں پر سوار ہونے لگا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ تو نے جو دعویٰ کیا اس کا کوئی ثبوت بھی ہے جب میں نے بڑے اعتماد سے اس امر کا اقرار کیا تو اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس پر کوئی تاریخ اور وقت درج کر دیا اور حکم دیا کہ "تم اس نشانی کے مطابق "قصر الشمس عرف سندباد پیلس" پہنچو۔ میں اس مژدہ کو ذہن نشین کر کے خدائے پاک کا شکر ادا کرتا اپنے گھر لوٹ آیا۔ جیسے ہی بیوی کو یہ ماجرا سنایا تو وہ خوشی سے نہال ہو گئی اور پھر اس سوچ میں پڑ گئی کہ محل میں حاضری کے لیے۔ سب لباس کہاں سے میسر ہوگا۔ بہر صورت تاریخِ مقررہ تک یہ مشکل کسی طرح آسان ہوئی اور وہ بھی یوں کہ کسی تازہ وارد حاجی سے میں نے عربی وضع قطع کے کچھ کپڑے مستعار لیے اور پھر وہ قدیمی "فرلیطہ"، جو ہزار سال سے پشت در پشت میرے اجداد سینے سے لگائے چلے آتے تھے صندوقچے سے نکالا۔ اسی میں وہ راز سربستہ تھا۔ جسے دکھا کر شیخ جزیرۃ الشمس" کو اپنے دعوے کی صداقت کا یقین دلا سکتا تھا۔ جمعہ کا مبارک دن تھا۔ جب میں صبح صبح بس پہ بیٹھ کر ساحل سمندر کے قریب اس جگہ پہنچا جہاں سے "سندباد پیلس" کا گنبد نظر آتا تھا۔ خراماں خراماں اس طرف چلتے ہوئے میں دل ہی دل میں "نصر من اللہ" کا ورد کر رہا تھا۔ محل کے قریب کھڑے ہو کر میں حیرت سے اس کے طول و عرض کا اندازہ لگانے لگا کیوں کہ ایسی عالی شان عمارت میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے چاروں کونوں میں معمار نے [illegible] بنائی تھیں جن میں پہریدار شب و روز تعینات رہتے تھے۔ صدر دروازے پر سنتریوں کے پہرے آنے جانے والوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ حالانکہ میں نے مصلحتاً ان سے عربی میں گفتگو کی اور شیخ کے مصاحب کا کارڈ دکھایا، لیکن انھوں نے کچھ نہ سنی اور مجھے اوروں کے ساتھ سڑک کے ایک کنارے کھڑا کر دیا۔ بڑی مشکل محل کے ایک ملازم نے آسان کی جسے میں نے اپنا ماجرا سنا

داستانِ ہندباد

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

تو وہ اندر سے داخلے کا اجازت نامہ لے آیا اور اس طرح میں اس ایوان میں داخل ہوا جسے طلسمِ ہوشربا کہوں تو مبالغہ
نہ ہوگا۔ اس ریگ زار میں خدا جانے کہاں سے سرو صنوبر اور شمشاد و گل مہر کے درخت قطار در قطار حوضوں
اور فواروں کے اردگرد سایہ فگن تھے۔ انواع و اقسام کے پرندوں کے نغموں سے محل کے در و دیوار گونج رہے
تھے۔ ملازم کے نقشِ قدم پر میں حق حیران پرپیچ روشوں سے گزر کر جب محل کی بارہ دری تک پہنچا تو دربان نے
مجھے روکا اور کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد لوٹ کر مجھے ایک دروازے میں جانے کا اشارہ کیا۔ وہاں "افسرِ
خاص" میرا منتظر تھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ میں وہ "آبائی فریطہ" ہمراہ لایا ہوں تو وہ دالان در دالان ایک
کمرے تک مجھے لایا جو بظاہر "شیخ الشمس" کا دیوانِ خاص تھا۔ میں عالمِ حیرت میں اس کے نقش و نگار کا نظارہ کر رہا تھا کہ
پردہ ہٹا اور شیخ چند مصاحبوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ میں نے جھک کر کورنش بجا لائی اور دست بستہ کھڑا ہو گیا۔
کیوں کہ شیخ کو میری عربی دانی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے اسی زبان میں ہم کلام ہوا۔ اس کے سوال کے جواب
میں میں نے عرض کیا۔ اس سے قبل کہ آپ اس فریطے کو ملاحظہ کریں۔ میں اختصار سے اس کی تاریخ بیان کرنے کی اجازت چاہوں گا"
اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ تیرھویں صدی میں آپ کے مورثِ اعلیٰ "سندباد" کی حیثیت بغداد میں ملک التجار کی تھی اور
میرے جدِ امجد "ہندباد" ان کے معتبر گماشتے کی حیثیت سے اکثر ہندوستان، سیلون وغیرہ سے جہازوں پر سامان لاتے لے جاتے
تھے۔ کون ایسا ہوگا جس نے "سندباد" کا ذکر الف لیلیٰ کی داستان میں نہ پڑھا ہوگا۔ اس نسبت سے "ہندباد" کا نام بھی
ان کے لیے غیر مانوس نہ ہوگا۔ ان کی زندگی نہایت عزت و آرام سے گزر رہی تھی کہ ناگہانی "ہلاکو" عذابِ الٰہی بن کر
بغداد کی طرف بڑھا اور ان سب کو مکان و سامان چھوڑ کر اہل و عیال کے ساتھ کشتیوں پر بیٹھ کر وہاں سے جان
بچانے کے لیے فرار پر مجبور ہونا پڑا۔ "سندباد" نے فیصلہ کیا کہ جب تک یہ فتنہ فرو نہ ہو جائے وہ سب ان کے جزیرۂ
خاص "الشمس" میں پناہ گزیں ہوں جہاں انھوں نے اپنا نہایت بیش بہا خزانہ چھپا رکھا تھا۔ تب سے لے کر اب تک
آپ کا خاندان وہیں مقیم ہے بلکہ مصر کے "مملوک" سلطانوں نے اس جزیرے پر "سندباد" کے وارثوں کی ملکیت تسلیم
کر لی تھی۔ چند سال بعد "سندباد" نے اپنے رفیق "ہندباد" کو ہدایت کی کہ وہ ہندوستان کے اطراف کسی مناسب جگہ کو اپنا
مستقر بنالے اور تجارت کا سلسلہ پھر سے شروع کرے۔ گماشتہ نامے کی سند جو "ہندباد" کو عطا کی وہ میرے خاندان
میں محفوظ رہا اور گو مالابار سے کراچی ہجرت کرتے وقت میں نے سب کچھ چھوڑ دیا، لیکن اسے ساتھ لانا نہ بھولا۔ آپ اس
فریطے کو ملاحظہ کر کے میرے قول کی صداقت کا اطمینان فرما لیں۔ شیخ میری گفتگو کو بڑی حیرانی اور دلچسپی سے سن رہا
پھر اس نے اس فریطے پر نظر ڈالی جو دراصل ہرن کی کھال پر خطِ کوفی میں چند سطری تحریر پر مشتمل تھا۔ اس کے نیچے
"ثابت بن ہاشم سندی المعروف بہ سندباد" کی مہر ثبت تھی۔ گو کہ کھال جگہ جگہ سے سکڑ گئی تھی اور روشنائی کی سیاہی مدھم
پڑ گئی تھی، تاہم ملک کی [illegible] اور کافور کے سفوف سے اسے تا ایں دم محفوظ کر رکھا تھا۔" شیخ اور اس کے منشی دیر تک
اس تحریر کا معائنہ [illegible] سے دوچار رہے۔ دیر تک وہ "اللہ اللہ" کی صدائیں بلند
کرتے رہے۔ پھر [illegible] سے بغلگیر ہوا۔ اس نے پوچھا "اے عزیز اس میں کوئی شک نہیں
کہ تم "ہندباد" کا وارث حقیقی ہے اور یہ ملاقات بھی عجیب ہے کہ میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا اور اس خاندانی

تعلق کا حق ادا کروں گا۔ اب یہ بتا کہ "ہندباد" میرے مورثِ اعلیٰ سے جدا ہو کر کہاں آباد ہوئے اور تو یہاں تک کیسے پہنچا۔
میں صرف یہ بتا سکا کہ خاندانی روایت کے مطابق "ہندباد" پہلے "جزیرہ مالدیپ" میں سکونت پذیر ہوا کیوں کہ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں اس امر کا ذکر کیا ہے، پھر خدا جانے کیوں وہ مالابار کے شہر کالی کٹ میں آبسا جہاں عرب تاجروں کا خاصا بڑا مرکز تھا۔ اس کے جانشین ابھی وہاں موجود ہیں اور "موپلا" کہلاتے ہیں۔ پھر میں نے "کالی کٹ" سے کراچی آنے کی تفصیل سنائی اور اپنی خستہ حالی کی روداد ایسے مؤثر اور پُرسوز انداز میں بیان کی کہ وہ آب دیدہ ہو گیا۔ اپنے کارپردازوں سے کچھ دیر مشورے کے بعد شیخ نے مجھ سے کہا کہ سیف اللہ اگر تم چاہو تو خلاصی کی ملازمت چھوڑ کر میرے داروغۂ محل کے نائب کا عہدہ قبول کر لو۔ داروغۂ محل تمھارے فرائض نیز ماہانہ مشاہرے کی تفصیل بتا دے گا۔ تمھارا فرزند اکبر سلیم اللہ کراچی میں ہمارے قونصل خانے سے وابستہ کیا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم دونوں اپنی خدمات بحسن و خوبی انجام دو گے۔ اس طرح ہمارا آبائی تعلق آئندہ بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔ انشاء اللہ۔" شیخ کا شکریہ ادا کرتے کرتے میری زبان سوکھ گئی اور گھر واپس آ کر میں اللہ کے حضور دیر تک شکرانے کی نماز ادا کرتا رہا۔

"الغرض گزشتہ دس سال سے میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ ایسے عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہا ہوں جس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شیخ یا اس کے اقارب گاہے گاہے محل کو رونق بخشتے ہیں لیکن ان کے انتظار میں پچاسوں نوکر چاکر ہمہ تن در و دالان اور باغات کی درستی و صفائی میں مصروف رہتے ہیں۔ آٹھ دس موٹریں کیل کانٹے سے درست ڈرائیوروں کے اشارے کی منتظر رہتی ہیں۔

میں صبح سے شام تک ان سب کی کارکردگی پر نظر رکھتا ہوں اور یہی طریقہ میرے فرزند کا ہے جو قونصل کے حکم پر سودا سلف کا انبار بازار سے خرید کر ان جہازوں کو مہیا کرتا ہے جو کبھی کبھی "جزیرۃ الشمس" جاتے ہیں۔ مجھے بھی ایک دو بار وہاں کی زیارت کا موقع ملا۔ اگر اسے جنّت نظیر کہوں تو مبالغہ نہ جانیے گا کیوں کہ "عدن" تو محض ریگ زار ہے ورنہ درحقیقت "باغِ عدن" تو یہی "جزیرۃ الشمس" ہے۔ زمانۂ قدیم سے اس علاقے میں یہ روایت مشہور ہے کہ فردوس سے ترکِ وطن کے بعد "آدم و حوا" نے یہیں سکونت اختیار کی تھی۔ واللہ اعلم۔" مالابار سے چلتے وقت کراچی کے متعلق ہم نے جس جنت کا خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر "جزیرۃ الشمس" میں نظر آئی۔

میرے لیے سیف اللہ کی گفتگو کو افیونی کی ترنگ سمجھنا مشکل تھا کیوں کہ زرق برق وردی میں ملبوس خوان بردار اور دروازے کے باہر کھڑی ہوئی لمبی قیمتی موٹر سیف اللہ کے ترقیٔ درجات کی بیانگِ دہل شہادت دے رہی تھی۔ سلام و کلام کا یہ طویل سلسلہ جب ختم ہونے کو آیا میں نے سیف اللہ کو اس کی خوش حالی پر مبارک باد دی تو اس نے طلائی جیب گھڑی پر نظر ڈال کر رخصت کی اجازت چاہی۔ اس وقت میرا ذہن یکایک پیر کرامت الٰہی کی طرف گیا جن کا ذکر اس دوران آیا ہی نہیں تھا، چنانچہ میں نے پوچھا کہ جانے سے پہلے اپنے پیر کا کچھ احوال تو سناتے جائیں کہ انھیں پاکستان کی زمین کھا گئی یا ان سے پھر کبھی ملاقات کا موقع ملا۔ اس سوال پر سیف اللہ نے زور کا قہقہہ لگایا اور پھر ان کی جو کہانی سنائی وہ ان کی اپنی "آپ بیتی" سے کم تعجب انگیز و دلچسپ نہ تھی۔

بیس سال قبل جب پیر کرامت الٰہی کراچی میں اپنے مریدوں کی مالابار سے آمد کا انتظار کرتے کرتے اوبھ گئے تو

ھوں نے گرد مندر کے قریب ایک حجرہ تلاش کیا اور وقت گزاری کے لیے ہر شام وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع کیا۔
ب تو اس علاقے میں پٹھانوں کی اتنی آبادی ہو گئی ہے کہ وہ انھیں کے نام سے موسوم ہے لیکن پہلے ان کی تعداد وہاں کم
ی ان میں سے خال خال کرامت الٰہی کی محفل میں شریک ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی خوش بیانی کا ایسا چرچا ہوا کہ سامعین
ے ٹھٹھ لگ گئے۔ ایک بار ان میں سے کچھ نے کرامت الٰہی کو بتایا کہ وہ چند ماہ کے لیے اپنے گاؤں جا رہے ہیں جو
بالاکوٹ" سے تھوڑی دور ہے۔ یہ سن کر کرامت الٰہی چونکے اور ان سے پوچھا کہ کیا وہ اس امر سے واقف ہیں کہ وہاں
سید احمد شہید" اور ان کے رفقا دفن ہیں۔ پٹھانوں نے جب اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو پیر کرامت الٰہی نے ان کو بڑی
لامت کی کہ اے نادانو! تم نہیں جانتے کہ سوا سو سال قبل جب سکھوں نے تمھاری سرزمین پر قبضہ کر کے تمھارے اجداد
ظلم و ستم ڈھائے تو ہندوستان سے حضرت سید احمد مجاہدوں کا لشکر لے کر تمھارے وطن کی آزادی اور اسلامی مملکت
کے قیام کی خاطر بڑی صعوبتیں جھیل کر وہاں پہنچے۔ سالہا سال انھوں نے بڑی جوانمردی سے سکھ جابروں سے نبرد آزمائی
ی، لیکن فتح حاصل نہ کر سکے اور "بالاکوٹ" کے معرکے میں شہید ہو کر وہیں کے قبرستان میں اپنے رفقا کے ساتھ ابدی نیند
سو رہے ہیں۔" یہ تقریر سن کر پٹھان حیرت زدہ رہ گئے اور اپنی رہائش گاہ میں رات کو دیر تک بیٹھ کر اس ماجرے پر بحث کرتے
رہے کیوں کہ بعض کو کرامت الٰہی کی بات پر یقین تک نہ آیا۔ بالآخر دوسرے دن وہ ایک وفد لے کر ان کی خدمت میں حاضر
ہوئے اور کہا اے بزرگ کیا اچھا ہو کہ آپ ہمارے ساتھ بالاکوٹ کی طرف چلیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ کراچی کے
مقابلے میں وہ خطہ کیسا سرسبز و جانفزا ہے۔ آپ کے طفیل ہمیں بھی ان شہیدوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت نصیب
ہو جائے گی۔ اس دعوت کو قبول کرنے میں انھیں کوئی پس و پیش نہ ہوا کیوں کہ اس دور دراز علاقے کی سیر کا اس سے
بہتر اور کون سا موقع فراہم ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی انھوں نے حامی بھری، آٹھ دس جوان بصد شوق ریل گاڑی کا ٹکٹ لے
آئے۔ بعد ازاں انھوں نے چندہ کر کے زادِ سفر تیار کیا جس میں بستر کے علاوہ رہنے کے لیے ایسی پوشش کا بھی انتظام تھا جو وہاں
کے موسم کے لیے موزوں تھی۔ پھر وہ دن بھی آیا جب ایک جلوس کی شکل میں وہ پیر کرامت الٰہی کو کراچی چھاؤنی کے اسٹیشن
لے گئے اور پشاور میل کے ایک ڈبے میں بٹھا دیا۔ راستے بھر انھوں نے پیر صاحب کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔
کسی نے اکتارا بجایا تو کسی نے اپنی زبان میں ٹپہ الاپا۔ کوئی توشے دان سے بھانت بھانت کا کھاجا انھیں چکھانے لگا۔ جب
یہ طویل سفر ختم ہوا تو ان سب نے ایک بس پر بیٹھ کر "ایبٹ آباد" کا رخ کیا۔ وہاں سے چند میل پیدل چل کر جب وہ "بالاکوٹ"
میں داخل ہوئے تو ساری تکان دور ہو گئی۔

دراصل یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس کے پہلو سے ایک تنگ سڑک وادی کاغان کی سمت جاتی تھی۔ بائیں طرف
چھوٹی چھوٹی دکانوں اور مکانوں کا سلسلہ تھا۔ دائیں جانب سرسبز میدان جس کے درمیان ایک قبرستان کے آثار صاف
نمایاں تھے۔ کرامت الٰہی کی رہائش کے انتظام میں زیادہ دقت پیش نہ آئی۔ ایک درزی نے اپنی دوکان کے اوپر انھیں ایک
کوٹھری دے دی۔

دوسرے دن نماز صبح کے بعد جب وہ چائے خانے میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ شہیدوں کا مدفن اسی قبرستان میں
ہے جس کی چہار دیواری سامنے نظر آ رہی ہے۔ وہ تن تنہا اس میں داخل ہوئے تو فرطِ جذبات نے مغلوب کر دیا اور تھوڑی دیر

قدم آگے نہ بڑھے۔ قطار در قطار پختہ قبریں بنی ہوئی تھیں اور چہار دیواری کے ساتھ گھنے درخت خاموش سنتریوں کی طرح پہرہ دے رہے تھے۔ بیشتر قبروں پر خفتگان کے نام کتبوں پر لکھے ہوئے تھے بلکہ "سید احمد شہید" اور ان کے خاص ساتھیوں کے کارناموں کا مختصر احوال بھی کندہ تھا۔ کرامت الٰہی دبے پاؤں ہر قبر پر فاتحہ پڑھتے رہے تا ایں دم کہ دھوپ نکل آئی، اور انھیں محسوس ہوا کہ ایسا پُر وقار شہرِ خموشاں انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

قبرستان کے تکیے دار کے لیے جو چھوٹا سا حجرہ کونے میں بنا ہوا تھا کرامت الٰہی اس میں جا بیٹھے اور اپنی یادداشت میں اس تاریخی عمل کا جائزہ لینے لگے جو ان جاں نثاروں کو صدیوں پہلے شمالی ہند سے یہاں کھینچ لایا تھا۔ یہی وہ جذبہ تھا جو انھیں بھی مالابار سے کراچی لے آیا تھا۔ ان کے ہم سفروں نے لاکھ کوشش کی کہ کرامت الٰہی ان کے گاؤں چلے چلیں لیکن بالاکوٹ کا ماحول انھیں اتنا بھایا کہ انھوں نے اس وقت تک یہیں رہنے کا تہیہ کیا جب تک وہ قافلے گھر والوں سے مل جل کر واپس کراچی کا رخ نہ کرتے۔ ان کا دستور یہ قرار پایا کہ دن کا زیادہ حصہ گورستان میں تلاوت کلام پاک اور مذہبی کتابوں کے مطالعے میں گزارتے۔ شام کو درزی سوار خاں کے پاس بیٹھ کر ان مجاہدوں کا جنگ نامہ اس طرح بیان کرتے کہ آنے جانے والوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ غرض چند ہی روز میں بالاکوٹ کے باشندوں میں یہ خبر پھیلی کہ شہید سیّدوں کا کوئی نام لیوا وارد ہوا ہے اور عقیدت مندوں نے ایسے خلوص سے انھیں سر آنکھوں پہ بٹھایا جس کی مثال انھیں کراچی میں نظر نہ آئی تھی۔ چند ماہ بعد جب حسب قرار ان کے پٹھان ساتھی بالاکوٹ لوٹے کہ انھیں کراچی لے جائیں تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ کرامت الٰہی نئے مریدوں کو قبرستان میں وعظ سنا رہے ہیں۔

دوسرے دن کرامت الٰہی نے انھیں ہدایت کی کہ وہ کراچی جا کر معلوم کریں کہ مالابار سے کچھ مرید ان کی تلاش میں آگئے ہیں یا نہیں، جب تک اس امر کی تصدیق نہ ہو جائے گی وہ بالاکوٹ میں ہی قیام کریں گے۔ یہ بات ان کے ہم سفروں کو پسند نہ آئی، لیکن کرامت الٰہی نے ان کی ایک نہ سنی، ناچار وہ اپنی منزل کی طرف سدھار گئے۔ وقت کے ساتھ کرامت الٰہی کی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا کیوں کہ نہ صرف سیّدوں سے ان کا سلسلہ ملتا تھا بلکہ وہ عربی داں بھی تھے اور بوقت ضرورت تعویذ لکھنے سے بھی عذر نہ کرتے تھے۔ چنانچہ دور دور تک ان کی آؤ بھگت ہونے لگی۔ درزی سوار خاں نے ان کی مہمانی کو باعث برکت گردانا۔ سردی کی آمد سے پہلے اس نے کوٹھری کو گرم رکھنے کے لیے آتش دان درست کیا۔ کرامت الٰہی کے لیے پوشش مہیا کی اور پڑوسیوں نے لباس اور بستر کا ایسا اہتمام کیا کہ انھیں برفانی ہوا چھو بھی نہ سکتی۔ کوہ خیل نامی قبیلے کے سردار کو ان کا وعظ اتنا پسند آیا کہ سواری کے لیے ایک خچر لا کر دیا جسے کرامت الٰہی بوقت ضرورت استعمال کرتے تھے۔ اتنے میں کراچی سے اطلاع آئی کہ ان کے مالاباری مرید طویل اور بے سود انتظار سے پریشان ہو کر بے نیل و مرام وطن واپس لوٹ گئے ہیں۔ کاش یہ خبر کرامت الٰہی کو پہلے ملتی تو وہ بلا تاخیر ان تک جا پہنچتے اور کراچی میں ہی بود و باش کی صورت نکال لیتے۔ لیکن اب وہاں ان کا کون رہ گیا تھا اور مالابار کیا منہ لے کر جاتے۔ چنانچہ انھیں یہ فیصلہ کرنا ہی پڑا کہ فی الوقت اسی علاقے میں گزر اوقات کریں۔ ایک تو ان کے عقیدت مندوں کی کوئی کمی نہ تھی اور دوسرے نذر و نیاز کے قصوں کی کشش نے سوار خاں درزی کو ان کا ایسا فدائی بنا دیا کہ ہمہ وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتا، ان کی مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا۔ کرامت الٰہی نے اس کارِ خیر کا بیڑہ بھی اٹھایا کہ شہید سیّدوں کے ایسے حالات جمع کریں جن کا علم باہر نہ پہنچا ہو۔ انھوں نے سن رکھا تھا

کہ سکھوں سے شکست خوردگی کے بعد جو مجاہد باقی رہ گئے وہ پہاڑوں میں یہاں وہاں پوشیدہ ہوگئے اور ۱۸۵۷ء
کی جنگ آزادی کے موقع پر انگریزوں کے خلاف سینہ سپر ہوگئے۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا اور نئے مجاہد شمالی ہند
کے مختلف صوبوں سے بالخصوص بہار سے یہاں آکر انھیں کمک پہنچاتے رہے۔ پیر کرامت الٰہی کو خیال آیا کہ اگر وہ پٹھان
بڑے بوڑھوں سے ایسے واقعات معلوم کر کے شائع کرا دیں تو تاریخ اسلام میں ایک زریں باب کا اضافہ ہوگا۔

ان کی یہ جستجو بے سود نہ گئی۔ کاغان، دیر اور سوات کے علاقوں میں جب لوگ "پیر ہندی" کے دیدار کے لیے جمع
ہوتے تو باتوں باتوں میں کرامت الٰہی کو صرف سنی سنائی باتیں ہی نہیں بلکہ مجاہدوں کی ملفوظات بھی دستیاب ہو جاتی تھیں
اس طرح کئی سال گزر گئے۔ شاید باقی عمر بھی اسی طرح بسر ہو جاتی کہ یک بیک ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ رات کو
انھوں نے خواب میں آواز سنی کہ اس بے نام و نشان قبر کی طرف توجہ دو جو "سیدو شریف" کے جنوبی نواح میں فاتحہ خوانی
کی منتظر ہے۔ دراصل یہ "سید زمرد علی" کی قبر ہے اور اس نام کی مناسبت زمرد کی ان کانوں سے ہے جو قبر کے مقابل
پہاڑیوں میں پوشیدہ ہیں۔ کرامت الٰہی کی آنکھ کھل گئی اور تعجب سے خواب کی تعبیر پر غور کرنے لگے۔ صبح واقف کاروں
سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ "سیدو شریف" کا پرانا نام "سید شریف" تھا اور دراصل ایک قبر وہاں موجود ہے جسے
لوگ سید کا مزار کہتے ہیں۔

یہ سنتے ہی کرامت الٰہی نے تہیہ کیا کہ وہ سیدو شریف جا کر اس مزار کی حفاظت کا انتظام کریں گے جو مدتوں
سے کسمپرسی کے عالم میں پڑا ہے۔ اس فیصلے کا اعلان کرتے ہی انھوں نے خچر پر بیٹھ کر سوات کا رخ کیا۔ کئی جوشیلے
مریدان کے ساتھ ہو لیے۔ ہر پڑاؤ کے بعد چند اور لوگ ان کے ہمراہ ہو جاتے حتیٰ کہ سوات کے قریب پہنچتے پہنچتے ایک جلوس
کی شکل بن گئی۔ جب "سیدو شریف" میں لوگوں نے سنا کہ ایک پیر ہندی نامعلوم سیّد کے مزار پر فاتحہ پڑھنے آیا ہے تو
وہ اپنی لاعلمی پر سخت پشیمان ہوئے۔ انھوں نے بڑی گرمجوشی سے کرامت الٰہی کا استقبال کیا۔ اس جگہ ان کے لیے ایک
پھلواری نصب کر دی جہاں سید زمرد علی دفن تھے۔

کچھ دنوں بعد اتنا سامان مہیا ہو گیا کہ کرامت الٰہی کی رہائش کے لیے ایک حجرہ تعمیر ہوا اور قبر پہ "سید زمرد علی"
کے نام کا کتبہ لگا۔ تاہم جلد ہی وہ "زمرد شاہ" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ کرامت الٰہی نے قیاس سے ان کے سنِ وفات
کا بھی تعین کر دیا اور ان کے سالانہ عرس کی رسم چل پڑی۔ اب بھی ۱۲ شعبان کو پشاور، کوہاٹ وغیرہ کے قوّال بصد احترام
مزار پر حاضری دیتے ہیں اور وادیٔ سوات کے بڑے بوڑھوں پر حال اور قال کی ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے جس کی مثال
پہلے یہاں نظر نہ آئی تھی۔ زمرد شاہ کی قبر پہ چادر چڑھانے اور فاتحہ پڑھنے والوں کی کمی نہیں رہی۔ کرامت الٰہی نے تعجب
سے مشاہدہ کیا کہ چادر پہ کبھی کبھی بطور نذر وہ سفوف چھڑکا جاتا تھا جو زمرد کی کانوں سے کھدائی کے وقت نکلتا تھا۔
اس میں جو باریک دانے باقی رہ جاتے وہ دھوپ میں چمکنے لگتے تھے اور کرامت الٰہی کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتے تھے۔ صبح
سویرے جب ہر سو خاموشی ہوتی وہ ایک چھوٹی سی پیتل کی چمچی لے کر خفیہ تل میں ان دانوں کو جمع کرتے رہتے۔ ڈیڑھ دو
سال میں اتنا ذخیرہ ہو گیا کہ دل ہی دل میں وہ اس کی قیمت کا تخمینہ لگانے لگے۔

یہ سارا واقعہ سنا کر سیف اللہ نے کہا۔ اس موقع پر کرامت الٰہی کو میرے بدلے ہوئے حالات کا علم ہوا تو سوچا

اور بولی
ہم وہی بولتے ہیں جو گودیں سنتے ہیں
پھر یہ نفرت
یہ ممکن ہے کہ ہم دوسری ماؤں سے نفرت کیے بغیر اپنی ماں سے محبت کریں
اور وہ جوہر
شاید ہم اسے پیچھے چھوڑ آئے ہیں
پھر ایسا کیوں ہے کہ شمال اور جنوب ایک نہیں ہوتے
مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب
یہ بات دوسری ہے
مگر ہمارے حصے کا زادِ راہ
اصل بات یہی ہے
چلنے والے رک کر کہاں پوچھتے ہیں

سنتے ہیں لوگ کبھی سونا اچھال کر چلتے تھے
ہاں اور کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں
اور سفر
سفر اب بھی جاری ہے جیسا اس پڑاؤ سے پہلے تھا

بہت سے لوگ آئے اور گئے
ہاں آئے تو شاہ بھی تھے اور گدا بھی
مگر وہ ایسے شاہ تھے جو گدا بن کر رہے
اور یوں
ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد
وہ تو مخدوم کے پاس سے اٹھ کر آئے تھے
اسی لیے تو سزا کے مستوجب ہیں
کہ وہ خادم ثابت نہیں ہوئے
مگر وہ پیغام

کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ کسی اور کے گھر کی بولی لگائے
یہ تجارت کا سیدھا سا اصول ہے
یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی
یہ تو سمجھنے کی بات تھی
کہ ایک بار گھر کی راہ بھول جائے تو کوئی راہ چلنے والے کو قبول نہیں کرتی
مگر یہ تو زمینی باتیں ہیں
ہاں کہ ہمارے پاؤں مٹی پہ جمے ہوئے ہیں
ہمارے اوپر بھی کچھ ہے
ہوگا، سمت تو صرف چار ہیں
اور پانچویں
ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں
نقطہ کا بھی وجود ہوتا ہے
لیکن اس میں جگہ کے تعین کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا
مگر یہی نقطہ جب ہیئت اختیار کر لیتا ہے تو اس میں سمتیں پیدا ہو جاتی ہیں

بہت دیر تک بحثیں ہوتی رہیں
جب یہ طے نہیں کر پائے کہ کہاں پہنچے تو ایک نے کہا
"ہم کب سے چل رہے ہیں؟"
"شائد صدیوں سے!" دوسرے نے جواب دیا
"تو ہم راستے میں کیوں ہیں؟" تیسرے نے دریافت کیا
"شائد چلنے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ آنکھ لگ گئی" چوتھے نے اطمینان سے کہا
"تو آؤ چلیں!" پانچویں نے مشورہ دیا
اور سب چل پڑے
اس بات سے بے نیاز کہ پھر اگر سوال اٹھا کہ کہاں جانا ہے
تو کیا جواب دیں گے؟

رحمٰن نشاط

سیکنڈ ہینڈ

"ابے آج بڑی دیر کر دی تو نے" رفیق نے نمبر 6 سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔

"یار کیا بتاؤں۔ آج گھر والی کی آنکھ دیر سے کھلی۔ وہ چھوٹا والا ہے نا۔ وِس کی آنکھیں دکھ رہی ہیں۔ رات بھر ماں کو جگاتا ہے۔ روز تو وہ سویرے اٹھ جائے۔ پر آج ذرا دیر ہو گئی۔ بس دوپہر کی روٹی باندھنے میں 'وخت' لگ گیا" تاجو نے عذر پیش کیا۔

"ہاں یار مزے ہیں تمارے۔ بھرا پرا گھر۔ وخت پہ کھانا، وخت پہ ناشتہ، دھلے دھلائے کپڑے، ہر کام ایک دم ریڈی، اور پھر ہنستے بولتے بچے۔ 'دا کمی' گھرداری کے بڑے فائدے ہیں۔" رفیق نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"ابے تو کر لے نا شادی۔ اچھا کھاتا کماتا ہے۔ کٹیا بھی اپنی ہے۔ پھر کیا روک ہے؟"

"دیکھ بھئی پتا ہوں کباڑیا۔ سودا اور اچھان پھٹک کرتا ہوں۔ جب تک ایک ایک چیز کا ہر کل پرزہ نہیں پرکھ لیتا اس پر ہاتھ نہیں دھرتا۔"

"یار اس چھان پھٹک میں ادھیڑ تو ہو گیا۔ اب کیا مرنے کے قریب، کرے گا شادی؟"

"ابے قسمت میں اگر کنوارا مرنا ہے تو کنوارے مر جائیں گے پہلے ماں باپ پیسے جمع کرتے کرتے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب میں گھر والی ڈھونڈتے ڈھونڈتے ——!"

"اچھا بے، چائے منگوا۔ دیر پہلے ہی ہو گئی ہے ——!"

"ابھی لے ——!" رفیق نے سگریٹ پھینک کر سامنے والے ہوٹل کے لڑکے کو آواز دی۔

تاجو اور رفیق ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ تاجو سڑک سے ذرا قریب ایک نسبتاً پکی جھونپڑی میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ رفیق ذرا اندر کی گلیوں میں اپنی بانس چٹائی کی جھونپڑی میں تنہا رہتا تھا۔ دونوں کا کئی برسوں کا ساتھ تھا۔

تاجو ہر مال دس روپے کا ٹھیلہ لگاتا تھا۔ اس کے ٹھیلے پر سوئی دھاگے سے لے کر بچوں کے کھلونے، لڑکیوں کے پراندے کنگھے کنگھیاں اور نقلی لپ اسٹک اور نیل پالش تک سبھی کچھ نظر آتا تھا۔

رفیق ایک کباڑی تھا۔ سال بھر گلی گلی گھوم پھر کر پرانی مشینیں، اوزار اور گھریلو استعمال کی اشیا وغیرہ اسی قسم کا دوسرا

ند سامان خریدتا اور شام کو ایک بارونق چوراہے پر ٹھیلہ لگا کر کھڑا ہو جاتا۔ آتے جاتے لوگ کچھ دیر کے لیے ٹھیلے کے پاس رکتے۔
ضرورت کی کوئی شے نظر آجانے پر دیر تک الٹ پلٹ کر، ٹھونک بجا کر اسے جانچتے اور اگر کارآمد سمجھتے تو خرید کر لے جاتے۔

رفیق کو اس کام کا بڑا تجربہ تھا۔ وہ جب بھی کوئی پرانی چیز دیکھتا تو خریدنے سے پہلے اس کی مانگ، ضرورت اور ری سیل
یو کا اندازہ ضرور لگا لیتا۔ جس چیز کو وہ ذرا بھی اپنے نقطۂ نظر سے بے کار یا فضول سمجھتا اسے ہاتھ ہی نہ لگاتا اور اس معاملے
، وہ کم ہی دھوکا کھاتا تھا۔ وہ کسی چیز کی قیمت اور منافع کا جو اندازہ لگاتا وہ سو فی صد نہیں تو ننانوے فی صد ضرور درست ہوتا
، ایک فی صد کا الاؤنس وہ گاہکوں کو دیا کرتا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اس ٹھیلے پر سے گاہک اس وقت تک کوئی چیز نہیں
یدے گا جب تک کہ اپنی ضرورت کی چیز کے ایک ایک کل پرزے، ایک ایک کیل اور ایک ایک حصے کا بغور معائنہ اور اطمینان
ں کرے گا۔ کیونکہ وہ ایک کباڑی کا ٹھیلہ تھا کسی سپر ڈپارٹمنٹل مارکیٹ کی کوئی دکان تو تھی نہیں کہ جہاں ہر چیز صاف ستھری،
نویل، خوبصورتی کے ساتھ پیکڈ ملتی ہے۔ جس میں دھوکا اور شکستہ کارہ ہونے کا ایک فی صد بھی امکان نہیں ہوتا۔ اور یہاں ہر
ارہ، ٹوٹی پھوٹی اور کاٹ کباڑ تھی۔ اور اس کاٹ کباڑ میں سے گاہک اپنی ضرورت کی شے نکال کر اس میں کوئی صفت اور کارکردگی
ش کرتا تھا۔

نئی چیز کو خریدتے وقت وہ جتنا پُر اعتماد اور مطمئن ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ غیر مطمئن اور چوکنا پرانی چیز خریدتے
ت ہوتا تھا۔ لہٰذا رفیق کو اپنے گاہکوں کی یہ احتیاط اور چھان بین ناگوار نہیں گزرتی تھی کیوں کہ وہ خود بھی یہی کرتا تھا اور پھر اس
کامیابی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ پرانے مال کو زیادہ دیر تک اپنے پاس نہیں رکھتا تھا۔ اچھا گاہک ملتے ہی فوراً اس کے
لے کر کے دام کھرے کر لیتا تھا۔

رفیق اور تاجو روز صبح اپنے اپنے گھر سے نکل کر، محلے سے باہر میدان کے کنارے پر لگے نیم کے بڑے سے پیڑ کے سائے میں
دیر بیٹھتے۔ ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھتے۔ سامنے ستار کے جھونپڑا ہوٹل سے منگوا کر ایک ایک کپ چائے پیتے، اور پھر
گریٹ سلگا کر اپنے اپنے کام پر روانہ ہو جاتے۔ رفیق چائے کے ساتھ دو نمکین بسکٹ بھی کھاتا تھا کیوں کہ یہی اس کا ناشتہ
ا ہوتا تھا۔

"ابے یہ کل کیا دنگا ہو رہا تھا تیری گلی میں ——— ؟" رفیق نے تاجو سے پوچھا۔ جو بڑے انہماک سے چائے کے کپ
جھکا ہوا تھا۔

"کچھ نہیں یار۔ وہ اپنا رحمت ہے نا ——— اس کا اپنی گھر والی سے جھگڑا ہوا تھا۔ بات بہت بڑھ گئی تھی۔ اس
گھر والی کے بھائی وائی آگئے تھے۔ پھر تو لمبا ہی پھڈا ہو گیا ———
رحمت کی، دو تین پولیس والوں سے دوستی ہے۔ اپنے سالوں کو بند کروا دیا۔ دو دن میں دماغ ٹھکانے آگئے۔

"آخر بات کیا تھی ؟"

"یار اصل میں اس کی گھر والی بہت فتنہ ہے۔ کام ایک کوڑی کا نہیں کرتی، اور ادھر بیچارہ رحمت کی بوڑھی ساس کرتی ہے بدلا
، ساس کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہے!"

مگر اس کی سنا ہے کچھ سال بھر بھی نہیں ہوا، اور سنا ہے رحمت کی ماں بہت چاؤ اور پسند سے چاند سی بہو لائی تھی"

"ہاں سنا تو یہی ہے!" تاجو نے چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے کہا۔
رفیق ہنسنے لگا۔
"ابے اس میں ہنسی کی کون سی بات ہے؟" تاجو کو رفیق کی بے موقع ہنسی پر حیرت ہوئی۔
"تو نے کبھی کوئی نئی چیز خریدی ہے؟" رفیق نے پوچھا
"ہاں۔ اسی میٹھی عید پر یہ سلوار کمیض لیا تھا، مگر اس کا اس بات کا کیا تعلق ہے؟"
"کیسے لیا تھا؟" رفیق نے تاجو کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔
"کیسے لیا تھا کیا مطلب؟ شیشے میں رکھا تھا رنگ اچھا لگا۔ نکلوا کر اپنا ناپ کیا۔ تھوڑا سا مول تول ہوا اور لے لیا۔"
"بس یہی فرق ہے نئی اور پرانی چیز میں۔ نئی چیز لیتے وقت ہم اس کی چمک اور رنگ روپ کو تو دیکھتے ہی ہیں مگر اس سے زیادہ اس بات سے خوش اور بے فکر ہوتے ہیں کہ وہ نئی ہے۔ اسی لیے زیادہ چھان بین نہیں کرتے اور پھر دھوکا کھاتے ہیں اور سر پکڑ کر روتے ہیں۔ رحمت کی ماں بھی اگر بہو لاتے وقت ذرا چھان بین کر لیتی تو آج یہ دنگا فساد نہ ہوتا۔"
"یار تیری تو منطق ہی نرالی ہے۔ اب کیا وہ تیری طرح لونڈیا کا معائنہ کرنے بیٹھ جاتی۔ جیسے تو کاٹھ کباڑ کے کل پرزے دیکھتا ہے۔"
"عقلمندی تو یہی ہوتی ——!"
"چل بے —— باؤلا ہوا ہے —— تو کر لیجو یہ سب اپنی گھر والی لاتے وقت ——!" تاجو چڑ گیا۔
رفیق پھر ہنسنے لگا۔
تاجو، منہ اور آنکھیں اپنی کوشش کی حد تک کھولے بیٹھا تھا اور رفیق بہت لطف لے لے کر قصہ سنا رہا تھا۔
"پھر کیا ہوا؟" رفیق کے خاموش ہوتے ہی تاجو بولا۔
"ہونا کیا تھا۔ اس نے مجھے اوپر گھر میں بلا لیا"
"ابے نہیں؟" تاجو کی آنکھیں پھر پھیل گئیں۔
"ہاں بے ——!"
"پھر —— پھر ——؟"
"پھر وہ میرے بارے میں پوچھتی رہی، کہاں رہتے ہو —— کتنے بچے ہیں —— بیوی کیسی ہے؟"
"تو نے سب بتا دیا ——؟"
"ہاں ——!"
"اور اس نے بھی اپنے بارے میں کچھ بتایا؟"
"نہیں ابھی تو نہیں۔ بس میرے بارے میں پوچھتی رہی۔ پھر کچھ پرانی کتابیں، اخبار اور میک اپ کی خالی شیشیاں اٹھا لائی —— مگر یار ہے زوردار ——!"
"ابے مگر تو وہاں کہاں پہنچ گیا ——؟"

"بس بے یونہی ـــــ ایک دن چکر لگاتا اس طرف نکل گیا تھا"

"خیال رکھیو بیٹا۔ یہ لوگ بہت تیز ہوتی ہیں۔ آدمی کو بیچ کر دام کھرے کر لیں تو پتہ نہ چلے اور پھر ادھر پولیس بھی بہت چکر لگاتی ہے۔ کسی دن دھر نہ لے!"

"ابے نہیں بے۔ میں کوئی دس لیے تھوڑی جاتا ہوں۔ یہ تو دھندا ہے میرا ـــــ!"

"ہاں ـــــ مگر ان کا بھی دھندا ہے ـــــ!"

"ہاں ـــــ ہاں معلوم ہے!"

رفیق آج کل ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

"ابے کیا داکئی چکر چل گیا ـــــ؟" تاجو نے ایک دن اس سے پوچھ لیا۔

"یار کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ باتیں تو بہت میٹھی میٹھی کرتی ہے۔ روز ادھر گھر میں بلا کر دیر تک بٹھائے رکھتی ہے۔ چائے بھی پلاتی ہے۔!"

"اور تو روز ادھر جاتا ہے؟" تاجو نے تیز لہجے میں پوچھا۔

رفیق نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

"دیکھ بے پھر بتا رہا ہوں۔ یہ بہت تیز ہوتی ہیں۔ کسی دن کھیلے دھیلے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا اور روتا پھرے گا!"

"نہیں بے۔ ایسی کوئی بات تھوڑی ہے۔ تو میری عمر اور شکل دیکھ۔ یہ اس قابل ہے کہ کوئی چکر چلے۔"

"خیر عمر تو تیری زیادہ نہیں ہے، اور صحت بھی اچھی ہے۔ ہاں شکل ذرا ـــــ!" اس نے رفیق کے میلے کچیلے حلیے، خشک بے ترتیب بال اور شیو بڑھے چہرے پر نظر ڈال کر کہا۔

پھر خود ہی بولا۔

"مگر شکل سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ جو ہے نا کہ دل گدھی پر آ جائے تو پری کیا چیز ہے"

"تو بیٹا تیرے پر اس کا دل آ گیا ہوگا ـــــ!"

"نہیں بے ـــــ!"

"اچھا یہ بتا۔ اس نے اپنے بارے میں بھی کچھ بتایا ـــــ؟"

"ہاں یار بے چاری بہت دکھی ہے۔ کسی اچھے گھر کی ہے۔ ماں باپ کی ایک ہی تھی سال کا انتقال ہو گیا۔ چاچا تایوں نے سب کچھ چھین چھان کر کسی نکھٹو کے پلے باندھ دیا، اس نے جوئے اور نشے کی لت میں اسے یہاں پہنچا دیا اور اب وہ دوسروں کی لت پوری کرتی ہے ـــــ!"

"بہت تیرے کی ـــــ!" تاجو برا سا منہ بنا کر بولا۔

"کیوں ـــــ کیوں ـــــ؟"

"بہت پرانی کہانی ہے ـــــ سب یہی کہتی ہیں۔ مگر بیٹا تو پھنس مت جائیو ـــــ!"

"نہیں یار۔ میں کوئی دس لیے تھوڑی جاتا ہوں۔ بس اچھی لگتی ہیں اس کی باتیں ـــــ!"

"صرف باتیں یا وہ بھی ــــ؟"

"یار ہے تو بہت زوردار ــــ ہاں وہ بھی ــــ!"

"دیکھ ــــ دیکھ ــــ اتر گیا نا پٹڑی سے ــــ!"

رفیق ہنسنے لگا۔

اب روز صبح پھیری پر جانے سے پہلے رفیق اور تاجو کا موضوع گفتگو وہ عورت ہوتی۔

رفیق نے بتایا تھا کہ اس کی عمر تیس بتیس کے قریب ہوگی اور اس کی شکل و صورت کا ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ تاجو کو بھی اس کی باتیں سننے میں لطف آنے لگا تھا لیکن وہ رفیق کو وقتاً فوقتاً تنبیہہ ضرور کرتا رہتا تھا کہ اس چکر میں دور تک نہ چلا جائے کیونکہ وہ خراب جگہ تھی اور وہاں کی رہنے والیاں بہت خراب ہوتی ہیں۔ ایسی ہی میٹھی میٹھی باتیں نہ معلوم کتنے لوگوں سے کرتی رہتی ہوگی۔ رفیق کی تو حیثیت ہی کیا ــــ نہ پلّے رقم ــــ نہ شکل صورت اوپر سے الف کے نام سے لٹھ۔

ایک روز اس نے رفیق کو بہت سنجیدہ دیکھا تو ایک بار پھر اسے سمجھانے بیٹھ گیا۔ "ابے میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا۔ یہ چکر کیا ہے۔ میں تو بس یہ سمجھا تھا کہ یونہی ہمدردی میں حال چال پوچھ لیتی ہوگی۔ اپنا دکھ کہہ لیتی ہوگی۔ بس یونہی۔ کوئی باتیں کرنے والا نہیں ملتا ہوگا ــــ دن بھر اکیلی پڑی رہتی ہے ــــ مگر یہ تو ــــ!"

"کیوں۔ کیا کوئی خاص بات ہوگئی ــــ؟"

"سمجھ میں نہیں آرہا"

"ابے کچھ بتا تو ــــ؟"

"یار کیا بتاؤں۔ کل کہنے لگی مجھے یہاں سے نکال لو، کہیں دور لے چلو ــــ!"

"بس بیٹا پھنس گیا تو بن گئی گلے کا ہار ــــ"

"ابے سن تو ــــ!"

"کیا سنوں ــــ؟ میں نے تو تجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ لوگ بہت تیز ہوتی ہیں۔ ایسے ہی چکر چلا کر تجھ جیسے الوؤں کو پھانستی ہیں۔ کبھی محبت جتا کے، کبھی اپنے دکھوں کی کہانی سنا کے اور جب کھوکھلا کر دیتی ہیں تو دھتکار کے الگ ہوجاتی ہیں۔"

"ابے مگر میرے پاس کیا رکھا ہے جو مجھے کھوکھلا کرے گی؟"

"ہاں یہ بات تو ہے ــــ!" تاجو کا جوش اچانک ٹھنڈا پڑ گیا۔

"اور سن وہ ہے کسی شریف گھر کی۔ ان میں سے نہیں ہے۔ میں نے تجھے پہلے ہی بتایا تھا۔

"اس بات کو تو تو چھوڑ۔ مجھے اس پر بالکل یقین نہیں آیا۔ تیری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اس نے تجھے یہ کہانی سنائی ہوگی اور میرا یقین ہے کہ وہ وہیں کی ہوگی ــــ!"

"چل وہیں کی سہی۔ پر وہ وہاں سے نکلنا چاہتی ہے"

"تو ــــ!"

"تو کیا ــــ نکال لاؤں گا ــــ!"

"دھت تیرے کی۔ کتے کی دم وہی ٹیڑھی کی ٹیڑھی ---- ابے اتنے دنوں سے سبق پڑھا رہا ہوں کہ بیٹا اس چکر میں مت پڑ۔ اس ہمدردی اور محبت کے چکر میں مارا جائے گا۔ گلے کا ہار بن گئی تو اتارنا مشکل ہو جائے گا۔ پر تو تو آج کل ہیرو بننے کے چکر میں ہے --- جا --- نکال لا --- اپنی ہیروئن کو ---!" تاجو کو غصہ آگیا۔

"یار دیکھ تجھے سچی بات بتاؤں۔ میرا دل وہاں جائے بغیر نہیں مانتا۔ جس روز اس سے نہیں ملتا۔ بس پتہ نہیں کیسا لگتا ہے۔ پھر اس کی باتیں، اس کی شکل، ہر وقت دماغ میں گھومتے رہتے ہیں، میں سوچ رہا ہوں ---!" رفیق کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں کیا سوچ رہا ہے ---؟" تاجو بولا۔

"میں سوچ رہا ہوں۔ معاملہ ذرا پکا ہو جائے تو گھر بنا ہی لوں ---"

"ابے ہٹ ---!" تاجو کو ایک بار پھر غصہ آگیا --- "ابے یہ لوگ کوئی گھر بسانے کے لیے ہوتی ہیں۔ تو بھی بس ---!"

"یار دیکھو اب تو میرا بھی جی کرتا ہے۔ میرا ایک گھر ہو۔ جس میں میری گھر والی میرا انتظار کرے۔ شام کو واپس آؤں تو شور مچاتے بچے ٹانگوں سے لپٹ لپٹ کر گود میں آنے کی ضد کریں۔ وقت پر کھانا ملے، وقت پر ناشتہ ہو۔ گھر سے چلتے وقت گھر والی۔ دوپہر کی روٹی رومال میں لپیٹ کر دروازے پر آ کر دے --- ہا --- ہہ ---!" رفیق نے ٹھنڈی سانس لی۔

"ابے تو سیدھی سیدھی شادی کر۔ یہ چکر کیا چلا رہا ہے ---!"

"ابے --- اب اس عمر اور حالیت میں کون اپنی لمڈیا مجھے دے گا۔ کہیں بات بھی کروں گا تو لوگ ہنسیں گے اور پھر اپنے پاس مال کہاں ہے۔ پیارے بھائی لوگ سیکنڈ ہینڈ مال خریدتے ہی اس لیے ہیں کہ ان میں نیا مال خریدنے کی طاقت نہیں ہوتی --- اور پھر یہ مال تو بالکل پھوکٹ میں مل رہا ہے --- یعنی منافع ہی منافع --- اور یہ میں تجھے بتا ہی چکا ہوں کہ سیکنڈ ہینڈ مال میں دھوکا نہیں ہوتا اور ویسے بھی میری رحمت کی طرح پولیس والوں سے دوستی نہیں ہے --- کل --- کلاں کو کوئی پھڈا ہو گیا تو میں مارا جاؤں گا --- نا --- بابا --- اپنے کو سیکنڈ ہینڈ ہی ٹھیک ہے ---!"

تاجو کچھ نہیں بولا۔ غصے سے منہ پھلائے بیٹھا رہا۔

دس بارہ روز تک تاجو کی رفیق سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ روز صبح حسب معمول نیم کے پیڑ کے نیچے اس کا انتظار کرتا۔ تین چار بار اس کی جھونپڑی کی طرف بھی گیا لیکن وہاں بھی تالا تھا۔ وہ بہت حیران تھا کہ آخر رفیق گیا کہاں ---؟

ایک صبح اچانک رفیق آگیا۔ نئے شلوار قمیص میں ملبوس، کان میں تیز عطر کا پھایا لگائے، سر میں خوشبودار تیل چپڑے اور انگلیوں میں نمبر ۶ کے بجائے میلبورن کا سگریٹ دبائے وہ مسکرائے جا رہا تھا۔ اس کے تازہ شیو کیے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"ابے کہاں جا مرا تھا --- اتنے دنوں سے شکل ہی نہیں دکھائی --- اور --- اور --- یہ کیا بابو بنا پھر رہا ہے آج کیا لاٹری وا ٹری نکل آئی ہے۔ خیریت تو ہے؟" رفیق کو دیکھ کر تاجو نے شکوہ کیا۔

"بالکل خیریت ہے --- تو سنا کیسا ہے؟"

"ٹھیک ہوں --- بیٹھ --- بیٹھ --- یہ بتا اتنے دن کہاں رہا اور دس کا کیا بنا؟" تاجو بہت کچھ پوچھنے اور جاننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

"یار اسی چکر میں تو پھنسا ہوا تھا ـــ!"

"بتا تو ہوا کیا؟"

"ابے، بس معاملہ پکا ہوتے ہی ایک دن اسے ٹیم دے دیا کہ تیار رہے۔ وہ بھی شیر کی بچی بہت ہمت والی تھی۔ فوراً حامی بھر لی۔ اگلے دن صبح گیارہ بجے میں پہنچ گیا اور لے اڑا۔"

"لے ـــ اڑا ـــ؟ اوہ ـــ اور کوئی جھگڑا پھڈا نہیں ہوا؟" تاجو حیرت سے بولا۔

"نہیں بے ـــ جھگڑا پھڈا کیسا ـــ؟"

"لے بے، اتنا سب کچھ ہو گیا اور تو نے مجھے بتایا ہی نہیں؟"

"موقع ہی کہاں ملا یار ـ اسی دن میں دوسرے شہر چلا گیا۔ رات ہی کو تو آیا ہوں ـــ!"

"اچھا تو خیر باتیں ہوں گی ـــ پھر پہلے چائے منگوا لیں ـــ!" تاجو نے آواز دے کر چائے کے لیے کہا۔

"ہاں بھئی اب بتا ـــ!" تاجو اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اب تو تیرے بھی عیش ہوں گے۔ وقت پہ کھانا، وقت پہ ناشتہ، دھلے دھلائے کپڑے ـــ مزے ہی مزے ـــ اچھا ہے پیارے عیش کرو۔ پھوکٹ میں گھر بس گیا۔ مگر یار کسی روز بھابی کو دکھا تا تو ـــ جس کے پیچھے اتنا مجنوں ہو رہا تھا"،

رفیق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس مسکراتا رہا۔ اتنے میں ہوٹل والا چائے لے آیا۔

"ابے تو نے میرے لیے بسکٹ نہیں منگوائے؟" رفیق نے چائے کے ساتھ بسکٹ نہ پا کر کہا۔

"ابے آج تجھے بسکٹوں سے ناشتہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آج تو تو گھر والی کے ہاتھ کے پراٹھے کھا کر آ رہا ہو گا ـــ!" تاجو ہنس کر بولا۔

"نہیں بے، میں نے ابھی ناشتہ نہیں کیا ـــ!" رفیق نے کہا۔

"ہیں ـــ ناشتہ نہیں کیا ـــ؟" تاجو حیرت سے بولا ـــ "کیا ابھی سے نخرے شروع ہو گئے گھر والی کے؟"

رفیق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاجو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکراتا رہا۔

پھر اپنی مسکراہٹ دبا کر بولا۔

"دیکھ بھئی میں ہوں کباڑیا ـــ سیکنڈ ہینڈ مال کو زیادہ دیر اپنے پاس نہیں رکھتا۔ اچھا گاہک ملتے ہی فوراً اس کے حوالے کر دیتا ہوں"

▲▲

اظہر حسن صدّیقی

جواب سے مطلع فرمائیے

(انشائیہ)

دعوت ناموں سے واسطہ تو ہم سب کا ہی پڑتا رہتا ہے اور خاص کر آج کے خود تشہیری کے دور میں جب کہ دعوت نامے زیادہ ہوتے ہیں اور دعوت کم ہوتی ہے۔ آپ سے کیا چھپائیں بعض دعوتیں تو اچھی خاصی عداوت ثابت ہوتی ہیں۔ ایک تو گاڑی چلانا جو کراچی جیسے شہر میں بنات خود ایک چھوٹا موٹا عذاب ہے، پھر مہنگا پٹرول جلانا اور اس پر تحفہ یا نقدی کی شرط۔ یہ سب باتیں اور دعوت نامہ لازم و ملزوم ہیں۔ آج کل دعوت ناموں کے سلسلے میں جو جدّتیں اختیار کی جا رہی ہیں وہ دیکھنے سے تعلّق رکھتی ہیں۔ دعوت نامہ بذات خود فن کا ایک اچھوتا نمونہ یا شاہکار لگتا ہے۔ بعض دعوت ناموں کو تو دیکھ کر پرانے زمانے کے بادشاہوں کے فرمان یاد آجاتے ہیں جب کہ بعض دوسرے بالکل درس گاہوں کی ڈگریوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ ایک دعوت نامہ دیکھا، بانس کی شکل کی نالی میں کپڑے میں لپٹا ہوا گویا سلک کا تھان ہو۔ باہر نکالنے پر بالکل شاہی فرمان نما دعوت نامہ نکلا، صرف ایک کسر رہ گئی تھی کہ فریم اور شیشہ نہیں تھا ورنہ دیوار پر آویزاں کر دیتے۔ دعوت ناموں کے سلسلے میں کاغذ کپڑا، لکڑی، پلاسٹک ہر چیز استعمال ہونے لگی ہے۔ ہر میزبان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ جدّت طرازی میں اپنے سے پہلوں کو مات دے اور اس نمونے کے کارڈ تیار کرلئے جو آج تک کسی دوسرے نے نہ کرائے ہوں۔ اس کوشش میں دیکھا گیا ہے کہ طرح طرح کے مضحکہ خیز نمونوں کے کارڈ تیار کرلئے جاتے ہیں۔ آپ کی نظر سے بھی اس قسم کے کارڈ گزرے ہوں گے جن کی شکل کیک، شمع، ڈھولک، نفیری، بانسری یا دیگر آلات موسیقی سے ملتی جلتی ہوگی۔ اس کے علاوہ رنگوں اور ان کے امتزاج میں بھی جدّت طرازی سے کام لیا جاتا ہے لیکن حال ہی میں ہونے والی ایک شادی کے دعوت نامے نے جدّت طرازی اور اپنے انوکھے پن کی وجہ سے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ ہوا یوں کہ ہمیں ایک لفافے میں ایک عدد ریڈیو کا کیسٹ موصول ہوا اس ہدایت کے ساتھ کہ اسے بجا کر سنیے، کیوں کہ یہ ایک نئی چیز تھی اس لیے ہم فوراً دوڑے دوڑے اپنے صاحب زادے کے کمرے میں گئے، کیوں کہ موصوف جب سے جوان ہوئے ہیں ہم اس قسم کے تمام لوازمات سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں یا دوسرے الفاظ میں محروم کر دیے گئے ہیں اور ان سے کہا کہ خدا بجا کر سنائیں کہ ہمارے لیے کیا پیغام ہے۔ ٹیپ چلتے ہی ہمارے کرم فرما کی آواز گونجی اور دعا سلام کے بعد اپنی صاحب زادی کی شادی کی خوش خبری سنائی اور ساتھ ہی اپنی اور بیگم کی جانب سے شرکت کی دعوت دی اور تاریخ، وقت اور جگہ بھی بتائی۔ شکریے کے ساتھ ٹیپ ختم ہوگیا، کیوں کہ اس میں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں تھی مبادا کہ ہم

اس کو گانے بھرنے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے روز ہم نے انھیں اس جدّت پر مبارکباد دی اور پوچھا "فرض کیجیے ہمارے پاس ٹیپ ریکارڈر نہ ہوتا تو ہم دعوت نامہ کیسے سنتے" کہنے لگے کہ ہمیں یقین تھا کہ اگر آپ کے پاس نہیں ہوگا تو کسی نہ کسی ملازم کے گھر میں تو ضرور ہی ہوگا۔ ساتھ ہی ہم نے اپنے اس افسوس کا اظہار بھی کر دیا کہ کیوں کہ یہ ان کی آخری بچّی کی شادی تھی اس لیے اب یہ امکان بھی نہیں رہا کہ اگلے دعوت نامے کے ساتھ ہمیں ایک عدد ویڈیو کیسٹ ہی مل جائے۔

آج کل کے زمانے میں شاید ہی کوئی بندہ بشر ایسا ہو جس کو منگنی، مہندی، شادی بیاہ، ولیمہ وغیرہ کی دعوت نہ ملتی ہو اور اب تو دولت کی فراوانی کی وجہ سے دعوت کرنے کے نت نئے طریقے اور بہانے ایجاد ہوتے جا رہے ہیں۔ کہیں پر حج کی مبارکباد دینے کے لیے دعوت ہو رہی ہے تو کہیں عقیقہ یا رسم بسم اللہ کی خوشی میں کھانا کھلایا جا رہا ہے۔ کوئی امتحان میں کامیابی کی خوشی میں دعوت کر رہا ہے تو کوئی اپنے دوستوں کو کسی عہدے پر منتخب ہونے کی خوشی میں یا ان کی ترقی کی مبارکباد دینے کے لیے مدعو کر رہا ہے۔ غرض کہ دعوت کے اہتمام کے لیے کوئی بہانہ ہونا چاہیے اور اس کی کوئی کمی نہیں۔ کبھی کسی کا تبادلہ ہے تو کبھی کسی کی ترقی ہے اور کچھ نہیں ہے تو صرف بہر ملاقات ہے۔ ویسے بھی دعوت سے زیادہ آسان اور موثر کوئی اور خوشامد کا ذریعہ نہیں ہے۔ الغرض دعوت کسی قسم کی بھی ہو اور اس کا کوئی بھی موقع ہو، دعوت کا تصوّر بغیر دعوت نامے کے ممکن نہیں ہے، دعوت نامہ دعوت کا جزو لاینفک ہے۔ جس طرح یار لوگوں نے دعوت کھانے اور کھلانے کے نئے نئے مواقع ایجاد کیے ہیں اور ہنوز جدید تر کی تلاش میں ہیں اسی طرح دعوت ناموں کے لیے بھی خوب سے خوب تر کی تلاش جاری و ساری ہے۔ دعوت ناموں کے لیے سائز، چھپائی، لکھائی، رنگ، بناوٹ اور مضمون میں طرح طرح کی جدّت سے کام لیا جاتا ہے اور برابر یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایسا دعوت نامہ ہو جو پہلے کسی اور نے نہ بنایا ہو۔ ابھی حال ہی میں ہمیں ایک ایسا دعوت نامہ ملا ہے جس کے اوپر دولہا کے بڑے بھائی اور بھاوج کی شادی کی رنگین تصویر ہے جس میں دولہا اور دلہن مع اپنے رشتے داروں کے اسٹیج پر بیٹھے ہیں اور کارڈ کے اندر چھوٹے بھائی کی شادی کا دعوت نامہ ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ شادی کی تصویر کے چھاپنے کے لیے بڑے بھائی اور بھاوج کو ہی کیوں منتخب کیا گیا ہے جب کہ دولہا کے والدین اور دادا دادی بھی ضرور دولہا دلہن بنے ہوں گے اور ان کی تصویریں بھی ضرور رہی ہوں گی۔ صرف ایک قباحت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ ممکن ہے کہ والدین یا دادا دادی کی شادیوں کی تصویریں شاید رنگین نہ ہوں۔ ویسے یہ مسئلہ بھی کوئی ماہر فوٹو گرافر ری ٹچنگ کے ذریعے بآسانی حل کر سکتا تھا۔

دعوت ناموں کے مضامین بھی اس جدّت طرازی کا بری طرح شکار ہوئے ہیں۔ بعض دعوت ناموں کی زبان اس قدر ثقیل، مسجّع اور مقفیٰ ہوتی ہے کہ پہلے اس کو سمجھنے کے لیے لغت کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ بعض دعوت ناموں میں اس قدر تفصیل اور فضولیات ہوتی ہیں کہ یہ پتہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ دعوت نامہ کس بات کا ہے۔ اس کے برعکس بعض دعوت نامے پر تار یا ٹیلکس کا گمان ہوتا ہے۔ دعوت ناموں میں عبارت لکھنے کا بھی ایک نیا انداز نکلا ہے۔ بہت کم دعوت نامے آج کل ایسے ہوتے ہیں جن میں سیدھے سادے انداز میں عبارت لکھی ہو ورنہ کبھی اس کونے سے اس کونے تک، کبھی آڑی اور کبھی ترچھی اور کبھی اشعار کے انداز میں لکھی جانے لگی ہے۔

دعوت نامہ خواہ کسی شکل و صورت کا ہو یا کسی بھی تقریب کا ہو، اس میں ایک چیز کا ہونا بہت ضروری خیال کیا جاتا ہے

ہے عبارت "جواب سے مطلع فرمایئے" یہ کبھی تو R.S.V.P کی شکل میں ہوتی ہے اور کبھی ج۔س۔م۔ت کی صورت میں،
ں کا ہونا بہت ضروری سمجھا جاتا ہے، کیوں کہ یہ فیشن بھی ہے اور دستور بھی۔ یہ الفاظ دراصل میں فرانسیسی زبان سے لیے
یا اور اگر ہم نے صحیح سنا ہے تو ان کا تلفظ کچھ یوں ہے "ضیپوندے سلووپلے" جن کا لفظی ترجمہ ہمیں یوں بتایا گیا
جواب دیجیے اگر آپ کو پسند آئے"۔ دعوت نامہ ملنے والے اکثر حضرات آخری الفاظ پر ہی زیادہ عمل کرتے ہیں اور بہت
وگ ایسے دیکھے گئے ہیں جن کو جواب دینا یا اطلاع دینا پسند آتا ہے اور یہ فقرہ "جواب سے مطلع فرمایئے" بھی ایک
سی اطلاع ہو کر رہ گیا ہے، لیکن میزبان حضرات دعوت ناموں کی ان رسمی ضروریات سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے ہیں
خاص بات جو آج کل اس ضمن میں دیکھنے میں آ رہی ہے وہ ہے ناموں کی بھرمار۔ بعض دعوت ناموں میں تو خاندان کے
رخوار بچوں سے لے کر عمر رسیدہ تمام بزرگوں تک کا نام مختلف حیثیت سے درج کیا ہوا ہوتا ہے اور اس طرح کارڈ
چ ہونے والی پوری رقم کی ایک ایک پائی وصول کی جاتی ہے مثلاً ایک دعوت نامہ ہمیں ملا جس میں شادی میں
ن کی درخواست کی گئی تھی۔ دعوت نامے کی ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ دعوت نامہ دولہا کے دادا دادی کی طرف سے تھا۔
ت کے متمنی دولہا کے ماں باپ تھے، بصورت معذرت دولہا کے بھتیجے بھتیجیوں کو اطلاع دینی تھی، بقیہ رشتے داروں
دوستوں کا حق اس طرح ادا کیا گیا تھا کہ ان سب کے نام چشم براہ کے عنوان کے تحت درج تھے جن میں ہماری اطلاع کے
ہی کچھ شیر خوار بچے بھی شامل تھے اور آخر میں "جواب سے مطلع فرمایئے" میں دولہا کے بہن بھائیوں، بہنوئیوں، اور
دجوں کی ایک لمبی فہرست اور ان کے فون نمبر درج تھے۔ میزبانوں میں ہمارے ایک بے تکلف دوست بھی شامل
۔ ہم نے ان سے عرض کیا کہ اتنی زحمت کی کیا ضرورت تھی، صرف دولہا کا شجرۂ نسب تمام مہمانوں کو روانہ کر دیتے کام
جاتا۔ اس ذرا سی بات پر وہ ہم سے ناراض ہو گئے اور آئندہ کافی عرصے تک ہمیں ان کی طرف سے کوئی دعوت نامہ
ملا۔

اس قسم کے دعوت ناموں میں بعض اوقات تو یہ پتہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ کس کی شادی ہے اور کون بلا رہا
۔ یہ دعوت نامے، دعوت نامے کم ہوتے ہیں اور میمنے زیادہ لگتے ہیں۔ پھر ایک اور مشکل یہ درپیش آتی ہے کہ یہ کس طرح پتہ کیا
ئے کہ ان ناموں کی لمبی چوڑی فہرست میں سے آپ کا میزبان کون ہے۔ یہ دریافت کرنا بھی ایک کارِ دارد ہے۔
ان کی بلا سے اگر مہمان کو پڑھنے اور سمجھنے میں دقت یا زحمت ہوتی ہے تو ہوا کرے اس کا مقصد تو اپنی اور اپنے اہل
ان کی شہرت کرنا تھا سو وہ حاصل ہو گیا۔ اس قسم کے گنجلک دعوت ناموں کی وجہ سے بعض اوقات مہمانوں سے لطیفے
سرزد ہوتے ہیں۔ ناموں کی اس بھیڑ میں سے میزبان کا نام اور دولہا اور دلہن کا نام نکالنا بھی جوئے شیر لانے سے کسی
کم نہیں ہوتا۔ اس کوشش میں ہوتا یہ ہے کہ کبھی تو آپ والدین کو ان کی شادی پر مبارکباد دے رہے ہوتے ہیں اور
دولہا کے دادا کے نام یا اس کے بھتیجوں کے نام "کامیاب و کامران شادی شدہ زندگی گزارنے کی دعاؤں" کے
پہنچتا ہے۔ اس سلسلے میں مزید دشواری مبارک باد کے نمبر والے تار پیدا کر دیتے ہیں جن میں ذرا سی بے پروائی سے
بجائے بہتر ہونے کے خراب ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ خود ہمارے ساتھ کئی دفعہ ایسا ہو چکا ہے کہ ہم نے دولہا کے
"آپ کے فرزند کی شادی پر دلی مبارک باد" والا تار بھیجا، لیکن نہ جانے نمبروں میں کیا گھپلا ہوا کہ ان کو "طویل

جواب سے مطلع فرمایئے

اظہر حسن صدیقی

اور خوش گوار ازدواجی زندگی کے لیے بہترین خواہشات" والا تار موصول ہوا اور حد تو یہ ہوئی کہ ایک عزیز کی لڑکی کی شادی پر ہم نے ان کو "آپ کی دختر کی شادی پر دلی مبارک باد" والا تار ارسال کیا، مگر خدا جانے ٹائپ کی غلطی ہوئی یا پھر وہی نمبروں کا گھپلا ہوا کہ انھوں نے تار کا لفافہ کھولا تو وہاں یہ مضمون تھا "آپ کو یہ پُر مسرّت دن بار بار نصیب ہو۔"

وہ تو بڑا غنیمت ہے کہ ڈاک خانے والوں نے تعزیت اور عیادت کے لیے کچھ عبارتیں اپنے تاروں میں مخصوص نہیں کی ہیں ورنہ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہم کسی کو تعزیت نامہ بھیجیں تو یقیناً اس کو "بحفاظت اور خوش گوار سفر کے لیے بہترین خواہشات" والا تار ملے گا اور اگر کسی کی عیادت کے لیے "گیٹ ویل" GET WELL والا تار بھیجیں تو اسے شاید "نومولود کی پیدائش پر بہترین مبارکباد" والا تار نہایت خوش نما اور پھول دار لفافے میں ہماری طرف سے ملے گا۔

سید ثروت ضحیٰ

گلاب اور موتیا

اُسے گلاب ہمیشہ سے پسند تھا — مگر آخر میں کیا ہوا اسے موتیا کو پسند کرنا پڑا — موتیا کی خوشبو بھی مسحور کن تھی۔ اور موتیا ہوتا بھی اچھا ہے — مگر اس کی پسند گلاب تھی، اور پسند پھر پسند ہوتی ہے۔

موتیا اور گلاب کا موازنہ کرنا اب اس کا روز کا معمول تھا۔ آخر — مجھے خوشبو ہی چاہیے تھی، سو وہ تو مل رہی ہے۔ مگر نہیں — ! اگر میرے پاس گلاب ہوتا تو میں زیادہ مطمئن رہتا — یہ تمہارا خیال ہے — اس کے دل نے سرگوشی کی — گلاب سے بھی تمہارا دل بھر جاتا — اور پھر تم چنبیلی کی جستجو شروع کر دیتے — اس کا دل اس کی کمزوریاں ایک ایک کر کے گنوا رہا تھا۔

نہیں — ! میں ایسا تو نہیں ہوں، مجھے خوشبو کی جستجو ہے۔ میں خوشبو کا دیوانہ ہوں۔ میں کبھی گلاب سے بے وفائی نہیں کر سکتا — اور اس کا دل اس کی حالت دیکھ کر اور تنگ کرنے پر اتر آتا ہے۔

گلاب اور موتیا ہی کی طرح کا فرق صولت کی بیوی اور اس کی محبوبہ میں تھا — وہ نائلہ سے شادی تو نہیں کر سکا تھا، مگر وہ اس گلاب تک بھلا بھی نہیں سکا تھا — اور اس کو بھول جانا اتنا آسان بھی نہ تھا — نائلہ کے ساتھ گزرے ہوئے دن ایک زمانے پر محیط تھے — اور نائلہ سے بچھڑ جانے کے بعد زمانہ ہر قدم پر کسی نہ کسی طور وہ لمحے واپس لاتا رہا — کسی نئی شکل میں — اور نائلہ کی یاد ہمیشہ ابھرتی رہی — جب ہی صولت کبھی کبھی یہ سوچتا تھا کہ نہ معلوم لوگ کیسے کہہ دیتے ہیں کہ بھول جاؤ سب کچھ! وہ سوچتا تھا — کیسے بھول جاؤں!!

اس کی بیوی بھی تو کسی طور کم نہ تھی، مگر — !! وہی موتیا اور گلاب کا تنازعہ صولت کے دماغ پر چھایا رہتا تھا۔ وہ موتیا کو بہت عزیز تھا اور وہ — ! وہ گلاب کو عزیز رکھتا تھا — ہر وقت ہر گھڑی وہ گلاب کی خوشبو ڈھونڈتا رہتا تھا مگر گلاب کو کیا خبر — کہ کوئی اب تک اس کی خوشبو کا دیوانہ ہے۔

سنا تھا کہ نائلہ کی زندگی بھی اچھی گزر رہی تھی۔ اس کے تین بچے تھے — گھر، دولت اور عزت یہ سب ہی کچھ اس کے پاس تھا — !! نائلہ اور صولت کی شادی نہ ہونے کا بڑا سبب صولت کی دوری تھی — !! صولت اس سے بہت دور تھا اور سماجی [illegible] — اور خود نائلہ بھی کچھ نہ کر سکی۔ جب صولت کو نائلہ کی شادی کی خبر ملی تھی تو اس

کو محسوس ہوا کہ کسی نے اس کو "عمر قید" کی سزا سنا دی ہے ——!! عمر قید ملنے کے بعد ہر آدمی کا دن ہزاروں پل کا ہو جاتا ہے اور لگتا ہے کہ وہ ابھی میں قید ہو گیا ہے ——!! بس یہی کچھ —— صولت کو بھی محسوس ہونے لگا تھا —— وہ سوچتا کہ اس کا پسندیدہ گلاب کسی نے اس سے چھین لیا ہے۔

پھر جو کچھ بھی ہوا، وہ کسی سے چھپا نہ رہ سکا۔ صولت نے واپسی پر بہت قیامت مچائی —— وہ بزرگوں سے حساب مانگ رہا تھا —— مگر وہ کیا حساب دیتے۔ سب ہی ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے ——!! صولت سے خوشبو بچھڑ گئی تھی، مگر یادوں نے پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اب ایک انجانی تکلیف میں رہنے لگا تھا —— اور اسی تکلیف کا علاج اس کے گھر والوں نے اس طرح کیا کہ اس کی بھی شادی کر دی ——!!

اس کی شادی بھی کامیاب زندگی کی ایک زندہ مثال تھی۔ اس کے پاس بھی تمام وہ چیزیں موجود تھیں جو کامیاب زندگی گزارنے کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ ہاں! مگر اس کے پاس گلاب نہ تھا —— اور بس یہی کمی اس کو چین نہیں لینے دیتی تھی۔ نائلہ کے حسین ریشمی بال، دراز قد، ہرن جیسی چال اب اس کے پاس نہیں تھے —— مگر یہی چیزیں کسی اور رنگ میں اس کے ساتھ ساتھ تھیں ——!!

ایک بار —— ایک بھری تقریب میں دونوں نے ایک دوسرے کو تنہا تنہا دیکھا ——!! دونوں نے ایک دوسرے کی خیریت پوچھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے جھوٹ بولتے رہے —— نائلہ کا ہر جھوٹ، صولت کی محبت کے لیے بڑا مؤثر تھا ——!! صولت کو خوشی ہو رہی تھی کہ نائلہ اس سے جھوٹ بول رہی ہے —— کیوں کہ وہ جھوٹ بول رہی تھی محض یہ جتانے کے لیے کہ وہ بہت خوش ہے ——!! صولت بازی ہار کر بھی خود کو جیتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

نائلہ سے اس مختصر ملاقات کے بعد، یہ اس کا روز کا معمول ہو گیا تھا۔ وہ ہر وقت موازنہ کرتا رہتا تھا —— بیوی اور نائلہ میں۔ دیکھو ——! نائلہ کتنی حسین ہے۔ اس نے سوچا، مگر اسی لمحے اس کی نظر کمرے میں لگی اس کی بیوی کی تصویر پر پڑ گئی —— وہ بھی کم حسین نہ تھی ——!! نہیں مگر نائلہ کی آواز کس قدر حسین ہے ——!! تو اس کو خیال آیا کہ اس کی بیوی کی آواز کی تو دنیا دیوانی ہے۔ وہ ایک مشہور گلوکارہ تھی۔ کچھ بھی ہو —— مگر نائلہ والی بات نہیں ہے۔ صولت نے خود ہی فیصلہ صادر کر دیا —— اور صولت کی آخری دلیل یہی تھی کہ گلاب کی جگہ کبھی موتیا نہیں لے سکتا اور بس گلاب ہی مجھے پسند ہے۔

دماغ اور دل دونوں باغی ہو چکے تھے —— وہ ایک مضبوط انسان ہونے کے باوجود، اب کافی باتوں میں کمزور ہو گیا تھا —— اور نائلہ! وہ بے چاری تو اپنی سب پچھلی باتوں کو روز یاد کرتی تھی اور روز ہی بھلا دیتی تھی —— صولت نے جب نائلہ سے ایک روز براہ راست اس کیفیت کا ذکر کیا تو وہ بہت حیران ہوئی —— نائلہ! —— میں ہار گیا —— میں تمہیں بھلا نہیں سکا۔ صولت نے راز دل سے آگاہ کیا۔

یہ ہار کہاں ہے۔ یہ تمہاری جیت ہے صولت ——!! نائلہ نے ہلکے سے جواب دیا ——!! تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟ یہ تمہاری جیت ہے —— تم اگر مجھے بھلا دیتے تو، وہ تمہاری ہار ہوتی ——!! مگر —— یاد کرنے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے! تم میری طرح —— یاد کیا کرو —— میری طرح ——!!

سیّد ثروت صُحّی

گلاب اور موتیا

نائلہ کی ہنستی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ صولت کو محسوس ہوا کہ گلاب پر شبنم برس رہی ہے ——! اس نے شبنم کے قطروں کو سمیٹنا چاہا —— مگر نائلہ خود پہلے سمٹ گئی —— اور جبھی صولت کو یقین ہو گیا کہ نائلہ اب اس کی نہیں رہی —— وہ گلاب کسی اور کا ہو چکا ہے ——!!

دونوں نے عہد کر لیا کہ وہ اب ایک دوسرے کے سامنے کبھی نہیں آئیں گے —— وہ اگر سامنے آئے بھی تو وہ اجنبی بن جائیں گے —— عہد کرنے کو تو کر لیا تھا، مگر دل بہت پریشان تھا —— کمزور صولت کو اس کے دل نے کہا کہ عہد سے کیا ہوتا ہے۔ مگر صولت کو معلوم تھا کہ کچھ باتیں دل کے برخلاف کرنے ہی میں عافیت ہوتی ہے۔

کیا ہوا —— ؟ کچھ پریشان لگ رہے ہیں، اس کی بیوی نے پوچھا۔ نہیں کوئی بات نہیں —— بس تھکن سی ہے دل بڑا بوجھل ہو رہا ہے —— صولت نے جواب دیا۔

بوجھل کیوں نہ ہوگا ——!! اس کی بیوی نے کہا۔

صولت کو لگا جیسے اس نے اس کی چوری پکڑ لی ہے —— کیا مطلب —— ؟

مطلب یہی کہ —— روز منع کرتی ہوں —— روزانہ صبح کا آغاز اخبار سے نہ کیا کریں —— ہر طرف چیخ پکار، ہر طرف ہنگامہ آرائی، ہر طرف کہرام —— پھر ایسے میں کوئی انسان بھلا کیسے سکون سے جی سکتا ہے —— میں اسی لیے اخبار کو اب ہاتھ بھی نہیں لگاتی ——!!

صولت کو اپنی بیوی کی معصومیت پر بہت پیار آیا —— کتنی اچھی ہو تم —— دنیا سے بے خبر —— اور مجھ سے بھی بے خبر ——!!

چلو، تھوڑی دیر سو جاؤ، پھر سے تر و تازہ ہو جاؤ گے —— صولت کو بھی یہ بات بھلی لگی —— اور وہ کچھ ہی دیر بعد نیند کے جھولے جھول رہا تھا ——!!

اس نے خواب دیکھا —— وہ اک باغ سے گلاب توڑ رہا ہے۔ پھر وہ بہت سارے گلاب توڑ کر اپنے گھر آ گیا۔ گھر آ کر دیکھا تو اس کی عدم موجودگی میں کوئی گھر کا صفایا کر گیا تھا۔ سامنے پڑے ہوئے گلدان سے سارے موتیا بھی غائب تھے!!

موتیا اس کو زیادہ پسند تو نہ تھا، مگر اب اس کی خوشبو سے بہت انسیت ہو گئی تھی، وہ بہت پریشان پھر رہا ہے۔ پھر جب اس کو ذرا ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ سارے گلاب جو وہ جمع کر کے لایا تھا اب مرجھا گئے ہیں۔ وہ پریشانی کے عالم میں زمین پہ ڈال کر گھر میں موتیا ڈھونڈ رہا تھا —— اور سخت گرم زمین نے اک اک کر کے سارے گلابوں کو جھلسا دیا تھا ——!!

اب اس کے پاس نہ گلاب تھا اور نہ ہی موتیا —— !! وہ رونے لگا —— اور اسی دوران اس کی آنکھ کھل گئی —— اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی ہلکے ہلکے سروں میں ریاض کر رہی ہے ——!! یہ گیت بھی کوئی محبت کا گیت تھا وہ آنکھیں موند کر کے گیت سنتا رہا ——!! اور اس نے عہد دہرایا کہ اب وہ گلاب اور موتیا کا موازنہ کبھی نہیں کرے گا کیوں کہ جس کو گلاب ملنا تھا مل گیا —— اور جس کو موتیا ملنا تھا —— مل گیا!!

یہی زندہ حقیقت ہے۔

▲▲
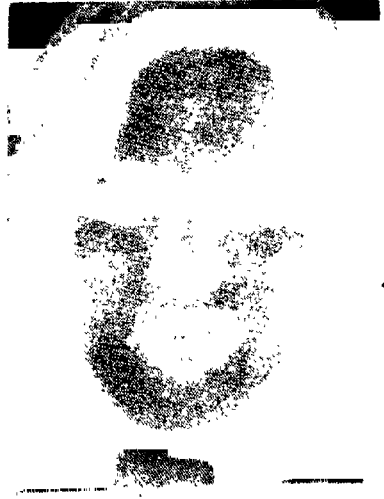
محمد خالد اختر • اکرام بریلوی • ممتاز احمد خاں • نکہت بریلوی

نئی کتابیں

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

ایک قاری کی سرگزشت

(منتخب مضامین اور تبصرے)

مصنف : کریم بخش خالد

صفحات : ۳۰۴ • قیمت : سو روپے

ناشر : پندرھویں صدی ہجری مطبوعات سی-۱/۴ جیکب لائنز ہاؤسنگ کمپلیکس کراچی ۷۴۴۰۰

کریم بخش خالد کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں۔ وہ سندھی اور اردو دونوں زبانوں کے معروف ادیب ہیں اور اس وقت تک ان کی چھتیس تصنیفات طبع ہو چکی ہیں۔ پچھلے برس ہی ان کو ان کی سیرت النبیؐ کی سندھی کتاب "محمد رسول اللہؐ" پر حکومت نے سندِ امتیاز کے ساتھ دس ہزار روپے کا انعام بھی دیا۔ ان کی دس کتابیں انجمن مصنفین پاکستان اور دوسرے قومی اداروں سے انعام کی مستحق قرار پا چکی ہیں۔ ان تصنیفات کے علاوہ صحافت، عمرانیات، لطیفیات، شخصیات جیسے موضوعات پر چالیس سے اوپر ایسی کتابیں ہیں جن کی انھوں نے ترتیب اور تدوین کی ہے۔ انہی موضوعات پر ان کی پندرہ کتابیں ابھی زیرِ طبع ہیں۔ اس سے ان کے تصنیف و تالیف سے شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ کریم بخش خالد حکومت سندھ کے شعبۂ تعلقاتِ عامہ کے ڈائرکٹر جنرل بھی رہ چکے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب اردو زبان میں ان کی پہلی تصنیف ہے اس لحاظ سے کہ اس میں انھوں نے اپنے وہ منتخب تبصرے اور مضامین یکجا کر دے ہیں جو مختلف تعارفی تقریبات کے لیے مختلف وقتوں میں لکھے گئے۔ انھیں اردو زبان پر پوری دسترس حاصل ہے اور ان مضامین کو پڑھتے ہوئے کہیں احساس نہیں ہوتا کہ اردو ان کے لیے اکتسابی زبان ہے۔ وہ اپنے مطالب کا اظہار بڑی خوبی اور بے تکلفی سے اردو میں ادا کر جاتے ہیں اور اکثر لگی لپٹی رکھے بغیر۔ سیرت النبیؐ اور دوسری کتابوں پر (جن میں محمد طفیل مرحوم کی "محترم" اور شیخ ایاز کے شاہ لطیف کے کلام کا منظوم ترجمہ بھی شامل ہیں) ان کے تبصرے بے لاگ اور پر لطف ہیں۔ وہ ان کی خامیوں کو قطعی معاف نہیں کرتے اور اپنے معنی خیز دو ٹوک انداز میں وہ سب کچھ کہہ دیتے ہیں جو وہ کہنا چاہتے ہیں۔ ہاں ان کی تنقید ٹھوس علمی دلائل سے کہیں انحراف نہیں کرتی اور وہ ہوا میں تیر نہیں چھوڑتے۔ سندھ کے ادبی، تاریخی اور تہذیبی ورثے پر ان کی معلومات وسیع اور مرعوب کن ہیں۔ کتاب اچھی چھپی ہے۔ گرد پوش آذر زردبی کے موقلم نے تیار کیا ہے۔ اس کی پشت پر ایک تصویر میں جناب کریم بخش خالد کو صدر پاکستان سے ہاتھ ملاتے اور دوسرے ہاتھ سے سندِ امتیاز وصول کرتے دکھایا گیا ہے۔

——— محمد خالد اختر

اکرام بریلوی

ڈسٹی نیشن مین ہول

(ناول)

مصنف : فہیم اعظمی

صفحات : ۳۱۱ ، قیمت : پچھتر روپے

ناشر : الباقریہ پبلی کیشنز، سی۔۴۰ ابلاک۔۲ فیڈرل بی ایریا، کراچی ۳۸

ڈاکٹر فہیم اعظمی اردو ادب کی مشہور و معتبر شخصیت ہیں۔ انھوں نے افسانہ و ناول نگاری کے فن میں بہت جلد نام پیدا کیا ہے اور ایسا کہ ان کا ذکر کیے بغیر فکشن کی تاریخ مکمل تصور نہیں کی جاسکتی۔ "ڈسٹی نیشن مین ہول" "بہت دیر ہو چکی" (سن ۱۹۶۰ء) اور "جنم کنڈلی" (سن ۱۹۸۳ء) کی مقبولیت کے بعد ان کا تیسرا ادبی ناول ہے جو پچھلے دو ناولوں سے اس لیے مختلف ہے کہ اس میں اسلوبیاتی انداز کے ساتھ حقیقت پسندی، جدیدیت اور عصری واقعیت کی بڑی ہنرمندانہ عکاسی کی گئی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے انھوں نے ہند آریائی اور یونانی دیومالا کا سہارا لیتے ہوئے ناول کی ماورائی کیفیت کو بڑے توازن کے ساتھ سمو دیا ہے اور اس فنی عمل نے ناول کی ادبی حیثیت میں اک گونا حسن پیدا کر دیا ہے۔

یہ ناول بقول محمد علی صدیقی "ایک ایسے گروہ کے ابتکار کی روداد پیش کرتا ہے جس نے ایک CAUSE کے حصول کے لیے اپنے آبائی وطن کے کنج عافیت کو خیرباد کہا۔ یہ گروہ صفاتی طور پر مختلف سماج کے REJECTIONIST MOULD میں اپنا خیمہ گاڑتا ہے اور پھر ایسے تجربات سے گزرتا ہے جو بیک وقت ہنساتے اور رُلاتے ہیں"۔ اس سے قطع نظر، مجھے یہ ناول پڑھتے ہوئے بٹلر اور سوئفٹ کے ناول "دی وے آف آل فلش" (THE WAY OF ALL FLESH) اور "گلیورس ٹریولز" (GULLIVER'S TRAVEL'S) بے ساختہ یاد آئے۔ شاید اس لیے کہ "دی وے آف آل فلش" میں وکٹورین دور کی ساختہ پرداختہ عیسائیت اور بورژوا معاشرے کو طنز کا ہدف بنایا گیا ہے جبکہ "گلیورس ٹریولز" میں سنہ ۱۷۱۴ء کے بعد کی برطانوی سیاست کی چپقلش کے علاوہ اس عہد کی سماجی اور معاشی فضا کو پیش کرتے ہوئے اس پر طنز کی کاری ضرب لگائی گئی ہے۔

حقیقت میں اسی انداز کی حقیقیوں (REALITIES) کو بڑے عمدہ علامتی پردے میں، اس ناول کی بُنت میں سمویا گیا ہے جو در اصل ان کے ذہنی کرب کا طویل نفسیاتی سفر ہے۔ فہیم اعظمی نے اپنے اس ذہنی کرب کے سفر کی داستان کو علامتی کرداروں ——— صابر، شاکر اور سیما ——— کا سہارا لیتے ہوئے بیان کیا ہے جس میں بلا کی دیومالائی رمز و اشاریت کے ساتھ ناول کی ادبی حیثیت کو قائم رکھا گیا ہے اور جس سے ناول میں ایک طرح کی فنی بلندی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ تخلیقی عمل، جدیدیت اور بالکل نئی اسلوبیاتی ساخت کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے کہ حقیقت نگاری، ادب اور زندگی کی قدریں کسی طرح مجروح نہیں ہونے پاتیں۔ یہ ہیئت اور نیرنگ نظر کی ایک ایسی نادرہ کاری اور نادرہ جو علامت ہے جو جدید اردو ناول میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے اور اس پر ہمیں ڈاکٹر فہیم اعظمی کو کھلے دل سے داد دینا چاہیے۔ ناول کو صوری اعتبار سے بڑے بناؤ سنگار اور سلیقے سے شائع کیا ہے جس کے پیش نظر کتاب کی قیمت زیادہ نہیں۔

——— اکرام بریلوی

نئی دنیا

(ناول)

مصنف : قمر اجنالوی

صفحات : ۴۷۰ ، قیمت : ایک سو پچیس روپے

ناشر : مکتبہ القریش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور ۲

نئی دنیا، معروف صحافی، شاعر اور تاریخی، سماجی اور رومانی موضوعات پر لکھنے والے ناول نگار قمر اجنالوی کا ایک ایسا ناول ہے جس میں ایک اصول پرست اور بے باک صحافی کی زندگی کو قصّے کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ قمر اجنالوی چونکہ خود بھی صحافی ہیں لہٰذا ناول کے ہیرو کی سرگزشت میں حقیقت کا رنگ بھرنے میں کامیاب ہیں۔ عام طور پر صحافت کی مخصوص زندگی سے متعلق ناول نہیں لکھا جاتا مگر اتنا ہوتا ہے کہ کوئی کردار محض صحافی ہو، لیکن نئی دنیا میں نئی دنیا اخبار کے دفتر کو مصنّف نے حقیقت سے باخبری کی علامت بنا دیا ہے۔

اس ناول کا پلاٹ روایتی معنوں میں سیدھا سادا ہے اور مصنّف کا اسلوب بھی سادگی سے عبارت ہے۔ اس ناول میں انہوں نے معاشرتی برائیوں پر بھی تنقید کی ہے اور زندگی کی اعلیٰ اقدار کے حامل کرداروں کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کے بغیر زندگی میں سکون نہیں مل سکتا۔ تحریر کے لیے کہا گیا ہے کہ وہ مصنّف کی شخصیت کا ہی روپ ہوتی ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ نئی دنیا کے ہیرو کے روپ میں خود قمر اجنالوی جلوہ گر ہوں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اکثر ناولوں میں ناول نگار خود کسی نہ کسی کردار کی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ یہ ناول رجحان کے اعتبار سے رومانی حقیقت نگاری کے فن پر پورا اترتا ہے۔ ضخامت کو دیکھتے ہوئے قیمت مناسب ہے۔

——— ممتاز احمد خاں

تلافی
(مختصر افسانے)

مصنّف : محمد سعید شیخ

صفحات : ۱۹۲ ● قیمت : ساٹھ روپے

ناشر : نیرنگ خیال پبلیکیشنز۔ لیاقت روڈ راولپنڈی

مجھے محمد سعید شیخ کے یہ مختصر مختصر افسانے اچھے لگے ہیں بالخصوص ان کا سادہ، سیدھا اسلوب، ادبی آرائشوں اور جھالروں کے بغیر ان میں اردو کی جدید اور جدید تر کہانیوں کی برہنگی اور بنجرپن (BARE TO THE LOVE) کی رمق تو ہے جسے میں ذاتی طور پر پسند کرتا ہوں، مگر وہ اتنی علامتی۔ سرریلی، اور مبہم بھی نہیں کہ پڑھنے والے کو بھارت لہ بجھی پڑے۔ چند ایک کو تو سیدھی سادی روایتی انداز کی کہانیاں کہا جا سکتا ہے جیسی کہ پندرہ بیس برس پہلے ہمارے ادیب لکھا کرتے تھے۔ سومرسٹ ماہام کے الفاظ میں ابتدا، وسط اور انجام کی کہانیاں۔ جیسا کہ مصنّف نے خود اشارہ کیا ہے۔ اس نے اپنی کہانیوں میں اپنے 'اصل' کو پانے کی کوشش کی ہے۔ ایک بے سمت عہد میں بے نام جذبوں کے ساتھ خود شناسی اور خود شناختی کی کوشش۔ کتاب کے شروع میں لذت آگہی کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کی چھوٹی سی خوب صورت معرا نظم ان کہانیوں کے مزاج کی کنجی (KEY) ہے۔ میں محمد سعید شیخ کی کہانیوں کو زندگی کے درد، خوف، سوز اور گداز کے چھوٹے چھوٹے سادگی اور پُرکاری سے بنائے ہوئے مرقعے کہوں گا۔ یہ منی ایچر آرٹ ہے جس میں تصویروں کے رنگ گہرے اور بے سکون کرنے والے ہیں۔ ان سب کہانیوں کو اپنے فن کی جدت کے لیے پڑھا جانا چاہیے، لیکن میرے خیال میں اس مجموعے میں سب سے اچھی کہانی، تاریخ کی خوشبو ہے جسے بہت کم پڑھنے والے اپنی زندگی کے عرصے میں بھول پائیں گے۔

کتابت اور طباعت معیاری ہے مگر دست جیکٹ مجھے بالکل پسند نہیں آیا (جو عامیانہ ہے، اور کہانیوں کے لئے اچھے مجموعے کے لئے بھی ناموزوں، شاید راولپنڈی میں اچھے آرٹسٹوں کا فقدان ہے (گو اچھے افسانہ نگار بہ کثرت ہیں)

——— محمد خالد اختر

دھنک
(شعری مجموعہ)

مصنّف : صہبا ساقی

صفحات : ۲۲۴ ● قیمت : چالیس روپے

ناشر ـ کامران اکیڈمی ۸۰۔ بی ۔ پی ای سی ایچ ... ہاؤسنگ سوسائٹی بلاک ۸-۷ کراچی ۵

صہبا ساقی ان شعرا میں سے ہیں جو ستائش اور صلے سے بے نیاز اپنی دھن میں مگن فن کی جوت جگاتے رہتے ہیں۔ ایک مدّت کے بعد ان کا مجموعۂ کلام "دھنک" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں ان کی غزلیں، نظمیں، قطعات اور گیت شامل ہیں۔ صہبا ساقی ایک کہنہ مشق اور روایت آشنا شاعر ہیں اور درد مند دل رکھتے ہیں چنانچہ ان کی غزل میں غزل کی حقیقی فضا ملتی ہے اور وہ سوز و گداز پایا جاتا ہے جو غزل کی جان ہے۔

مجموعے میں شامل نظموں کے موضوعاتی تنوّع نے واقعی دھنک رنگ جیسی کیفیت پیدا کردی ہے۔ ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ صہبا ساقی اپنے وطن سے اپنے لوگوں سے کس درجہ محبت کرتے ہیں اور ان کے دل میں انسان دوستی کا کتنا جذبہ موجزن ہے ان کی گیت نگاری کے بارے میں نگار صہبائی کا یہ جملہ کافی وضاحت کا حامل ہے کہ "صہبا ساقی کے گیتوں میں گیت کا رس بھرا ہے" دھنک میں پروفیسر انجم اعظمی، ڈاکٹر فہیم اعظمی، سرشار صدیقی، قمر ہاشمی وغیرہ جیسے اہلِ دانش کی توصیفی آرا شامل ہیں۔ سہ رنگے خوب صورت سرورق اور نظموں کو مصورانہ تزئین کاری کے ذریعے سجاکر "دھنک" کو سچ مچ دلکش بنا دیا گیا ہے۔

راشد نور ــــــــــــ

حکم نامہ
(شاعری)

مصنف: سلطان سبحانی
صفحات: ۱۲۸ • قیمت: بیس روپے ۲۰/-
ناشر: ہم زبان پبلیکیشنز ۱۹۳ - ایم ایچ بی کالونی مالیگاؤں - ناسک

حکم نامہ، ایک شاعری کی کتاب کے لیے کچھ انوکھا اور عجیب سا نام ہے، مگر جیسا کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے۔ یہ اتنا عجیب بھی نہیں۔ انھوں نے اس نام کو موزوں اور برمحل بتایا ہے کیوں کہ شاعری شاعر خود نہیں لکھتا بلکہ اس کا اندر کا جن اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے لکھواتا ہے۔ ایک حکم کے تحت۔ اس بات سے یقیناً انکار نہیں کیا جاسکتا جو شاعری زبردستی یا طبیعت پر زور ڈال کر کی جاتی ہے۔ اکثر محض قافیہ پیمائی ہوتی ہے کوئی جادو نہیں جگاتی۔

ہندوستانی نوجوان شاعر سلطان سبحانی ایک اچھے شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں درد مندی اور گداز کی کیفیات رچی بسی ہیں۔ ان کے شعر میں تازگی ہے نئے استعارے نئے امیجز، نئے خیالات، یہ پھیکی، گھسی پٹی مردہ شاعری ہرگز نہیں۔ ان کی ایک چھوٹی سی نظم "سورما" یوں ہے ؎

بتا سورما!
تو نے کتنے گھروں کو جلایا
کتنے معصوم بچوں کو چیرا
کیا تجھے علم ہے
ان میں تیرا بچہ بھی کھڑا تھا

اس مجموعے میں پچاس سے اوپر غزلیں ہیں اور چالیس کے قریب نظمیں۔ نظمیں سب کی سب آزاد بحر میں ہیں اور ان میں ایک دلکش معصومیت اور دلیری ہے جو پڑھنے والے کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔

بلاشبہ سلطان سبحانی اردو شاعری میں ایک نئی اور منفرد آواز ہیں۔

ــــــــــــ محمد خالد اختر

نکہت بریلوی

خواب دریچے

(شعری مجموعہ)

مصنفہ : وضاحت نسیم
صفحات : ۱۵۲ • قیمت : پینتالیس روپے ۴۵/-
ناشر : افسر پبلی کیشنز ۱۸/۵۹۴ سمن آباد فیڈرل بی ایریا کراچی

ادبی حلقوں اور شعر و ادب کے شائقین کے لیے وضاحت نسیم کا نام نہیں۔ اعمر کوئی بیس بائیس سال سے ان کی شاعری مشاعروں اور رسالوں میں سنی اور پڑھی جا رہی ہے۔ اب ماشاء اللہ نہایت دیدہ زیب انداز میں "خواب دریچے" کے عنوان سے ان کا پہلا مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آیا ہے جس میں غزلیں، نظمیں اور چند ہائیکو شامل ہیں۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وضاحت نسیم کے ہاں آج کے بیشتر شعراء اور شاعرات کی طرح روایت بیزاری اور فنی تقاضوں سے انحراف کا میلان نہیں پایا جاتا اسی لیے ان کی غزل میں غزل کا رچاؤ ہے اور نظم میں خیالات و احساسات کی ترتیب و تنظیم کا سلیقہ جھلکتا ہے۔ "خواب دریچے" کا مجموعی تاثر تکلف اور تصنع سے پاک سیدھے سچے پیرائے میں اظہارِ جذبات کا آئینہ دار ہے اور اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتا ہے۔ اس بنیاد پر وضاحت نسیم سے آئندہ اور بہتر توقعات بے جا نہیں۔

دیباچے میں مشفق خواجہ اور فلیپ پر رئیس امروہوی نے ان کی شاعری کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ کتاب اچھے گیٹ اپ سے شائع ہوئی۔

——— نکہت بریلوی

سروجنی نائیڈو کی نمائندہ نظمیں

(منظوم اردو ترجمے)

مترجم : ثاقب رزمی
صفحات : ۳۰۰ • قیمت : پینسٹھ روپے
ناشر : نگارشات ۲۴ ٹمپل روڈ۔ لاہور

ہمارے ایامِ طفولیت اور شباب کی بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو بہت سی خوبیوں اور کمالات کی خاتون تھیں۔ خوش گفتار، بھگت صفت، دردمند، انتہائی مہذب۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرر تھیں اور انھوں نے اپنے ملک کی جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مگر ان کا اصل جوہر ان کی شاعری میں تھا جو اپنی نغمگی، بہاؤ، شدتِ احساس اور اچھوتی امیجری سے عبارت ہے۔ ان کی یہ شاعری ساری کی ساری انگریزی زبان میں ہے جس پر ان کو حیرت ناک عبور تھا اور ان کی بعض نظموں کو انگلستان کے نقادوں نے قابلِ وقعت تسلیم کیا ہے۔ اس باکمال شاعرہ نے ۱۹۴۹ء میں ستر برس کی عمر میں انتقال کیا، اس وقت وہ اترپردیش کی گورنر تھیں۔

ثاقب رزمی نے اپنی زیرِ نظر کتاب میں سروجنی نائیڈو کی سو منتخب نظموں کے ترجمے پیش کر کے ایک اہم کام کو نہایت خوبی اور سلیقے سے سرانجام دیا ہے۔ یہ ترجمے شدہ معرّا اور ایک ہی بحر کی نظمیں اصل انگریزی نظموں کی رنگیں ادائی، ان کا رومانی اور جمالیاتی احساس قاری تک پہنچاتی ہیں۔ دوسری زبان کی شاعری کے ترجمے میں ہم اس سے زیادہ توقع بھی نہیں کر سکتے۔ قدرتی طور پر معرّا نظم میں اصل کی نغمگی اور غنائیت جو سروجنی نائیڈو کی شاعری کا امتیاز ہے پورے طور پر کوئی مترجم بھی نہیں پہنچا سکتا تاہم میں ان ترجموں کو کامیاب کاوش کہوں گا جو اپنے رنگ میں خوبصورت اور اثرانگیز ہیں۔

——— محمد خالد اختر

چار نئی کتابیں

یارانِ محفل

محفل

(چند خطوط)

ڈاکٹر منیر الدین احمد

(ہیمبرگ)

آج کی ڈاک سے "افکار" کا تازہ شمارہ "نذرِ زدبی"، موصول ہوا۔ اس کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ آزر زدبی سے تو خیر سرورق پر ملاقات ہوگئی۔ اندرونی صفحات پر ان کی زندگی کے کئی پہلو سامنے آتے چلے گئے۔ بالخصوص ان کے مجسموں، تصویروں اور پنسل ورک کی طباعت دیر تک یاد کی جاتی رہے گی۔ تم نے پھر ایک بار کارنامہ سر انجام دے دیا ہے اور زندہ دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ رسالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک چیز بار بار کھٹکتی رہی ہے اور وہ ہے آذر کا ہجا، جو سارے رسالے میں گڈمڈ ہو کر رہ گیا ہے۔ خود زدبی اپنے نام کو "آذر" (ذال سے) لکھتے ہیں مگر رسالے میں بیشتر جگہوں پر "آزر" (ز سے) لکھا گیا ہے۔ حتیٰ کہ جناب راغب مراد آبادی نے جو تاریخ نکالی ہے وہ بھی ز سے نکالی ہے۔[1] انھیں پھر ایک بار شاعری کی دیوی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

پروفیسر ضیا علیگ

(کنیڈا)

زدبی نمبر ملا، دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ اس کی دیدہ زیبی اور دل آویزی سے کون انکار کر سکتا ہے، اس میں آب بھی ہے تاب بھی۔ دل نشینی بھی، دل فریبی بھی۔ صوری اعتبار سے بھی دل کش اور معنوی نقطۂ نظر سے بھی بھاری بھرکم۔ تم نے، سحر انصاری اور اکرام بریلوی نے مشترکہ طور پر جو ان کا انٹرویو لیا ہے وہ تو دلچسپ ہے ہی، مگر السیند در بوساق کا مضمون روحانی نظریۂ فن کا نقیب بے انتہا معلوماتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض ادیبوں کے مضامین جو ہم میں اب موجود نہیں ہیں مثلاً سعادت حسن منٹو، حسن عسکری مجتبیٰ حسین وغیرہم لائقِ تحسین بھی ہیں اور قابلِ توجہ بھی۔ قرۃ العین حیدر کے مضمون "اشاریت کی نئی سمتیں اور زدبی" اپنی طرف توجہ

---

[1] آذر فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں آگ، اور آزر عربی کا لفظ۔ لغت میں تحریر ہے کہ آزر حضرت ابراہیمؑ کے چچا کا نام ہے جو بت تراش تھے۔ صوتی اعتبار سے ذ اور ز میں جو مماثلت ہے اسے ہم نے "نذرِ زدبی" میں دانستہ طور پر جائز قرار دیا ہے اور دونوں حروف استعمال کیے گئے۔ ———— صہبا

مرکوز کرلیتا ہے۔ محمد علی صدیقی کا لکھا ہوا اداریہ اور مضمون "ایک دبستان/ایک عہد" زوبی کے تعلق سے، ان کی تنقیدی صلاحیتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انور عنایت اللہ، شبنم رومانی، جوگندر پال اور انور سدید نے بھی زوبی کی فنکارانہ صلاحیتوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار بڑی خوبصورتی اور دیدہ وری کے ساتھ کیا ہے۔

مردہ پرستی اور روایت پسندی کے اس دور میں زوبی نمبر نکال کر ایک بار پھر تم نے نہ صرف زندہ دوستی کا ثبوت دیا ہے بلکہ آج کے انسان کی کج روی اور کم فہمی کے خلاف بغاوت بھی کی ہے اور بات صرف یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ایک عظیم فن کار کے فن کی مختلف جہتوں اور پرتوں کو سمجھنے کا موقع بھی اس کی زندگی میں افکار پڑھنے والوں کو مہیا کیا ہے۔ زوبی کی اشاعت پر ایک بار پھر مبارکباد قبول کرو۔

رشید منظر

(لندن)

جولائی کا شمارہ تخلیقات کے لحاظ سے کافی وقیع ہے۔ نظموں میں اختر الایمان کی نظم 'بے نام جذبہ'، احمد ظفر کی نظم 'شجر یادکا' اور غزلوں میں محشر بدایونی، مظفر حسین رزمی، باقر نقوی اور زاہد سعید زاہد کا کلام پسند آیا۔ ڈاکٹر شمیم حنفی کا اشاریہ بڑے سلیقے سے لکھا گیا ہے اور توجہ طلب ہے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین کا مضمون گرانقدر ہونے کے ساتھ ہی انتہائی دلچسپ ہے۔

ماہ بہ ماہ پابندی کے ساتھ اتنا معیاری اور خوبصورت رسالہ نکالنے کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔ دعاگزار ہوں کہ خداوند کریم آپ کے جذبۂ خدمت کو اور توانائی بخشے۔

حضرت شاہ

(بریڈفورڈ)

آنرز زوبی نمبر نکالنے پر میری اور بزم اردو بریڈفورڈ کے دیگر احباب کی طرف سے مبارکباد قبول کریں۔

آنرز زوبی نمبر ایک ایسی نایاب دستاویز ہے جو کہ ہمارے سبھی دوستوں کو کام آئے گی خداوند کریم آپ کو اس کا اجر ضرور دے گا۔ بھائی محمد علی صدیقی کو سلام۔

مرزا ادیب

(لاہور)

آرام سے بیٹھنا تمہارے مقدر ہی میں نہیں۔ نئے نئے شوشے چھوڑتے رہتے ہو۔ انہی شوشوں کی وجہ سے ہی تو تم آج اردو ادب کی قابلِ فخر شخصیت بن گئے ہو۔ نذرِ زوبی تمہارا نیا زندہ رہنے والا کارنامہ ہے۔

یہ کافی مدت پہلے کی بات ہے کہ تم نے مجھ سے زوبی پر مضمون لکھنے کے لیے کہا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ اس مدت میں کوئی بھی عنصر آسودہ خواب ہو جاتا ہے مگر میں تم سے واقف ہوں۔ مجھے یقین تھا صہبا کے نحیف و نزار جسم کے اندر تو بجلیاں بھری ہوئی ہیں۔ یہ کام ہو کر رہے گا اور نذرِ زوبی نے ثابت کر دیا ہے کہ صہبا مردِ گفتار ہی نہیں۔ مردِ کردار بھی ہے۔

عجیب بات ہے دینے والے نے تمہیں گفتار و عمل میں یکساں صلاحیت دی ہے۔

میں نے نذرِ زوبی کو پڑھا ہے۔ کالم لکھ دیا ہے۔ یہ ایک محبت کا پھول ہے میری طرف سے تمہارے لیے۔ زوبی کے لیے قبول کرو۔

ڈاکٹر سلیم اختر

(لاہور)

ہم مردہ پرست قوم ہیں آپ ایسے زندہ پرست ہیں کہ ان شخصیات کی عزت افزائی کرتے ہیں جو واقعی عزت افزائی کی مستحق ہیں اور ان کی زندگی ہی میں کرتے ہیں تاکہ وہ بھی اس عزت افزائی سے وابستہ احساسِ فخر سے لطف اندوز ہو سکیں۔ لیکن ہمارا عمومی رویہ تو بقول ندیم کچھ یوں ہے۔

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

زیدی صاحب کے فن اور شخصیت کا جس خوبی سے مطالعہ کیا گیا اور ان کی تصاویر سے جس طرح افکار مزین کیا گیا اس کی بنا پر افکار کی یہ خصوصی اشاعت اہلِ ذوق کے لیے تحفے سے کم نہیں۔ مصوری اور فنونِ لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے حوالے کی چیز ہے اور افکار کی یادگار اشاعتوں کی طویل فہرست میں یہ اشاعت خصوصی اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس محنت اور حسنِ انتخاب کے لیے یقیناً آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

محمد خالد اختر

(کراچی)

جولائی کا افکار دیکھا۔ ادا بہن کی خود نوشت خوب صورت۔ بہت خوب صورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں مکمل ہونے پر یہ ہماری زبان میں ایک کلاسک کا مرتبہ پائے گی۔ افکار نے اور کچھ کیا ہو یا نہیں (اور بہت کچھ کیا ہے) ہمارے ادب کو چند قابلِ وقعت آپ بیتیاں مزید دے دی ہیں جو افکار کے بغیر شاید کبھی نہ لکھی جاتیں۔ اختر حسین رائے پوری کی "گردِ راہ"، خلیق صاحب کی کچھ اپنی، کچھ لکھنؤ کی سرگزشت اور اب ادا کی دلکش یادیں۔

قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری کے بارے میں مجتبیٰ حسین کا تنقیدی مضمون (شاید آخری جو انہوں نے لکھا) بہت پسند آیا۔ اسلوب بڑا دلچسپ ہے اور مس حیدر کے حالیہ ناول پر اتنی اچھی اور گہری تجزیاتی تنقید میری نظر سے پہلے نہیں گزری۔

اور ساقی کی نظم "ہیجڑا" تو ایک شاہکار ہے۔ بڑی شاعری جو ایک بار پڑھنے کے بعد بھلائی نہیں جا سکتی (جیسے ان کی تھیلے میں بلّے والی نظم) یہ نظم اپنی طعن زنی اور شکستگی میں خوفناک کلیجہ ہلا دیتی ہے۔ میں ساقی کو سلام کرتا ہوں۔

تاج سعید

(پشاور)

افکار کا زیدی نمبر موصول ہو چکا ہے۔ شکریہ۔ اس بار بھی آپ بازی لے گئے ہیں۔ نہایت ہی عمدہ نمبر ہے اور آذر زیدی کے فن کا بھرپور جائزہ۔ تصاویر بھی بہت اچھی چھپی ہیں۔ مبارکباد قبول کیجیے۔

سہیل غازی پوری

(کراچی)

افکار ہر ماہ پابندی سے مل رہا ہے۔ "نذر زوبی" کیا خوب ہے۔ آپ لائق تحسین ہیں کہ پہلے ہی جیسے جوش و خروش سے ادب کی خدمت کیے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر ضرور دے گا کہ ہم ایسے تشنہ لب بھی اس ادبی میخانے سے اپنے جام بھرتے ہیں اور اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔

ڈاکٹر غلام سرور

(امریکہ)

تاریخ لکھتے ہوئے خیال آیا کہ ارے یہ تو پاکستان کی آزادی کی تاریخ ہوئی۔ کاش پاکستان کو اس کی تمام مشکلات سے آزادی حاصل ہو۔ افسوس ہوتا ہے جب بھی ادھر سے کوئی بری خبر آتی ہے۔

افکار باقاعدگی سے مل رہا ہے، ہمیشہ کی طرح۔ کیا آپ عمر خضر چاہیں گے کہ یہ کام ہمیشہ یونہی خوبی سے جاری رہے؟

مجتبیٰ صاحب کی حادثاتی موت کی خبر پڑھ کر دھچکا سا لگا تھا۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ مجھے ان سے بلوچستان یونیورسٹی کے دنوں میں ملنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ یہ کوئی ۷۳-۱۹۷۲ء کی بات ہے۔ ان کی باتیں اور مہربان و مشفق چہرہ یاد آتا ہے اور آتا رہے گا۔

کمال مصطفےٰ

(دارالسلام)

آج مجھے تنزانیہ آئے پورا ایک سال مکمل ہو گیا ہے۔ پہلے چھ ماہ تو گویا قدم جماتے، سیٹل ہوتے گزر گئے۔ پھر جو نظر اٹھا کر دیکھا تو کاموں کی طویل فہرست موجود تھی۔ تنزانیہ رقبے کے اعتبار سے پاکستان کے بالکل برابر ہے مگر آبادی صرف دو کروڑ کے قریب ہے۔ پورا ملک بے حد زرخیز ہے مگر زیادہ تر نیشنل پارکوں اور گھاس کے میدانوں پر مشتمل ہے۔ کھیتی باڑی بہت کم حصے پر ہوتی ہے۔ دنیا کی خراب ترین سڑکیں غالباً تنزانیہ ہی میں ہیں۔ دارالسلام کو دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے پاکستان کے کسی دور دیہاتی شہر میں آج سے بیس سال پہلے کے زمانے میں چلے گئے ہوں۔ کوڑے کے ڈھیر جا بجا نظر آتے ہیں۔ سڑکیں ٹوٹی پھوٹی ہیں، فٹ پاتھ پر گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ ریت کی موٹی تہہ فٹ پاتھوں اور سڑک کے کناروں پر جمی ہوتی ہے۔ رشوت عام ہے صرف فرق یہ ہے کہ یہاں لوگ ہنستے ہنستے رشوت لیتے ہیں یعنی لینے والا بھی خوش اور دینے والا بھی خوش۔ بہرحال لوگ بہت اچھے ہیں۔ یہاں کا کلچر عربی، ساحلی اور افریقی کلچروں کا امتزاج ہے۔

افسانے کئی نامکمل پڑے ہیں۔ انشاء اللہ جلد مکمل کر کے بھجواؤں گا۔

ڈاکٹر حنیف فوق

(کراچی)

شمارہ جولائی ۱۹۸۵ء کے "اشاریہ" میں صفحہ ۱۳ پر مولانا روم کی غزل کے پہلے مصرع میں کتابت کی غلطی ہو گئی ہے "سقامی کنم" کی جگہ "سقائی کنم" پڑھا جائے۔ پورا مصرع یوں ہو گا۔

"اے تشنگاں اے تشنگاں امروز سقائی کنم"

اور دوسرے مصرعے میں "وری" کی جگہ "دریں" پڑھا جائے۔ (حوالہ: کلیات دیوان شمس تبریزی از انتشارات نشر طلوع صفحہ ۱۰

عابد وودود

(بریڈفورڈ)

دنیا کو بہت دیکھ لیا موج فرازی
کھر جس نے جلایا وہ شناسا بھی تو دیکھوں

ابھی پرسوں موج صاحب نے دو بار فون کیا۔ مجھے یہاں کے مشاعرے میں ۲۲ر اگست کو جانے کے لیے زور لگایا۔ پھر مجھ سے نظم "ٹوٹ کر رونے کی رت آئی ہے جاناں" بار بار پڑھوائی۔ رات کو خبر ملی۔ موج صاحب انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
میری طبیعت بے حد اداس ہے۔ آج جمعے کی نماز کے بعد ڈھائی بجے نماز جنازہ ہوگی، اور بریڈفورڈ ہی میں انھیں سپرد خاک کیا جائے گا۔ ع قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو[1]

[1] موج فرازی کی اچانک رحلت پر ادارہ افکار بھی بے حد رنجیدہ اور غم گسار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور متعلقین کو صبر کی توفیق دے۔ (ادارہ)

افکار فاؤنڈیشن ۔ کراچی

افکار فاؤنڈیشن

ایک "فلاحی ٹرسٹ"

اردو رسالوں کی تاریخ میں پہلی بار اپنی نوعیت کے پہلے افکار فاؤنڈیشن نے بطور فلاحی ٹرسٹ یکم جنوری ۱۹۸۷ء سے اس کے بانی چیرمین صہبا لکھنوی اور سرپرست اعلیٰ جناب حکیم محمد سعید اور ملک کے اٹھارہ ممتاز دانشوروں، اہلِ قلم حضرات اور صاحبانِ علم و فن کی نگرانی میں اپنے نئے سفر کا آغاز کر دیا ہے۔

افکار فاؤنڈیشن کے کثیر المقاصد ادبی منصوبوں میں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا فروغ، تحقیق اور نادر دستاویزات کی تلاش و ترتیب اور اشاعت، مستحق ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کے لیے بہبود فنڈ کا قیام، نونہالانِ قوم، خواتین اور نئی نسل کے تعمیری منصوبوں میں اشتراک و تعاون شامل ہے۔ اس فاؤنڈیشن کی تمام تر کامیابی رفیقانِ افکار، محبانِ اردو اور علم و فن کی ترویج و ترقی میں گہری دلچسپی رکھنے والوں کے پُرخلوص تعاون پر منحصر ہے۔ یہ بات دہرانے کی نہیں کہ کوئی ادارہ مالی استحکام کے بغیر اپنے تعمیری منصوبوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا لہٰذا افکار فاؤنڈیشن کے ٹرسٹیوں نے جو تجاویز منظور کی ہیں ان کی تفصیلات "تعارف نامہ" میں شائع کر دی گئی ہیں جو آپ ایک کارڈ لکھ کر منگوا سکتے ہیں۔

ان تجاویز کی رو سے "افکار فاؤنڈیشن" کے سرپرستوں کے لیے کم سے کم دس ہزار روپے، معاونینِ خصوصی کے لیے پانچ ہزار روپے مقرر کیے گئے ہیں جو دو قسطوں میں بھی ادا کیے جا سکتے ہیں۔ رفیقانِ افکار جو عطیہ بھی سہولت سے ادا فرما دیں گے قبول کر لیا جائے گا۔ ذیل کا فارم پُر کر کے بھی بھیجا جا سکتا ہے۔

میں افکار کی خدمات کا معترف ہوں اور مجھے افکار فاؤنڈیشن کے مقاصد سے اتفاق ہے
اس لیے بطور تعاون مبلغ ________ روپے بذریعہ کراس چیک / بنک ڈرافٹ ارسال ہیں۔
مجھے افکار کے سرپرستوں / معاونینِ خصوصی / رفیقانِ افکار میں شامل فرما لیجیے۔

نام ________________

مکمل پتا ________________

____

تاریخ ________________

دستخط ________________

فون: گھر ________ فون: دفتر ________

• مدیر و ناشر صہبا لکھنوی • طابع مشہور آفسٹ پریس کراچی • [illegible]

Head Office
MAKTABA-I-AFKAR
Rabson Road,
KARACHI.

Head Office
24, PARK HILL DRIVE,
BRADFORD-8,
(YORKS - U.K.)

UNIQUE LITERARY, CULTURAL AND FAMILY JOURNAL

افکار

ntonic
OWDE
آجکل ڈنٹونک کا بول بالا ہے

"We wanted to show a whole biscuit...

but somebody got too tempted!"

Announcing the opening of the first Computer Institute with IBM System/36.

Hands-On is the first computer training institute to install in-house IBM System/36 with multiple terminals. It fulfills the yawning gap which had arisen due to non-availability of personnel trained on mini & mainframe computers. Now you can train for mini & mainframe systems on the world's most popular computers. And can give yourself a career-building advantage.

In the field of micro-computers too Hands-On is pre-emminent. It is the most lavishly equipped institute with a large number of micro-computers. Manned by experienced & qualified teachers with highly innovative approach to training & tutoring.

In this stimulating environment you will find yourself growing by the week, and will discover abilities you never suspected you had.

For details please give us a visit.

Hands-On

Brings out the best in you

11 & 12 F, Dadabhoy Centre, Shara-e-Faisal, Karachi. Phones: 522059 – 520938, Telex: 24434 GAFAR PK.

جاری شدہ ــــــ ۱۹۴۵ء
ٹیلیفون نمبر ــــــ ۲۱۴۰۷۹

سال ــــــ ۴۵ ● شمارہ ــــــ ۲۲۶

ــــــ مدیر : ــــــ

صہبا لکھنوی

ــــــ نمائندہ اعزازی ــــــ

راشد نور

ــــــ زر سالانہ : ــــــ

پاکستان میں	بیرونی ملکوں سے
۸۰/- روپے معمولی ڈاک سے	۱۵ پونڈ ــــــ ۲۰ ڈالر
۱۲۰/- روپے رجسٹری سے	ہوائی جہاز سے ۲۰ پونڈ ۴۰ ڈالر

فی شمارہ : آٹھ روپے

زیر اہتمام ــــ کراچی

رابسن روڈ نزد اردو بازار

کیا آپ کو روزگار کی تلاش ہے ؟

ہماری فیلڈ فورس میں شامل ہو کر
شاندار مستقبل کی تعمیر کیجئے۔

روشن مستقبل اور ترقی کے بہترین
لگن اور جذبہ کی بدولت۔

پرکشش آمدنی جس میں ہر سال مسا
کے میں مطابق ، اس کے علاوہ بونس ،

معاشی تحفظ خا
کی فراہمی ، ایک قومی خد

انعامات و اعزازا
کے طور پر انجارلت میں

خود مختار پیشہ اپنی خواہش کے مط

پنشن تین سال کام کرنے کے بعد کسو
پیسی طرح پنشن سے کم نہیں۔

ا رو

UNITED

PID-I-16/89

ترتیب

نومبر ۱۹۸۹ء کی تخلیقات

سرورق: موحد

ذکرِ اقبال ـــ مفکرِ ادب کی حیثیت سے!

نومبر ۱۹۸۶ء کا مہینہ علامہ اقبالؒ کی ولادت کا مہینہ ہے۔ اس عظیم مفکر کو اہلِ پاکستان نے خراجِ تحسین و عقیدت پیش کیا۔ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا ذکر کیا گیا۔ پاکستان اور مذہب اسلام کے ضمن میں ان کی بصیرت کو سراہا گیا۔ ان کے پیغامِ عقیدت، پیغامِ عمل، پیغامِ محبت، پیغامِ وحدتِ ملت کا ذکر بار بار کیا گیا۔ لیکن کسی نے اقبال کے ان پیغامات کا ذکر نہ کیا جو انھوں نے ادیبوں اور آرٹسٹوں کو دیا تھا اور نہ اس ضمن میں ان کے افکار کو اجاگر کیا گیا۔ شاید سیاسی اور مذہبی ترجیحات کی وجہ سے علامہ کے افکار میں آرٹ اور ادب کے عنصر کو خاطر خواہ اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی تخلیقات میں آرٹ اور ادب کے نظریات کو جگہ جگہ واضح کیا ہے۔ اگر ان کے متعلقہ اشعار کو جمع کیا جائے تو ان میں ایسے اصول ملیں گے جن کی بنا پر ہم اپنے آرٹ اور ادب میں بیش قیمتی اور تخلیقی پیدا کر سکتے ہیں اس میں شک نہیں کہ ان کے فن اور ادب کے نظریات کی بنیاد یقیناً مشرقی اقدار اور اسلام ہی تھے لیکن ان کے خیالات اور توضیحات میں خالص ادب کے حوالے سے ان کے عصر کے جدید افکار اور حقیقی معیار کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ اگر ان نظریات کو آرٹ اور ادب کے تناظر میں دیکھا جائے تو ان میں ایک یونیورسلیٹی نظر آئے گی جو کسی بار قدیم یا عقیدے کے حصار میں نہیں آتی۔

علامہ اقبال کا دور ایسا دور تھا جس میں شاعری اور فکشن نگاری دونوں میں نظریہ اور اسلوب کا تنوع اپنے عروج پر تھا۔ دنیا کے فن اور ادب میں تیزی سے تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ ایک طرف ریشنلیٹی اور سائنسی تحقیقات کے زیرِ اثر ادیب اور آرٹسٹ میٹا فزکس (METAPHYSICS) سے فزکس کی طرف رواں دواں تھے تو دوسری طرف آئیڈیلزم (IDEALISM) اور ریلزم (REALISM) کی بحث کو پیچھے چھوڑ کر لوگ پریگمیٹزم کی طرف مائل ہو رہے تھے یا پھر سائنٹیفک ذہن کے زاویے پر جدیدیت (EXISTENTIALISM) کی جانب۔ مغرب میں مارکسزم [illegible]

عمیق نگاہی کی دعوت دے رہے تھے تو اردو ادب میں سرسید، حالی اور آزاد روایت شکنی اور سہل پسندی کا دستر خوان سجائے ہوئے تھے۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی کبھی نہ ختم ہونے والی بحث جاری تھی۔

علامہ اقبال جو لاطینی محاورے کے مطابق POETA NASCITUR MAN FIT (شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں) کے مصداق تھے، ادب میں جدید رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کے کلام سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ روایت اور فرسودگی سے شدید انحراف کے حامی تھے۔ ان کے تخیل کو محدود کرنے والے عناصر مذہبی روایات اور احکامات تھے، لیکن ان میں بھی جدتِ فکر علامہ کا موقف تھا۔ ادیبوں نے علامہ کے کلام کے حوالے سے اگر کچھ کہا ہے تو انھیں مذہب اور سیاست کے ایوانوں میں اس طرح سمو دیا ہے کہ ان کے خالص ادبی نظریات کا پتہ نہیں چلتا۔ علامہ نے اپنے ادبی نظریات کو بالتفصیل کبھی بیان نہیں کیا لیکن ان کے اشعار میں سب کچھ موجود ہے بلکہ انھوں نے اپنی مختصر گوئی کا اعتراف بھی کیا ہے ؎

ادب گوید سخن را مختصر گوئے
تپیدم، آفریدم، آرمیدم

لیکن جب ہم علامہ کے اس شعر کو پڑھتے ہیں ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

تو ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا علامہ نے اس شعر میں رومانیت اور ادب برائے نشاط و حظ کے خلاف اپنے نظریے کا اظہار کیا ہے۔ کیا یہ مذہب کا اثر تھا یا جدید رجحان تھا جو عامیانہ موضوع اور اسلوب سے خصوصاً غزل کے مروجہ اسلوب سے کنارہ کشی کے مترادف تھا۔ یہی نہیں بلکہ علامہ نے اپنے اس نظریے کو مزید واضح کیا ؎

عشق اب پیرویِ عقلِ خدا داد کرے
آبروئے کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے
کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کرے
یا کہن روح کو تقلید سے آزاد کرے

ان اشعار میں کئی مسائل پوشیدہ ہیں۔ کیا علامہ تخلیقات میں جذبات کے بجائے عقل کے قائل تھے یا انھوں نے عقل کو اندھی تقلید سے انحراف کے محدود معنی میں استعمال کیا ہے۔ دوسرے شعر میں علامہ نے جدید ادب کا ایک ایسا اصول پیش کیا ہے جو ہر زمانے اور ہر جگہ مشعلِ راہ بن سکتا ہے بلکہ اسے جدید ادب کی تعریف کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

یوں بھی علامہ نے اس بات کو کئی مقام پر واضح کیا ہے کہ تقلید ادیبوں کا ایک بہت بڑا نقص ہے۔ ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

اس شعر سے بھی ہمیں دعوتِ فکر ملتی ہے کہ اغیار کون ہیں، مغرب والے یا اردو ادب کے تناظر میں عجمی فکر کی تقلید کرنے والے یا دونوں؟ کیا افکار و تخیل کی اصطلاح میں ادب بھی شامل ہے؟ اس طرح مختلف سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں اور علامہ کے نظریے کی تحقیق ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی

علامہ نے تخلیقِ فن کو بھی اپنے طور پر پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد
کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

یا علامہ کا یہ شعر ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

ان اشعار سے علامہ کے نظریات کے بارے میں بہت کچھ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کیا علامہ تعمیر کو تخلیق کا حصہ سمجھتے تھے؟ کیا وہ تخلیق بدیہہ (INTUITION) کے قائل تھے؟ کیا ان کے یہاں غیر شعوری اظہار یا "آمد" جیسی اصطلاح کے لیے کوئی گنجائش تھی؟ کیا تخلیق کے بعد کی شے ہے یا دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں؟ بہر حال یہ واضح ہے کہ علامہ نے تعمیر اور محنتِ مسلسل کو آرٹسٹوں اور ادبا کے لیے راہ نما اصول کے طور پر پیش کیا ہے۔ آگے چل کر اسی ذوقِ ایجادِ معنی کو جس میں تعمیر اور محنت شامل ہیں ایک ایسی راہِ جفاکش تعبیر کرتے ہیں جس کا کوئی انت نہیں ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اسی طرح علامہ نے اپنے متعدد اشعار میں نئی راہیں نکالنے کی ترغیب دی ہے، موسیقی اور شعر کا رشتہ بتایا ہے، مردہ اور بے ذوق تنا سے انحراف کا پیغام دیا ہے۔ آزادیٔ افکار کو آرٹ اور ادب میں اس طرح سمونے کی ترغیب دی ہے کہ وہ تقلید نہ ہو۔ ادب کی عجمی اور فکر کو کلام موضوع بنایا ہے۔ شاعر کی نوائے مردہ اور افسردہ میں مستی کردار پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔ عصرِ موجود میں شاعر کے افلاسِ تخیل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شعر کو پیغامِ حیاتِ ابدی بتایا ہے۔ آرٹ میں تعمیرِ خودی کے جوہر کو لازم قرار دیا ہے۔ کیا ان تمام عناصر سے علامہ کے نظریات کی بغیر تحمل و تکرے پوری طرح عکاسی نہیں ہو سکتی؟ کیا آرٹسٹ اور ادیب کے لیے ان کے پیغام کو اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ کیا علامہ کو دنیائے ادب اور فن میں نئی فکر کے پیغام بر کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا، اور اگر ایسا ہو سکتا ہے تو ہم علامہ کی ولادت اور برسی تاریخوں میں ان کے خالص آرٹ اور ادب کے نظریات کا ذکر مقامی اور معاشرتی حدود سے الگ ہو کر کیوں نہیں کرتے؟

امید ہے کہ اہلِ قلم اور ادب کے قاری اس امر پر غور کریں گے اور آئندہ ذکرِ اقبال کو وسعت دے کر سیاسی اور مذہبی نظریات کے ساتھ علامہ کے ادبی نظریات اور پیغامات سے بھی لوگوں کو روشناس کرائیں گے۔ بجا طور پر ہم اسی طرح اقبال شناسی کا حق ادا کر سکیں گے۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی

(مہمان مدیر)

عالمِ پیری

عالمِ شباب

جرمن زبان کی اتالیق مس ایما ویگے ناسٹ

پیدائش : ۲۶ اگست ۱۸۷۹ء

وفات : ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۴ء

(بشکریہ مسٹر ایلزبتھ شمٹ ویگے ناسٹ)

مسز ایڈتھ شمٹ ویگے ناسٹ اور ڈاکٹر سعید اختر درّانی ڈسل ڈورف میں
(فوٹو: جولائی ۱۹۸۶ء)

(تفصیلات اندرونی صفحات میں ملاحظہ کیجیے)

سونے اور جڑاؤ موتیوں کا بروچ (سینے پر سجانے کا مرقّع)
مسز ایڈتھ ویگے ناسٹ کا کہنا ہے کہ یہ بروچ اقبال نے
مس ایمّا ویگے ناسٹ کو ہندوستان سے تحفتاً بھیجا تھا۔
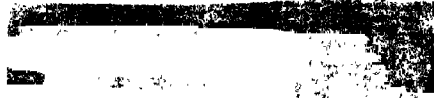
مسز ایلسا ویگے ناسٹ کے درِ دولت پر (۲۶ - بلوشر سٹراسے - ہائیل برون)
پیش منظر میں بیگم سعید اختر درّانی (مسز انگے یونگ) عقب میں مسز ایلسا ویگے ناسٹ
مسز اینی فرانس ویگے ناسٹ اور صاحبزادی نادیہ گیتی آرا درّانی (فوٹو ۱۹ اگست ۱۹۸۶ء)

خانوادہ ویگے ناسٹ کے وہ بھائی بہن جو ۱۹۷۹ء میں بقیدِ حیات تھے۔
(دائیں سے) ایمّا (بہ عمر ۸۱ سال، چشمہ لگائے ہوئے) ایڈولف (۷۵ سال) کارل (۷۶ سال)
البرٹ (۶۸ سال) اور صوفی (۷۳ سال) (بہ شکریہ، مسز ایڈتھ شمٹ ویگے ناسٹ)

ڈاکٹر سعید اختر درّانی مس ایمّا ویگے ناسٹ کے مزار پر (فوٹو: ۳۰ ستمبر ۱۹۸۲ء)

ڈاکٹر سعید اختر دُرّانی

اقبال ـــ ہائیڈل برگ، ہائیل برون، میونک

(حصّہ دوم ـ پہلی قسط)

حرفِ آغاز

قارئین کرام ـ میں یہ سطور بروز ۲۴ اگست ۱۹۸۸ء اطالیہ کے بے حد قدیم اور خوب صورت شہر PADOVA میں بیٹھا لکھ رہا ہوں جو وینس سے قریب چالیس میل دور واقع ہے اور جہاں میں اپنے خاندان سمیت تعطیلات کے لیے مقیم ہوں ـ اس سے قبل اس مضمون کا حصّہ اوّل ماہنامہ افکار بابت اپریل، مئی اور جون ۱۹۸۸ء میں بالاقساط شائع ہو چکا ہے جو ستمبر ۱۹۸۴ء میں میرے دورۂ ہائیڈل برگ کا احاطہ کرتا ہے اور اس میں علامہ اقبال کی قدیمی اقامت گاہ (دورانِ تابستان، ۱۹۰۷ء) کے مفصّل حالات اور ہائیڈل برگ کے ساتھ علامہ کے تعلقات بیان کیے گئے ہیں ـ

موجودہ حصّہ ستمبر ۱۹۸۴ء کے آخری ایّام میں میرے دورۂ ہائیل برون پر محیط ہوگا جہاں مس ایمّا ویگے ناسٹ کی آخری آرام گاہ واقع ہے اور جو ان کا آبائی قصبہ تھا ـ مضمون کا یہ حصّہ میں نے دراصل آج سے ایک سال قبل یعنی اگست ۱۹۸۷ء میں جنوبی ہسپانیہ کے ایک گاؤں BELLA ORCHETA میں تحریر کیا تھا جہاں ہم تین ہفتے کے لیے گرمیوں کی چھٹیاں منانے کے لیے مقیم تھے، لیکن جیسا کہ حصّہ اوّل کی قسط سوم کے آخر میں بیان ہوا، ہمارے ورودِ ہسپانیہ کا روزِ اوّل ایک طالعِ نحس کا مثیل ثابت ہوا ـ وہ یوں کہ جونہی ہم یکم اگست ۱۹۸۷ء کی شام کو ALICANTE (الیقانتے ـ الایقانتہ) کے ہوائی اڈے پر اترے اور اپنا سامان ٹرالی (TROLLEY) میں سے اس کار کے بوٹ میں لادنا شروع کیا جو ہم نے تین ہفتے کے لیے کرائے پر لی تھی، تو معاً چند نوجوان متحرک اٹھائی گیرے (MOBILE THIEVES) ایک کار میں وہاں وارد ہوئے ـ ایک نوجوان لڑکی کار میں سے اچھل کر اتری ـ میرا بریف کیس ٹرالی میں سے دبوچا، متحرک کار میں واپس داخل ہوئی اور کار یہ جا وہ جا ہوگئی ـ شام کے دھندلکے میں میں کار کا نمبر بھی ٹھیک سے نوٹ نہ کر سکا ـ میں چند قدم کار کے پیچھے دوڑا اور اس کے بوٹ پر دستک بھی دی، لیکن اٹھائی گیرے پلک جھپکنے میں ہوا ہوگئے ـ

اس بیگ میں وہ کیا خزانہ تھا جو ان چوروں کے ہاتھ لگا اور جس کا ضیاع میرے لیے سوہانِ روح ثابت ہوا ـ تو سنیے سب سے پہلے تو اس میں پچاس، اکیاون صفحے کا وہ مسودہ تھا جو اس مضمون کا حصّہ اوّل ہے ـ پھر میونک، ہائیڈل برگ اور ہائیل برون کے دورے اور مختلف اشخاص کے ساتھ ملاقاتوں اور INTERVIEWS کے بارے میں جو ہیں

صفحے کے نوٹ اور یادداشتیں اور نقشے تھے جو میں نے ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۴ء میں برمقام (IN SITU) اور گھر واپس پہنچتے ہی تحریر و تیار کیے تھے۔ ایک اور اہم اور نایاب چیز ویگے ناسٹ خاندان کا شجرۂ نسب تھا جو مجھے مسز ایلسا ویگے ناسٹ نے ۲۰ ستمبر ۱۹۸۴ء کو عطا کیا تھا۔ اس کے علاوہ پروفیسر کرشن ہوت کے (جو مس ایما ویگے ناسٹ کے چچازاد بھائی کی بیٹی ہیں) اور مسز ایڈیتھ شمٹ۔ ویگے ناسٹ کے (جو ایمّا کی برادر زادی ہیں) میرے نام خطوط، پروفیسر کرشن ہوت کے بھیجے ہوئے ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے یونیورسٹی کیلنڈر بابت ۱۹۰۷ء کے صفحات متعلقہ بہ پروفیسر شیرر پھر جناب ہنس ہیلمتھ سوئسلر (اقبال کے قدیمی مکان واقع ہائیڈل برگ کے موجودہ مالک) کی اقبال فائل کے بعض بے حد اہم حصّوں کی فوٹو کاپیاں، جناب ڈاکٹر لوزاش (سابق ڈائرکٹر میونک یونیورسٹی لائبریری) کے ساتھ انٹرویو کی تفصیلات اور ان کی مہیّا کی ہوئی چند اہم دستاویزیں۔ یہ سب مواد اور کئی ایک اور قیمتی کاغذات اس بریف کیس کے اندر بند تھے۔

دراصل پچھلے سال (اگست ۱۹۸۶ء میں) جب میں اور میری بیوی ہسپانیہ تعطیلات کے لیے گئے، تو میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اپنے ساتھ کوئی سائنسی کام کاج اور کاغذات لے کر نہ جاؤں گا۔ بلکہ صرف اقبال مواد ساتھ رکھوں گا تاکہ وہاں جم کر نہ صرف اس مضمون کے حصہ اوّل کو انجام تک پہنچاؤں بلکہ اس کے حصہ ہائے دوم وسوم بھی لکھ ڈالوں۔ مزید برآں میرا ارادہ تھا کہ جولائی ۱۹۸۶ء میں میں نے کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں جو دو اہم مخطوطے دریافت کیے تھے، ان پر بھی کام کرنے کی کوشش کروں گا (ان میں سے پہلا تو ایک بے نظیر نسخہ ہے یعنی پروفیسر نکلسن کے اسرارِ خودی کے مطبوعہ ترجمے پر علّامہ اقبال کے ہاتھ کی کی ہوئی ہزارہا تصحیحات اور شذرات و توضیحات اور دوسرا مخطوطہ پروفیسر آربری کا کیا ہوا گلشنِ رازِ جدید کا غیر مطبوعہ ترجمہ ہے۔ خوش قسمتی سے ان دونوں مخطوطوں کی فوٹو کاپیاں میرے بیگ میں نہ تھیں، بلکہ میرے صندوق میں بند تھیں اور یوں محفوظ رہیں)

میرے بیگ میں جو دیگر چیزیں موجود تھیں اور چوری ہوئیں ان میں سے میرے لیے سب سے زیادہ باعثِ قلق ۱۹۸۴ء کے دورے کے دوران قریب چار درجن وہ تصویریں تھیں جو میں نے ہائیڈل برگ میں پروفیسر کرشن ہوت کی معیت میں مس ایمّا ویگے ناسٹ کی سابقہ قیام گاہوں پر اور پھر ہائیل برون میں مس ایلسا ویگے ناسٹ کے گھر پر اور بالخصوص اس قبرستان میں کھینچی تھیں جہاں ایمّا اور صوفی ویگے ناسٹ دفن ہیں۔ علاوہ ازیں میونک میں علّامہ اقبال کی سابقہ قیام گاہ SCHELLINGSTRASSE 41 اور ان کی یونیورسٹی کی تصویریں اور جناب لوزاش کے مکان میں ان کی یونیورسٹی کی تصویریں اور جناب لوزاش کے مکان میں ان کی اور میری ایک ساتھ کی تصاویر یہ سب چیزیں ضائع ہوگئیں۔ ان تصویروں کے ساتھ ہی ان کے بہت سے NEGATIVES بھی تھے جو چوری ہو گئے (اگرچہ برمنگھم واپسی پر یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ اس دورے کی تصاویر کے کئی ایک نیگیٹو گھر پر محفوظ تھے) لیکن اپنے ذاتی کاغذات کے ضیاع کے علاوہ ایک گہرا دکھ جو مجھے ہوا وہ یہ تھا کہ اس بیگ میں کیمبرج یونیورسٹی لائبریری سے مستعار لی گئی تین کتابیں بھی بند تھیں جن میں سے اہم ترین اقبال کی "اسرارِ خودی" کے ترجمہ از پروفیسر نکلسن کے دوسرے ایڈیشن کا وہ نسخہ تھا جو جناب پروفیسر آربری کی ملکیت میں رہ چکا تھا اور جس کے حاشیوں پر آربری صاحب کے کئی ایک نوٹ اور نشانات و استفساری علامات ثبت تھیں۔ (کتاب کی جلد کے اندرونی

صفحے پر ایک چٹ چسپاں تھی کہ یہ کتاب پروفیسر اے ۔ جے ۔ آربری کے کتب خانے کا حصہ تھی جو ان کی وفات (۱۹۶۹ء) کے بعد کیمبرج یونیورسٹی لائبریری کو عطا کیا گیا تھا)

حیہات، کہ اب یہ نادرۂ روزگار کتاب اور باقی سب تصویریں، اور میرے تین سال کے دوران جمع کیے ہوئے وہ سب کاغذات اور یادداشتیں الیقانتے کے کسی کوڑے کباڑ کے ڈھیر کے نیچے دفن ہوں گی، جہاں ان بے رحم ڈاکوؤں نے اس تمام مواد کو بے قیمت سمجھ کر پھینک دیا ہوگا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے کہ میں نے کس طرح اس بیگ کی بازیابی کے لیے اپنی سی پوری کوشش کی اور نہ صرف الیقانتے اور ایلچے (ELCHE) کے پولیس اسٹیشنوں میں اس چوری کی رپورٹیں داخل کیں، بلکہ الیقانتے کے ہسپانوی زبان کے اخبار "اطلاعات" (INFORMATION) میں میرا ایک سہ کالمی انٹرویو بھی شائع ہوا جس میں تحریر کیا گیا کہ "خالقِ نظریۂ پاکستان، سر محمد اقبال پر ایک برطانوی "ماہرِ تاریخ" (PROFESSOR OF HISTORY) کی سالہاسال کی جمع کی ہوئی تحقیقات و معلومات الیقانتے کے ہوائی اڈے پر اٹھائی گیروں کی نذر ہو گئی ہیں، جب کہ پروفیسر درانی کے ہسپانیہ کے قیام کا واحد مقصد ان تحقیقات پر مبنی ایک کتاب کا تحریر کرنا تھا"۔ اس کے ساتھ میں نے بیگ اور اس کے مشمولات کی وضاحت پر مشتمل ایک اشتہار بھی شائع کیا (جس پر میرے پندرہ سو روپے خرچ ہوئے) اور اس بیگ کا کھوج لگانے والے کو قریب چار ہزار روپے انعام دینے کا وعدہ بھی کیا۔ اس کے چند روز بعد ایک مقامی انگریزی اخبار (POST) میں بھی میری تصویر اور اشتہار کے ساتھ اس ڈاکے کی ایک مستقل رپورٹ شائع ہوئی۔ پھر پولیس والوں نے اور میں نے ہوائی اڈے کے گرد و نواح میں کافی چھان بین بھی کی، لیکن ان کاغذات کا قطعاً کوئی سراغ نہ ملا۔

اس کے بعد میں سوائے اس کے "اناللہ وانا الیہ راجعون" کہہ کر اپنے سینے پر صبر کا بھاری پتھر رکھ لوں اور کیا کر سکتا تھا، لیکن بقول اقبال ع "کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد" میں نے فیصلہ کیا کہ جو مواد کھو گیا ہے۔ اسے دوبارہ حاصل کروں۔ چنانچہ اس چوری کے دو ماہ بعد جب اکتوبر ۱۹۸۴ء میں ایک کانفرنس کے سلسلے میں میرا میونک جانا ہوا تو میں نے نہ صرف ڈاکٹر بونا ش سے دوبارہ ملاقات کی اور علامہ اقبال کی قیام گاہ کی تازہ تصاویر حاصل کیں بلکہ مجھے ایک قطعی نعمتِ غیر مترقبہ وہاں حاصل ہوئی یعنی علامہ اقبال کے میونک یونیورسٹی سے ۱۹۰۷ء میں پی ایچ ڈی حاصل کرنے کی مکمل فائل، جو وہاں کے ARCHIVES (حفاظت خانے) میں پچھلے اسّی سال سے زمانے کی آنکھوں سے اوجھل محفوظ پڑی تھی (اس کے بارے میں میرا ایک ابتدائی اور تعارفی (INTRO DUCTORY) مضمون "نوائے وقت" لاہور کے یوم اقبال نمبر مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۸۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مفصّل مضمون لکھنا ابھی باقی ہے)، پھر پروفیسر کرشش ہوف سے خط و کتابت کے ذریعے اور موجودہ دورے (اگست ۱۹۸۵ء) کے دوران بیگم ایڈتھ شمٹ ویگے ناسٹ سے ڈسل ڈورف میں پچھلے ہفتے کئی نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ انگلی اور آسٹریا سے واپسی پر انشاء اللہ یعنی اب سے دو ہفتے بعد ہائیڈل برگ میں مسز ایما ویگے ناسٹ سے دوبارہ ملاقات ہوگی اور کچھ مزید تصاویر اور شجرۂ نسب کی کاپی وغیرہ حاصل کرنے کی کوشش کروں گا یعنی ع "ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں" شرطِ صرف ہمت کا نہ ہارنا ہے۔ یہاں، جیسا کہ مضمون کے حصۂ اوّل کے آخر میں بیان ہوا، خوش قسمتی سے موجودہ مضمون کے حصۂ اوّل کی ایک فوٹو کاپی میں مارچ ۱۹۸۵ء میں الجیریا جانے سے پیشتر برمنگھم یونیورسٹی میں چھوڑ آیا تھا، چنانچہ اسی کی بنا پر وہ حصہ "افکار" میں شائع ہو چکا ہے۔ "اسرارِ خودی" کے نسخۂ آربری کی ایک مکمل فوٹو کاپی بھی میں نے احتیاطاً یونیورسٹی میں محفوظ

کر رکھی تھی۔ کچھ تصاویر کے نیگیٹو اور "سوئسلر فائل" اور "ویگے ناسٹ فائل" کے بالکل مکمل تو نہیں، لیکن نوے فی صد کے قریب تمام فوٹو اسٹیٹ بھی محفوظ تھے ورنہ سوائے "گیا ہے سانپ نکل، اب لکیر پیٹا کر" کہنے کے اور چارہ کار نہ ہوتا۔ میں خدائے تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ بہت سی چیزوں کا نعم البدل مل گیا بلکہ جو کچھ کھویا اس سے کہیں زیادہ میں نے پایا۔

اس طویل تمہید کے بعد اب میں اس مضمون کے حصہ دوم کے اس نسخے کی طرف لوٹتا ہوں جو میں نے آج سے ایک سال قبل بروز ۱۴ اگست ۱۹۸۵ء جنوبی ہسپانیہ کے قصبے BELLA ORCHETA (بانیچو، اسپین) میں شروع کیا تھا اور اس تعطیل گاہ سے واپسی سے دو روز قبل (یعنی ۱۹ اگست ۱۹۸۵ء کو) ختم کیا تھا۔

نفسِ مضمون (حصہ دوم)

اس مضمون کے حصہ اول میں میں نے تفصیلاً ذکر کیا ہے کہ اتوار ۸ ستمبر ۱۹۸۵ء کے روز ہماری دو مصروفیات متعین تھیں۔ پہلی علامہ اقبال کے قدیمی مکان واقع ہائیڈل برگ میں موجود مالک مکان جناب سوئسلر کے ساتھ ملاقات اور دوسری اقبال کی ۱۹۰۷ء میں جرمن زبان کی اتالیق مس ایما ویگے ناسٹ (MISS EMMA WEGENAST) کے آبائی قصبے ہائیل برون (HEIL BRONN) کی زیارت اور وہاں ایما کے قرابت داروں کے ساتھ ملاقات بالخصوص ایما کی آخری آرام گاہ اور ان کے آبائی مکان کا دیدار۔ واضح رہے کہ یہاں "ہم" سے مراد ہے راقم الحروف اور میری ممیری بہن شہناز درانی اور ان کے نو مسلم شوہر کارل ہائنز برن ہارٹ (KARL-HEINZ BERNHARDT) (جن کی ملاقات چند سال قبل بیکنگ میں ہوئی تھی، جہاں یہ دونوں اعلیٰ تعلیم پا رہے تھے اور اب یہ دونوں بون یونیورسٹی میں بین الاقوامی روابط کے موضوع پر پی ایچ ڈی کر رہے تھے) مضمون کے حصہ اول میں جناب سوئسلر کے ساتھ ہماری ملاقات کا مفصل تذکرہ ہو چکا ہے۔ دراصل سوئسلر صاحب کے ساتھ ملاقات صرف آدھ گھنٹے کے لیے معین ہوئی تھی، لیکن یہ بات اس قدر معلومات افزا ثابت ہوئی اور وہ ہمارے ساتھ اس قدر تکلف سے پیش آئے کہ جب بالآخر ہم نے قریب دو گھنٹے بعد ان سے اجازت چاہی (اور ان کی بکمال عنایت عاریتاً عطا کردہ "اقبال فائل" ساتھ لے کر ان کے گھر یعنی بالفاظ اقبال "شیر منزل" سے نکلے) تو قریب ساڑھے بارہ بج رہے تھے جب کہ مسز ایلسا ویگے ناسٹ کو ہم نے ملاقات کے لیے بارہ بجے کا وقت دے رکھا تھا اور ہائیل برون، ہائیڈل برگ سے قریب پچاس میل پر واقع تھا۔

چنانچہ سب سے پہلے تو ہم نے ہائیڈل برگ کے مرکزی علاقے میں ایک ٹیلی فون بوتھ سے مسز ایلسا ویگے ناسٹ کو فون کیا اور معذرت پیش کی کہ بدقسمتی سے ہمیں ہائیل برون پہنچنے میں ابھی کچھ دیر لگے گی۔ شاید ڈیڑھ بجے تک ہم وہاں پہنچ پائیں گے۔ انھوں نے کہا وہ چرچ سے واپس آ چکی ہیں اور اگرچہ پچھلے پہر ایک عزیزہ کے یہاں انھیں چائے پر جانا ہے تاہم وہ ہماری آمد کا انتظار کریں گی۔ اس کے بعد ہم نے سوچا کہ کیوں نہ جلدی سے دوپہر کا کھانا کھا لیا جائے ورنہ پھر موقع نہ ملے گا۔ چنانچہ ہم وسط مدینہ میں ایک اطالوی ریستوراں میں پہنچے اور ایک ایک PIZZA کا (اطالوی خمیری روٹی، جس پر مچھلی کے تکے، ٹماٹر، پنیر، بڑی سبز مرچیں وغیرہ پک کر اور پگھل کر چسپاں ہوتی ہیں) آرڈر کیا۔ کیوں کہ یہ عموماً غذا کے سریع (FAST FOOD) سمجھی جاتی ہے، لیکن بدقسمتی سے اطالوی خدو دو کوشش اس قدر آہستہ خرام ہوتی ہے کہ ہمارا

کی یادوہانیوں کے باوجود جب اطالوی بیرے نے پکوان ہماری میز پر چایا تو تقریباً سوا بج رہا تھا۔ ہم نے پلک جھپکنے میں کھانے پر ہاتھ صاف کیا اور وہاں سے بھاگے۔ رستے میں مجھے خیال آیا کہ مزید رنگین فلم لے لی جائے تاکہ ہائیل برون میں تصویریں اتارنے میں رکاوٹ نہ ہو، لیکن اتوار کو سب دکانیں بند ملیں اور بڑی مشکل سے ریلوے اسٹیشن پر فلم خریدنے میں کامیابی ہوئی۔

ہمیں اس تاخیر سے بڑی الجھن ہو رہی تھی، بہرصورت قریب دو بجے ہم ہائیڈل برگ سے نکل کر شاہراہ AUTOBAHN پر گامزن ہوئے۔ کارل ہائنز نے کار بڑی تیز رفتار سے دوڑائی۔ رستے میں المانیہ کے خوش منظر درخت، پھول دار پودے، جنگلی جھاڑیاں، خودرو گل بوٹے برق رفتار سرعت کے ساتھ الٹے چلے جا رہے تھے اور پونے تین بجے کے قریب ہم ہائیل برون کے مضافات میں داخل ہو گئے۔ مسز ویگے ناسٹ نے ہمیں اپنا مکان ڈھونڈنے سے متعلق ہدایات دے رکھی تھیں کہ ریل کی لائنوں کے اوپر سے گزر کر فلاں جگہ بائیں ہاتھ مڑ جاؤ وغیرہ۔ ہائیل برون ایک متوسط سائز کا خوب صورت پرانا قصبہ ہے۔ اس روز اتوار کی وجہ سے دکانیں اور دفتر بند تھے، شہر کے باشندے کم و بیش ہی نظر آ رہے تھے۔ بہرصورت ہم بھولتے، بھٹکتے کسی نہ کسی طرح BLÜCHERSTRASSE تک پہنچ ہی گئے۔ یہ سڑک شہر کے کنارے پر کھلی کھیتوں کے سامنے واقع تھی۔ نمبر ۲۶ کے سامنے ایک باڑھ لگی ہوئی تھی اور اس کے پیچھے ایک چھوٹا سا خوب صورت باغیچہ اور پھر مکان کی پورچ، جہاں ایک سفید بالوں والی بوڑھی خاتون ہمارے انتظار میں کھڑی تھیں۔ انھوں نے ہاتھ ہلا کر ہمارا استقبال کیا اور اندر آنے کی دعوت دی۔

ہم اندر داخل ہوئے۔ اور سب سے پہلے اس قدر دیر سے پہنچنے کے لیے معافی چاہی۔ مسز ویگے ناسٹ نے کہا کہ ان کی ایک عزیزہ کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی ہے اور انھیں پچھلے پہر وہاں جانے کے لیے جانا تھا (ہائیل برون ہی میں یا اس کے قرب وجوار میں) لیکن اب وہ وہاں شام کو چلی جائیں گی۔ مکان کے سامنے اور عقب میں ایک بڑا ہی خوبصورت باغیچہ تھا جس میں رنگا رنگ پھول اور گل بوٹے بہار دکھا رہے تھے۔ اس وقت دھوپ نکل ہوئی تھی، پرندے چہچہا رہے تھے اور باغ میں اکا دکا سفید کرسیاں بچھی ہوئی تھیں کہ ان پر بیٹھ کر دھوپ تاپی جا سکے۔ ہم وہاں تھوڑی دیر کے لیے ان کی پورچ میں بیٹھے۔ انھوں نے اپنے خاندان کے چند افراد سے، جو اس وقت گھر پر تھے، تعارف کرایا۔ ایک ان کی بڑی خوب صورت فرانسیسی نژاد بہو تھیں، جن کا نام اینی فرانس (ANNIE FRANCE) ویگے ناسٹ تھا۔ یہ ان کے چھوٹے بیٹے ڈیٹر (DIETER) کی بیوی تھیں، جو مشنری کی حیثیت سے جنوبی افریقہ میں آباد ہو گیا تھا، لیکن چند سال بیشتر اپنے چرچ کے حکم پر واپس جرمنی آ کر بس گیا تھا۔ اینی فرانس کے دو پیارے بچے بھی وہاں تھے۔ قریب بارہ تیرہ سال کا بیٹا ڈیوٹی اور چار پانچ سال کی بیٹی سونیا۔ مسز ویگے ناسٹ نے بتایا کہ وہ پچھلے آٹھ برس میں تقریباً ہر سال جنوبی افریقہ جایا کرتی تھیں، اور وہاں کئی کئی ماہ ٹھہرا کرتی تھیں اور ایک مرتبہ شاید دو سال تک وہاں رہ پڑی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ اسی وجہ سے میں انگریزی زبان آسانی کے ساتھ بول سکتی ہوں۔ ان کا بڑا بیٹا ہیلمس اپنے خاندان کے ساتھ اسی مکان کے پچھواڑے میں واقع دوسرے مکان میں رہتا ہے جس کا نمبر BLÜCHERSTRASSE 26 I ہے۔ ہنس ELECTRONICS کی ایک صنعتی فرم کے ساتھ وابستہ ہے اور مختلف صنعتی نمائشوں میں حصہ لینے کے لیے کبھی فرینکفرٹ

اور کبھی مشرقی المانیہ میں لائپزگ وغیرہ جاتا رہتا ہے۔ وہ آج صبح ہم سے ملنے کا منتظر تھا، لیکن پھر اسے باہر جانا پڑ گیا۔ انھیں امید تھی کہ شاید ہماری واپسی سے پہلے وہ گھر لوٹ آئے گا اور ہم سے مل سکے گا۔

پھر مسز ایلسا ویگے ناسٹ نے فرمایا کہ تمہارے آنے سے پہلے میری عزیزہ پروفیسر ہیلا کرش ہوف HELLA CIRCHHOFF نے دوبارہ ٹیلی فون کر کے مجھے تاکید کی تھی کہ میں ہر طرح سے تمہاری مدد کروں اور ہو سکے تو ایمّا ویگے ناسٹ کی کوئی تصویر تمہیں بہم پہنچاؤں، لیکن ہمارے پاس ایمّا کی کوئی تصویر موجود نہیں ہے، سوائے اس اخبار کی فوٹو کاپی کے جو ہمیں ایک پاکستانی پروفیسر نے اس سال کے اوائل میں دی تھی۔ سو اگر تم چاہو تو بخوشی یہ لے لو، لیکن میں نے دیکھا کہ یہ روزنامہ HEIDELBERGER TAGEBLATT مورخہ ۲۹ جون ۱۹۶۶ء کے اسی صفحے کی فوٹو کاپی ہے جس کا مفصل ذکر اس مضمون کے حصہ اوّل میں آچکا ہے اور جس اخبار کا ایک اصل صفحہ اسی صبح جناب سوئسلر مجھے عطا کر چکے تھے (چونکہ ان کے پاس اس صفحے کی تین چار کاپیاں موجود تھیں جس پر علامہ کے ۱۹۰۷ء کے قیام ہائیڈل برگ کا حال مع ایمّا اور اقبال کی تصاویر کے درج تھا) ظاہر ہے کہ مسز ویگے ناسٹ کو یہ فوٹو کاپی ڈاکٹر صدیق شبلی صاحب نے بہم پہنچائی تھی، جنھوں نے "افکار" بابت ۱۹۸۳ء میں ایمّا اور اقبال کی خط و کتابت کے بارے میں میرا مضمون پڑھ کر خود بھی اس مسئلے میں کچھ علمی دلچسپی دکھائی تھی۔ وہ ہائیڈل برگ میں اپنی اقبال فیلو شپ کا عرصہ ختم کر کے حال ہی میں پاکستان واپس جا چکے تھے۔ میں نے مسز ویگے ناسٹ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس اخبار کا یہ صفحہ مجھے اسی روز دستیاب ہو چکا ہے، چنانچہ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں ہے، وہ بخوشی اسے اپنے ہی پاس رکھ لیں۔

مسز ایلسا ویگے ناسٹ کچھ عرصہ اپنے خاندان سے متعلق باتیں کرتی رہیں، جن کا میں بعد میں ذکر کروں گا۔ وہ کافی بے تکلف اور ہنس مکھ خاتون تھیں اور بات چیت کرنے کی شوقین۔ کہنے لگیں کہ میں پیدائشی ویگے ناسٹ نہیں ہوں اور ایمّا ویگے ناسٹ سے (جن کا انتقال ۱۹۶۴ء میں ہو گیا تھا) میں کبھی نہیں ملی تھی، لیکن پروفیسر ہیلا ویگے ناسٹ ان کے بارے میں بہت سی معلومات رکھتی ہیں کہ وہ خود ولادتاً ویگے ناسٹ تھیں۔ مجھے ایمّا سے متعلق جو بھی اطلاعات ہیں، وہ پروفیسر ہیلا ہی نے بہم پہنچائی تھیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ ایلسا خاتون اپنے خاندان کا نام "ویگے ناسٹ" کے طور سے ادا (PRONOUNCE) کر رہی تھیں۔ چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ معاف کیجیے، کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آیا اس نام کا تلفظ ویگے ناشٹ (یعنی حرف "ش" کے ساتھ) ہے یا ویگے ناسٹ ("س" کے ساتھ) کیونکہ جہاں تک میں سن پایا تھا، پروفیسر کرش ہوف اسے "س" کے ساتھ بول رہی تھیں۔ مسز ایلسا ویگے ناسٹ نے کہا کہ "نہیں، اس نام کا صحیح تلفظ ویگے ناسٹ ہی ہے۔ دراصل ہم یہاں (SCHWABIA) کے علاقے کے رہنے والے اسے اپنے علاقائی لہجے (SCHWABIAN DIALECT) میں ویگے ناشٹ کے طور سے (یعنی "ش" کے ساتھ) پکارتے ہیں۔[1]

---

[1] پچھلے ہفتے (بروز ۲ جولائی ۱۹۸۵ء) ڈسل ڈورف میں مجھے بیگم شمٹ ویگے ناسٹ نے بتایا کہ ان کا خاندان ایک بڑا قدیمی گھرانہ ہے جس کا ایک پرانا CREST (خاندانی طغرا) بھی ہے جو ان کی انگشتری پر ثبت تھا۔ انہوں نے کہا کہ دراصل یہ نام WEGENAST زمانۂ قدیم میں تین الفاظ سے مرکب ہوا تھا۔ یعنی WEGE – AM – AST (راہ۔ بر۔ شاخِ شجر) اور وہ خاندانی CREST انھی اجزا پر مشتمل تھا۔ درانی

اس کے بعد میں نے بیگم ویگے ناسٹ سے عرض کیا کہ میرے بائیل بروِن آنے کی ایک بڑی غرض (ان کے ساتھ ملاقات کے علاوہ) یہ تھی کہ ممکن ہو تو مس ایما ویگے ناسٹ کی قبر کی زیارت کروں اور میں نے اپنی اس آرزو کا ان سے ٹیلی فون پر ایک ہفتہ پہلے بھی ذکر کر رکھا تھا (دیکھیے مضمون کا حصۂ اوّل)، انھوں نے کہا کہ ہاں، میں نے اس کا بندوبست کر رکھا ہے اور ایک دو روز ہوئے مقامی قبرستان کے دفتر سے میں نے ایما کی قبر کا نمبر معلوم کر لیا ہے۔ اس پر وہ اندر گئیں اور ایک صندوقچی میں سے وہ پُرزہ نکال کر لائیں جس پر یہ نمبر رقم تھا (یس تحریر، خوش قسمتی سے یہ نمبر برمنگھم میں میری یادداشتوں میں محفوظ رہا۔ چنانچہ یہاں اسے حوالے کے لیے درج کرتا ہوں ABT. 4; REIHE 9; GRAB 23-24 یعنی حصۂ چہارم، قطارِ نو، قبور ۲۳-۲۴) - یہ کاغذ برآمد کرنے کے بعد ایلسا صاحبہ نے کہا، چلیے، میں تیار ہوں

چنانچہ ہم چاروں (یعنی بیگم ویگے ناسٹ، شہناز، کارل ہائنز اور میں) کارل ہائنز کی کار میں سوار ہو کر بیگم ویگے ناسٹ کی ہدایات کی تعمیل کرتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ یہ قبرستان ان کے گھر سے چار پانچ میل کے فاصلے پر شہر کے ایک اور گوشے میں آباد تھا۔ میں "آباد تھا" کے الفاظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ جرمنی کے قبرستان ہمارے یہاں کی بعض آبادیوں سے بڑھ کر حسین و جمیل اور پر رونق ہوتے ہیں۔ ان کے اندر سرو و صنوبر کے سہی قامت درخت، رنگا رنگ جھاڑیاں اور گل بوٹے اور سبزۂ بیگانہ کے بچھونے دور دور تک پھیلے ہوتے ہیں۔ اس گلستان کے اندر تمام قبریں رو در رو صف بستہ ہوتی ہیں اور بڑی PLANING کے ساتھ متوازی قطاروں میں آراستہ نظر آتی ہیں جن پر نمبر شمار لگے ہوتے ہیں تاکہ ان کی تلاش میں آسانی رہے۔ ہر روز اور بالخصوص اتوار کے دن بہت سے لوگ (خصوصاً خواتین) قبروں پر پھول چڑھاتے اور گھاس پھونس کی صفائی کرتے اور لحدوں پر آب افشانی کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض خاندانوں کی قبریں خاص گوشوں اور کنجوں میں یکجا ہوتی ہیں جیسا کہ ہمارے یہاں بھی دستور ہے۔

مسز ویگے ناسٹ اپنے کاغذ کے نقشے کے مطابق ڈھونڈتی ڈھونڈتی چند منٹ بعد اس گوشے میں پہنچ ہی گئیں، جہاں ویگے ناسٹ خاندان کی قبریں واقع تھیں۔

سب سے پہلے ہم جس کنج لحد پر پہنچے وہاں زرد، قرمزی اور کاسنی رنگوں کے چھوٹے چھوٹے خوشنما پھولوں اور بیلوں میں گھرے ہوئے کتبے سے ظاہر تھا کہ یہاں اس خاندان کے چار افراد دفن ہیں۔ ایلسا خاتون نے مزار کے پاس بیٹھ کر بڑی محبت کے ساتھ جب یہ بیلیں اور گھنے و سبز پتے ہٹائے تو وہاں چار نام ایک ہی کتبے پر یوں تحریر تھے۔ (اوپر سے نیچے کی طرف، ADOLF WEGENAST (۱۸۴۶ء تا ۱۹۱۰ء)، اس کے نیچے SOPHIE WEGENAST (اسم مولود NEHER) (۱۸۴۲ء تا ۱۹۱۳ء) پھر FRITZ WEGENAST (۱۸۹۱ء تا ۱۹۲۱ء) اور سب سے نیچے EMMA WEGENAST (۱۸۷۹ء تا ۱۹۶۴ء) اوّل الذکر دو اشخاص ایما کی والدہ اور والد تھے، اور تیسرا شخص ایما کا ایک چھوٹا بھائی تھا۔ بقول مسز ایلسا ویگے ناسٹ، اسی مزار میں ایما کی بڑی بہن SOFIE WEGENAST بھی دفن تھیں، اگرچہ کتبے پر ان کا نام درج نہ تھا (پچھلے ہفتے بیگم شمٹ، ویگے ناسٹ نے بھی اس بات کی تصدیق کی)

ایما ویگے ناسٹ کی قبر کو دیکھ کر میرے دل پر عجیب تاثر پیدا ہوا۔ میں اس قبر کے سامنے آنکھیں بند کر کے تا دیر ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہا اور ان پرانے دنوں کی یادیں دل میں تازہ کرتا رہا جب ایما اور اقبال ایک ساتھ تھے

اور ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے۔ اقبال نے اس تعلقِ خاطر کا اپنے خطوں میں بار بار ذکر کیا ہے۔ مثلاً ان کی یہ سطور
"لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا کروں۔ جو شخص آپ سے دوستی کر چکا ہو، اس کے لیے ممکن نہیں کہ آپ کے بغیر وہ جی سکے"۔
(دیکھیے میری کتاب" اقبال یورپ میں"، ایما کے نام اقبال کا خط نمبر ۵ مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۰۷ء لندن)

"آپ میری زندگی میں ایک حقیقی قوت بن چکی ہیں۔ میں آپ کو کبھی فراموش نہ کروں گا اور ہمیشہ آپ کے لطف و کرم کو یاد رکھوں گا"، (خط نمبر ۶ مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۰۸ء لندن) "میں ہمیشہ آپ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں اور میرا دل ہمیشہ بڑے خوب صورت خیالوں سے معمور رہتا ہے" (لندن ۲۱ جنوری ۱۹۰۸ء) "آپ کی تصویر میری میز پر رکھی ہے، اور ہمیشہ مجھے ان سہانے وقتوں کی یاد دلاتی ہے جو میں نے آپ کے ساتھ گزارے تھے" (لندن ۲۶ فروری ۱۹۰۸ء) "میرے دلِ غمگیں میں آپ کے لیے بڑی خوب صورت سوچیں ہیں اور یہ خاموشی سے ایک کے بعد ایک آپ کی طرف روانہ ہوتی ہیں۔ یہ ہیں آپ کے لیے میری تمنّائیں (لندن ۳ جون ۱۹۰۸ء) "اگرچہ کئی ملک اور سمندر ہمیں ایک دوسرے سے جدا کریں گے۔ پھر بھی ہمارے درمیان ایک غیر مرئی رشتہ قائم رہے گا۔ میرے خیالات ایک مقناطیسی قوت کے ساتھ آپ کی طرف دوڑیں گے اور اس بندھن کو مضبوط بنائیں گے"، (لندن ۲۷ جون ۱۹۰۸ء) "میں اپنی ساری جرمن زبان بھول گیا ہوں، لیکن مجھے صرف ایک لفظ یاد ہے ۔۔۔۔ ایما"، (سیالکوٹ، ۳ ستمبر ۱۹۰۸ء) "ہائیڈل برگ میں میرا قیام مجھے ایک خوب صورت خواب سا لگتا ہے، اور میں اس خواب کو دہرانا چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ آپ بہتر جانتی ہیں" (لاہور۔ ۱۱ جنوری ۱۹۰۹ء) "بعض اوقات میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہوں ۔۔۔۔ براہ کرم مجھے اپنے دل اور اپنی یادوں میں ایک چھوٹی سی جگہ دیجیے گا"۔۔۔۔۔
(لاہور۔ ۲۰ جولائی ۱۹۰۹ء) "اگر میں واقعی یورپ آیا تو یقیناً اس دیارِ قدیم جرمنی کا بھی پھر سفر کروں اور آپ سے دوبارہ ہائیڈل برگ یا ئیل براؤن میں ملاقات کو آؤں گا جہاں سے ہم دونوں ایک ساتھ اس عظیم فن کار گوئٹے، کے مزارِ مقدس کی زیارت کو جائیں گے" (لاہور، ۷ جون ۱۹۱۴ء) "میں ہائیڈل برگ کے وہ ایام کبھی فراموش نہ کر سکوں گا جب آپ نے مجھے گوئٹے کا "فاؤسٹ"، پڑھایا۔۔۔۔ اور دیگر کئی طرح سے میری مدد کی تھی، وہ کیا ہی بہجت افزا دن تھے ۔۔۔۔ میں اپنی سعی پوری کوشش کروں گا کہ ہائیڈل برگ آؤں اور آپ سے اسی پرانے مقام پر ملاقات کروں۔ مجھے اب تک دریائے نیکر یاد ہے جس کے کنارے ہم دونوں ایک ساتھ گھوما کرتے تھے ۔۔۔۔ مجھے یہ کہنے کی بالکل ضرورت نہیں کہ میری یہ بڑی ہی آرزو ہے کہ میں پھر آپ سے ملوں اور ان پُرمسرت دنوں کی یادیں تازہ کروں جو افسوس کہ اب ہمیشہ کے لیے گزر چکے ہیں"۔۔۔ (لندن۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء)، اور آخر میں "میرے یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں ہے کہ ان تمام برسوں میں میں نے آپ کو کبھی فراموش نہیں کیا اور میرے دل میں ہمیشہ یہ تمنّا زندہ رہی ہے کہ میں دوبارہ آپ سے ملوں گا، لیکن بختِ تیرہ کو جو منظور ہوا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! ان دنوں کی یاد جب ہم گوئٹے کا فاؤسٹ ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے، ہمیشہ ایک غم انگیز مسرت کے ساتھ میرے دل میں آتی رہتی ہے۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو بتاؤں کہ ان تمام سالہا سال کے دوران میں کیا کرتا اور سوچتا رہا ہوں۔ تو سنیے! میں نے بہت کچھ لکھا ہے اور وہ تمام چیزیں جو میں نے بطور شاعری اور فلسفے کے لکھی ہیں، وہ میں نے شائع کر دی ہیں۔ تاہم میرے ذہن نے ہمیشہ ایک کمی سی محسوس کی ہے اور خود کو اپنے ان ہندی گرد و نواح میں تنہا سا پایا ہے۔ جوں جوں میری عمر بڑھ رہی ہے اس تنہائی کا احساس بھی فزوں تر ہوا جاتا ہے، لیکن سوائے تسلیم و رضا کے ہمارے لیے اور کوئی چارہ کار

نہیں، اور میں نے بھی پوری تسکینِ دل کے ساتھ اپنی قسمت کو قبول کر لیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔" (خط نمبر ۲۴ لندن، ۱۷ جنوری ۱۹۳۲ء)
تو یہ تھیں وہ پاکیزہ اور جذبات سے مملو یادیں اور سوچیں جو اقبال کے دل میں ایما کے لیے سالہا سال تک موجزن رہیں اور یقیناً ایما کے دل سے بھی منعکس ہوتی رہی ہوں گی (کیوں کہ جیسا کہ اس سے ایک روز قبل ایما کی برادر زادی پروفیسر ہیلا کرشن ہوفت نے مجھے بتایا تھا، ان کے خاندان میں یہ روایت تھی کہ ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ ایما ہندوستان جانے کی خواہش رکھتی تھی، لیکن اس کے بڑے بھائی کارل نے اسے اس سفر سے منع کر دیا تھا۔ دیکھیے اس مضمون کا حصہ اوّل[1])

جب میں ایما کی قبر کے سرہانے بیٹھا یہ سوچیں اپنے ذہن میں تازہ کر رہا تھا تو اس وقت مجھے واقعی یوں محسوس ہوا گویا اقبال خود اس گھڑی میرے اور ایما ویگے ناسٹ کے ساتھ اسی گوشۂ خاک پر موجود ہیں اور خوش ہیں کہ سالہا سال کے بعد ان کا ایک قاصد اور ہم راز ان کا پیامِ شوق لے کر وہاں آیا ہے ؎

صبا بہ گلشنِ ویمر سلامِ ما برساں
کہ چشمِ نکتہ وراں خاکِ آں دیار افروخت (اقبال)

---

[1] پچھلے ہفتے (بروز ۲۰ جولائی ۱۹۸۸ء) ڈسل ڈورف میں محترمہ ایڈتھ شمٹ ویگے ناسٹ نے بھی اس روایت کی تصدیق کی انھوں نے کہا کہ میری پھوپی ایما نے، جو مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں، کبھی کھلے الفاظ میں تو مجھے ایسا نہیں بتایا لیکن اپنی تمناؤں اور یادوں کے بارے میں انھوں نے مجھے یقیناً یہ IMPRESSION (تاثر) دیا اور اس زمانے کی طرف اور ان احساسات کی جانب کئی مرتبہ اشارہ کیا۔

پھر ایڈتھ خاتون کہنے لگیں، ہاں مجھے ایک اور بات یاد آئی اور تھوڑی دیر میں وہ اپنے جواہرات کی صندوقچی میں سے ایک بڑا خوب صورت زیور لے کر آئیں جو انھوں نے مجھے اور میری بیوی کو دکھایا۔ یہ ایک بڑا دلکش اور دیدہ زیب BROOCH (بلاؤز کے سینے پر ٹانکنے کا مرصّع) تھا۔ یہ قریباً ایک RHOMBUS معیّن یا پتنگ یعنی KITE کی شکل میں تھا جس کی اطراف ڈیڑھ سینٹی میٹر کے قریب تھیں۔ یہ بڑے نازک کام کا ایک طلائی زیور تھا جس کے درمیان میں دو بڑے خوب صورت ننھے ننھے موتی جڑے ہوئے تھے اور ارد گرد سنہری پتیاں سی بل کھاتی ہوئی بیلوں کی صورت میں حلقہ کیے ہوئے تھیں (اس وقت میرے سامنے اس کی ایک رنگین تصویر موجود ہے) ایڈتھ خاتون کہنے لگیں کہ اس قسم کے دو بروچ تھے جو ایما کی ملکیت تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ ان کی بہن صوفی کے پاس آئے جنھوں نے ان میں سے ایک مجھ کو اور دوسرا اپنی دوسری بھتیجی (یعنی میرے بڑے چچا کارل کی بیٹی) فریدہ FRIEDA کو عطا کر دیا۔ پھر ایک مرتبہ جب میری کزن فریدہ اسے مرمت کے لیے اپنے جوہری کے پاس لے گئی تو اس نے کہا کہ یہ تو ہندوستانی کام کا ایک بڑا نازک اور خوب صورت مرصّع ہے۔ چنانچہ اس وقت سے میرا (یعنی ایڈتھ ویگے ناسٹ کا) یہ ذاتی خیال رہا ہے کہ یہ دونوں خوب صورت اور جڑواں بروچ اقبال ہی نے ایما کو ہندوستان سے تحفتاً بھیجے ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب (مزید دیکھیے میری کتاب "اقبال یورپ میں")، اقبال کا خط نمبر ۱۵ مرقومہ لاہور ۲۲ ستمبر ۱۹۱۰ء، جس میں وہ ایما کو تبتی بھیڑ کی کھال کی بنی ہوئی ایک چیز تحفتاً بھیجنے کا ذکر کرتے ہیں جو اوور کوٹ کے کالر اور بازوؤں پر لگانے کے لیے تھی مزید ان کا خط نمبر ۱۶ - از لاہور ۱۱ مئی ۱۹۱۱ء، جس میں وہ ایما کا ان خوب صورت ٹائیوں یا گلوبندوں (CRAVATS) کے لیے شکریہ ادا کرتے ہیں جو اس نے اقبال کو تحفتاً بھیجی تھیں)   درانی

ڈاکٹر سعید اختر درانی

فاتحہ خوانی کے بعد میں نے ایمّا ویگے ناسٹ کی قبر کی چند ایک تصویریں اتاریں جن میں سے چند میں مسز ایلسا ویگے ناسٹ اپنے شوہر کی پھوپی ایمّا کی قبر کی تزئین کر رہی تھیں اور ایک دو میں میں دعائے مغفرت کر رہا تھا یا ایمّا کی قبر پر پھول چڑھا رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس قبر کے چند پھول یادگار کے طور پر اپنی جیب میں رکھے اور ایمّا کو دل ہی دل میں سلام کہہ کر ان سے رخصت چاہی۔ اس خواہش کے ساتھ کہ انشاء اللہ ایک روز پھر حاضر ہوں گا اور اس اثنا میں اقبال کے دلدادگان کو اس زیارت کے حالات سے آگاہ کروں گا۔

ایلسا ویگے ناسٹ نے کہا کہ چلیے اب آپ کو ویگے ناسٹ خاندان کی کچھ اور قبریں بھی دکھا دوں جہاں میرے شوہر مرحوم کا مزار بھی ہے۔ پھر وہ ہمیں ایمّا اور اس کے والدین کی قبروں سے کافی فاصلے پر اسی قبرستان کے ایک اور گوشے میں لے گئیں۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ ایک خاصا اثر آفریں (IMPRESSIVE) کنج لحد واقع ہے جس میں ایک پُر شوکت بڑا سا سنگ مزار ایستادہ ہے اور اس گوشے کے گردا گرد تن آور پودے حلقہ کیے ہوئے ہیں جن کے سرخ اور بادامی پھول نقرئی دھوپ میں لہلہا رہے تھے۔ یہاں پروفیسر کرشن ہوف کے والدین دفن تھے (ان کے والد ماجد کا نام OTTO WEGENAST تھا اور وہ ۱۹۵۲ء میں فوت ہوئے تھے) ایک قبر پر ایلسا ویگے ناسٹ کے شوہر محترم (LUDWIG) کا نام کندہ تھا۔ جن کا ۱۹۷۶ء میں انتقال ہوا تھا۔[1]

ایلسا نے اپنے شوہر کی قبر پر پھولوں کو آراستہ کیا اور مرحوم کے بارے میں کچھ محبت آمیز الفاظ کہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بیچارے بھی نوجوانی میں دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے چند ماہ بعد فرانس میں جنگی قیدی (PRISONER OF WAR) کے طور سے جاں بحق ہو گئے تھے۔ ان کی عمر اس وقت پینتالیس[۴۵] سال تھی۔

یہاں بھی چند مزید تصویریں اتارنے کے بعد (جن میں سے ایک میں نے بعد ازاں پروفیسر کرشن ہوف کو انگلستان سے شکریے کے ایک خط کے ساتھ بھیج دی۔ جس میں ان کے والدین کا کتبہ دکھائی دیتا تھا) ہم لوگ واپس روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم دوبارہ ایمّا ویگے ناسٹ کی قبر کے سامنے سے گزرے اور میں نے پھر ایک بار اس لحد کے دیدار سے آنکھیں روشن کیں۔ جب ہم قبرستان سے گزر رہے تھے تو مسز ایلسا ویگے ناسٹ نے فرمایا کہ ان قبروں کی نگہداشت اور UPKEEP یعنی انھیں برقرار رکھنے کے لیے ویگے ناسٹ خاندان کو بلدیہ ہائیڈل برگ کو ہر دس سال (یا کسی ایسی ہی مدت) کے بعد ایک خاصی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ انھوں نے کنایتاً استفسار کیا کہ اب جب کہ علامہ اقبال کے توسط سے پاکستانی قوم اور ویگے ناسٹ خاندان کے درمیان ایک رشتہ استوار ہو گیا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ مثلاً حکومت پاکستان ایمّا ویگے ناسٹ کی قبر کی خبر گیری کے اخراجات کا ذمہ لے لے، میں نے کہا کہ میں اس بارے میں کوشش کروں گا۔ چنانچہ یہ سطور میں نے اسی نقطۂ نظر سے تحریر کی ہیں تاکہ مسز ایلسا ویگے ناسٹ کی یہ خواہش میں متعلقہ حکام کے علم میں لا سکوں۔ ع

تو دانی حساب کم و بیش را

---

[1] پچھلے مہینے یعنی بروز ۱۹ اگست ۱۹۸۵ء مجھے ہنس ویگے ناسٹ نے بتایا کہ یہاں ان کے والد یعنی جناب لُڈوگ ویگے ناسٹ کا صرف کتبہ یعنی سنگ مزار نصب ہے۔ ان کی خاک تاحال فرانس میں آسودہ ہے۔ یوں ایمّا کے والد ایڈولف ویگے ناسٹ اور لُڈوگ کے دادا گستاف ویگے ناسٹ جڑواں بھائی تھے اور دونوں کی تاریخ پیدائش ۴ اپریل ۱۸۲۴ء تھی۔ درانی

یاں ایمّا ویگے ناسٹ کی لوحِ مزار پران کے والد ماجد کی تاریخ وفات یعنی ۱۹۱۳ء کو میں نے ذہنی طور سے بالخصوص نوٹ کیا۔ کیوں کہ علامہ اقبال کا خط نمبر ۱۸ بنام ایمّا ویگے ناسٹ (لاہور ۳۰ جولائی ۱۹۱۳ء) ایمّا کے والد محترم کی وفات ہی سے متعلق ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ " مجھے آپ کے والد صاحب کی وفات کی خبر سن کر بے انتہا صدمہ ہوا ہے، اور اگرچہ میرا خط اس افسوسناک سانحے کے بہت دنوں بعد آپ تک پہنچے گا تاہم اس اندوہناک نقصان میں آپ کے ساتھ مجھے جو ہمدردی ہے اس کی شدت کو نہ وقت کم کر سکتا ہے، نہ فاصلہ ..... " چنانچہ ایمّا کے والد کا سنگِ مزار علامہ اقبال کے اس مجموعۂ خطوط کی اصلیت (AUTHENTICITY) کی تصدیق کرتا ہے۔ اگر کسی تصدیق کی ضرورت ہو تو واضح رہے کہ علامہ اقبال کا ایمّا کے نام یہ وہ پہلا خط ہے جو (چھے سال کے عرصے میں) انھوں نے انگریزی زبان میں لکھا ہے۔ اس سے پیشتر کے تمام سترہ مکتوب جرمن زبان میں تحریر کیے گئے تھے۔ البتہ یہ خط علامہ نے انگریزی میں اس لیے لکھا کہ شدتِ جذبات کا اظہار کر سکیں ورنہ اس سے قبل کے تمام خطوط میں وہ بار بار یہ معذرت کرتے رہے تھے کہ " جب آدمی کوئی زبان نہیں لکھ سکتا تو اس کا قلم بہت دل شکستہ ہوتا ہے اور ایسے انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ اپنے دلی جذبات کا پورا اظہار کر سکے " (خط نمبر ۱۶ مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۱۱ء از لاہور) ۔ پھر ایک دفعہ جب ۱۹۱۳ء کے اس خط میں وہ انگریزی زبان میں اظہارِ جذبات کر چکے تو اس کے بعد کے تمام خطوط علامہ اقبال نے ایمّا کو انگریزی ہی میں لکھے ہیں۔

(جاری) ۵۵

افکار فاؤنڈیشن کراچی

(ایک فلاحی ٹرسٹ)

افکار فاؤنڈیشن کے کثیر المقاصد ادبی منصوبوں میں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا فروغ، تحقیقی اور نادر دستاویزات کی تلاش و ترتیب اور اشاعت، مستحق ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کے لیے بہبود فنڈ کا قیام، نونہالانِ قوم، خواتین اور نئی نسل کے تعمیری منصوبوں میں اشتراک و تعاون شامل ہے۔

افکار فاؤنڈیشن کے اراکین ٹرسٹ دفاتر کی فراہمی کے بعد " بہبود فنڈ " کے جلد از جلد قیام کے لیے کوشاں ہیں۔ افکار کے قارئین، اردو کے بہی خواہوں اور تمام افکار دوستوں سے درخواست ہے کہ اس کارِ خیر میں حصّہ لے کر شکر گزار فرمائیں اور زیادہ سے زیادہ عطیات بھیج کر اس منصوبے کی تکمیل میں ہاتھ بٹائیں۔

اردو رسالوں کی تاریخ میں افکار فاؤنڈیشن پہلا ٹرسٹ ہے جس نے ایک قلیل عرصے میں رفیقانِ افکار کے بھرپور تعاون سے کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

ادا جعفری

خود نوشت

(ساتویں قسط)

روشنی کی لکیر

جب ان حیران آنکھوں نے
اجالے اور اندھیرے دیکھنا سیکھا
اندھیرے باادب خدّام کی صورت کھڑے استادہ
اُجالا ماں کی پلکوں پر دھرا تھا۔

میں بند دروازے کے آگے کھڑی ہوئی تھی۔ دستک دینے کی اجازت نہیں تھی اور جرأت بھی نہیں تھی۔ دل آرزومند بھی تھا اور خوف زدہ بھی۔ پھر ایک مہربان ہاتھ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ بند کواڑوں نے راستہ دے دیا تھا اور دور روشن اور مستحکم نقوش قدم میری رہ نمائی کر رہے تھے۔

ٹونک والا پھاٹک کے اندر رہنے والے ایک طے شدہ ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے، جہاں روایت کسی قسم کے فیصلے مرد خود اپنے لیے نہیں کر سکتے تھے وہاں عورتوں کے لیے تو سانس لینے کے آداب تک مقرر تھے۔ ایسے میں وہ ہستی صرف ماں کی تھی جس نے نسل در نسل بڑی استقامت اور صبر کے ساتھ اپنی بیٹیوں کے لیے ایک خاموش اور مسلسل جہاد کیا۔

مدّتوں برِّصغیر میں مرد کے پندارِ برتری نے عورت کو علم و آگہی کے ورثے کے قابل ہی نہیں سمجھا تھا اور مدّتوں عورت احساسِ محرومی سے بھی محروم رہی تھی۔ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ ٹونک والا پھاٹک کے اندر مرد کا گلو بند اور اکسیرِ حیات سے زیادہ قیمتی تھا۔ یوں بھی جاگیردارانہ نظام میں یہ صرف مرد کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ اپنی زیرِ نگیں مخلوق کو کس حد تک شرف دینا چاہتا ہے اور مرد کو عورت کے ذہن یا اس کے علم کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں تھی، لیکن ہر ماں اپنی عمر بھر کی فرماں برداری کے صلے میں اتنی کامیابی ضرور حاصل کرتی رہی کہ اس کی بیٹی کا قدم اس رہ گزرِ حیات میں نسبتاً اونچی اور ہموار سطح پر ہو۔ برِّصغیر میں

اگلے زمانوں کی عورت نے اپنی تمام محرومیوں کا معاوضہ اتنا ہی چاہا کہ اس کی اگلی نسل کو سانس لینے کے لیے تھوڑی سی اور کھلی فضا میسّر آجائے۔ وہاں یک دو نفس کی اجازت مل جانا بھی کچھ کم نہیں تھا اور بے شک اس کوشش میں وہ شاد کام رہی۔ عورت نے جینے کے لیے بڑا طویل سفر کیا ہے

ٹونک والا خاندان میں خصوصاً آدم کی بیٹیوں کا یہ سفر اور بھی دشوار گزار بنا دیا گیا تھا۔ نہ جانے کیوں ؟ لیکن میری ماں کے زمانے تک آتے آتے وقت بھی کچھ تیز رفتار ہو چکا تھا اس لیے اس نسل کی ماں قابل شمار رکاوٹوں کو عبور کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ آج کے دوڑتے بھاگتے بلکہ پرواز کرتے ہوئے وقت میں اس ٹھہرے ہوئے اور منجمد دور کا تصوّر بھی شاید ممکن نہ ہو۔ وہ رینگتا ہوا وقت، گھر کی بساط پر کچھ خانے بنے ہوئے ایک شطرنج، جس کا ہر مہرہ اپنی جگہ پر قرینے سے رکھا ہوا ایک طویل تسلسل، ایک طے شدہ یکسانیت، سوچنے سمجھنے اور دیکھنے کے تمام دریچے بند، دبیز دھند کی چادر اوڑھے ہوئے ارض و سما۔

میری ماں کے سامنے بھی ابھی تک کئی سنگین فصیلیں موجود تھیں۔ انھوں نے اپنے بچّوں کی خاطر حالات اور روایات سے شکست تسلیم نہیں کی۔ ان ناتواں مہربان ہاتھوں نے پتھر کی دیوار میں شگاف تراشا اور اسی روزنِ دیوار سے تازہ ہوا کے جھونکے اور روشنی کی لکیر دونوں کو گھٹے ہوئے اندھیرے دالانوں میں اذنِ باریابی ملا۔

امّی کی دور اندیشی اور فراست کے ساتھ نانا کا محترم اور مہربان وجود بھی تھا جو ہمارے لیے گھنے سایہ دار شجر کی طرح تھا۔ جہاں رواج اور ماحول کی تمام تمازتوں سے ہر ممکن پناہ حاصل رہی، طبعاً فراخ دل، روشن خیال اور خاندان پرور تھے۔ امّی نے اس زمانے کی پرورش سے ہٹ کر اور اس خاندان کی قدیم روایات سے روگردانی کرتے ہوئے جو دانش مندانہ فیصلے کیے ان فیصلوں کو نانا کی تائید حاصل رہی۔

امّی بہت کم عمری میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ اندازاً تیس پینتیس سال کی عمر میں۔ مالی پریشانی نہیں تھی۔ اپنا علیحدہ گھر بسانے کی کبھی اجازت ہی نہیں ملی تھی، لیکن بیوگی کی سفید چادر جن کلفتوں اور ظلمتوں سے بُنی ہوئی ہوتی ہے ان کا بوجھ اٹھانے کے ساتھ ساتھ ایک نومولود بیٹے اور تین کم سن بیٹیوں کی پرورش، پرداخت اور تربیت کی چٹانیں بھی سامنے سر اٹھائے کھڑی تھیں جنھیں سر کرنا تھا۔ باپ کے سائے سے محروم بچّوں کو اپنی زندگی اپنی ہی دھوپ اور اپنی ہی چھاؤں میں بسر کرنا سکھانا تھا اور اس ماحول میں جہاں آہ بھرنے کے لیے بھی اجازت درکار تھی۔ ان کے سامنے صرف اپنی زندگی گزارنے کا سوال نہیں تھا، اپنے بچّوں کا حال اور مستقبل سنوارنے کے مراحل بھی تھے جو بڑے حوصلے اور مستقل مزاجی کے ساتھ انھوں نے طے کیے۔

میری عبادت گزار، کم گو اور صابر ماں غم کی آگ میں تپ کر بے شک کندن ہو گئی تھیں۔ پورے خاندان کے لیے ان کا وجود ایک رحمت تھا۔ ہم نے ہمیشہ انھیں مصروف دیکھا۔ گود کے بچّوں کا علاج معالجہ ہو یا گھر داری کے انتظامات، خاندان میں کوئی بھی بیمار رہو، امّی تیمارداری کرتی نظر آتیں۔ گھریلو فیصلے ان کے مشورے سے انجام پاتے۔ ہاں اپنے تمام معاملات انھوں نے اللہ کے سپرد کر دیے تھے۔ میں نے انھیں افسردہ یا اداس نہیں دیکھا۔

انتقال سے چند دن پہلے میرے والد نے ان سے کہا تھا۔

"میری تینوں بیٹیاں اپنا اپنا نصیب لے کر آئی ہیں۔ تم ان کے لیے پریشان نہ ہونا، اور میں اسے نہیں دیکھ سکوں گا، لیکن تم اپنے بیٹے کی بہت خوشیاں دیکھو گی۔"

شاید انھیں جملوں کے سہارے وہ کھڑی تھیں۔ ان جملوں کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ امّی نے طویل عمر پائی۔ طیّب کے ساتھ ہی رہیں۔ طیّب والد کی وفات کے تین مہینے بعد پیدا ہوئے تھے۔ میری بھاوج سعیدہ نے ان سے بیٹیوں سے زیادہ محبّت کی۔ ان کے بچّے فوزیہ، فراز، شاداب اور اسما امّی کی زندگی بھر کی محرومیوں کے صلے کی طرح ان کے پاس رہے۔ آخری بیماری میں ان کی خدمت کی سعادت بھی سعیدہ کے حصّے میں آئی۔

اس زمانے، اس ماحول اور اس گھر کے لحاظ سے امّی یقیناً ایک غیر معمولی خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی اولاد کے لیے جو فیصلے کیے وہ بڑے دور رس نتائج کے حامل تھے۔ آج جب میں سوچتی ہوں تو مجھے ان کی پیش بینی پر حیرت ہوتی ہے۔ جیسے وہ واقعی وقت کے قدموں کی چاپ سن رہی تھیں۔ انھیں اپنے بچّوں کے مستقبل کا جو دھیان تھا وہ ماتا کا محض ایک خواب بن کر نہیں رہ گیا۔ انھوں نے اپنے خوابوں کو جیتی جاگتی حقیقت بنانے کی اپنے مقدور بھر اور طویل عرصے تک جدوجہد بھی کی جس کے لیے بڑی ہمّت، اور استقامت کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کے وسائل محدود تھے اور اختیارات محدود تر۔

سب سے پہلا اہم فیصلہ انھوں نے اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں کیا۔ اگرچہ قدم قدم پر پابندیوں کی وجہ سے بہت سی آرزوئیں نہ ہماری پوری ہو سکیں نہ ان کی، لیکن رکاوٹوں کا مقابلہ تو انھوں نے کیا۔ اپنے اس حق کی اہمیت کا احساس تو حلقۂ خواتین میں بیدار کیا۔

جہاں لڑکیوں کے لیے مروّجہ تعلیم حاصل کرنے کے تمام دروازے بند تھے وہاں امّی نے سب سے پہلے میری بڑی بہن کو ایک عمر رسیدہ استاد سے پردے کے مکمّل اور شدید انتظام کے ساتھ فارسی پڑھوائی اور ساتھ ہی ایک ہندو ٹیوٹر سے انگریزی بھی۔

ٹیوشن کا سلسلہ پردے کے مکمّل انتظام کے ساتھ شروع کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود خاندان کے کئی بزرگ خفا ہوئے۔ مخالفت زیادہ تر خواتین ہی کی جانب سے شدید تھی۔ لڑکیوں کو انگریزی پڑھانا ناقابلِ درگزر واقعہ یا سانحہ تھا۔ میری ماں نے حالات کا تحمّل سے سامنا کیا۔ لیکن اندھیروں سے سمجھوتے پر راضی نہیں ہوئیں۔ پہلا قدم اٹھایا جا چکا تھا۔ پہلا قدم جو راہ سفر کا تعیّن کرتا ہے۔ ان کی پوری زندگی ایک تکلیف دہ اور مصنوعی طرزِ حیات کے خلاف خاموش، لیکن پُر اثر اور نتیجہ خیز احتجاج تھی۔ وقت کے احکام بھی اٹل تھے۔ دیکھتے دیکھتے تعصّبات کی بوسیدہ فصیلیں تڑخ رہی تھیں۔ مخالفتیں دم توڑ گئیں اور پھر اس خاندان کی دوسری لڑکیوں کے لیے تعلیم کے دروازے خود بخود کھلتے چلے گئے کہ اب ایک نئی روایت جنم لے چکی تھی۔

بدایوں میں اس زمانے میں لڑکیوں کا کوئی کالج نہیں تھا۔ پرائیویٹ طالبہ کی حیثیت سے میں امتحانات میں شریک بھی ہوئی، لیکن مجھے باقاعدہ کالج میں داخل ہو کر تعلیم حاصل نہ کر سکنے کا دکھ بہت رہا اور بہت دنوں رہا۔

زمانہ، علی گڑھ یونیورسٹی، گرلز کالج ——— وہ خواب تھا جو کبھی پورا نہیں ہوا۔

میرا جو دکھ تھا اس کا مداوا مولا کے کرم سے میری بیٹی صبیحہ نے کیا۔ جب وہ راولپنڈی میں کالج میں داخل ہوئی تو ان فضاؤں میں سانس میں لے رہی تھی۔ جب اس نے میری لینڈ یونیورسٹی (امریکہ) سے پی ایچ ڈی کیا تو نصرت و کامرانی مجھے حاصل ہوئی۔

ہاں شاید ابھی تک ایک دل ربا رشک کی اصرار کرتی ہوئی کیفیت سے مکمل چھٹکارا نہیں مل سکا ہے اور چھٹکارا میں چاہتی بھی کب ہوں۔ امریکہ بچوں کو دیکھنے جاتی ہوں اور ہر بار ایمرسٹ اور بوسٹن کی شہرۂ آفاق جامعات کی زیارت مجھ پر لازم آجاتی ہے۔ ہارورڈ، ایم آئی ٹی　　یونیورسٹی آف میساچیوسٹس وغیرہ۔ اب تو عزی کا گھر اس نواح میں ہے اس لیے یہ پھیرا اور آسان ہو گیا ہے۔

ان ہواؤں میں سانس کتنی نکہت بیز لگتی ہے۔ ارض و سما کا یہ مخصوص حصہ کتنا پاکیزہ، کتنا مقدس نظر آتا ہے۔ ہر ملک، ہر قوم اور ہر مذہب کی نوجوان نسل کے اُجلے اُجلے چہرے، خود آشنا اور خود اعتماد چہرے، یہ خوش نصیب چہرے جن کے آئینوں کے آگے کوئی انسان ساختہ دیوار نہیں ہے۔ کتاب اور قلم کی حرمتوں سے آشنا یہ نوجوان جنھیں ان کی اپنی مرادیں ہی پروان چڑھاتی ہیں۔ ان امنگوں کے راستے میں کوئی سنگِ گراں حائل نہیں ہوتا۔ اگر مالی حیثیت مستحکم نہیں ہے، ماں باپ مجبور ہیں یا مزید اخراجات برداشت کرنا نہیں چاہتے تو ایک ٹرم میں کوئی سی بھی ملازمت اختیار کر لی۔ پیسے جمع کیے اور اگلی میقات کے لیے دوبارہ داخلہ لے لیا۔ اس میں وقت لگتا ہے، مگر اپنی اپنی تشنگی ہے اور اپنی اپنی سیرابی۔

قابلِ رشک تو ہر ملک، ہر قوم اور ہر مذہب کی وہ پرانی نسل بھی ہے جو صدیوں اور قرنوں سے نئی نسل کی راہوں میں چراغ سے چراغ جلاتی چلی آ رہی ہے۔ قلبِ مطمئنہ کا حق دار بھلا ان سے زیادہ کون ٹھہرے گا۔

میرے دیس کے کسی چھوٹے سے گاؤں کا وہ مدرس جو پیڑ کی چھاؤں میں ٹوٹی پھوٹی چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس چند بچوں کو پڑھاتا نظر آتا ہے وہ بھی اسی عالمگیر برادری کا ایک معزز رکن ہے۔

مگر آج میرے شہروں کو کیا ہو گیا ہے۔ تدریسی اداروں کی زندگی بخشنے والی ہواؤں میں زہر کس نے گھول دیا ہے؟ میری آنکھوں میں آج کراچی کا تعلیمی ماحول بھی ہے، جہاں نوخیز ہاتھوں سے قلم چھین کر خوں آشام ہتھیار تھما دیے گئے ہیں۔ جہاں سال میں آٹھ مہینے فسادات کی وجہ سے درس گاہیں بند رہتی ہیں۔ سلامتی اور آشتی کی وراثت کے امین دھوئیں اور شعلوں میں اپنا چہرہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ آج ہمارے بچوں کی آنکھوں سے خوب صورت خواب تک نوچ لیے گئے ہیں، مگر انسان، انسان سے مایوس کیسے ہو جائے۔ جو ہو رہا ہے انسانی تاریخ میں ایسا بھی ہوتا آیا ہے۔ ہمیشہ ظلمتوں کی کوکھ سے ہی دمکتا ہوا آفتاب جنم لیتا ہے اور اجالا داغ داغ کو نہیں دیکھتا اور آنکھیں اجالوں کا انتظار کرنا جانتی ہیں۔

جب زہرہ بیمار ہوئی ان دنوں ہم لڑکے لڑکیاں چودھویں کے چاند سے خوف زدہ رہتے تھے۔ اس کی ذہنی کیفیت کا اتار چڑھاؤ حیرت انگیز طور پر چاند کے عروج و زوال سے مربوط تھا۔ پونم کی رات اس کی حالت بے انتہا خراب ہوتی تھی۔

ہمیں اس سے محبت تھی۔ دل دُکھتا بھی تھا اور خود اپنی دماغی صحت کی جانب سے ہزار بدگمانیاں بھی دل میں جنم لیتی تھیں

ادا جعفری

ایسے میں اگر والدہ نے پڑھنے لکھنے کی لگن بیمارانہ کی ہوتی یا اس کو پہنچنے کا موقع نہ دیا ہوتا تو شاید ہمارا اعتماد ہمیشہ کے لیے زندگی کی خوش آئندگی پر سے اُٹھ جاتا۔ میرے لیے تو میری موزونیٔ طبع کی بنیاد پر انھوں نے ایک نئے افق کو لبیک کہنے کی آسائش بھی مہیا کردی تھی، جیسے مجھے دو دنیاؤں کی توقیت اور شہرت مل گئی ہو یا جیسے زندگی نے سوتے سوتے اچانک آنکھیں کھول کر گرد و پیش کا جائزہ لیا ہو۔

ان دنوں کی ایک نظم کا عنوان ہے 'افق کے پار'، اس کے چند مصرعے ہیں۔

یہ زندگی کہ شکست دوام کہیے جسے
طلسم بندگیٔ صبح و شام کہیے جسے
یہ رہ گزر مرے پائے جنوں کو راس نہیں
یہ تیرگی مری تعمیر کی اساس نہیں

یہ احساس بہ ظاہر تغیر میں اس وقت کے سماجی، سیاسی اور ادبی تناظر میں ایک اجتماعی حقیقت بھی رکھتا تھا۔

یہ بہرحال یہ بہرطور دن گزر رہے تھے۔ وقت کچھ نہ کچھ سکھا بھی رہا تھا اور پھر میرے فارسی کے استاد ناراض ہو گئے۔ ان بزرگ کا نام عبدالستار تھا۔ غالباً لڑکوں کے اسکول یا کالج میں مدرس تھے۔ آثر لکھنوی کی ایک رباعی کے معنی پر اختلاف اس ناراضگی کا سبب تھا۔ رباعی اردو کی تھی۔ ایک مصرعے میں جو ترکیب استعمال کی گئی تھی اس کی وضاحت کے لیے ان سے رجوع کیا تھا اور پھر ان کی تشریح کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اب سوچتی ہوں کہ اختلاف رائے کے باوجود میں احتراماً خاموش بھی رہ سکتی تھی۔ شاید وقت وقت کے اپنے ہی تقاضے ہوتے ہیں۔ خصوصاً کچی عمر میں خود شناسائی کی خواہش بہت سے حیلے بھی تراشتی ہے۔ ایک اقرار کے لیے کئی انکار بھی لازم آجاتے ہیں۔

ماسٹر عبدالستار نے تدریس کا سلسلہ آگے جاری رکھنے سے انکار کر دیا اور میں نے ایک بار پھر براہ راست کتابوں سے اپنا تدریسی سلسلہ جوڑ لیا۔ بعد میں یہی واقعہ آثر لکھنوی سے میرے تعارف کا وسیلہ بنا۔

بقیہ نصاب کے لیے ہندو استاد تھے۔ پہلے بابو رام اور پھر مدن لال، جن سے اپنے نصابی مضامین کے علاوہ میں نے ہندی پڑھی اور کچھ عرصہ سنسکرت بھی۔ رامائن شروع کی تھی، لیکن خالص ہندی زبان جتنی موہنی ہے سنسکرت کے الفاظ اتنے ہی ثقالت زدہ ملے۔ تلفظ قطعی غیر شاعرانہ۔ دل نہیں لگا۔

بدایوں میں نظامی پریس سے اخبار ذوالقرنین شائع ہوتا تھا۔ یہ اخبار اب بھی شائع ہو رہا ہے۔ نانا کے پاس "ذوالقرنین" "مدینہ" بجنور، اور انگریزی روزنامہ "پائنیر" آتا تھا اور ایک دو ادبی رسالے۔ پھر میرے نام تمام قابل ذکر رسائل کے اعزازی شمارے آنے لگے۔ میں اپنے خفیہ کتاب گھر سے بھی کتابیں نیچے آتی تھی اور بڑی بات یہ کہ تازہ مطبوعات کے وی پی پارسل منگوانے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ خریداری منظور شدہ تخمینے کے اندر ہی ہو سکتی تھی۔ مگر میرے سروساماں بے اختیاری میں اتنے اختیار کا سرمایہ بھی بہت تھا۔

وہ جدید شاعری اور مختصر افسانے کے عروج کا زمانہ تھا۔ ہمارے ادب میں پہلی بار حقیقی زندگی اپنے تمام تاریک اور روشن چہروں کے ساتھ بے نقاب ہوئی تھی۔ اردو شعر و ادب کی تاریخ کے نئے ابواب تحریر ہو رہے تھے اور ساتھ ہی نئے

مباحث بھی چھڑے ہوئے تھے جو برسوں الجھتے سلجھتے رہے۔ شاید اب بھی کسی کونے کھدرے میں موجود ہوں۔

کتابیں تو میں کم ہی خریدتی تھی، لیکن رسالے میرے پاس باقاعدگی سے آ رہے تھے۔ اس عہد میں نئے لکھنے والوں کے لیے تنقید بڑا اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ اس وقت تک کتابوں اور مصنفوں کی رونمائی کی بدعت شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے یہ مضامین محض اخلاقاً یا مصلحتاً نہیں لکھے جا رہے تھے اور ناقدیہ مضامین انتقاماً بھی نہیں لکھتا تھا۔ اس کے پیشِ نظر فنی محاسن و معائب کا ابلاغ ہوتا تھا۔ کوئی ذاتی رنجش نہیں۔

ایک چھوٹی سی مثال عندلیب شادانی کے وہ مضامین ہیں جو ساقی میں شائع ہوئے تھے۔ جن میں حسرتؔ، جگرؔ، اصغر گونڈوی اور دوسرے اساتذہ کے اشعار میں خالص فن کے حوالے سے کوتاہیوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔ ان موشگافیوں سے ان بزرگوں کا تو کچھ نہیں بگڑا کہ شاعری محض فن نہیں ہوتی، صرف موزوں الفاظ کا مجموعہ بھی نہیں ہوتی، ماورائے حرف و صوت بھی ہوتی ہے اور بہت کچھ ہوتی ہے۔ البتہ نئے لکھنے والوں کے سامنے فنی تقاضوں کے بہت سے پہلو آ رہے تھے اور وہ کچھ نہ کچھ سیکھ ہی رہے تھے۔

اس زمانے میں تنقید نگار حضرات کے جتنے مضامین میری نگاہ سے گزرے میں نے ان سے زبان و بیان کے بارے میں یقیناً بہت کچھ سیکھا۔ گھر میں آس پاس ساتھیوں یا بزرگوں میں مجھے اس سلسلے میں مشورہ دینے والا کوئی نہ تھا۔ میں تو جیسے ابھی ابھی ایک بند کوٹھری سے نکل کر ایک وسیع و عریض صحن میں آن کھڑی ہوئی تھی، جہاں اکیلی بھی تھی اور نگاہوں کے سامنے بھی تھی۔

ہمارے گھروں میں گنجائش کے باوجود لڑکیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ کمرہ نہیں ہوتا تھا۔ میری پوری سلطنت میرا پلنگ تھا اور اب جو والدہ کی مہربانی سے کتابوں تک رسائی ہوئی تو اس بستر کے ایک کونے میں خود ہوتی بقیہ ہر طرف کتابیں بکھری رہتیں۔ میں آج تک میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کے اسلوب سے آگاہ نہیں ہو سکی۔ آج بھی وہی پلنگ کا ایک کونا یا میری لائبریری کے فرش کا ایک مخصوص گوشہ، چاروں طرف بکھری ہوئی کتابیں، ہاتھ میں قلم اور سامنے کاغذ۔ یہی میری مسند ہے اور یہی میری جاگیر۔

ٹونک والا پھاٹک کے اندر ایک اور انقلاب آفریں فیصلہ امّی نے باجی کی شادی کے موقع پر کیا۔ اس خاندان میں میری بڑی بہن پہلی لڑکی تھیں جن کی شادی غیر خاندان میں ہوئی اور جو ٹونک والا پھاٹک سے رخصت ہوئیں۔

میرے بہنوئی ڈاکٹر مقبول الحق جنرل عتیق الرحمٰن کے چچازاد بھائی تھے۔ ان دنوں وہ بنارس میں میڈیکل آفیسر تھے۔ باجی شادی کے بعد بنارس جا کر رہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ ڈاکٹر نعیم الحق جو کراچی میں ہیں اور اسلم حق جو انجینئر ہیں اور امریکہ میں مقیم ہیں۔ دونوں ماشاء اللہ صاحبِ اولاد ہیں۔

بے شک امّی کے فیصلوں میں اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شامل رہا۔ ان کے اختیار میں جو کچھ تھا انھوں نے اس سے بہت زیادہ ہمارے لیے کیا۔ لیکن یہ فیصلے اتنے آسان نہیں تھے۔ مروّجہ دستور کے خلاف چلنے کی سکت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ میری ماں نے اپنے بچوں کی راہوں کے تمام کانٹے اپنی جھولی میں چن لیے۔ ان کی انگلیاں کیا کیا زخمی نہ ہوئی ہوں گی۔ اس روایت پرست خاندان میں مجھے انھوں نے نہ صرف شعر کہنے بلکہ چھپوانے کی بھی اجازت دی۔ میری جرأت اور رہنمائی کے جتنے موسم ہیں

وہ سب میں نے اسی ہستی میں دیکھئے جو آج اس دنیا میں نہیں ہے، مگر اجالے کے استعارے کی طرح اپنی اولاد کے ذہن اور دل میں سکونت رکھتی ہے۔

مدّتوں بعد جب میں نے اپنے نوجوان بیٹے صابر کے نام ایک نظم لکھی اس وقت بھی شاید میرے دل اور ذہن کے کسی گوشے میں میری ماں موجود تھیں۔ اس نظم کا عنوان ہے "شجر ناز ان" اس کے چند اختتامی مصرعے ہیں ؎

گھنیری چھاؤں مل جائے
تو موسم کی تمازت ہار جاتی ہے
دلوں میں پھول کھل جائیں
تو ویرانوں کی شدّت ہار جاتی ہے
مرے بچے!
مجھے جب دیکھنا جب سوچنا چاہو
تو بس اپنی طرف دیکھو
تمہارے لب پہ جو حرفِ صداقت ہے
یہی میں ہوں
تمہارے دل میں جو نازِ جسارت ہے
یہی میں ہوں
نگاہوں میں جو اک طرزِ عبادت ہے
یہی میں ہوں
محبت کی طرح میں بھی ہوں بے پایاں
کبھی ظاہر کبھی پنہاں
جہاں تم ہو وہاں تک میری خوشبو ہے
وہاں میں ہوں!

(خودنوشت کی نئی قسط بعنوان "سفر ہے شرط" اگلے مہینے ملاحظہ فرمائیے) ☙

اخترالایمان

نشاۃِ ثانیہ

موسموں کے بدلنے کا منظر تو پیچھے کہیں رہ گیا
کھیت پر چھاؤں میں شیشموں کے
بھرے کنڈ میں!
جامنوں کے گھنے جھنڈ میں!
کوئلوں اور پپیہوں کے آوازے کے شور میں
اُمڈے جذبات کے زور میں
وقت یوں بہہ گیا جیسے آنسو کا قطرہ تھا بے مایہ سا
قہقہہ تھا جو پھولوں کی خوشبو میں گھل مل گیا
کتنے کردار ہیں سامنے
ہنستے روتے ہوئے
زندگی کی کشاکش میں اُلجھے ہوئے

عشق کرتے ہوئے آہیں بھرتے ہوئے
جانِ راحت پہ ہر آن مرتے ہوئے
بے خبر ساری دنیا سے اک دوسرے کو سنبھالے ہوئے
ہاتھوں کو چومتے بوسے آنکھوں کو دیتے ہوئے
بہتے جاتے ہیں موجِ رواں کی طرح
ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے
ایک دیکھی ہوئی فلم کا ایسا منظر ہے یہ
جس کے کردار اب گویا افسانہ ہیں
فلم بوسیدہ اتنی ہے چلتے ہوئے ٹوٹ جاتی ہے۔ پھر جوڑتا ہوں اسے
جوڑ کر پھر چلاتا ہوں خوش ہوتا ہوں
گاہے روتا ہوں میں
اک بہت خوب صورت سی رنگین تصویر ہے
کتنے لمحات میرے بھی اس فلم میں بند ہیں
وہ جو دھندلا سا چہرہ نظر آ رہا ہے تمھیں

پیڑ کی آڑ میں
وہ، جہاں سادہ کپڑوں میں
ایک مہ جبیں ہنس رہی ہے کھڑی
اس کے بائیں طرف میں ہوں وہ

○

رفعت سروش

سہلِ ممتنع غزل

خموشیاں، اُداسیاں
نظر نظر میں تشنگی
لبوں پہ پیاس کی جھلک
تھکی تھکی سی آنکھوں میں
نہ جانے کتنے رت جگے
رخِ حسیں، کہ جیسے پھول
موسم بہار کا
خزاں میں بھی کھلا رہے
ہر ایک برگ پر رقم
حکایتیں شباب کی
خطوطِ جسم میں نہاں
محبتوں کے تجربے
بدلتے موسموں کا عکس
گیسوؤں کی چھاؤں میں

وہ اک نظر میں یوں لگے
کہ جیسے میر کی غزل
لباسِ رنگ و نور میں

مرے لبوں پہ یہ غزل
ہے عالمِ سرور میں
معانی و خیال کی
ہزار جھلملاہٹیں
ہر اک لطیف شعر میں
یہ سہلِ ممتنع غزل
اُتر گئی ہے روح میں

حسن عابد

کتابِ دل کے افسانے

ہجر تھا کیا تھا کہ یوں ہم ما را ایوانوں میں تھے
پھول کمھلائے ہوئے رنگین گلدانوں میں تھے

مستِ پندارِ جنوں شب گرد، صحرا آشنا
اک زمانہ تھا کہ ہم اُس گل کے دیوانوں میں تھے

گفتگو کرتا تھا سارا شہر حسنِ یار کی
عشقِ موضوعِ سخن تھا رنگ افسانوں میں تھے

مجلسیں آباد تھیں اہلِ جنوں کے ذکر سے
نام تھا اپنا بھی روشن خوب فرزانوں میں تھے

ساقیانِ سیم بر تقسیم کرتے تھے شراب
رنگ مستانِ چمن آبادے خوانوں میں تھے

تیز تھی گردشِ لہو کی موج میں رہتا تھا دل
شعلہ ہائے آتشِ سیال پیمانوں میں تھے

پا بہ جولاں رقص کرتے تھے سرِ بازارِ شوق
عاشقانِ کج کلہ محبوب انسانوں میں تھے

حُسنِ کافر کی قصیدہ خوانیاں تھیں جا بہ جا
اور فقیہانِ حرم افسردہ انسانوں میں تھے

توڑ کر دیوار آجاتی تھی بستی تک صدا
کچھ عجب شوریدہ سر زنجیر زندانوں میں تھے

کوہ کن اور قیس تھے زندہ روایت کے نشاں
خسروانِ سرگراں نسیاں کے تہ خانوں میں تھے

کوچہ و بازار میں بستی کے رونق تھی کماں
نوجوانانِ گلستانِ دل غزل خوانوں میں تھے

حلقہ زن رہتے تھے سب روشن جبینانِ چمن
قصہ گویانِ سحر معروف انسانوں میں تھے

اور اب لگتا ہے یہ سب کچھ نہ تھا اک خواب تھا
جیسے یہ قصے کتابِ دل کے افسانوں میں تھے

اختر ضیائی

حسرتِ سعیٔ طلب

غم کا آہنگ ہے
اس شام کی تنہائی میں
دامِ نیرنگ ہے
آغاز کا انجام لیے
کوئی نغمہ کوئی خوشبو نہیں
پروائی میں
دل کے آئینے میں
اور روح کی گہرائی میں
ایک ہی عکس کئی نام لیے
رقص میں ہے
پرتوِ حسنِ دلآرام لیے
پھر ترے دھیان میں
بیٹھا ہوں تہی جام لیے
حسرتِ سعیٔ طلب
بے سر و سامان بھی ہے
سخت ہیجان بھی ہے
جلتے بجھتے سے دیے
زیست کی پہنائی میں
وقت کی جھیل میں
یادوں کے کنول

دور تک دھند کے ملبوس میں
مانوس نقوش
چاندنی رات یوں
تاج محل
تلخ ماضی کی حکایات ہیں
اور حال کے افسانے بھی
منتشر خواب ہیں
ویران صنم خانے بھی
ہاں مگر یاد
ترے وصل کا پیمان بھی ہے
ایک مدت سے
تیری دید کا ارمان بھی ہے

(لندن سے)

O

عذرا وحید

دو نظمیں

انگلش میڈیم اسکول

خوش ہے میرا بھائی کہ اس نے
قوم کو تہذیبی پس منظر دینے کو
انگلش میڈیم اسکول چلایا
خوش ہے میری بہن کہ اس نے
قوم کے بچّوں کو عصری ماحول مہیّا کر کے
وقت کو ان کے در پہ جھکایا
خوش ہوں میں کہ میرا بچّہ
انگلش میڈیم اسکول میں پڑھ کے
دولت مند گھرانے کا بچّہ کہلایا

○

سلمان رشدی

ایک شیطان نے
اپنے پندار کی دلپذیری کی خاطر
اُٹھایا تھا پتھر
کہ انساں کی تقدیس کو
بیچ بازار رسوا کرے
ایک طاقت نے
پتھر کو یہ سرفرازی عطا کی
کہ کیچڑ سے لت پت ہوا اہرمن کا سراپا

○

ماہ طلعت زاہدی

کوئی پیماں نیا باندھیں

ہمارے پیار کی مانند اُجلا
کنول مہتاب کا پھر کھل اُٹھا ہے
آسمانوں میں
ہمارے آنسوؤں جیسی مقدّس
کامرانی دور تک بکھری ستاروں کی
فضاؤں میں
بہت دن بعد فطرت نے بلایا ہے
چلو پھر سے کوئی پیماں نیا باندھیں
ابھی جینا ہے —! کیوں مایوسیوں کا تذکرہ چھیڑیں
ادھر دیکھو، کہ پھر اک خواب نے راتوں کو جل تھل کر دیا ہے
چلو ہم خواب میں جھولیں
تمناؤں کے لب چومیں
ہنسیں نادانیٔ دل پر
بدن آشاؤں کا چھولیں
اُٹھو، ہم آنسوؤں میں گوندھ لیں
دل کی یہ نادانی، یہ خوابوں کی ہنسی
آؤ، کہ ہم پھر زندگی کے دشت پر اک سائباں باندھیں
کوئی پیماں نیا باندھیں

جوش نمبر • حفیظ نمبر • فیض نمبر • ندیم نمبر اور • نذر اختر حسین رائے پوری کے بعد

زندہ دوستی اور اعتراف عظمت کا نقیب

ماہنامہ **افکار** کراچی

پاکستان کے مایۂ ناز مصوّر، خطّاط اور مجسمہ ساز

آزر زوبی کے فکر و فن پر ایک لازوال پیشکش

نذرِ زوبی

شائع ہو چکا ہے

اپنے شہر کے ہر اچھے بک سٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

چند لکھنے والے:- پروفیسر الساندرو باؤسانی - جی الانا - پروفیسر محمد حسن عسکری - ممتاز مفتی - میرزا ادیب - پروفیسر مجتبیٰ حسین - قرۃ العین حیدر - ڈاکٹر احسان رشید - اشفاق احمد - بانو قدسیہ - ڈاکٹر اسمٰعیل سعد - انور عنایت اللہ - شان الحق حقی - اکرام بریلوی - راغب مراد آبادی - محشر بدایونی - محمد علی صدیقی - شبنم رومانی - سحر انصاری - ڈاکٹر انور سدید - ڈاکٹر منیر الدین احمد - جوگندر پال - بشیر موجد - صبا انصاری اور دوسرے۔

- آرٹ پیپر پر زوبی کے دو درجن سے زائد فنی شاہکار (رنگین اور بلیک اینڈ وائٹ)
- ہر مضمون زوبی کے حسین و دلکش اسکیچز سے مزیّن
- اردو رسالوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی باتصویر پیشکش

بہترین گیٹ اپ • آفسٹ طباعت • قیمت: سو روپے

مکتبۂ افکار - رابسن روڈ کراچی

جوش نمبر۔ حفیظ نمبر۔ فیض نمبر اور ندیم نمبر

ایسی تاریخ ساز اشاعتوں کے بعد

ماہنامہ افکار کراچی

کی ایک اور ادبی دستاویز

نذرِ

اختر حسین رائے پوری

زندہ دوستی اور اعترافِ عظمت کا ایک اور سنگ میل جو برِّصغیر کے مایۂ ناز ادیب و دانشور اور جدید ادب کے رہنما ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے فکروفن اور ہمہ جہت ادبی کارناموں پر نامور لکھنے والوں کے تعاون کا رہینِ منت ہے۔

- سرورق : عزیز کارٹونسٹ اور آذر زوبی
- صفحات : ۴۴۴ • آرٹ پیپر پر نادر و نایاب تصاویر
- آفسٹ طباعت • قیمت : پینسٹھ روپے

(محدود کاپیاں دستیاب ہیں)

نئے سالانہ ممبر یہ دستاویزی اور یادگاری اشاعت رعایتی قیمت میں حاصل کر سکتے ہیں آج ہی ایک سو بیس روپے زرِ سالانہ اور چالیس روپے نذرِ اختر حسین رائے پوری کی رعایتی قیمت جملہ ایک سو ساٹھ روپے ذریعے منی آرڈر یا بنک ڈرافٹ بھیج کر طلب فرمالیں۔ اس طرح "نذرِ زوبی" بھی سالانہ ممبروں کو رعایتی قیمت میں مل سکتا ہے۔

ماہنامہ **افکار** رابسن روڈ۔ کراچی

صبا اکبر آبادی

ہم کو جزائے اشکِ فراواں بھی چاہیے
آنکھوں پہ تیرا گوشۂ داماں بھی چاہیے

پرچھائیاں سی دوڑ رہی ہیں ہر اک طرف
انبوہِ کائنات میں انساں بھی چاہیے

آثار وحشتوں کے مکمّل نہیں ابھی
دستِ جنوں ملا تو گریباں بھی چاہیے

کرنا ہے دل میں قید تو دیکھو مری طرف
زنداں کے واسطے درِ زنداں بھی چاہیے

چلتا نہیں ہے کام غرورِ نگاہ سے
اُس انجمن میں دیدۂ حیراں بھی چاہیے

ہنگامۂ خزاں میں جو لٹنا تھا لٹ گیا
اب ہدیۂ بہارِ گلستاں بھی چاہیے

کب تک سُبک خرام رہے آنسوؤں کی لہر
اس بحرِ پُرسکون میں طوفاں بھی چاہیے

لہریں جو لے رہا ہے یہ دل میں تو کیا ہوا
تھوڑا سا خون تو سرِ مژگاں بھی چاہیے

پھولوں سے سج گیا ہے گریباں تو فائدہ
دامن میں خاکِ کوچۂ جاناں بھی چاہیے

مرنا ہی ہے تو کیوں نہ مریں تیرے نام پر
ہستی میں کوئی کارِ نمایاں بھی چاہیے

یہ دل کی آگ لاکھ جہاں سوز ہے صبا
تیرے لیے چراغِ شبستاں بھی چاہیے

فضا ابن فیضی

تم اپنے پاس ہی رکھو، حکایتیں اپنی
خدا نے مجھ پہ اُتاری ہیں آیتیں اپنی

فریب نکلیں، نہ جھوٹی بصیرتیں اپنی
کہ آئینوں نے بدل لی ہیں صورتیں اپنی

اسی عذاب کو کہتے تھے تم نئی دانش
اب آؤ، خود ہی سنبھالو قیامتیں اپنی

ہمارا درد، ہواؤں سے پوچھتے کیا ہو
چراغ خود ہی کریں گے حفاظتیں اپنی

کہاں وہ لوگ، جو لوح و کتاب پڑھتے تھے
تم اپنے چہروں پہ لکھ لو عبارتیں اپنی

اٹھا کے اب کسی دریا میں ڈال دو ان کو
کہ نیکیاں، نہ بنیں پھر مصیبتیں اپنی

فضول ہے کسی معیار کی تلاش یہاں
کہ سب کے پاس ہیں جھوٹی صداقتیں اپنی

یہ اس کا ظرف تھا، انجان بن کے ٹال گیا
ہمیں تو یاد تھیں ساری حماقتیں اپنی

پہناؤں اُن کو نہ معنی، تو پھر رہوں عریاں
فضا ہیں بس یہی الفاظ خلعتیں اپنی

O

راسخ عرفانی

سایہ پیڑوں کا سرسراتا ہے
کان بجتے ہیں کوئی آتا ہے

ہر طرف ہے گلی میں سنّاٹا
شور اندر کا بڑھتا جاتا ہے

کون آیا ہے دل کے آنگن میں
غم کا لمحہ بھی مسکراتا ہے

وہ کرن ہے اُمید کی شاید
دور جگنو سا ٹمٹماتا ہے

ایک الھڑ حسین چرواہی
پھول جنگل میں لہلہاتا ہے

اپنے "کچے" مکان کو دیکھوں
کالے بادل سے خوف آتا ہے

ناتوانی کی انتہا راسخ
پاؤں سائے سے ڈگمگاتا ہے

اطہر نادر

تو آئینہ ہے میں عکسِ جمال اپنا ہوں
بساطِ دہر پہ اسپِ خیال اپنا ہوں

جواب خود ہوں میں اپنا، سوال اپنا ہوں
اُلجھ گیا ہوں تو کیا ہے میں جال اپنا ہوں

مرے مزاج کی تلخی کی ہو شکایت کیا
میں بیٹھ جاؤں گا خود ہی اُبال اپنا ہوں

گزر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی اپنی
کوئی ملے نہ ملے مست حال اپنا ہوں

پڑا جو وقت زمانہ ہی ساتھ چھوڑ گیا
حیات یوں ہے کہ خود ہی کمال اپنا ہوں

مری نگاہ میں اب ہیچ ہو گئی دنیا
میں کائنات میں جاہ و جلال اپنا ہوں

بہار لوٹ کے آئی بھی اب تو کیا نادر
مثالِ برگِ شکستہ زوال اپنا ہوں

موج فرازی

موج فرازی جن کا گزشتہ دنوں انتقال ہو گیا
افکار کے دیرینہ رفیقوں میں تھے۔ ان کی ایک
غیر مطبوعہ غزل ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے
شائع کی جا رہی ہے۔ صہبا

اہلِ زر آپ کے رخسار و دہن تک پہنچے
ہم پہ الزام لگے دار و رسن تک پہنچے

منتظر گرچہ بہاریں تھیں چمن کی ساری
کون وہ لوگ تھے جو صحن چمن تک پہنچے

ہائے وہ کون سا خدشہ تھا کہ جانے نہ دیا
صرف درباں کے قدم سرو سمن تک پہنچے

جانے کس کس کی ضرورت تھا کہ میں مر ہی گیا
گورکن شب کے اندھیرے میں کفن تک پہنچے

تو زمانے کی شکایت بھی ہے کرتا ہم سے
ہم تو اپنے تھے مگر تیری شکن تک پہنچے

کیا سکندر کی طرح خالی چلا جاؤں گا
کوئی تو شہر میں ہو موج کے فن تک پہنچے

(بریڈ فورڈ سے)

مشتاق شاد

خوشی کے بھاؤ بکے تو بھی صرف غم نہ کرو
جو چیز پہلے ہی کم ہے وہ اور کم نہ کرو

اندھیری رات میں جو بے چراغ چلتا ہے
وہ کور شب ہے، اسے روشنی بہم نہ کرو

بدل نہ جائے کہیں ذائقہ شبِ غم کا
کسی کے درد کو اپنے دکھوں میں ضم نہ کرو

تمام لوگ ہراساں ہوں جس کی عزت سے
فقیہِ شہر کو اتنا بھی محترم نہ کرو

جو تھک گیا ہو، کرو اس کا انتظار، مگر
جو تم سے تیز چلے اس کو ہم قدم نہ کرو

نہ جانے اس کا جنوں مجھ کو کس طرف لے جائے
ابھی نگر سے کوئی قتل گاہ کم نہ کرو

تمہارا نام بخیلوں میں لکھا جائے گا شاد
کریم ہو تو کسی پہ کوئی کرم نہ کرو

سلطان صبروانی

شکستہ آئینے ہیں کس لیے بچا رکھے
یہ ہم نے کام بھلا کل پہ کیوں اٹھا رکھے

یہ کیسا شور ہے، جس سے نہ اپنی آنکھ کھلی
یہ کیسی نیند ہے خوابوں میں جو سجا رکھے

ہماری سوچ کی پرواز جانتا ہوگا
جو قید خانے کے دروازے کو کھلا رکھے

ہم عہدِ جبر کی سوچوں سے مختلف نہ ہوئے
خیال کچھ بھی تھے، لفظوں سے بھی جدا رکھے

یہ کس لہو کی روایت ہے ہر زمانے میں
چلے ہیں وسعتِ صحرا میں کربلا رکھے

تقاضا یہ بھی ہے اس کا، کہیں اُسے دریا
ہماری راہ میں دیوار جو اٹھا رکھے

بھٹک رہے ہیں مسافر یہ کیسی بستی ہے
کوئی تو شام دریچے میں اک دیا رکھے

تسلیم الٰہی زلفی

مَیں جسم اگر ہوں تو مری جاں کی طرح وہ
ہوں شہر اگر مَیں تو چراغاں کی طرح وہ

مَیں یوں ہوں کہ جیسے کوئی بکھرا ہوا ملبہ
بکھرے ہوئے ملبے کے نگہباں کی طرح وہ

میری ہی طرح میرے نہاں خانوں سے واقف
اور دل میں چھپے درد کے درماں کی طرح وہ

سیاح وہ اک عمر سے ہے میرے بدن کا
مَیں راہ گزر، گرد پریشاں کی طرح وہ

مَیں ذہن کی صورت، وہ خیالات کی مانند
میں بے سروساماں، سروساماں کی طرح وہ

سب لغزشیں میری اسے معلوم ہیں زلفی
میں تو ہوں خطاکار، پشیماں کی طرح وہ

(جدّہ سے)

O

گلزار بخاری

جلا وطن ہو رہے ہیں سلئے کہ شاخِ زیتون جل رہی ہے
گرے جو پتا یہی بتلائے کہ شاخِ زیتون جل رہی ہے

عجب ہے انصاف جن کے گھر ہیں وہی زمانے میں دربدر ہیں
ہمیں یہ منظر نہ کیوں رلائے کہ شاخِ زیتون جل رہی ہے

یہیں سے ملتا تھا آب ودانہ یہی مسافر کا تھا ٹھکانہ
قدم کہاں فاختہ جمائے کہ شاخِ زیتون جل رہی ہے

اسی نے شعلوں کو دی روانی سنے گا کس کی ستم کا بانی
اسے کوئی کس طرح سمجھائے کہ شاخِ زیتون جل رہی ہے

رہی نہ زنجیر میں حلاوت کہاں گئی طور کی طراوت
قسم خداوند کس کی کھائے کہ شاخِ زیتون جل رہی ہے

اگر شراروں کا دل بڑھے گا کسی کا دامن نہ بچ سکے گا
کوئی تو اس آگ کو بجھائے کہ شاخِ زیتون جل رہی ہے

○

اختر امان

کسی کی آس پہ ایسے جیا نہیں کرتے
وہ بے وفا ہے تو ہم بھی وفا نہیں کرتے

تمہیں خبر ہے بدل جانا اس کی عادت ہے
کسی کے دل میں ہمیشہ رہا نہیں کرتے

تمام عمر سدا زخم دیتے رہتے ہیں
جو چاک دل کے ہیں، وہ ہم سیا نہیں کرتے

ہمارا چہرہ ہماری زبان ہے لوگ
ہم اپنے ہاتھ سے کچھ بھی لکھا نہیں کرتے

وہ ہم کو بھولنا چاہے تو بھول سکتا ہے
جو بات دل میں ہو، دل میں رکھا نہیں کرتے

وہ جب بھی چاہے جدا ہم سے ہو سکے گا امانؔ
غموں کی آگ میں ہم تو جلا نہیں کرتے

○

محمد خالد اختر

سعید بن مجید عرف مجاہد اشبیلیہ

(ایک اسلامی تاریخی ناول)

ابتدائی نوٹ

اسلامی تاریخی ناولوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی ایک اسلامی تاریخی ناول لکھا ہے۔ اسے لکھتے وقت کئی ایسے مشہور تاریخی شاہکار مصنف کے (یعنی میرے) پیش نظر رہے ہیں، جن کے تھوڑی مدت میں سات سات ایڈیشن طبع ہو کر شائقین کے ذوق تفریح و جہاد کی تسکین کر چکے ہیں۔ میں نے اس ناول کو جدید طرز پر لکھا ہے۔ میں نے ان تاریخی ناولوں میں جہاد اور محبت کے جو تذکرے موجود ہیں ان سے کافی استفادہ کیا ہے، اس کا مجھے اعتراف ہے، اس لیے کوئی صاحب ایسے فقرے یا پیرے پڑھ کر جو وہ اس سے پیشتر کہیں اور پڑھ چکے ہوں چیں بہ جبیں نہ ہوں۔ کاپی رائٹ والے اصحاب سے استدعا ہے کہ خواہ مخواہ مقدمے بازی میں پڑ کر اپنا قیمتی سرمایہ ضائع نہ کریں۔

اگر ناشروں اور قاریوں نے مصنف کی (یعنی میری) اس پہلی کوشش کو قدر دانی کی نظروں سے دیکھا تو میرا ارادہ ہے کہ اس قسم کے کئی ناول لکھوں اور اس کار خیر کو اپنا مستقل پیشہ بنا لوں۔ میں چار سو صفحات کا اسلامی تاریخی ناول پندرہ روز میں مکمل کر سکتا ہوں۔ ایسے ناولوں کے ناشر حضرات کو چاہیے کہ مجھ سے اس معاملے میں فوری خط و کتابت کریں اور کنٹریکٹ وغیرہ کی ضروری شرائط طے کریں۔

اس ناول کا معرکہ آرا باب بمصداق مشتے نمونہ از خروارے یہاں دیا جا رہا ہے۔ اس میں اگر قارئین کرام کو اسلام اور تاریخ کی کوئی بات نظر نہ آئے تو اسے مصنف اور اس کے مقبول و معروف پیشرووں کی بے بضاعتی اور کم فہمی پر محمول کر کے درگزر فرمائیں۔

باب ہشتم
اشبیلیہ کی گمشدگی

سعید بن مجید چند ایک ماہ کے بعد اشبیلیہ واپس آیا اور پھر محاذ پر چلا گیا۔ مشرقی محاذ پر سلطان ابن جابر بن خمیرہ کی افواج پیش قدمی کر رہی تھیں۔ مغربی محاذ پر شاہ اوقیانوس کے سفاک بھانجے کا وحشی لشکر ایک غضب ناک سیلاب کی مانند المغیرہ کی آہنی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا، اور ہزاروں مجاہد جام شہادت نوش جان کر چکے تھے۔ جنوب مشرقی سمت سے خلیفہ نعوذ باللہ کے باجگزار ملک و قوم کے غدار راد، ابو تمیم کے سرکش لشکر سوار علم بغاوت بلند کیے ہوئے اسطیلیہ کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ شمال مغربی محاذ پر چنگیز خان کا لنگڑا نواسہ چالاکو خان اپنے پچاس ہزار درندہ صفت سپاہیوں کے ساتھ اشبیلیہ پر آخری حملے کے لیے مناسب گھڑی کا انتظار کر رہا تھا۔

سعید بن مجید نے اپنے باد رفتار مشکی گھوڑے پر سوار ہو کر باری باری سب محاذوں کا دورہ کیا، اپنی ولولہ انگیز تقریروں سے مجاہدین کے حوصلوں کو پھر سے ابھارا۔ شمال مغربی محاذ پر اس نے فوج کو کیل کانٹوں سے لیس کیا۔ اس کی صف آرائی کی اور ظہر کی نماز کے بعد مشکی گھوڑے پر سوار اسلام کے جانبازوں سے ان الفاظ میں مخاطب ہوا: "اللہ اور رسول کے مجاہدو! آج تمہاری شجاعت اور ایمان کی آزمائش کا دن ہے۔ تم نہیں جانتے کہ کن جری اور بہادر اسلاف کا خون تمہاری شریانوں میں دوڑ رہا ہے۔ دیکھو ان کے نام کو آج بٹہ نہ لگنے پائے ورنہ آنے والی نسلیں تم پر ہمیشہ لعنت بھیجیں گی اور تمہارا ذکر آتے ہی شرم سے اپنی گردنیں جھکا لیں گی۔ اگر تمہاری رگوں میں اسلام کی عظمت کا احساس بالکل مردہ نہیں ہوا، اگر تمہارا خون حمیت بالکل ہی منجمد نہیں ہوا تو تم چالاکو خان کے تاتاری بھیڑیوں کے دانت اپنی خوں آشام تلواروں سے کھٹے کر دو اور انھیں ایسا سبق دو کہ وہ دوبارہ ادھر کا رخ نہ کریں۔"

اسی طرح وہ دوسرے محاذوں پر پہنچا اور مشکی گھوڑے پر سوار اس نے کم و بیش یہی بات وہاں کی افواج سے بھی کہی۔ اس کی فصاحت اور شجاعت سے لبریز تقریروں نے ہر جگہ سپاہیوں کے اندر نیا ولولہ پیدا کر دیا۔ جہاں کہیں وہ جاتا، عوام اُسے اشبیلیہ کا نجات دہندہ سمجھ کر اس کی قبا کو فرطِ عقیدت سے بوسہ دیتے اور اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے۔

سعید بن مجید مغربی محاذ پر چالاکو خان کے ٹڈی دل لشکر کی روک تھام کے لیے افواج اور رضاکاروں کی تنظیم کرنے میں مشغول تھا کہ اس کے پاس ایک حوصلہ شکن خبر پہنچی۔ اشبیلیہ کے بعض امرا اور سپہ سالار انور بن اللہ دتا کی غداری سے سلطان ابن الجابر بن خمیرہ اور یک چشم بطلیموس کے فوجی دستے اشبیلیہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خلیفہ نعوذ باللہ کے باجگزار ابو تمیم کے بدوی شہر کی مغربی فصیل کو منجنیق سے منہدم کرنے کے بعد شہر کے اندر گھس آئے تھے۔ یہ منحوس خبر اُسے قاضی ابو مصلح کی زبانی سے معلوم ہوئی۔ قاضی ابو مصلح اشبیلیہ کی جامع مسجد کا خطیب تھا اور وہ سعید بن مجید کو یہ خبر دینے کی خاطر اپنے صبا رفتار گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ دور دور تک قاضی ابو مصلح کے تقوے اور علم کا شہرہ تھا۔ پہلے تو سعید بن مجید کو پیغامبر پر شبہ ہوا کہ ممکن ہے کہ وہ دشمن کا کوئی جاسوس ہو اور اسے اس کی باتوں پر یقین نہ آیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ یہ شاہسوار قاضی ابو مصلح ہے تو وہ فوراً اپنے گھوڑے پر سے اتر آیا اور بڑھ کر عزت و تکریم کے ساتھ قاضی سے مصافحہ کیا۔ قاضی ابو مصلح نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے سعید بن مجید کے کندھے پر اپنا بزرگانہ ہاتھ رکھا اور کہا۔
"اے نوجوان! آج اہل اشبیلیہ نے انتہائی بزدلی اور کم ہمتی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی عزت اور آزادی کا سودا کیا۔ انہوں

نے خود ہی اپنے دشمنوں پر شہر کے دروازے کھول دیے اور شہر کے معززین اور فقیہوں نے دروازوں سے چند قدم آگے بڑھ کر سلطان ابن الجابر بن خمیرہ اور یک چشم بطلیموس کا استقبال کیا۔ ان کی گردنوں میں پھولوں کے ہار پہنائے اور انھیں نہایت عزت و تکریم سے شہر کے اندر لے آئے، مگر خلیفہ نعوذ باللہ کے باجگزار ابو تمیم نے کھلے پھاٹک سے پُرامن طریقے سے داخل ہونے کو اپنی شایان شان نہ دیکھا بلکہ ایک بہادر غنیم کی مانند دیوار میں منجنیق سے شگاف ڈال کر یلغار کرتا در آیا۔ اب یہ تینوں اپنے لشکر کے ہمراہ اشبیلیہ کے اندر ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں اور اہل شہر ان بن بلائے مہمانوں کی خاطر مدارات میں مشغول ہیں۔ دشمن کے سپاہی اور اشبیلیہ کے بدکردار لوگ بازاروں اور چوراہوں میں گلے ملتے اور ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں۔ شاعروں اور قصیدہ گویوں کی ٹولیاں جا بجا اپنے اشعار سناتی ہیں اور عوام سے خراج تحسین وصول کرتی ہیں۔ اہل اشبیلیہ کا ارادہ بھی یہ ہے کہ آج رات اپنے شہر کے فتح ہونے کی خوشی میں چراغاں کریں۔ ابو تمیم چراغاں کا بڑا دلدادہ ہے۔ کیوں کہ صحرائی مملکت میں مٹی کا تیل بمشکل دستیاب ہوتا ہے۔ اہل اشبیلیہ جوق در جوق یک چشم بطلیموس کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں اور جامع مسجد کو چھوڑ کر بقیہ سب مساجد کے بے ضمیر خطیب منبروں پر سے ادا نوں کی بجائے اس کی فیاضی اور عدل و انصاف کے قصیدے پڑھتے ہیں۔ نوجوان! میرا دل چاہتا ہے کہ زمین کا سینہ شق ہو جائے اور میں اپنے گھوڑے سمیت اس میں سما جاؤں۔"

قاضی کے منہ سے اہل اشبیلیہ کی اس بے حسی اور بے غیرتی کا تذکرہ سن کر سعید بن مجید کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے اپنی خوں آشام تلوار بلند کرتے ہوئے کہا "محترم بزرگ! ابھی وہ نامبارک وقت نہیں آیا کہ آپ کا غیور گھوڑا یا آپ زمین میں سما جائیں۔ میرے محسن آپ گواہ رہیں کہ جب تک اشبیلیہ کے اندر دشمن کا ایک سپاہی بھی موجود ہے، جب تک ایک خوشامدی شاعر اور غزل گو بھی اپنے فاتحوں کی ستائش میں قصیدے الاپتا ہے۔ یہ تلوار اپنے نیام میں واپس نہیں جائے گی۔

قاضی ابو مصلح نے خوردسال مجاہد کو بڑی شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا "شاباش نوجوان! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ تمہاری پیشانی تابناک ہے اور تمہارا چہرہ عزم و استقلال کا آئینہ دار ہے۔ خدا نے چاہا تو دنیائے اسلام پر یہ مصیبتوں کے بادل تمہاری باہمت تلوار سے جلد چھٹ جائیں گے۔ نوجوان! سچ سچ بتلاؤ کیا میری بوڑھی آنکھیں اپنے سامنے اشبیلیہ کے نجات دہندہ سعید بن مجید کو تو نہیں دیکھ رہی ہیں۔

سعید بن مجید نے ادب سے سر جھکا کر کہا "جی ہاں میرا نام سعید بن مجید ہے۔"

بوڑھے قاضی ابو مصلح کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے کہا، میرے بیٹے گواہ رہنا کہ جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے میں تمہارے دوش بدوش کفر و باطل کی افواج کے خلاف سینہ سپر رہوں گا۔ جب تک اشبیلیہ کی جامع مسجد کے احاطے دشمنوں کے ناپاک وجود سے بالکل صاف نہیں ہو جاتے، میں قسم کھاتا ہوں کہ میرے پاؤں اپنے گھوڑے کی رکابوں سے علیحدہ نہیں ہوں گے۔

سعید نے پوچھا "محترم بزرگ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

قاضی ابو مصلح نے کہا "نوجوان میرے ہمراہ اشبیلیہ چلو وہاں جامع مسجد کے خطیب ابو فراس عالم اسلام میں واحد ہستی ہیں جن کے پاس ہمارے مشکل کا حل ہو سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے۔ شیخ فراس ہمیں وہ راہ بتا سکتے ہیں جس پر چل کر ہم بالآخر اپنے دشمنوں

پر ظفریاب ہو سکتے ہیں۔

سعید بن مجید، قاضی ابو مصلح کے ہمراہ چلنے کے لیے اپنے مشکی گھوڑے پر سوار ہونے لگا تو قدرتاً اسے ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنی تلوار کو نیام میں ڈال لے۔ اس نے ایسا کرنے کے لیے بازو کو اٹھایا ہی تھا کہ اسے یاد آ گیا کہ وہ ابھی ابھی قاضی صاحب کو گواہ ٹھہرا چکا ہے کہ جب تک اشبیلیہ میں دشمن کا ایک بھی فرد جیتا ہے وہ تلوار کو نیام میں نہیں رکھے گا اس نے اپنے بازو کو وہیں روک لیا۔ ایک ہاتھ میں تلوار سونتے وہ اچک کر اپنے مشکی گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

قاضی ابو مصلح نے کہا "نوجوان! تلوار کو نیام میں رکھ لو، تمہیں گھوڑا دوڑانے میں دقت ہوگی۔"

سعید بن مجید بولا "مجاہد کو ہر تکلیف برداشت کرنی چاہیے اور پھر میں آپ کو قول دے چکا ہوں۔"

"میرا تو اب بھی یہی مشورہ ہے ویسے تمہاری مرضی۔"

"محترم بزرگ! یہ تلوار اب تو دس ہزار کفار کو موت کی گہری نیند سلا کر ہی نیام میں آرام کرے گی۔"

یہ کہہ کر سعید نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور قاضی ابو مصلح کے ہمراہ مسیلیہ کی سمت روانہ ہو گیا۔

سعید بن مجید اور قاضی ابو مصلح گرد میں اٹے ہوئے مسیلیہ کے آہنی پھاٹک پر نماز عشاء کے وقت پہنچے۔ پہرے داروں کے افسر نے جو ایک دراز قد کا بائیس سالہ نوجوان تھا اور جس نے شلوار قمیص پر ایک تانبے کا خود پہن رکھا تھا۔ ان سے کہا۔

"آپ گورنر کے پروانے کے بغیر مسیلیہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔"

سعید بن مجید نے تلوار کو سر کے اوپر لہراتے ہوئے جواب دیا "ہم کو شیخ ابو فراس سے ایک ایسے ضروری کام کے سلسلے میں چند لمحوں کے لیے ملنا ہے۔ نوجوان ہمارا راستہ نہ روکو، ورنہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہسپانیہ میں اسلامی سلطنت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل نہ ہو جائے اور شہدا کی روحیں تمہیں ابد تک بددعائیں نہ دیتی رہیں۔"

نوجوان افسر نے کہا "معاف کیجیے گا ہم حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ آپ کے نام کیا ہیں؟"

سعید نے کہا میرا نام سعید بن مجید ہے اور یہ بزرگ جو میرے ہمراہ ہیں قاضی ابو مصلح اشبیلیہ کی جامع مسجد کے خطیب ہیں۔"

دراز قامت نوجوان افسر کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمکنے لگے۔

اس نے پوچھا "آپ نے مجھے پہچانا؟"، دونوں چند منٹ ایک دوسرے کی طرف تکتے رہے اور سعید بن مجید گھوڑے سے اتر کر اور تلوار کو ایک طرف پھینک کر نوجوان افسر سے لپٹ گیا۔

"بھائی شہید۔ تم یہاں کہاں!"

"اور بھائی جان سعید۔ آپ اتنی مدت کہاں غائب رہے؟"

"اباجان اور امی جان تو بخیریت ہیں؟"

"یہی سوال میں آپ سے پوچھنے والا تھا۔"

"تم کو گھر سے نکلے کتنا عرصہ ہو گیا؟"

"میں ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا، بھائی جان۔ یہی کوئی بارہ سال گزر چکے ہوں گے۔ بس آپ کے جانے کے دو سال بعد میں بھی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس وقت سے اباجان اور امی جان کی خیریت کی کوئی خبر نہیں مل رہی جانے وہ مر گئے یا جیتے ہیں۔"

دونوں بھائیوں نے وضو کر کے نماز عشاء ادا کی۔ قاضی ابو مصلح بھی کچھ نماز اور کچھ سستانے کے ارادے سے گھوڑے سے اترنے کا ارادہ کر رہے تھے، لیکن ابھی ایک پاؤں رکاب میں تھا کہ انھیں اپنا قول یاد آگیا۔ اشبیلیہ کی جامع مسجد کو دشمنوں سے صاف کرنے سے پہلے انھوں نے رکاب سے پاؤں نکالنے کی قسم کھائی تھی۔ کچھ دیر تو وہ بیٹھے رہے۔ پھر انھوں نے سوچا کہ آخر کب تک وہ سعید بن مجید کے سامنے اپنا قول ہارنے پر تیار نہ ہوں گے۔ آخر انھوں نے ایک ترکیب سوچی۔ انھوں نے یہ قول دیا تھا کہ وہ رکاب سے اپنے پاؤں علیحدہ نہ کریں گے۔ اگر وہ کسی طرح رکابوں کو تھام لیں اور پھر انھیں اپنے موزوں میں پنجوں کی طرف سے پھنسا لیں تو ان کو چلنے میں دقت تو ہوگی لیکن ان کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔

برسوں کے بچھڑے بھائی سعید بن مجید اور شہید بن مجید نماز کے بعد دیر تک اپنی سرگزشت ایک دوسرے کو سناتے رہے۔ شہید بن مجید بار بار بھائی سے پوچھتا کہ آخر قاضی ابو مصلح گھوڑے پر سے کیوں نہیں اترتے۔ یہ دونوں کے لیے اچنبھے کی بات تھی۔

سعید نے کہا "عزیزم ہم کو شیخ ابو فرار سے ملنا ہے کیا تم ہمیں ان کے گھر تک پہنچا سکتے ہو؟"

"بھائی جان میری خواہش تو یہی تھی کہ آپ کچھ عرصے میرے پاس رہتے، لیکن چونکہ آپ ایک ضروری مہم پر ہیں اس لیے میں اصرار نہیں کرتا۔ چلیے میں آپ کو شیخ کے مکان تک پہنچا آتا ہوں۔ خدا کرے وہ مکان پر ہوں۔"

"کیوں۔ کیا تمہیں ان کے مکان پر ہونے میں کچھ شک ہے؟"

"ہاں بھائی جان۔ وہ آج کل گورنر ابو قلندر کے عتاب میں ہیں —————— یہ ابو قلندر چند نا عاقبت اندیش اور خود غرض امراء کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔ یہ لوگ اسے غلط مشورے دیتے رہتے ہیں۔ وہ فقیہوں اور علمائے کرام کا مذاق اڑاتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ شیخ فرار نہ ہو گیا ہو۔"

"خدا نہ کرے۔"

رات کے تیسرے پہر تہجد سے فارغ ہونے کے بعد یہ دونوں بھائی اور قاضی ابو مصلح گھوڑوں کو ان کی باگوں سے پکڑے، شیخ ابو فرار کے دو منزلہ مکان پر پہنچے۔ شیخ کا مکان جامع مسجد کے عقب میں واقع تھا۔

گورنر ابو قلندر کے چھ سیاہ فام حبشی سپاہی شیخ کے مکان کے دروازے پر نیزے تانے پہرہ دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک غالباً حوالدار میجر تھا۔ اس کے دائیں برہنہ بازو پر سونے کی دو سفید دھاریاں تھیں۔ حوالدار میجر نے لنگوٹی پہن رکھی تھی۔ باقی سب ننگے تھے۔

حوالدار میجر نے پکارا "ٹھہرو کون آتا ہے۔ جواب دو ورنہ تیسرے سوال کے بعد ہم کو نیزہ مارنے کا حکم ہے۔"

سعید بن مجید نے شہید بن مجید اور قاضی ابو مصلح کو رکنے کا اشارہ کیا اور پھر تلوار سونت کر بجلی کی پھرتی کے ساتھ حبشی پہرے داروں پر ٹوٹ پڑا۔ وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھے۔ چند لمحوں میں سات خون آلودہ لاشیں گلی کے فرش پر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔

سعید بن مجید اور شہید بن مجید حبشیوں کی لاشوں کو گھسیٹ کر ساتھ بہتی ہوئی بدرو میں پھینکنے میں مصروف تھے کہ مکان کی چھت سے آواز آئی "میرے محسنو، السلام علیکم۔"

سعید نے سر اٹھا کر دیکھا تو چھت کی شہتیر سے ایک سفید ریش بزرگ کو الٹے لٹکتے ہوئے پایا۔

سعید نے پوچھا "محترم بزرگ آپ کون ہیں؟"
سفید ریش بزرگ نے کہا "برخوردار۔ پہلے مجھے نیچے اتارو تعارف بعد میں ہو جائے گا۔
"پہلے آپ بتائیں کہ آپ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"برخوردار۔ نوجوانوں کی کٹ حجتی اور نادانی کوئی مستحسن چیز نہیں۔ تم اصرار کرتے ہو، تو تمہیں معلوم ہو کہ میرا نام شیخ ابو فرار ہے اور ابو قلندر کے حبشیوں نے مجھے شہتیر سے سر کے بل لٹکا دیا تھا۔ اس حالت میں لٹکتے ہوئے مجھے دو گھنٹے ہو چکے ہیں۔"

سعید بن مجید نے عقیدت مندانہ لہجے میں کہا "شیخ ابو فرار آپ ہیں۔ ہم آپ سے ایک بے حد ضروری مشورہ کرنے آئے ہیں امید ہے کہ آپ جو کہ ہمارا اس وقت واحد سہارا ہیں ہماری رہنمائی کر سکیں گے۔ آپ کو یہ سن کر افسوس ہو گا کہ یک چشم بطلیموس۔ سلطان ابن الحاجر بن خمیرہ اور ابو تیمّم کے خونخوار بھیڑیے اس وقت اشبیلیہ پر قابض ہیں اور ہماری تہذیب کا آخری چراغ گل ہو چکا ہے۔ آپ کی مشعلِ عظیم اسے روشن کر سکتی ہے۔"

"برخوردار میں اس حالت میں کچھ نہیں کر سکتا۔ پہلے مجھے نیچے اتارو پھر جتنے چاہو گے چراغ روشن کردوں گا۔"
قاضی ابو مصلح نے رکاب میں پھنسے ہوئے موزوں سے بمشکل چلتے ہوئے کہا "شیخ ہم آپ کو ساتھ لینے آئے ہیں۔"
"اس حالت میں، میں کیسے چل سکتا ہوں۔ قاضی ابو مصلح۔"

سعید بن مجید نے تلوار کے ایک بھرپور وار سے اس رسّے کو کاٹ دیا جس سے شیخ ابو فرار لٹکے ہوئے تھے۔ شیخ کھوپڑی کے بل پختہ فرش پر گرے۔ اور ان کی کھوپڑی زخمی ہو گئی۔ قاضی ابو مصلح نے جو اشبیلیہ کے نامی طبیب بھی تھے اپنی دستار کو پھاڑا اور فوراً زخم پر پٹی باندھ دی۔

شیخ کو تھوڑی دیر بعد کچھ ہوش آیا۔ تو اس نے اشارے سے سعید بن مجید کو پاس بلایا۔ شفقت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا "برخوردار تمہارا نام کیا ہے؟"
"نیاز مند کو سعید بن مجید کہتے ہیں۔"

"برخوردار میں نے تمہارا شہرہ سن رکھا ہے۔ ملارس کے محاصرے میں جو کارہائے نمایاں تم نے سرانجام دیے اور جس طرح تم نے تن تنہا دو ہزار فرنگی سپاہیوں کے چھکے چھڑا دیے، وہ واقعہ بھی میرے کانوں تک پہنچ چکا ہے۔ خرطوم میں آپ نے جس طرح اسلامی فوج کے علم کو سرنگوں ہونے سے بچایا۔ وہ بھی مجھے معلوم ہے۔ آپ کی زیارت کا بہت اشتیاق تھا۔ الحمد للہ کہ وفات سے پہلے یہ آرزو بھی پوری ہوئی۔" "شیخ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ اسلام کے بطلِ عظیم ہیں۔ شیخ اب بیٹھنے کا وقت نہیں۔ ہم آپ کو ساتھ لینے آئے ہیں۔ اشبیلیہ پر کفار کے لشکر قابض ہو چکے ہیں۔"

"برخوردار میں ساتھ چلنے کے لیے بالکل تیار ہوں۔ گھوڑوں کا انتظام ہو جانا چاہیے۔ میری اکلوتی بیٹی بھی میرے ساتھ جائے گی۔ میں اسے یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ بیٹا، دروازے پر دستک دو اور اسے اطلاع دو کہ وہ ایک بہادر اور غیور باپ کی بیٹی کی طرح زرہ بکتر اور اسلحہ سے لیس ہو کر تیار ہو جائے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج اشبیلیہ کے بازاروں اور گلی کوچوں میں خون کے وہ سیلاب ہوں گے کہ اس کی سرخی صدیوں تک ڈھل نہ سکے گی۔"
سعید بن مجید چوکی پر سے دوتانہ دم گھوڑے لاتے چلا گیا۔

سعید بن مجید کے دروازے پر دستک دینے پر ایک مشعل بردار خاتون نے دروازہ کھولا۔ جو حسن اور رعنائی کی مکمل تصویر تھی۔ سعید نے فرش پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"معزز خاتون! آپ ہی شیخ ابو فرار کی بیٹی ہیں"۔ "جی ہاں۔ میرے والد اب کیسے ہیں۔ آپ کون ہیں؟" "اس کا اب وقت نہیں۔ جلدی تیار ہو جائیں۔ آپ کے والد کا حکم ہے کہ جنگی لباس پہن کر باہر آجائیے۔ مکان کو مقفل کرنے کی ضرورت نہیں۔

تھوڑی دیر میں ایک زرہ پوش نوجوان خوب رو ترکش سے مسلح تھا۔ مکان سے باہر نکل آیا۔ سعید بن مجید نے اس نوجوان کو حیرت سے دیکھا تو اس کے پھول جیسے چہرے پر نسوانی شرم و حیا کی لہریں پھیل گئیں۔ اتنے میں شہید بن مجید دو تازہ دم تازی گھوڑے لے آیا۔ افق مشرق پر صبح کا ستارہ طلوع ہو رہا تھا۔ صبح کی نماز سے فارغ ہوتے ہی یہ قافلہ اشبیلیہ کے مغربی دروازے سے نکل کر طلبوریہ کی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ دو گھڑی دن چڑھے جانباز مجاہدوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ طلبوریہ کے مشرقی دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ طلبوریہ کے لوگ بازاروں اور مکانوں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر اشبیلیہ کے نجات دہندہ کو دیکھ رہے تھے۔ سعید بن مجید کے چہرے پر ایک نوزائیدہ بچے کی سی دل فریبی، نیم روز کے سورج کا سا جاہ و جلال، شیر ببر کا سا دبدبہ اور صبح کے ستارے کی سی صباحت اور طہارت تھی۔ لوگ بڑھ بڑھ کر اس سے پوچھتے کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ وہ نرمی سے کہتا کہ "اشبیلیہ سے"۔ اس پر لوگ اصرار سے کہتے کہ آپ ہمارے مکان میں ٹھہریے۔ چوراہے پر پہنچ کر سعید بن مجید نے اپنے وفادار مشکی پر سے ایک چھوٹی سی تقریر میں اہل طلبوریہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "بھائیو اور بزرگو! آج میں طلبوریہ کے لوگوں کے پاس ضروری پیغام لے کر آیا ہوں۔ ہمیں فوراً اشبیلیہ جانا ہے۔ میرا پیغام سن لو تو مجھ پر عنایت ہوگی۔ میرا پیغام ہے کہ اے طلبوریہ کے لوگو۔ آج وہ دن آگیا ہے کہ تم اپنے طنبورے اور ساز توڑ دو اور شمشیر و سناں سے لیس کٹ مرنے کے لیے نکل پڑو۔ اشبیلیہ کے در و دیوار تمہارے گھوڑوں کی آہٹ کے منتظر ہیں"۔

شیخ ابو فرار اور قاضی ابو مصلح نے بھی اہل طلبوریہ سے خطاب کیا۔ کمسن لڑکے، نوجوان، بوڑھے ایک نئے جذبے سے سرشار ہو کر جوق در جوق ان کے قافلے میں شامل ہوتے گئے اور جب وہ جامع مسجد میں ظہر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد شہر کے شمالی دروازے سے نکلے تو طلبوریہ کے اسّی فی صدی لوگ تیر اور کمان، نیزے اور سناں اٹھائے ان کے ساتھ تھے۔ بعض زندہ دل لوگ شہر کی وہ منجنیقوں اور ایک دبابے کو بھی ساتھ لیتے آئے تھے جو بڑی مدت سے بے کار پڑے تھے۔

فجر کی نماز کے وقت وہ اشبیلیہ کی دیواروں کے قریب پہنچ گئے۔ سعید بن مجید نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اپنی فوج کا معائنہ کیا۔ ان کی صفوں کو آراستہ کیا۔ وہ طلوع آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا کہ ایک زرہ پوش سوار اس کی طرف گھوڑا دوڑاتا آیا۔ سوار قریب پہنچا سعید نے اسے پہچان لیا۔ یہ حسین سوار شیخ ابو فرار کی شجاع اور غیور بیٹی زہرہ بی بی تھی۔

"سالارِ محترم! میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ مجھے بھی حملے میں شریک ہونے کی اجازت دیں۔ میں تیر چلانا جانتی ہوں"۔

سعید بن مجید نے کہا "زہرہ بی بی، بے وقوف نہ بنو تمہارے ذمے زخمیوں کی دیکھ بھال کا کام ہے"۔

پھر سعید کچھ سوچ کر شیخ ابو فرار کی تلاش میں چل کھڑا ہوا۔ شیخ اپنی کمان کھینچے ہوئے ایک بوڑھے سالار سے محو کلام تھا۔

سعید بن مجید نے کہا "شیخ میں آپ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں"۔

شیخ نے کہا "ارشاد"

سعید نے سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہاں نہیں، یہاں بہت سے لوگ جمع ہیں۔" شیخ نے کہا "بہت اچھا۔ جہاں دل چاہے لے چلو۔" وہ چلتے گئے یہاں تک کہ اندھیرا ہوگیا۔

شیخ نے کہا "یہاں بات ہو سکتی ہے۔"

سعید نے کہا "ابھی ہمیں اور چلنا ہے۔" وہ چلتے گئے یہاں تک کہ ماہتاب طلوع ہوگیا۔ آخر شیخ نے سعید بن مجید سے کہا۔

"تم کیا بات کہنا چاہتے ہو؟" "آپ وعدہ کریں کہ آپ برا نہیں مانیں گے۔"

"انشاء اللہ!"

"وہ بات اتنی ہے کہ اگر میرے والدین موجود ہوتے تو آپ سے کرتے۔"

"اوہو! نوجوان کوئی ایسی بات ہے۔" "ہاں ایسی ہی بات ہے۔"

"اچھا کہو۔"

"دیکھیے۔ شیخ میں آپ کی لڑکی زہرہ بی بی کو اپنی زوجیت میں لانا چاہتا ہوں۔"

شیخ ابو فرار نے ہنستے ہوئے کہا "برخوردار اتنی سی بات کے لیے مجھے اتنی دور کھینچ لائے ہو۔ ہم اس وقت لشکر سے پانچ میل دور نکل آئے ہیں۔"

"تو پھر آپ مجھے اپنی فرزندی میں قبول کرتے ہیں؟" "خاطر جمع رکھو برخوردار۔ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارا نکاح جلد ہو جائے۔"

ساری رات سعید بن مجید اور اس کا چھوٹا بھائی شہید بن مجید منجنیق کی مدد سے شہر کی فصیلوں پر سنگ باری کرتے رہے۔ دو ہزار آدمی قلعے میں سرنگ ڈالنے پر مامور کر دیے گئے۔ دشمن کی طرف سے کسی قسم کا جوابی حملہ نہیں ہوا۔ علی الصبح سعید بن مجید نے دیکھا کہ دیواریں جوں کی توں مستحکم کھڑی ہیں اور ان پر سنگ باری کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ منجنیق کے گولے دیوار سے کچھ ادھر ہی رہ گئے ہیں۔ منجنیق کچھ پرانے ڈیزائن کی تھی۔

وہ پھر زور و شور سے شہر پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہے تھے کہ گدھے پر بوریاں لے کر ایک چھوٹا سا آدمی وہاں سے گزرا۔

اس نے کہا "تم خواہ مخواہ شہر کی دیوار کیوں ڈھا رہے ہو؟"

سعید بن مجید نے کہا "ہم دشمنوں پر حملہ کر رہے ہیں جو قلعہ بند ہیں۔"

گدھے والے آدمی نے جو شاید کمہار تھا، کہا "دشمن، نوجوان کیا باتیں کر رہے ہو۔ اس شہر میں دوست یا دشمن کوئی بھی نہیں رہتا۔ وہاں میرا ایک جھونپڑا ہے۔ کیا اس کو منہدم کرنے کا خیال ہے؟"

"تو کیا یہ شہر اشبیلیہ نہیں ہے؟"

کمہار ہنسا "اشبیلیہ! تم نے اسے اشبیلیہ سمجھا ہے۔ یہ خوب مذاق رہا۔ برادرم گھاس تو نہیں چر گئے۔ اشبیلیہ تو یہاں کوسوں جنوب میں ہے۔"

سعید بن مجید یہ خبر سن کر بے ہوش ہوگیا۔

▬▬

عرفان علی شاد

رشتہ سازی

سنا ہے ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب انسانوں کے درمیان حقیقی اور انسانی رشتے قائم تھے مثلاً والدین اور اولاد کا رشتہ تھا، استاد اور شاگرد کا رشتہ تھا، بھائی بہنوں کا رشتہ تھا، چچا چچی، تایا تائی، ماموں ممانی، خالہ خالو، پھوپھا پھوپھی کا رشتہ تھا۔ پھر خلوص، محبت، دوستی، اخوت اور بھائی چارے کے رشتے تھے، اور پڑوسیوں کا بہت مضبوط رشتہ تھا —— اور ان سب سے بڑھ کر میاں بیوی کا رشتہ تھا جو توڑے نہیں ٹوٹتا تھا اور جس نے غالب جیسے آزاد مرد کے گلے میں زنجیر ڈال کر کھونٹے سے اس طرح باندھ دیا تھا کہ بیچارے ساری زندگی اونٹ بچھڑے کی طرح زنجیر تڑانے کی کوشش میں خوار ہوتے رہے، دو بار کامیاب بھی ہوئے کہ زنجیر تڑا کر بلادِ شرقیہ کی طرف اور رامپور کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے مگر پھر پکڑے آئے اور سر جھکا کر کھونٹے سے بندھ گئے، لیکن آشفتہ سری اور گریز پائی کسی صورت نہ گئی، آخر کار موت نے بیچارے کو دونوں قیود سے یکبارگی آزاد کرا دیا۔ خیر یہ تو یونہی بات سے بات نکل آئی۔ اصل بات جو میں کرنے جا رہا ہوں وہ آج کے ماڈرن رشتوں کی ہے۔ چونکہ زمانہ ماڈرن ہو گیا ہے اس لیے رشتوں نے بھی ترقی کر کے ماڈرن صورت اختیار کر لی ہے۔

اب انسانوں کے درمیان صرف اور صرف منافعوں کے رشتے باقی رہ گئے ہیں، کیوں کہ منافع سے ترقی ہوتی ہے اور ترقی سے خوش حالی آتی ہے اس لیے جو ممالک جتنے زیادہ خوش حال ہیں وہاں رشتے بھی اتنے ہی "خوش حال" ہیں —— اور ان کی خوش حالی کا منہ بولتا ثبوت اولڈ ہومز ہیں جو بڑی خوب صورت اینٹوں سے بنے ہوئے ہیں، بڑی نفاست سے سجائے گئے ہیں اور مکمل ایئر کنڈیشنڈ ہیں —— اور ان میں جسمانی آرام و آسائش اور تفریح کے تمام سامان موجود ہیں —— لیکن مجھ جیسے احمق ابھی تک نہیں سمجھ پائے کہ آخر رشتوں کے ذریعے خوش حالی تک کیسے پہنچا جاتا ہے اور نہ شاید سمجھ پائیں گے کیوں کہ "رشتہ سازی" دورِ جدید میں باقاعدہ ایک فن کی صورت اختیار کر گئی ہے اور بہت ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں کچھ ایسے ادارے بھی قائم ہو جائیں جو "فنِ رشتہ سازی" کی سند تصور کیے جائیں اور ان اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے اشخاص دنیا کے لیے عجوبۂ روزگار بن کر کچھ اس طرح ممتاز رہیں کہ مجھ جیسے بیوقوف ان کے فن کا کمال دیکھ کر اپنے سر [illegible] کر لیں۔ بہر حال یہ تو بعد کی بات ہے، فی الحال تو ہمارے لوگوں کا یہ چلن ہے کہ جہاں منافع دیکھا وہاں فوراً رشتہ جوڑ لیا اور جہاں سے خسارے کا اندیشہ ہوا وہاں سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کے چل دیے۔

یہ جوڑ توڑ اتنی ترقی کر چکا ہے کہ بیٹا باپ کو باپ نہیں کہتا کیوں کہ باپ ہمارا پیچھے رہ گیا ہے، بیٹا ترقی کر گیا ہے، باپ اب ان پڑھ، دیہاتی اور گنوار ہے اور اپنی جان سے بیزار ہے اس لیے اونچی سوسائٹی میں محض بیٹے کا پرانا نمک خوار ہے —— اس کے برعکس کوئی پڑھا لکھا "منافع بخش" ہو اور اس کی حالت "تسلی بخش" نہ ہو تو ماہرین رشتہ سازی اسے بستر مرگ پر بھی باپ بنا کر دم لیتے ہیں۔ بڈھا لاکھ چیخے چلائے، شور مچائے، احتجاج کرے، کھانس کھانس کر بے دم ہو جائے اور پھول سانسوں کے ساتھ چیخ چیخ کر کہے کہ مجھے باپ بنانے والے یہ دعویدار جھوٹے ہیں مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ بناسپتی بیٹے ہم آواز ہو کر کہتے ہیں "چونکہ ڈیڈی کا آخری وقت ہے اس لیے یہ اپنی یادداشت کھو چکے ہیں" اور اس کے بعد کورس کی شکل میں رونا شروع کر دیتے ہیں۔ بصورت دیگر اگر کیس عدالت تک بھی پہنچ جائے تو وہاں جج کے سامنے ایسے ایسے کاغذات پیش کیے جاتے ہیں کہ وہ بڈھا جس نے زندگی بھر شادی کا منہ نہیں دیکھا۔ عدالت کی رو سے ان کا باپ ٹھہرا دیا جاتا ہے۔

یہی رشتہ ساز حضرات دفاتر اور دوسرے اداروں میں اپنے افسران بالا سے خوشامد کا رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔ حالانکہ کہہ ہی گئے ہیں۔

ع سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں

چنانچہ ان خوشامدیوں کے کام دھڑا دھڑ ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور جو بے چارے رشتہ سازی کے اس ہتھیار کا استعمال نہیں جانتے وہ بے دست و پا اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ جاتے ہیں اور "صاحب" کی لسٹ میں بلیک لسٹ ہو جاتے ہیں اور ان کی ترقی رک جاتی ہے اور یہ "خوش حالی رشتے" سے بہت پیچھے جا پڑتے ہیں۔ انہی رشتہ سازوں میں میرے ایک دوست تھے جن کا نام ایچ بی خان تھا۔ ان کے ادارے کے سربراہ نیازی صاحب آئے تو انہوں نے اپنا نام ایچ بی نیازی رکھ لیا۔ ان کے بعد ہاشمی صاحب نے دفتر کا چارج سنبھالا تو وہ فوراً ایچ بی ہاشمی بن گئے، اس کے بعد کوئی چوہدری صاحب تشریف لائے تو وہ ایچ بی چوہدری بن بیٹھے، پھر ٹھاکر صاحب نے چارج لیا تو وہ ایچ بی ٹھاکر میں تبدیل ہو گئے۔ انھوں نے ہر دور میں عیش کیا اور اب بھی کر رہے ہیں۔ میں نے تبدیلی نام کی وجہ تسمیہ پوچھی تو دانت نکال کر بولے ——
"ارے یار، نام میں کیا رکھا ہے، کچھ بھی رکھ لو، بس "صاحب" خوش ہو جائے ...... ہی ہی ہی ہی ...... !"

اس ہی ہی ہی ہی کو جب میں نے ذرا بڑے کینوس پر دیکھا تو بے شمار ہی ہی ہی میرے سامنے آ گئے۔
گویا "رشتہ سازی" کا ایک پورا دھڑا دھڑا چنگھاڑتا کارخانہ میرے سامنے کھل گیا اور ماڈرن رشتے مجھے پرانے رشتوں کی نسبت اس قدر مضبوط نظر آئے کہ مجھے لگا میں اب تک جھک مارتا رہا ہوں، مجھے بہت پہلے اس کارخانے میں آ جانا چاہیے تھا میں بھی کیا چغد آدمی ہوں۔ آئیے آپ کو اس کارخانے کے چند سیمپل رشتے دکھاتا ہوں جن سے آپ کو ان کی پائیداری کا اندازہ ہو جائے گا مثلاً ڈاکٹروں کا کیمسٹوں سے رشتہ، کیمسٹوں کا جعلی دوائیں بنانے والوں سے رشتہ، فوڈ انسپکٹروں کا قصابوں سے رشتہ، چور اچکوں کا پولیس سے رشتہ، کسٹم کا اسمگلروں سے رشتہ، ایل ڈی اے کا ٹھیکیداروں سے رشتہ، بینکوں کا قرض خواہوں سے رشتہ، اے جی آفس کا بڈھے پنشنروں سے رشتہ، آب پاشی والوں کا زمینداروں سے رشتہ، فرنیچر والوں کا محکمہ جنگلات سے رشتہ، بجلی کے ملازمین کا میٹر ریڈنگ سے رشتہ، اسی طرح ٹھیکے والوں کا کارپوریشن سے، ویگن فلائنگ کوچوں کا

ٹریفک پولیس سے، فقیروں، جوگیوں کا اونٹان سے، ملاوٹ کرنے والوں کا اکبری منڈی سے، شکاریوں کا وائلڈ لائف پروٹیکشن والوں سے، وائلڈ لائف کا بڑے بڑے ہوٹلوں سے، ہوٹلوں کا ایکسائز والوں سے، کلرکوں کا عوام سے اور اس کے بعد یہ زنجیر اتنی لمبی ہے کہ اس کا سرا ڈھونڈنا آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا، اس لیے اتنے پر ہی اکتفا کیجیے کیوں کہ عقلمند کو اشارہ کافی ہے۔

ان مستحکم، اٹوٹ اور مستقل رشتوں کے باوجود ابھی تک دنیا مجھ جیسے احمقوں سے خالی نہیں ہوئی ہے جو "فول پیراڈائز" میں رہ رہے ہیں اور "دل" اور "ضمیر" دونوں کے ساتھ ہنوز زندہ ہیں۔ اسی لیے یہ لوگ سچے رشتوں کے لیے رو رہے ہیں اور سچے رشتے سچے انسانوں کے لیے رو رہے ہیں اور چونکہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے اس لیے بہت ممکن ہے کہ آئندہ اخبارات میں "ضرورتِ رشتہ" کے ساتھ ساتھ "رشتوں کی خرید و فروخت" کے اشتہار بھی کچھ اس قسم کے عنوانات کے ساتھ شائع ہونے لگیں۔

- ایک باپ بکاؤ ہے۔
- ایک پوتا کماؤ ہے۔
- ایک بڑھیا کا نیلام عام۔
- پھوپھیوں کا جمعہ بازار۔
- خالاؤں کا منگل بازار۔
- دادیوں کا لنڈا بازار لگ گیا۔
- نانیاں رعایتی قیمت پر موجود ہیں۔
- ایک عدد بھائی درکار ہے۔
- اماؤں کے اسٹور کا شاندار افتتاح۔
- تایاؤں کی سیل جاری ہے۔
- ایک مخلص دوست کی تلاش ہے۔
- ایک بہن کی اشد ضرورت ہے۔

ان عنوانات کے تحت جو تحریریں ہوں گی، وہ آپ خود ترتیب دے سکتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے گا کہ خریدا ہوا مال واپس نہیں ہوگا۔

محمد سعید شیخ

رنگوں کا رزق

وہ مصوّر تھا ـــــ رنگوں، لکیروں، قوسوں، دائروں، زاویوں پر قادر تھا۔ جب اس کی انگلیوں کی گرفت میں برش حرکت کرتا تو فضا ساکت ہو جاتی۔ وہ کائنات کے لمحوں کو موقلم کی پوروں سے تتلیوں کی طرح پکڑتا اور کینوس پر نقش کر دیتا۔ سپنے، خواب، خوشبوئیں، محبتیں ہر خیال اس کے ذہن سے بہہ کر برش میں منتقل ہوتا اور کینوس زندگی سے بھر کر چھلکنے لگتا۔ وہ خود ایک خواب کی طرح ہلکا پھلکا لطیف احساس بن کر جسم سے بے نیاز ہو جاتا۔ زندگی کے ان لمحوں میں ساری کائنات اسے اپنے برش کی زد میں لگتی۔ وہ ہر چیز، ہر احساس پر حاوی ہو جاتا۔ سارے نام اس کی تصویروں میں سورج چاند کی طرح زینہ زینہ اترنے لگتے۔ منحنی سے کمزور جسم کا وہ مصوّر جانو ساری کائنات کو اپنے کمزور بازوؤں میں سمیٹ لیتا۔

مگر اس بستی کے لوگ خواب نہیں خریدتے تھے، سپنے پسند نہیں کرتے تھے۔ انھیں چیزیں پسند تھیں۔ شاندار، چمکتی جھلملاتی، اونچی لمبی چیزیں جو ان کے جسموں کو ہر لمحہ آرام پہنچاتی رہیں۔ جن میں ہر لمحہ ان کا وجود لپٹا رہے۔ وہ ہر وقت اپنے وجود کی پکار پر دھیان رکھتے تھے۔ اس طرح ان کے گرد چیزوں کے ڈھیر لگتے رہتے۔

خواہشیں نکیل بن کر ان کو کھینچتی رہتیں پر وہ اس کا شعور نہیں رکھتے تھے۔

مصوّر اپنی ہی بستی میں اکیلا تھا، اجنبی تھا، لیکن جب وہ تصویر بنا رہا ہوتا تو یوں لگتا ساری زندگی اس کی ساری قوتیں، علامتیں اس کے برش کی دسترس سے دور نہیں ہوتیں اور ایسے ہی سمے وہ اس کے پاس آئی۔

"میں اپنے وجود سے انکار نہیں کر سکتی۔ اس کی ضرورتیں تمہاری تصویروں کے رنگوں سے زیادہ سچ تھیں زندگی وجود سے ہے، تم کیسے جھٹلاؤ گے مصوّر!"

"میں جھٹلاتا نہیں۔ میں اس پر فتح پاتا ہوں"

اس نے برش سے تصویر کے ایک کونے میں رنگ کو گہرا کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں! یہ ممکن نہیں۔ تمہارا آرٹ تک تو وجود سے ہے، تمہارے اپنے وجود سے اور میں . . . . . اور میں تم سے مقدر کی گئی ہوں . . . . تم سوچتے کیوں نہیں؟"

"لیکن میں ان رنگوں کو بیچ نہیں سکتا۔ ان خوابوں کو کوئی نہیں خریدتا!"

تم بھی جاؤ رئیسِ شہر کے پاس۔ ہماری بھی ضرورتیں ہیں۔

تمہارے رنگ تو ہماری ضرورتوں میں شامل ہیں۔ ضرورتوں سے انکار کیسے ممکن ہے؟

مجھے پتہ ہے تمہارا مقدر مجھ سے وابستہ کیا گیا ہے، مگر یہ تصویریں، یہ کاروبار نہیں بن سکتا۔ ان سے شاید چیزیں نہیں خریدی جا سکتیں۔ یہ میرے وجود کا بھی تو جواز نہیں۔ ہر کوئی تو جواز کے بغیر جی نہیں سکتا۔"

"ٹھیک ہے مصوّر! مگر میں تمہاری ذمے داری کی گئی ہوں۔ اس سے کیسے انکار کر سکو گے اور پھر ایک اور وجود جو میرے اندر پل رہا ہے جو میرا اپنا جواز ہے۔"

مصوّر چپ ہو گیا۔

وہ تمہاری کسی بھی تصویر سے زیادہ رنگین اور حقیقی ہو گا۔ چوری چھپے جو میں تمہاری تصویر بیچ ڈالتی ہوں اس کی آمدنی کافی نہیں۔ ہم سب کے لیے، اور بڑے بیٹے عاصم کی ضروریات بڑھ رہی ہیں وہ ساتویں جماعت میں آگیا ہے نا

اور مصوّر سب کچھ سنتا رہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں جاؤں گا رئیسِ شہر کے پاس"

اس نے فیصلہ کر لیا۔ وہ جیسے زمین پہ گرا ہوا تھا

اور جب وہ وہاں پہنچا تو پہلے اسے رئیسِ شہر کے پاس پیش ہونے کے آداب سمجھائے گئے۔ وہ سنتا رہا۔ سمجھتا رہا

اور پھر اس کے پاؤں میں کسی نے گھنگھرو باندھ دیے جن سے چھن چھن کی آواز نکلی۔

اسے نہیں پتہ تھا پہلے کون سا پاؤں اٹھانا ہے، دایاں یا بایاں —— پھر بھی خود بخود جیسے اس کے پاؤں ایک خاص سر تال کے ساتھ رقص میں آ گئے۔

وہ ناچتا رہا —— ناچتا رہا اور اس کی ساری تصویریں، تصویروں کے سارے رنگ، سب لکیریں، قوسیں، دائرے، زاویے ٹوٹ ٹوٹ کر یوں گرتے رہے جیسے اندھیری رات میں ستارے ٹوٹ رہے ہوں۔ اس کی آنکھوں، اس کے برش کے سارے رنگ جمع ہونے لگے۔

رئیسِ شہر سے اسے رزق کی ضرورت تھی۔ اپنے ساتھی کے لیے، اس کے اندر پلنے والے وجود کے لیے اور بچے کی کتابوں کے لیے۔ ان کتابوں کے لیے جن کے اندر رنگین تتلیوں والی تصویریں تھیں، اچھی اچھی باتوں کا ذکر تھا۔

جب وہ لوٹا تو اس نے گھنگھرو نہیں اتارے۔ چھن چھن کرتا واپس آیا تاکہ سب سنیں، سب اس کے پاؤں کی ضرورتوں کی پکار سنیں۔

اس نے اپنی جھولی اپنے ساتھی کے سامنے خالی کی۔

"یہ ہے میرے پاؤں کی کمائی۔"

وہ بہت اداس تھا۔ اس کے سب رنگ بجھ گئے تھے اور اس رات وہ اپنے کمرے میں نہ جا سکا۔ وہ ناچ ناچ کر بہت تھک چکا تھا۔ اس کے زخموں پر ورم آ گیا تھا۔ سوتے میں ہی اس کی ساتھی نے اس کے پاؤں سے گھنگھرو علاحدہ کر کے ایک طرف رکھ دیے تھے۔

اگلے روز وہ جب اپنے کمرے میں داخل ہوا تو سب تصویریں جیسے اداس تھیں۔ سارے خواب چپ تھے۔
اس نے برش پکڑا۔ اس کے گلے میں کانٹے اگ آئے تھے۔ برش کو اس نے رنگوں میں ڈبویا۔ ایزل پر لگے کینوس پر اس نے برش سے رنگوں کی لکیر کھینچنا چاہی تو سُن رہ گیا۔ برش کے سارے رنگ اڑ چکے تھے۔

شام اپنی افسردگی سمیت اتر رہی تھی جب اس نے اپنے ساتھی کو دروازے میں کھڑا پایا۔ مصوّر نے دیکھا اس کے ہاتھ میں گھنگھرو تھے اور پاس ان کا بیٹا عاصم کھڑا تھا۔

مصوّر نے بڑی اداسی سے پوچھا۔

"پھر رزق ختم ہو گیا؟"

وہ چپ رہی۔

مصوّر آگے بڑھا۔ اس نے ہاتھ میں ابھی تک برش پکڑا ہوا تھا۔

گھنگھرو پکڑنے کے لیے اسے اپنا ہاتھ خالی کرنا تھا۔

مصوّر نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر برش اپنے بیٹے کے ہاتھ میں دے دیا۔ بیٹا بڑے شوق سے آنکھوں میں چمک لیے ایزل کی طرف بڑھا اور جیسے ہی اس نے ہنستے ہوئے وہ برش کینوس پر پھیرا تو جیسے رنگوں کی پھوار پھوٹ پڑی۔

مصوّر نے اپنے ساتھی کے ہاتھ سے گھنگھرو پکڑے اور پھر سے رزق کی تلاش میں باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر خالد سہیل

کھلے اور بند دروازے

تم سے پہلی ملاقات کل کی بات لگتی ہے، لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے برسوں نہیں صدیاں بیت چکی ہیں۔ اس دور کے بعض نقوش تو آج تک ذہن میں تر و تازہ ہیں، لیکن بعض یادیں دل کے طوفانوں کی نذر ہو کر دھندلا گئی ہیں۔

میں بچپن کی ندی کے کنارے چلتے چلتے اور لڑکپن کے دریا کو عبور کر کے جب ساحل نوجوانی پر پہنچا تھا تو تمہیں اجنبیت کے پہاڑ سے نیچے اترتے دیکھا تھا۔ جب ہم ایک دوسرے کے قریب پہنچے تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور تمہاری پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ ہم دونوں کی زبانیں گنگ تھیں۔ میں نے تمہیں قریب سے دیکھا تو مجھے وہ گھر یاد آیا جس میں پُراسراریت بستی ہو اور جس کی سب کھڑکیاں اور دروازے بند ہوں تاکہ کوئی اندر نہ جھانک سکے اور میں نے اپنے بارے میں سوچا تو مجھے وہ مکان یاد آیا جس میں حبس اور گھٹن رہتے ہوں اور جس کی تمام کھڑکیاں اور دروازے کھول دیے ہوں تاکہ تازہ ہوا اندر آ سکے۔

میں نے اپنی زندگی کے سارے دروازے کھول کر تمہیں اندر آنے کی دعوت دی، لیکن تمہاری نگاہوں کی شرم اور تمہارے دل کی غیر اعتمادی تمہارے پاؤں کی زنجیر بن گئے۔ تم نے "میں تمہیں ابھی اچھی طرح نہیں جانتی" کہہ کر سکون اختیار کر لیا۔ میں چند لمحے خاموش کھڑا رہا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

اپنی تنہائی کی پگڈنڈی پہ چلتے چلتے میری ہر موڑ پہ تم سے ملاقات ہوئی۔ وہ تم تھیں یا تمہارا ہمزاد، کچھ سمجھ میں نہ آیا فرق اتنا تھا کہ کہیں تم خوش شکل نظر آتیں، کہیں خوش مزاج، کبھی تم مسکرا دیتیں اور کبھی سنجیدگی اختیار کر لیتیں، کہیں تمہارے بال کالے اور لمبے، آنکھیں نیلی اور جلد سفید ہوتی اور کہیں بال چھوٹے، آنکھیں بھوری اور جلد گندمی نظر آتی۔ میں ہر پیکر سے تپاک سے ملتا۔ لیکن تکلفات کی دیواریں راہ میں حائل تھیں۔ کبھی کبھار تو تم شک کی نگاہ سے دیکھتیں کہ میں نے اپنی ذات کے سب دروازے کھلے کیوں رکھے ہیں۔

وقت کا سورج چمکتا رہا اور ہمارے تعلقات کی برف پگھلتی رہی۔ ایک سہ پہر ہم ندی کے کنارے گھنٹوں بیٹھے رہے۔ تم نے بیسیوں سوال پوچھے اور میں اپنے ماضی کی کہانی تمہیں سناتا رہا۔ تم بڑے غور سے سنتی رہیں جیسے ہر بات کا تجزیہ کر رہی ہو اور جب

ڈاکٹر خالد سہیل

میں نے تمہاری ذات کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کی تو تم نے ایک دو کھڑکیاں تو کھولیں لیکن باقی کھڑکیاں اور دروازے بند رکھے۔ ہر دروازے پر لکھا تھا کہ "انتظار" میں مسکراتا ہوا لوٹ آیا۔

حالات نے میری تمہارے ہمزادوں سے ملاقات کروائی۔ تم شاید میرے ہمزادوں سے ملتی رہیں۔ قربتیں اور فاصلے چاند کی طرح گھٹتے بڑھتے رہے۔

ایک شام تم نے میرے گھر آنے کی دعوت قبول کرلی۔ تم میری طرف ایسے دھیمے دھیمے بڑھ رہی تھیں جیسے بچے ٹھنڈے پانی کے تالاب میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھتا ہے۔ میں نے تمہیں شراب کا گلاس پیش کیا، لیکن تم نے چائے کی پیالی پر اکتفا کیا مبادا شراب کا گلاس چند اور کھڑکیاں نہ کھول دے۔ تم زیادہ دیر نہ ٹھہریں اور میں تمہاری آنکھوں میں جھانک کر یہ نہ جان سکا کہ تم واقعی ٹھہرنا نہیں چاہتی تھیں یا روایات کی مقناطیسی قوت تمہیں مجھ سے دور لیے جا رہی تھی اور حالات کا دریا عبور کیے بغیر میں تم تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

تم مختلف چہروں کی صورت میں قوس قزح کے رنگوں کی طرح میرے چاروں طرف پھیلی رہیں اور میں اپنے ہمزادوں کے ہمراہ پھولوں کی پتیوں اور بیجوں کی طرح بدلتے موسموں کے دوش پر تیرتا رہا۔

کتنے سورج طلوع ہوئے اور ڈوب گئے۔ کتنے چاند نکلے اور روپوش ہوگئے، لیکن میرے جذبے کی دھوپ اور تمہاری احتیاط کی چاندنی باہم نہ ہوسکے۔

اور پھر ایک رات تم نے شرم و حیا کے سب نقاب طاق پر رکھ دیے اور اعتماد کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے میری زیست کے ایک دروازے سے داخل ہوئیں۔ ہم دونوں ایسے بغل گیر ہوئے جیسے ازل سے اسی لمحے کا انتظار کر رہے ہوں۔ ہم نے ایک دوسرے کے سراپا کو دیکھا، چکھا، چھوا، محسوس کیا اور ایک دوسرے کے تجربات کے آئینوں میں اپنی ذات کی تکمیل کی کوشش کی۔

تم نے اپنی ذات کا ایک دروازہ کھولا اور میری ذات کے ایک دروازے سے داخل ہونے کے بعد اس دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔

اس رات قربتوں کی لذت سے ہم ایسے سرشار رہے کہ نہ تم نے میرے ہمزادوں کا ذکر کیا اور نہ میں نے تمہارے ہمزادوں کی بات کی۔

جانے سے پہلے تم نے میری ذات کے باقی دروازوں کو بند کرنے کی کوشش کی لیکن جلدی میں بند نہ کر سکیں۔

اگلے ہفتے تم پھر آئیں لیکن تمہارا ظاہر و باطن بدل چکا تھا۔ تمہاری جلد کا رنگ، تمہارے چہرے کے تاثرات، تمہارے جذباتی ردِعمل سب مختلف تھے۔ میں نہ جان سکا کہ وہ تم ہی تھیں یا تمہاری کوئی ہمزاد تھی، لیکن میں اس بات سے باخبر تھا کہ وہ کسی اور دروازے سے داخل ہوئی تھی اور اس نے بھی دیگر دروازے بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں دل ہی دل میں مسکرا دیا تھا۔

میں تمہاری ذات کے دیگر دروازے کھولنے کی کوشش کرتا رہا اور تم میری ذات کے باقی دروازے بند کرنے کی سعی کرتی رہیں۔

اس کشمکش میں کئی نازک لمحے آئے اور گزر گئے۔ اچھے وقت بھی آئے اور برے وقت بھی، کئی ملاقاتیں شہد کی طرح شیریں تھیں اور کئی زہر کی طرح تلخ۔

ڈاکٹر خالد سہیل

پھر ایک رات جب چاند بادلوں میں چھپ چکا تھا، بادل کاجل کی طرح آسمان کی آنکھ میں پھیلتے جا رہے تھے اور بارش کے آنسوؤں کی طرح بہنے لگے تھے۔ ہم دونوں نے ماحول کی سردی کو کم کرنے کے لیے ایک دوسرے کو آغوش میں لے لیا تھا —— فون کی گھنٹی بجی —— وہ تمہاری ہمزاد تھی —— نہ میں اسے کچھ کہہ سکا اور نہ تمہیں —— ابھی ہم اس طوفان سے گزرے نہ تھے کہ کسی نے دوسرے دروازے پر دستک دی۔

میں نے جواب نہ دیا، لیکن وہ چابی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ مجھے تم دونوں میں بہت شباہت لگی —— تم دونوں ایک دوسرے کو اور پھر مجھے غور سے دیکھتی رہیں اور تم نے تکیے کے نیچے سے تیز دھار کا خنجر نکال کر میری کمر میں گھونپ دیا۔

میں نہ جانے کب تک بے ہوش رہا —— ہوش آیا تو ایک ہمزاد میری مرہم پٹی کر رہی تھی اور دوسری میرے زخم چاٹ رہی تھی۔ میں نہ جان سکا کہ تم کون سی تھیں اور میری خواب گاہ کی دیوار پر فریم شدہ دل جو پیازی ہوا کرتا تھا ایک دم سرخ ہو گیا تھا۔

میں ایک دفعہ پھر بے ہوش ہو گیا اور جب جاگا تو تم دونوں جا چکی تھیں۔

مرے سراپا سے ٹیسیں اٹھتی رہیں۔ تم نے خنجر ایسی جگہ گھونپا تھا کہ عین ممکن تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے نامرد ہو جاتا، لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی کہ میں پھر صحت یاب ہو گیا۔

نہ جانے تم اور تمہارا ہمزاد میرے ہمزادوں سے کیسا سلوک کر رہا تھا اور ان کا ردِّ عمل کیا تھا۔

کتنے موسم خزاں موسم بہار سے جا ملے، کتنی گرمیاں سردیوں سے ہم آغوش ہو گئیں اور ہماری انگلیاں تعلقات کی گرہیں کھولتے کھولتے لہولہان ہو گئیں۔

جوں جوں جذبات میں شدّت پیدا ہوتی گئی، تعلقات دو دھاری تلوار بنتے گئے اور جوں جوں ہم انھیں مستحکم کرنے کی کوشش کرتے رہے وہ اور پیچیدہ اور گنجلک ہوتے گئے۔

ایک مقام پر ایسا لگا کہ میں، تم، میرے ہمزاد، تمہارے ہمزاد ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ ہمارے دکھ سکھ، غم اور خوشیاں مشترک ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہماری خود غرضیاں، ہمارے رشتوں میں قطرہ قطرہ زہراب گھولتی رہیں اور ہمارے تعصّبات ہمارے اعصاب پر آسیب بن کر سوار رہے۔

انگلیوں کے ناخن اکھڑ گئے، لیکن الجھنوں کی گرہیں اور الجھتی رہیں۔

مختصر یہ کہ میرے تمہارے رشتوں کے رنگ پھیکے نکلے اور رشک، حسد اور رقابت کے مون سون کی بارشوں میں بہہ گئے۔

نہ صرف یہ کہ رنگین پھول پھیکے پڑ گئے بلکہ کانٹوں نے موسموں کے ساتھ ساتھ زہر بھی گھول دیا۔

ایک رات تم غصّے میں دندناتی آئیں۔ اپنا دروازہ کھولا، باقی دروازے جن کے پیچھے تمہارا ہمزاد کھڑا تھا دھڑام سے بند کیے اور سارے رشتے منقطع کرنے کی دھمکی دے کر میرے گھر سے نکل گئیں۔ یہ علیحدہ بات کہ میری ذات کے دروازے بند کرنے کی کش مکش میں تمہارے اپنی ذات کے کئی دروازے کھل گئے اور مجھے جو جھلکیاں نظر آئیں وہ مجھے حیران کرنے کے لیے کافی تھیں۔

تم شاید میرے ہمزاد کی تلاش میں دوبارہ اجنبیت کے پہاڑ پر چڑھ گئیں تاکہ کسی اور کی قربتوں کی وادی میں اتر سکو اور تمہارا ہمزاد ہر دروازے کے پیچھے ہکّا بکّا کھڑا رہے۔

میں نے اپنی خواب گاہ کی دیوار پر فریم شدہ دل دیکھا جس کا رنگ سرخ سے کالا ہو رہا تھا۔
کالے گلاب مسکرا مسکرا کر سوگ مناتے رہے۔
اس واقعے کو برسوں کیا صدیاں بیت گئیں۔ ہمارے نقطہ ہائے نظر وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے۔
تم یا تو صرف دوستی کی کھڑکیاں کھولنے پر آمادہ تھیں اور اگر رومانوی دروازے کو وا کرنے پر رضا مند ہوئیں تو باقی دروازوں کو بند کرنے پر مصر ہوئیں اور میں تمہیں باقی دروازوں کو باقی ہمزادوں کے لیے کھولنے پر اصرار کرتا۔
نہ ہم اتفاق کر سکے نہ اختلاف اور حالات کی گاڑی پٹڑی بدلتی رہی، مختلف جنکشنوں پر رک رک کر آگے بڑھتی رہی، مسافر چڑھتے اور اترتے رہے۔ تلخیاں بڑھتی اور گھٹتی رہیں اور ہم اپنے اپنے آئینوں کے دھندلاجانے کا سوگ مناتے رہے۔
نہ تم مجھے پوری طرح جان سکیں اور نہ میں تمہاری ذات کے پوشیدہ گوشوں سے واقف ہو سکا۔ ہم آدھے راستے سے واپس لوٹ آئے۔ لیکن آج میرے دل نے پھر زور زور سے دھڑکنا شروع کیا ہے اور تمہاری آنکھوں میں پھر ستارے ٹمٹماتے نظر آئے ہیں،
امید کا چاند اور تجربات کا سورج ہمارے رہبر ہیں،
عین ممکن ہے اس دفعہ ہم آدھے راستے سے آگے بھی جا سکیں۔
میری خواب گاہ کا دل کورے کاغذ کی طرح سفید ہے اور نقش ثانی کا منتظر!

(ٹورنٹو، کینیڈا سے) ▲▲

شام بارک پوری

بیس کروڑ کندھے

اندھیرے کا بچپن آہستہ آہستہ جوانی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ فلک پر چاند کسی بیوہ کی چوڑی کی طرح ٹوٹا نظر آرہا تھا۔

دینو کی آواز اندھیرے کے اندر زندگی کا سبق دیتی ہوئی کانوں سے ٹکرائی "لالٹین جلا دینا نازو بیٹا!"

حوروں کی سی معصوم نازو کی آواز سنائی دی جیسے نیند سے جاگ اٹھی "گھر میں تیل کہاں بابا جو لالٹین جلاؤں"

حالات کی ستم ظریفی میں پسنے کے بعد انسان کی ساری تمنائیں آوارہ روح کی طرح بھٹکنے لگتی ہیں، جب زندگی عذاب بن جائے تو سیہ بختی کی پرچھائیاں عفریت کی طرح چھا جاتی ہیں۔

میرا مکان محصور پاکستانیوں کے کیمپ کے بالکل ساتھ تھا۔ میرے کمرے کے پیچھے دینو کے ٹین شیڈ سے بنی کوٹھری تھی جہاں سے اس کی سسکیوں کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ کیمپ میں داخل ہونے کا راستہ دوسری طرف تھا۔

جھٹ پٹے کے وقت آسمان کے آنچل میں ایک بھی تارا نہ تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا خیالی ہیولوں سے کھیل رہا تھا۔ دینو اور نازو کی گفتگو مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ جنھوں نے اپنوں کے لیے خون بہایا، عزت لٹائی۔ آج وہ ان کے لیے اجنبی بن گئے تھے۔ ساری دنیا ان کے لیے تنگ ہو گئی تھی۔ کوئی بھی انھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ کیمپوں کی المناک زندگی ساری دنیا کی آنکھوں میں حیرت اور رحم کی لکیر تو بن گئی تھی، مگر اپنوں کی آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ بھلا کھوٹا سکہ کون اپناتا ہے۔ آج کا انسان اتنا خود غرض ہو گیا تھا کہ جب تک ان بہاریوں سے ان کا مفاد وابستہ تھا، فائدہ اٹھایا اب پاکستانی ہونے کے جرم میں ان پر افتاد ٹوٹ پڑی تھی۔ تین نسلیں اس زمین کی مٹی چاٹتی رہیں مگر ان کا مسئلہ حل کرنے کی پیش قدمی نہ ہوئی۔ ساری دنیا میں محصور پاکستانیوں کے تبادلے کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے مگر ان کی منتقلی اور آبادکاری کے لیے کسی نے بھی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا۔ وہ کیمپوں میں کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگ رہے ہیں۔ ریلیف کے چند چھٹانک گندم سے ان کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔

دینو بھی ان ہی بدقسمت لوگوں میں تھا جس کا جوان لڑکا بلوائیوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ بیوی جب جھلسی ہوئی حالت میں مورا پاڑہ کیمپ میں لائی گئی تو زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسی۔ انٹرنیشنل ریڈ کراس نے دینو اور چار سالہ نازو کو مارکیٹ کیمپ میں منتقل کر دیا۔ کئی سالوں تک کھلے آسمان کے نیچے رہنے کے بعد بین الاقوامی ادارے نے ٹین کے شیڈ سے کوٹھریاں بنا دیں۔

بیس کروڑ کندھے

شام بارک پوری

دینو کا اصل نام دین محمد تھا۔ کبھی وہ بھی صاحبِ حیثیت اور معزز تھا مگر آج وہ جسم پر غربت کے چیتھڑے لگائے بے جا کی کے چوراہے پر کھڑا تھا۔ آسمان کا چاند مغرب سے نکل کر مشرق میں ایسا ڈوبا کہ دوبارہ مغرب کا چاند نظر نہیں آیا۔ ملک میں ایسا انقلاب آیا کہ امیر فقیر بن گئے اور بھکاری دولت مند! لیکن پھر بھی دینو زمانے کے ہر تھپیڑے سہتا رہا اور ناانصافی کی تلخیاں پیتا رہا۔

جب کبھی کیمپ کے اوپر سے بوئنگ پرواز کرتا تو وہ بھی دوسروں کے ساتھ ٹکٹکی باندھے بڑی حسرت سے آسمان کی طرف دیکھتا کہ نہ جانے کب انھیں لے جانے کے لیے آخری فلائٹ آئے گی۔

میرا اور دینو کا مالک اور نوکر کا رشتہ تھا۔ عام نوکر نہیں بلکہ وہ وفادار اور محنتی نوکر تھا۔ ایک بار جب وہ کسی کام کی تلاش میں میرے پاس آیا تھا تو میں نے اسے اپنے آفس میں چپراسی لگا دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ریلوے میں ملازم تھا مگر بنگلہ دیش بننے کے بعد اسے برطرف کر دیا گیا۔ میرا اس کا ساتھ کئی سالوں سے تھا۔ جب کبھی دکھ درد سے کراہتے وقت اس کے چہرے پر رونق سی آتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ اس میں زندگی سے لڑنے کی قوت پیدا ہو چکی ہے۔

دن گزرتے رہے —— برس بیتتے رہے —— کیلنڈر بدلا کیے —— سترہ سال قبل دینو جس راستے میں گم ہوا تھا۔ بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح اب بھی وہیں چکر لگا رہا تھا۔

میں فلسفے کی ایک کتاب میں کھویا ہوا تھا۔ سامنے ٹیبل پر ارسطو، ایلیٹ، سارتر، کافکا، البرٹو موریہ، ہنری جیمس خلیل جبران، دیوان غالب، علامہ اقبال کی کتابیں اور سگریٹ وغیرہ رکھے تھے۔ بیچ بیچ میں اسٹوو پر بنی ہوئی چائے سے تھکاوٹ دور کر لیتا۔ جب پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو نازو کے بارے میں دینو کی سچائی پر غور کرنے لگ جاتا۔

چائے سگریٹ وغیرہ کے ساتھ کھیلتے کھیلتے نہ معلوم کب میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے دیکھا کہ دینو کو کہیں سے دس ہزار کی رقم ملی ہے۔ اس کی حسین بیٹی نازو —— اکیس برس کی بھرپور جوانی میں بیاہی جا رہی ہے۔ نازو کے ہاتھ پاؤں حنا آلود میں۔ شہنائیاں بج رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کا سمندر جھانک رہا ہے جیسے خزاں کے بعد بہار آ گئی ہو۔

دینو چپ ہے۔ بیٹی کی جدائی کا غم اسے کھائے جا رہا ہے۔

"کھٹ —— کھٹ کھٹ ——" دروازے پر دستک کی آواز سے میری نیند کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دیوار گیر گھڑی نے چھ بجا کر صبح ہونے کی اطلاع دی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دی۔

صبح کی سپیدی کے گھونگھٹ سے سورج جھانک رہا تھا۔ اس کی کپکپاتی کرنوں سے کیمپوں میں زندگی جاگ پڑی تھی۔ لوگ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے سائیکل رکشا لے کر نکل رہے تھے۔ نوجوان ٹھیلے لے کر کام پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ بوڑھے اور بوڑھی عورتیں کاسۂ گدائی لیے نکل رہی تھیں۔ نوکری ان کے لیے مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ محصور پاکستانی اس دھرتی پر نوکری کی نعمت سے محروم تھے۔

باہر دینو کھڑا تھا۔ اداس، غمگین، اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ چہرے پر رنج و غم کے گہرے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ کل ہی وہ کہہ رہا تھا "صاحب! نازو بخار سے تپ رہی ہے۔ واہی تباہی بکتی ہے۔ کہتی ہے۔ بابا! تمہیں میری شادی کی فکر ہے نا؟ دیکھو۔ آسمان والے مجھے بلا رہے ہیں۔ بادلوں کی ڈولی دروازے پر لگی ہے۔ جاؤ دیکھو!"

یہ سب باتیں میں پانچ منٹ میں سوچ گیا۔
دینو غمزدہ کھڑا تھا، جیسے سچ مچ اس کی کوئی چیز کھو گئی ہو۔
"صاحب!"
"کیا بات ہے؟"
"میری ہمت جواب دے گئی ہے۔"
"ابھی ـــــ کیا ہوا تمہیں؟"
"نازو بہت بیمار ہے۔ ڈسپنسری والے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اسے ہسپتال لے جاؤ"
"کیا ہوا ہے تمہاری نازو کو؟" سب کچھ سمجھ کر بھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔
"بخار اترنے کا نام نہیں لیتا۔ نہ کچھ کھاتی ہے۔ نہ کچھ پیتی ہے۔ ہسپتال میں داخل کرانا ہوگا۔ بڑی مشکل سے جنرل وارڈ میں جگہ ملی ہے۔" اس کی ہچکی بندھ گئی۔ غم واندوہ کا آتش فشاں جیسے اس نے دل میں چھپا رکھا تھا۔ پھٹ پڑا۔
میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ سانسوں کے تار کو جیسے کسی نے جھنجھوڑ دیا ہو۔
"علاج کے لیے کچھ ٹاکا (روپے) لوگے؟"
اس کی روتی ہوئی آنکھوں سے "ہاں" کا اشارہ ہوا۔ میں نے ٹیبل پر رکھے ہوئے بٹوے سے سو ٹکا کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔
"جاؤ ـــــ اس سے نازو کی دوا کا انتظام کرنا۔ تمہاری چھٹی منظور ہے"
دینو، روتا بلکتا چلا گیا۔

اکیس برس کی نازو کنواری رہ جائے گی یا مر جائے گی۔ بے یار و مددگار انسان کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ ان کا نہ کوئی مستقبل ہے اور نہ کوئی ٹھکانہ! جنھیں ایک وقت کی روٹی میسر نہیں۔ ان کا علاج کیسے ہو۔ برِ صغیر کے تین ٹکڑوں میں بٹی ہوئی کوئی سرزمین انھیں اپنانے کو تیار نہیں۔
گزرے ہوئے خیالوں کی لکیر تمتما اٹھی۔
"نازو کی شادی کیوں نہیں کر دیتے دینو؟" فائلوں سے الجھتے ہوئے میں نے ایک دن سوال کیا تھا۔
"کہاں سے کروں حضور! لکھے پڑھے ہیں کیا؟" ہم لوگوں کے لیے بھوک، بیماری اور رہائش ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ سترہ سال اس انتظار میں گزار دیے کہ شاید زندگی کے اچھے دن نصیب ہوں۔"
اس وقت اس کی روح دل چیر کر نکل پڑی تھی۔ "صاحب! مجھ جیسے مجبور اور بے کس کا کوئی پرسان حال نہیں۔ پہلے انسانیت اور ایمان کی شاہراہ پر گامزن تھا۔ اب تو سچائی اور انصاف کی گلی بھی نہیں ملتی۔ کیمپوں میں رہنے والے ہمارے بھائی بھی اپنے بیٹوں کے لیے جہیز مانگتے ہیں۔ اگر مجھ غریب کا خون بیٹی کے جہیز کے کام آسکے تو میں خوشی سے تیار ہوں۔ جب میں اپنی نازو سے اس کے بیاہ کی بات کرتا ہوں تو میرا کلیجہ کٹ کٹ جاتا ہے۔ وہ برابر یہی کہتی ہے کہ بابا، میری شادی کی فکر مت کرو۔

شام بارک پوری

جب آسمان والے مجھے لے جائیں گے تو بادلوں میں میری یاد رات جلائے گی"۔

اس ادھیڑ بن میں رات گزر گئی۔ سوچتا رہا کہ اس کیمپ میں بھی جہیز ایسی دیمک ہے جو لٹے پٹے گھرانوں کے چوکھٹ کو اندر اندر چاٹ جاتی ہے۔

صبح سورج کا تمتماتا ہوا چہرہ نمودار ہوا۔

جلدی جلدی ناشتہ کرکے آفس پہنچا۔ گزشتہ دو راتوں سے اس کی کوٹھری سے کوئی آواز سنائی نہ دی تھی۔ شاید اپنی بیٹی کو ہسپتال میں داخل کرانے گیا تھا۔ آج بھی دینو نہیں آیا۔ پھر اس صبح کی یاد آئی جب وہ انتہائی اندوہ و غم کی حالت میں میرے پاس آیا تھا۔

آج آفس کی فائلوں سے اچھی طرح نپٹ نہ سکا۔ رہ رہ کر دینو کا خیال دماغ میں چکر لگانے لگتا۔ دل چاہا کہ ایک دفعہ کیمپ کا چکر لگاؤں۔ آخر دوپہر کے وقت میں نے اپنے کلرک کو کیمپ میں دینو کا پتا لگانے کے لیے بھیجا۔

دینو، ہانپتا، ڈگمگاتا ہوا، آنکھوں میں آنسو لیے آفس آیا مجھے دیکھ کر وہ بے تحاشہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"نازو چل بسی صاحب"

میرے دل میں جیسے کسی نے سوئی چبھو دی ہو۔

دینو کی آنکھیں گنگا جمنا ہو رہی تھیں۔

دکھی دل سے اُسے بے بی ٹیکسی پر بٹھایا۔ کیمپ کے قریب بے بی ٹیکسی رک گئی۔ کیمپ کے باہر والی سڑک پر ہزاروں لوگوں کا جم غفیر تھا۔ بھیڑ چیر کر مجمع میں داخل ہوا تو دیکھا کہ نازو کی لاش ہسپتال سے لا کر سڑک پر رکھی ہوئی تھی۔ اس کے حلق میں کینسر ہو گیا تھا۔ دینو غم سے پاگل ہو رہا تھا۔ مفلسی کیمپ میں ننگی ناچ رہی تھی۔ دینو کی جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا کہ کفن دفن کا انتظام کر سکے۔ روتے روتے دینو بے ہوش ہو گیا۔

نازو کی لاش اپنے دس کروڑ کلمہ گو بھائیوں سے فریاد کر رہی تھی کہ جنازے کو کندھا تو لگاتے جائیے"۔

(بنگلہ دیش سے) ▲▲

محمد خالد اختر • نکہت بریلوی • ڈاکٹر حنیف فوق

نئی کتابیں

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

قرآن مجید اور اردو
(کتابچہ)

مصنف: اظہر حسن صدیقی
صفحات: • قیمت: درج نہیں
ناشر: مقتدرہ قومی زبان۔ ۱۶۔ ڈی (غربی) بلیو ایریا مالیفنا ا۔ اسلام آباد

مقتدرہ قومی زبان کا مطبوعہ یہ دلپذیر کتابچہ بڑا ریڈیبل ہے اور مجھے بہت پسند آیا۔ اس کی تھیم (THEME) جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے اچھوتا ہے یعنی کہ قرآن مجید سے اردو زبان سے نسبت، اور میں نہیں سمجھتا کہ کسی نے اس سے پہلے اس موضوع پر اس انداز سے سوچا ہو۔ قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے دنیائے ادب کی عظیم کتاب ہے اور لسانی سطح پر اس نے اردو زبان کا دامن بے حد وسیع کیا ہے جیسا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی اس کتابچے کے پیش لفظ میں ہمیں بتلاتے ہیں۔ قرآن پاک کے تقریباً ۷۵ فی صد الفاظ آج اردو زبان کا مسئلہ ہیں اور لغات اور اسلوب قرآن نے اردو زبان کی ساخت اور مزاج کو متاثر کیا ہے۔

اس کتابچے میں مصنف نے اپنے صاف اور روشن اسلوب میں ان الفاظ، آیات، ناموں، تلمیحات، اقوال۔ ضرب الامثال میں سے کئی ایک کا ذکر کیا ہے جو بالعموم اردو میں مستعمل ہیں۔ پھر کئی ایسے محاورے ہیں جو قرآن مجید کی مناسبت سے اردو زبان میں رواج پا چکے ہیں مثلاً ہر فرعونے را موسیٰ۔ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ وغیرہ

قرآن حکیم کے اردو زبان پر اثرات کے بارے میں یہ کتابچہ بڑی دلچسپی کا حامل ہے اور اس کے فاضل مصنف ہماری داد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس موضوع کو ایک نئے اور مختلف ڈھنگ سے اردو زبان کے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے (جزاک اللہ۔ یہ ترکیب بھی تو قرآن حکیم سے اردو میں آئی ہے۔) توقع ہے کہ اظہر حسن صدیقی جنھوں نے عربی میں ایم اے کیا ہے اس منفرد پہلو پہ مزید تحقیقی کام سرانجام دیں گے۔

——— محمد خالد اختر

اقبال۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید
(مقالات کا مجموعہ)

مرتب: ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری
صفحات: ۳۲۴ • قیمت: ایک سو بیس روپے ۱۲۰/
ناشر: پاکستان اسٹڈی سنٹر جامعہ کراچی

محمد خالد اختر

اقبال ہماری زبان کے ایک بڑے شاعر تھے اور ان کی خوب صورت نغمہ ریز، پر تخیل شاعری رہتی دنیا تک زندہ رہے گی مگر شاعر ہونے کے علاوہ وہ ایک مفکر اور فلسفی بھی تھے جنھوں نے قدیم اور جدید فلسفے کے عمیق مطالعے کے بعد اپنے چونکا دینے والے فکر اسلامی کی راہ تلاش کی تھی۔ ان کے مدارس میں پڑھے خطبات کو جو بعد میں

کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے، بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ یہ خطبات بڑے فکر انگیز اور اہم ہیں اور مسلمان مفکرین کی نگاہ میں ان کو سامنے رکھ کر فکر اسلامی کی ایک نئی تشکیل جو بیسویں اور اکیسویں صدیوں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی تقاضوں سے مطابقت رکھتی ہو۔ ممکن ہے۔ THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM

یہ کتاب ان مقالات پر مشتمل ہے جو پاکستان سٹڈی سینٹر جامعہ کراچی کے ایک سالانہ سیمینار میں ان خطبات کے موضوع پر پڑھے گئے۔ ملک کے مانے ہوئے دانشوروں اور اقبالیات کے مفسروں نے اس سیمینار میں حصہ لیا اور ان کے مقالات تقریباً سب کے سب فکر انگیز اور دلچسپ ہیں۔ انھوں نے بظاہر اس عالمانہ اور خشک موضوع کو عام قاری کے لیے بڑا EXCITING بنا دیا ہے۔ جن دانشوروں نے اس سیمینار میں مقالے پڑھے (اور جو اس کتاب میں شامل ہیں) ان کے نام یہ ہیں۔ ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری، جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، پروفیسر وارث مرحوم، جسٹس ریٹائرڈ قدیر الدین احمد، ڈاکٹر منظور الدین احمد، مولانا محمد طاسین، پروفیسر محمد منور، پروفیسر پریشان خٹک، پروفیسر محمد عثمان مرحوم، اور پروفیسر کرار حسین۔ یوں تو سب مقالات ایک علمی اور تحقیقی شان رکھتے ہیں۔ پروفیسر کرار حسین کے منہ بولتے ہوئے مقالے کا جواب نہیں۔ کرار حسین کا انداز بیان ہی اور ہے دل کو موہ لینے والا۔ قانون شریعت کا مسودہ تیار کرنے والوں کے لیے حکیم الامت علامہ اقبال کی اصل کتاب جس کا اردو ترجمہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے نام سے دستیاب ہے اور زیر تبصرہ کتاب کا مطالعہ لازم ہے۔ ——— محمد خالد اختر

دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء (تحقیقی و تنقیدی مقالہ)

مصنف: ڈاکٹر آغا سہیل

صفحات: ۴۷۴ • قیمت: نوے روپے

ناشر: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۳۰۷/این سمن آباد لاہور ۵۴۵۰۰

ڈاکٹر آغا سہیل افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے ادبی دنیا میں معروف ہیں۔ ادھر کوئی پندرہ بیس سال کے دوران برصغیر کے ادبی جرائد میں ان کے افسانے اور تنقیدی مضامین مطالعے میں آتے رہے ہیں۔ افسانہ ہو کہ تنقید آغا سہیل مثبت انداز فکر اور عصری حقائق کے شعور کی بدولت جدید ادبی منظر نامے پر نمایاں نظر آتے ہیں۔

"دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء"، ان کی تحقیقی کد و کاوش کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ یہ ڈاکٹریٹ کے لیے لکھا گیا مقالہ ہے لیکن اس میں محض امتحانی ضرورت کی تکمیل کا سرسری انداز کہیں نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر آغا سہیل نے ایک باشعور محقق اور بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے موضوع کو قرار واقعی طور پر پیش کرنے کے لیے خوب اچھی طرح چھان پھٹک کی ہے۔ ایک سو اکہتر کتابوں، متعدد رسائل، اخبارات اور مخطوطات کا بغور مطالعہ کر کے اردو ادب کے داستانی ادب کا ارتقاء کے بارے میں لکھنؤ کے تعلق سے نہایت علمی انداز میں مستند حوالوں کے ساتھ اپنے موقف کی کامیاب وکالت کی ہے اور اس ضمن بعض نئے پہلو نمایاں کر کے داستانی ادب پر اس کتاب کی نوعیت کو اہم اور منفرد بنا دیا ہے۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی نے کتاب سادگی کے ساتھ بہت سلیقے سے خوب صورت ٹائپ میں پیش کی ہے (کاش اردو ٹائپ کی کتابیں قبول عام حاصل کر سکیں) ——— نکہت بریلوی

...دکا قصہ
...انوں کا مجموعہ)

مصنفہ : جیلانی بانو
صفحات : ۲۴۵ ● قیمت : ساٹھ روپے
ناشر : نفیس اکیڈمی - اردو بازار - کراچی

جیلانی بانو کے نام اور ان کے افسانوں سے ہم سب واقف ہیں۔ انھوں نے اس زمانے میں لکھنا شروع کیا جب سعادت حسن ...، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، زندہ تھے اور ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی - اپنی اوّلین کہانیوں ...ہی انھوں نے سب کو چونکا دیا۔ اور جدید افسانوی ادب میں اپنے لیے جگہ پیدا کرلی - ان کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ رات کو گمنام ...ہیں صبح کو جاگیں تو ہر جگہ ان کا چرچا تھا - انھوں نے اپنے اس خدا داد تخلیقی جوہر کو نہ کھویا اور آنے والے سالوں میں برابر ...نیاں لکھتی رہیں - ان کی کہانیاں اپنی فنی پختگی اور تیکھی حقیقت نگاری کی بدولت بھارت میں بھی اتنی ہی مقبول ہیں جتنی پاکستان ...جہاں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "روشنی کے مینار" شائع ہوا تھا - جیلانی بانو نے کامیاب ناول بھی لکھے ہیں - ان کی بیشتر ...نیوں کا ہندی اور بعض دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

زیر تبصرہ مجموعے میں سترہ افسانے ہیں - ان میں تنوّع اور رنگا رنگی ہے اور ان کے موضوعات کی وسعت متاثر کرتی ہے ...زمرّہ کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی تلخیوں اور مسرّتوں کے بارے میں ان کی نظر بہت گہری ہے اور کہانیاں ایسی ڈھلی ڈھلائی اور ...تی ترشائی ہیں جیسا کہ اتنی منجھی ہوئی فنکارہ سے ہم توقع رکھتے ہیں - مجموعے میں عنوانی کہانی غالباً سب سے اچھی اور کامیاب ...ہے - ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی - جیلانی بانو خط فصل یا انگریزی DASH (—) کی بڑی مشتاق ہیں (ایک زمانے میں یہ ...فصل یا ڈیش انشائے لطیف میں بے تحاشا استعمال ہوتے تھے) ان کی کئی کہانیوں میں بہت سے فقروں کے اختتام پر ایک ...یش (—) ہے - ان خطوطِ فصل سے رواں دواں بیانیہ میں رکاوٹ سی آجاتی ہے اور وہ قطعاً غیر ...روری ہیں - کتاب خوب صورت چھپی ہے۔

——— محمد خالد اختر

...وسم کا مسیحا
(افسانے)

مصنف : محمود واجد
صفحات : ۱۲۸ ● قیمت : چالیس روپے
ناشر : دبستان جدید ۹۱۵ یدنی پلازہ - چندریگر روڈ کراچی

محمود واجد کی ۱۲۸ صفحات پر مشتمل کتاب "موسم کا مسیحا" جس میں بائیس افسانے اور فکشن کے بارے میں کچھ معروضات" ...کے عنوان سے دس صفحوں کی ایک قابلِ مطالعہ تحریر ملتی ہے کئی لحاظ سے شایان ذکر ہے - کتاب کی ابتدا مارسل پروست کے ایک اقتباس سے ہوتی ہے جس میں اس نے لکھنے والے کے کام کو محض ایک نوع کا آلۂ مشاہدہ قرار دیتے ہوئے بھی اسے پڑھنے والوں کے ادراک میں اضافے کا باعث جانا ہے - اس بنیادی اقتباس اور پھر خود محمود واجد کی معروضات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف افسانے لکھنے اور افسانے کے بارے میں پڑھتے رہے ہیں، بلکہ انھوں نے ادب اور زندگی کے تعلق پر بھی غور کیا ہے اور ادبی تحریکات کے مطالعے کا سلسلہ بھی قائم رکھا ہے - محمود واجد ترقی پسند ادیبوں کی محفل میں بھی شریک ہوئے ہیں جو اسلام اور پاکستان کے حوالوں کی مقابلت اور منافقت دونوں کے دائرے میں گھومے ہیں، اور اب وہ حلقۂ جدیدیت کے حلقہ بگوش نہیں، تو اس سے وابستہ ضرور ہیں، لیکن ان کی اصل وابستگی اپنے فن سے ہے - پھر خود جدیدیت نہ نامۂ ندامت ہے اور نہ سندِ امتیاز - یہ حقیقت کو محسوس کرنے کی متعدد صورتوں میں سے ایک صورت ہے، لیکن ان محسوسات کے پیش کرنے

ہوا اپنے گرد وپیش کی زندگی کی پرکھ اور اس پرکھ کے واسطے سے انسانوں کے لیے زیادہ بہتر زندگی کی آرزو مندی ہی سے فنی اوصاف کے ساتھ، ادبی تخلیق کے درجے کا تعین ہوتا ہے۔ محمود واجد کے ان بائیس افسانوں میں جو (ترتیب کے اعتبار سے) از ۱۹۵۶ء تا ۱۹۸۶ء کے طویل عرصے پر محیط ہیں، کئی ادبی رجحانات کی بازگشت ملتی ہے، لیکن ان کے بیشتر افسانوں کا مطالعہ اور خود اس مجموعے کا نام اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ وہ فن کی مسیحائی کے قائل ہوتے ہوئے ادب کی مقصدیت کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اس طرح وہ اس گروہِ جدید سے الگ ہو جاتے ہیں جو لایعنیت کو اپنا نصب العین جانتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ کلفتِ حال سے نجات کی کوئی راہ ممکن نہیں۔ اگرچہ محمود واجد خود اس نتیجے پر بھی پہنچتے ہیں کہ "مسیحا کوئی نہیں تھا"۔ لیکن یہ درونِ ذات اور بیرونِ ذات مصالحت کی ایک کوشش ہونے کے علاوہ شعور پیش روی کے فقدان کی صورت حال کا ماتم ہے، ورنہ وہ جانتے ہیں کہ نامساعد حالات خود بخود نہیں بدلتے، بدلے جاتے ہیں۔

محمود واجد کے ان افسانوں میں معاشرت، سیاست اور محبت کے رنگوں کی پرچھائیاں پڑتی ہیں ان میں ہجرت اور اس سے متعلقہ مسائل کے کرب کو بھی پیش کیا گیا ہے اور انسانوں کے لیے بے رحم حالات کی پیدا کردہ سفاکی کا جائزہ بھی ملتا ہے۔ ان کی کوشش یہی رہی ہے کہ پارہ پارہ ہونے کے اضطراب کی جھلکیاں پیش کرتے ہوئے بھی دائرۂ نظر وسیع رکھا جائے۔ ہیئت کے اعتبار سے جہاں بعض افسانوں میں جدیدیت کے زیر اثر تمثیل، تجرید، علامت اور تاثریت سے کام لیا گیا ہے وہاں متعدد افسانے بیانیہ طرزِ نگارش کے حامل بھی ہیں اور عدم افسانویت و عدم کرداریت کے ہجوم مزخرفات گوئی میں، خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کے اکثر افسانوں کی بُنت میں کہانی اور کردار دونوں کے نقوش مل جاتے ہیں۔ وہ افسانے بھی جو کہانی اور کردار کی روایت سے الگ ہو کر لکھے گئے ہیں، اپنے اندر ماجرائے حقیقت کے کسی نہ کسی گوشے کو کسی نہ کسی زاویے سے بامعنی طور پر پیش کرنے کا وصف رکھتے ہیں۔

محمود واجد کے یہ افسانے حالات کے خلاف ایک حساس ردِّعمل کا اظہار ہیں، لیکن صنعتی دور کی پیدا کردہ برائیوں نے جہاں ہجومِ تنہائی، ہیجان، ہوسِ زر اور تشدد کے رویوں کو فروغ دیا ہے، وہاں اجتماعی مزاحمت کی راہیں بھی ہموار کی ہیں۔ محمود واجد کے ان افسانوں میں اپنے دور کا جو بامعنی اظہار ملتا ہے، امید ہے کہ وہ اس اجتماعی معنویت کی سمت قدم بڑھائے گا جس سے انسانی جدوجہد کی راہیں روشن ہوتی ہیں۔ انسان کی فعالیت ہی مجہولیت کی تاریکی کو دور کرتی ہے۔ موجودہ دور کے درد کے رشتوں پہ اگرچہ بہت سے دروازے بند ہیں لیکن محمود واجد نے "موسم کے مسیحا" میں کئی کھڑکیاں کھلی رکھی ہیں اور غیر تخلیقی کاوشوں کی موجودہ دوڑ میں محمود واجد کا تخلیقی اظہار سے یہ لگاؤ ایک مستحسن قدم ہے۔ کتاب اچھے گیٹ اپ سے چھپی ہے۔

———— ڈاکٹر حنیف فوق

<u>دیوارِ آب</u>
(غزلیں)

مصنف : اظہار الحق اظہار
صفحات : ۱۹۰ • قیمت : ساٹھ روپے
ناشر: شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ لاہور۔ حیدرآباد۔ کراچی

مرزا حامد بیگ نے اس آدم جی انعام یافتہ شاعری کی کتاب کے ابتدائیے میں مصنف کے مزاج کو اسلامی عجمی مزاج یا عربی عجمی مزاج بتایا ہے اور لکھا ہے کہ محمد اظہار الحق ارضی تہذیب کا دلدادہ نہیں (جو کچھ بھی اس کا مطلب ہو) ابتدائیہ نگار نے مصنف، کی شاعری پر اپنے تفصیلی عمدہ تجزیاتی جائزے میں اس کی خوبیوں اور امیجری (IMAGERY) کی ندرت پر بحث کی ہے اسی طرح خلیب نگار

سراج منیر نے اپنے فاضلانہ ٹھاٹ دار لہجے میں اظہار کی شاعری کے مزاج اور طرز ادراک کی تہ تک پہنچنے کی سعی کی ہے۔ مجھے تو ابتدائیے کا اظہار اور رفلیپ کا اظہار دو مختلف شاعر اور انسان لگے اور میں مخصوص تنقیدی لغت کی دھند میں کھو کر رہ گیا۔ مگر کیا شاعری کی ایسی گہری تجزیاتی چھان پھٹک ضروری ہے۔ شاعری یا اچھی ہوتی ہے یا بری۔ میرے نوجوانی کے ایام کے ایک چہیتے ناول نگار۔ جے۔ بی۔ پریسٹلے نے (جس نے ساری عمر شعر نہیں کہا) ایک دفعہ کہا تھا کہ اچھی شاعری میں ایک جادو کا عنصر ہوتا ہے جو اسے زندہ رکھتا ہے۔ اس جادو کے بغیر شاعری شاعری نہیں رہتی بلکہ محض حسین الفاظ کی شیرازہ بندی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اظہار کی بعض غزلوں میں وہ جادو کا عنصر ہے اور وہ بلاشبہ ایک اچھے شاعر ہیں۔

زیر نظر کتاب میں چوہتر غزلیں ہیں اور آخر میں مختلف موقعوں پر کہے گئے اشعار۔ اظہار نئے اور جدید شاعروں کے گروہ میں ہونے کے باوجود کلاسیکل غزل کی روایت سے نہیں ہٹے اور ان کی غزل میں وزن کے ساتھ قافیہ اور ردیف کی قیود موجود ہیں۔ ان کی شاعری جدید تر اپنی امیجری کے اچھوتے پن اور اپنے استعاروں اور علامتوں کے نئے پن کی وجہ سے ہے۔ ان کی شعری لفظیات میں زیتون کے باغ، محرابی دریچے، الحمرا، سندرین، آتشیں گلاب، سرخ طائر، قرطبہ، چلتا پانی وغیرہ مناسب مقامات پر جڑے ہوئے ان کی غزلوں کو فروزاں کر دیتے ہیں ان کی بیشتر غزلوں میں اشعار کی تعداد چار پانچ سے زیادہ نہیں اور ان میں بھرتی کا شعر مشکل سے ملے گا۔

کتاب چکنے سفید کاغذ پر خوبصورت چھپی ہے اور ڈسٹ جیکٹ پر سسلی کا منظر، شاعر کی اگزاٹک مناظر سے شیفتگی کا مظہر ہے۔

———— محمد خالد اختر

چاند کے چار رنگ
(انتخاب)

مصنف: سنی گیو مترجم: محمد رئیس علوی
صفحات: ۱۱۱ • قیمت: چالیس روپے
ناشر: مجلس مطبوعات و تحقیقات اردو جامعہ نگر۔ جامعہ کراچی

جاپانی شاعری سے ہم ہائیکو کی صنف کے ذریعے متعارف ہو چکے ہیں۔ جاپان کی شاعری کی دو اور اصناف 'واکا' اور 'تنکا' بھی ہیں جنہیں محمد رئیس علوی نے جاپانی ادب کے ماضی کو کھنگالتے ہوئے اس خطے کے قدیم شاعر سنی گیو کے نغموں میں دریافت کیا ہے۔ تنکا میں پانچ مصرعے ہوتے ہیں اور اکتیس ارکان یا صوتی آہنگ اس ترتیب سے پہلے مصرعے میں پانچ، دوسرے میں سات، تیسرے میں پھر پانچ، چوتھے میں پھر پانچ، پانچویں میں بھی سات، مثلاً ذیل میں علوی صاحب کا کیا ہوا ایک 'تنکا' کا ترجمہ درج ہے سو پھول چہرے کے ہنستے ہوئے

دیکھ کر
بے وجہ
دل پہ
افسردگی چھا گئی

کسی دوسری زبان کی شاعری کو اپنی زبان کا قالب پہنانا اس طرح کہ اصل کا جادو نہ مٹنے ناممکن نہیں تو بہت ہی مشکل کام ہے (میرے ذہن میں ایڈورڈ فٹز جیرلڈ ADWARD FITSGERAD کا نام آتا ہے جو اس پل صراط سے پوری خوبی سے گزر گیا مگر اس کا رباعیات کا ترجمہ کافی حد تک آزادانہ ہے) محمد رئیس علوی نے جو ایک مدت تک جاپان میں رہ چکے ہیں اور وہاں کے ادب کے مزاج سے واقف، اپنے اس خوبصورت ترجمے سے اردو شاعری کو ایک نئی صنف سے متعارف کیا ہے۔ ہائیکو کی طرح یہ نئی صنف جس کے موضوعات زیادہ تر موسم اور قدرت کی رنگا رنگی اور انسانی زندگی کے دکھوں سے عبارت ہیں بڑی دل فریب ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ یہاں رواج نہ پائے۔

یہ ایک خوبصورت کتاب ہے صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے۔

———— محمد خالد اختر

یارانِ محفل

محفل

کچھ افکار اور ندرزوبی کے بارے میں

محمد خالد اختر

(کراچی)

ماہنامہ "افکار" کے مدیر صہبا لکھنوی ایک حیرتناک شخصیت ہیں اور اپنی ذات میں ایک ادارہ، وہ اب ستّر سال کے پیٹے میں ہیں، مگر ان کے جوش اور ولولے میں کوئی کمی نہیں آئی؛ بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ نحیف و نزار جسم میں بجلی کی قوت بھری ہے ایک روحانی قوت جو انھیں نچلا نہیں بیٹھنے دیتی۔ انھیں ادبی مہمیں سر کرنے کا شوق ہے اور جب ایک سودا ان کے دماغ میں سما جاتا ہے وہ اسے عملی جامہ پہنائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سب جانتے ہیں کہ اردو میں خالصتاً ادبی پرچہ نکالنا پڑے بکھیڑے کا کام ہے۔ تقسیم ملک کے بعد بہت سے ادبی ماہنامے جاری ہوئے لیکن ادبی بے حسی کے ماحول میں پنپ نہ سکے اور ایک ایک کرکے اپنی موت آپ مر گئے۔ صہبا نے بھوپال سے ہجرت کے بعد ۱۹۵۱ء میں کراچی سے اپنے ماہنامہ افکار کا اجرا کیا (پہلے وہ اسے بھوپال سے نکالتے تھے)، حالات کے ناساعد ہونے کے باوجود انھوں نے ہمّت نہ ہاری اور ان کے قدم نہیں لڑکھڑائے انھوں نے خون پسینہ ایک کیا، اپنا پتّا مارا، اور آخر یہ پرچہ چل نکلا۔ اس کی ساکھ قائم ہوگئی۔ "افکار" کو کراچی سے چھپتے کم و بیش اڑتیس برس ہونے کو آگئے ہیں اور اس عرصے میں کبھی اس کی وقت پر اشاعت میں ناغہ نہیں ہوا۔ (اس ملک میں یہ امتیاز صرف افکار کو ہی حاصل ہے) اس دور میں ایک خالصتاً ادبی پرچے کا اتنے عرصے تک باقاعدگی سے چھپتے رہنا ایک ایسا معجزہ ہے جس کا یقین نہیں آتا۔ صہبا چونکہ خود ایک شاعر اور ادیب ہیں اس لیے شاید ہی کوئی غیر معیاری چیز افکار میں کبھی جگہ پا سکی۔ ملک کے اچھے اچھے ادیبوں اور شاعروں کا تعاون انھوں نے حاصل کیا اور وہ افکار کے لیے لکھ کر فخر محسوس کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے کئی ہونہار نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کو دنیائے ادب میں روشناس کرایا۔ اس سارے عرصے میں افکار نے کتنے ہی اہم لکھنے والوں پر ضخیم اور جامع خاص نمبر شائع کیے مثلاً فیض احمد فیض نمبر، جوش نمبر، احمد ندیم قاسمی نمبر، اختر حسین رائے پوری نمبر وغیرہ۔ ان خصوصی نمبروں کو ہمارے ادب میں تاریخی حیثیت حاصل ہو چکی ہے

درجب کوئی مستقبل کا ادیب اس عہد کی ادبی تاریخ مرتّب کرنے بیٹھے گا اسے ان شماروں کو کھنگالنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوگا۔

لیکن اتنے عالی شان اور بظاہر ناممکن ادبی معرکے سر کرنے کے بعد بھی صہبا صاحب نہیں تھکے۔ اب انھوں نے ملک کے مشہور مصوّر آذر زوبی پر ایک نہایت ہی بھرپور اور خوب صورت نمبر شائع کرکے اپنے سات آٹھ سال کے پرانے خواب کو حقیقت کا روپ دے دیا ہے یہ اتنا عمدہ اور عالی شان کام ہے کہ اس کی جتنی بھی تحسین و ستائش کی جائے کم ہوگی۔ صہبا صاحب کے ذہن میں اس نمبر کا خاکہ کئی سالوں سے تھا اور وہ اٹھتے بیٹھتے اس کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ پریشان بھی ہو جاتے کہ کیوں کر یہ بیل منڈھے چڑھے گی، مگر وہ ایسے شخص نہیں" نذر زوبی" نمبر یقیناً پہلا خصوصی نمبر ہے جو کسی خالصتاً ادبی رسالے نے کسی ادبی شخصیت پر نہیں بلکہ ایک معروف پاکستانی آرٹسٹ کے فن اور شخصیت کے بارے میں شائع کیا ہے۔

آذر زوبی (بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان کا خاندانی نام عنایت اللہ ہے) ہمارے ملک کے نامی گرامی مصوّر، نقاش، تزئین کار، خطاط، کتاب آرا اور مجسمہ ساز ہیں۔ مجسمہ سازی کے ضمن میں غالباً یہاں ان کے مد مقابل کم ہی لوگ ہوں گے۔ قرۃ العین حیدر کے نزدیک وہ بنیادی طور پر مجسمہ ساز اور تمثال گر ہیں اور ممتاز حسین کی نظر میں پاکستان بھر میں ڈرائنگ میں ان کا ہمسر دوسرا کوئی نہیں مگر ان کے آرٹ کی کئی جہتیں ہیں بے شمار کتابوں کی تزئین و آرائش انھوں نے کی ہے دل کش میورال انھوں نے بنائے ہیں۔ ایک مصوّر کی حیثیت سے استاد اللہ بخش، عبدالرحمٰن چغتائی اور صادقین کے بعد ان کا نام سب سے نمایاں نام ہے۔ کراچی میں رہتے بستے انھیں تقریباً چالیس سال ہو چکے ہیں اور اپنی اکادمی آف اپلائڈ آرٹس میں مصوّری اور آرٹ کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ فیض اس اکادمی میں جا کر بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے لکھا۔ یہ درس گاہ فن آج کے دشت ثقافت میں شاداب گلستان کی مانند ہے جہاں ہر سال حسن و خوبی کے طالب و طالبات شائستہ نگاہ اور مستفید فن ہوکر نکلتے ہیں۔

آذر زوبی جنھوں نے کئی ممتاز اردو ادیبوں کو جیتے جاگتے پلاسٹر کے قالب میں ڈھالا اور اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ کی لکیر اور رنگ سے بے مثال عکاسی کی ہے۔ فی الواقع اس کے مستحق تھے کہ ایک اردو کا ادبی پرچہ ان کے فن اور شخصیت پر ایک خوب صورت نمبر انھیں پیش کرتا۔ ویسے بھی جملہ فنون میں لکھنے کا فن مصوّری سے سب سے زیادہ قریب ہے لکھنے میں الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور مصوّری میں رنگ اور لکیر سے جادو جگایا جاتا ہے۔

اب آئیے آذر زوبی کے اس نمبر کی طرف سرورق آذر زوبی کا بنایا ہوا سلف پورٹریٹ ہے۔ زندہ جیتا جاگتا گٹھا ہوا جسم میانہ قد چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی سے سجا، متین چہرہ چشمے کے پیچھے شوخی سے چمکتی آنکھیں وہ بنیان پہنے ہیں، اور اپنے اسٹوڈیو میں اپنے موقلم سے ایک ایبسٹریکٹ ماڈل میں رنگ بھر رہے ہیں۔ زوبی پورٹریٹ بنانے کے استاد ہیں۔ اور یہ ایک بڑا زندہ اور فاش کرنے والا پورٹریٹ ہے۔ سرورق الٹیں تو ان کے مداحوں اور پرستاروں شان الحق حقی اور محشر بدایونی کی منظومات کے بعد ایک مضمون میں زوبی سے ایک گفتگو میں اکرام بریلوی، سحر انصاری، اور صہبا لکھنوی نے کھل کر ان کی ذات اور ان کے فن کے بارے میں باتیں کی ہیں۔ یہ مضمون بہت اہم اور دلچسپ ہے اور ہم زوبی کے بچپن کی بے پروائیوں، عنفوان شباب کی مستانگیوں، فن کے حصول کی خاطر ان کی دور آزمائیوں، ان کی آوارگیوں اور سیاحیوں اور ان

خوابوں کے متعلق وہ سب کچھ جان لیتے ہیں جو ہم جاننا چاہتے ہیں۔ آگے عمدہ رنگا رنگ مضامین کی ایک ضیافت ہے۔ لکھنے والے اطالوی السنیدور برسانی، سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، جی الانہ، اشفاق احمد، ممتاز مفتی، محمد علی صدیقی، مرزا ادیب، اکرام بریلوی، مظفر علی سید، سحر انصاری اور بہت سے دوسرے لوگ ہیں۔ جنھوں نے زوبی پر محبت اور PERCEPTION ادراک سے لکھا ہے۔ مجھے ایک بھی غیر دلچسپ یا بے رنگ مضمون نظر نہیں آیا۔ بالخصوص ممتاز مفتی نے اپنے خاص چونچال سیمابی اسلوب میں زوبی کا جو پورٹریٹ کھینچا ہے خوب مزے کا ہے۔ اسے الفاظ میں مصوری کہوں گا۔ مظفر علی سید کا مضمون آزر کی تمثال گری بھی اپنی تازگی فکر اور عبارت کی شگفتگی کی بدولت مجھے بہت پسند آیا۔ ہر مضمون زوبی کے اسکیچز سے مزین ہے (وہ بہت اچھے کتاب آرا ہیں)

اب تصویروں کی طرف آئیے جن کی ایک نمائش تذرِ زوبی نمبر میں سجی ہے آرٹ پیپر پر زوبی کی دو درجن سے زائد نمائندہ رنگین اور بلیک اینڈ وہائٹ تصاویر دل کو بھاتی ہیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے اپنے لڑکپن کے زمانے کے اردو رسائل یاد آگئے جو اپنے قراواں مواد کے خاص نمبروں میں استاد اللہ بخش اور دوسرے مصوروں کی بنی ہوئی رنگین تصاویر چھاپا کرتے تھے۔ میں نذرِ زوبی نمبر کو ایک عالی شان ادبی کارنامہ کہوں گا۔ آرٹ اور ادب کے شیدائیوں کے لیے ایک انمول خزانہ صہبا لکھنوی بڑے خوش نصیب ہیں کہ وہ اپنے پیچھے اپنی مستحکم اور زندہ یادگاریں چھوڑ جائیں گے۔ اللہ ان کی عمر اور قوت میں برکت دے۔

چلتے چلتے یہ بتاتا چلوں کہ ایک نادر پاکستانی مصور پر اس نمبر کی قیمت گولڈ لیف سگریٹ کے پانچ پیکٹوں یا جیکولین سوزی کے ڈیڑھ ناول کے برابر ہے جو صحت اور اخلاق وغیرہ کو بگاڑنے والی چیزیں ہیں۔ جب کہ یہ نمبر آپ کو ہر لحاظ سے فائدہ دے گا۔ اور اگر آپ فن کاروں آرٹ اور لٹریچر سے الرجک ہیں اور ان سب پر خاک ڈالتے ہیں تو اس فقرے کو بس چھوڑ دیں۔

(بشکریہ "نوائے وقت"، کراچی)

متین فکری

(راولپنڈی)

ماہنامہ افکار کراچی ملک کے ان موقر ادبی جرائد میں سرِ فہرست ہے جو اپنی اشاعت کو مقررہ تاریخ سے ایک دن بھی موخر نہیں ہونے دیتے افکار نے پابندیٔ وقت کے اس غیر معمولی ریکارڈ کے ساتھ ساتھ بہت سے یادگار ادبی معرکے بھی سر کیے ہیں جن میں جوش، حفیظ، فیض اور ندیم نمبر بھی شامل ہیں) یہ وہ نمبر ہیں جو ان مشاہیر کی زندگی میں شائع کیے گئے اور برصغیر کے قدیم ترین ادبی جریدے نیرنگِ خیال کی اس روایت کو قائم رکھا گیا جو اس نے علامہ اقبال کی زندگی ہی میں ان کے بارے میں نمبر شائع کرکے قائم کی تھی۔ جوش فیض اور حفیظ جالندھری اگرچہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں لیکن جناب احمد ندیم قاسمی بفضل تعالیٰ بقیدِ حیات ہیں ادب کا جو بھی طالب علم ان مشاہیرِ ادب پر تحقیقی کام کرنا چاہے گا وہ افکار کے ان خصوصی نمبروں کو نظر انداز نہ کر سکے گا۔

افکار نے اپنی تازہ ترین اشاعت میں ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا ہے جو اگرچہ شاعر اور ادیب نہیں لیکن اسے فنونِ لطیفہ کے انتہائی اہم شعبے یعنی مصوری، سنگ تراشی اور خطاطی میں بین الاقوامی شہرت اور مقام حاصل ہے، ہماری مراد آزر زوبی سے ہے جنھوں نے رنگوں اور خطوط کے ذریعے شاعری کی ہے اور پتھروں کو تراش کر انھیں بولنا سکھایا ہے" نذرِ زوبی"

افکار کی وہ اشاعت خاص ہے۔ جس میں عہد حاضر کے اس عظیم فن کار کو اس کی زندگی ہی میں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ آزر زوبی کے فن اور ان کی تخلیقی عظمتوں پر لکھنے والوں میں سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، پروفیسر مجتبیٰ حسین، میرزا ادیب اشفاق احمد، بانو قدسیہ، ڈاکٹر منیر الدین احمد، ڈاکٹر احسان رشید، ڈاکٹر انور سدید، جوگندر پال اور بہت سے معتبر ادیبوں کے نام شامل ہیں۔ جناب آزر زوبی نے نصف صدی قبل اپنے فنی سفر کا آغاز کیا تھا۔ ممتاز دانشور اور نقاد جناب محمد علی صدیقی مہمان مدیر کی حیثیت سے افکار کے اداری کالم میں لکھتے ہیں۔

"زوبی ہماری قومی ثقافت کا اہم عکاس ہے اس کی تصویروں میں ہمارے ملک کے سب سے بڑے صوبے کے کسان بھنگڑا ڈالتے اور دھمال کرتے نظر آتے ہیں لیکن وہ ان دنوں ملک کے دیگر علاقوں کے رومان پرور کرداروں اور ماحول سے ایک ہمہ گیر ثقافتی موزائیک ترتیب دے رہا ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ خالصتاً سیاسی اور معاشی تصورات کو عناصر مصوری کے طور پر پیش کر رہا ہے۔"

آزر زوبی ہمہ جہت فن کار ہیں وہ مصور بھی ہیں مجسمہ ساز بھی، اور اپنی طرز کے منفرد خطاط بھی۔ ان کی تخلیقی صلاحیتیں فن کے تمام شعبوں میں اپنا لوہا منوا رہی ہیں ان کی مصوری میں مجسمہ سازی کی جھلک بھی موجود ہے اور خطاطی میں مصوری اپنا رنگ دکھا رہی ہے جب کہ مجسمہ سازی میں مصوری اور خطاطی کی جھلکیاں بیک وقت موجود ہیں افکار نے ان کے فن کی ان تینوں جہتوں کے رنگین اور بلیک اینڈ وائٹ نمونے شامل اشاعت کئے ہیں جن سے زوبی کے تخلیقی جوہر کو پہچاننے میں مدد ملتی ہے۔ اس اشاعت میں خصوصی مضامین کے علاوہ زوبی سے ایک پینل انٹرویو بھی شامل ہے جو اکرام بریلوی، سحر انصاری، اور صہبا لکھنوی نے کیا ہے جس سے زوبی کی شخصیت کے بہت سے خفیہ گوشے اور ان کے فنی سفر کے مختلف پڑاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ افکار کی یہ اشاعت خاص فنون لطیفہ سے شغف رکھنے والوں کے لیے ایک نعمت گراں مایہ ثابت ہوگی۔

(بہ شکریہ روزنامہ "جنگ"، راولپنڈی)

محمد احمد سبزواری

(کراچی)

پاکستان کے مایۂ ناز مصوروں میں آزر زوبی بھی شامل ہیں لیکن آزر زوبی کو دوسرے مصوروں پر جو فوقیت حاصل ہے وہ ان کی دیگر فن کارانہ صلاحیتیں ہیں جن میں مجسمہ سازی اور مخصوص خطاطی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ زوبی ایک اچھے مصور ہیں یا خطاط یا مجسمہ ساز۔ ان میں کئی اور اوصاف بھی ہیں۔ مثلاً ایک معیاری ادبی رسالے "شعور" کے مدیر رہے ہیں بطور استاد اور ڈانسر انھوں نے اٹلی میں خاصا نام پیدا کیا اور پاکستان آنے کے بعد عرصے سے وہ آرٹ اسکول۔ اسکول آف ڈیکر کے پرنسپل کی حیثیت سے مصوری کے شوقین طلبہ و طالبات کو آرٹ کی تعلیم دے رہے ہیں۔ وہ ایک مخلص انسان اور ایک محقق فن کار کی حیثیت سے علمی، ادبی اور فنی حلقوں میں عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

ماہنامہ افکار کراچی نے زوبی کے فنی کمالات کے اعتراف میں "نذر زوبی" شائع کیا ہے جو تمام تر زوبی کے موقلم کا رہین منت ہے "نذر زوبی" میں زوبی کی آٹھ تصاویر کی رنگوں میں اور آٹھ مجسمے اور آٹھ بلیک اینڈ وائٹ ڈرائنگ کے شاہکار نمونے شامل ہیں اور دو درجن سے زائد مضامین بھی زوبی کے خوب صورت خاکوں سے مزین ہیں۔ مجسموں میں محترمہ فاطمہ جناح، فیض، ڈاکٹر سلیم الزماں

صدیقی، منٹو، ممتاز مفتی اور رئیس امروہوی وغیرہ کے دلکش اور اصل سے قریب تر مجسّمے قابلِ دید ہیں۔ تمام رنگین اور بلیک اینڈ وائٹ تصاویر شائع کی گئی ہیں۔ افکار کی زندہ دوستی اور اعترافِ عظمت کی روایت جوش، فیض، حفیظ، ندیم اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے بعد آذر زوبی کے خاص نمبر "نذرِ زوبی" تک پہنچ گئی ہے جو قابلِ تحسین ہے۔ تمام مضامین میں زوبی کے فکروفن کا بھرپور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

(بہ شکریہ روزنامہ "جنگ"، کراچی)

ڈاکٹر جمیل جالبی

(اسلام آباد)

آذر زوبی نمبر آپ نے خوب شائع کیا۔ اتنی رنگین تصاویر کے ساتھ شاید آج تک کوئی خاص نمبر شائع نہیں ہوا۔ میری طرف سے دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔

مشتاق شاد

(ریاض)

آذر زوبی کے لیے خصوصی نمبر کی اشاعت زندہ دوستی کی ایک نئی اور زندہ مثال ہے۔ ادب میں ایسے "مجرمانہ اقدامات" صرف افکار کے ہی حصے میں رہے ہیں۔ ورنہ یار لوگ تو ہمیشہ زندان کی صف میں ہیں نہ پسِ مردن کی۔ اس اشاعت سے آپ نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ادب اور مصوّری یک جان اور یک قالب ہیں۔ ادیب، شاعر اور مصوّر میں "تخلیق" ایک قدرِ مشترک ہے اور اس اشتراک کی نشاندہی جراُت مندانہ اور باغیانہ اقدام ہے جس کے لیے ماہنامہ "افکار" تحسین کی سزا کا مستحق ہے۔

آذر زوبی پر کچھ کہنے کے لیے اتنے بہت سے اور بڑے بڑے نام، ایک چھوٹی سی فہرست میں یکجا کرنا آپ ہی کا کام ہے۔ آذر زوبی جیسے ہمہ جہت مصوّر اور مجسمہ ساز پر تمام اہلِ قلم احباب کے مضامین اور رقعے خوب صورت اور معلومات افزا ہیں۔ خصوصاً ڈاکٹر انور سدید نے "آذر زوبی کی بازیافت" پر خاص محنت کی ہے، جی چاہتا ہے کہ انھیں ڈائرکٹریٹ کی ایک اور ڈگری دلوانے کا بندوبست کردوں۔

اس خصوصی اشاعت میں سے اب تک جو کچھ بھی پڑھا ہے اس سے آذر زوبی کے کئی ایک پہلو کھل کر سامنے آئے ہیں۔ لیکن اپنے بارے میں خود ان کا انٹرویو خاصی حد تک تشنہ ہے۔ وہ اپنی کتابِ حیات کے کتنے ہی ابواب اور اوراق سادہ کی طرح چھوڑ گئے ہیں۔ بہرحال مجموعی طور پر افکار اور آذر زوبی دونوں مبارک باد سے کچھ زیادہ کے مستحق ہیں۔

منیر احمد

(لندن)

اگست ۱۹۸۹ء میں "نذرِ زوبی" کے نام سے بہت ہی پیارا نمبر پیش کرنے کے بعد بلا سانس لیے ستمبر میں معمول کا پرچہ شائع کرنا آپ ہی کی ہمت ہے۔ ورنہ بالعموم کسی خصوصی اشاعت کے بعد بڑے بڑوں کی سانس پھول جاتی ہے اور اگلا پرچہ کئی ماہ کی تاخیر سے آتا ہے۔

ادب جدید کا ماہنامہ جو کبھی نہ رُکا

افکار
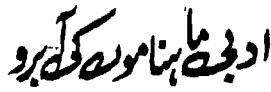
گزشتہ 45 سال سے ہر ماہ شائع ہو رہا ہے۔

ادبی سفر کا مختصر جائزہ :۔

پہلا دور:۔ ۱۹۴۵ء ــ ۱۹۵۰ء ــ بھوپال

۳ خاص اشاعتیں • لکھنؤ اردو کانفرنس نمبر • بھوپال اردو کانفرنس نمبر • بھیلسہ ادبی کانفرنس نمبر

دوسرا دور:۔ ۱۹۵۱ء ــ ۱۹۸۷ء ــ کراچی

اردو ماہناموں کی تاریخ میں پہلی بار افکار نے حسب ذیل مشاہیر و اکابرین ان کی زندگی میں خاص نمبر شائع کیے :۔

• جوش نمبر (پہلا ایڈیشن ۱۹۶۱ء) • جوش نمبر (دوسرا ایڈیشن بہ اضافہ ۱۹۶۲ء) • حفیظ نمبر (۱۹۶۳ء) • فیض نمبر (۱۹۶۵ء) • ندیم نمبر (۱۹۷۵ء) • نذر اختر حسین رائے پوری (۱۹۸۶ء) • ارمغان مجنوں (پہلی جلد ۱۹۸۰ء) • ارمغان مجنوں (دوسری جلد ۱۹۸۴ء) مرتبہ: صہبا لکھنوی، شبنم رومانی نذر زیدی ۱۹۸۹ء جوش نمبر ۱۹۶۲ء میں کراچی یونیورسٹی کے بی اے آنرز اور ایم اے اردو کے نصاب میں شامل ہوا اور دیگر خاص اشاعتیں ساری دنیا میں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے حوالے کا کام دیتی ہیں۔

شخصیت و فن پر کلاسیکی اور جدید ادب کے معماروں پر افکار کی یادگار اشاعتیں :۔

• امیر خسرو ایڈیشن • رومی ایڈیشن • غالب نمبر (دو ایڈیشن) • اقبال نمبر (دو ایڈیشن) • منٹو نمبر • مجاز نمبر (دو ایڈیشن) • کرشن چندر ایڈیشن • مصطفیٰ زیدی ایڈیشن (دو ایڈیشن) • سجاد ظہیر ایڈیشن • حفیظ ہوشیارپوری ایڈیشن • حمید احمد خان ایڈیشن • بیاد جوش • بیاد فیض

عصری ادب و تحقیق پر چند لازوال دستاویزی اشاعتیں :۔

• دائرہ کولنٹن نمبر • جوبلی نمبر • نئی تخلیق نمبر • برطانیہ میں اردو ایڈیشن اور بے شمار سالنامے، خاص نمبر اور افسانہ نمبر

اور اب ......

اردو ماہناموں کی تاریخ میں پہلی بار افکار جنوری ۱۹۸۷ء سے افکار فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے۔ یہ فاؤنڈیشن بطور فلاحی ٹرسٹ رجسٹرڈ ہو چکا ہے اور اس کے بانی چیئرمین صہبا لکھنوی، سرپرست اعلیٰ حکیم محمد سعید اور اٹھارہ معتمد صاحبان علم و فن کی نگرانی میں سرگرم عمل ہے۔ پروگرام کی تکمیل کے لیے اب صرف ۴ لاکھ روپے درکار ہیں جو حسب توقع انشاء اللہ ملک اور بیرون ملک کے رفیقان افکار اور زبان و ادب کے پرستاروں کے مخلصانہ تعاون سے جلد فراہم کر لیے جائیں گے۔

افکار فاؤنڈیشن کی کامیابی ادب میں ایک نئی روایت کا پیش خیمہ ثابت ہوگی

شعبۂ نشر و اشاعت افکار فاؤنڈیشن نے جاری کیا

افکار کی خاص اشاعتیں

ایک نظر میں

پہلا دور

۱۹۴۵ء : افکار کا اجراء بھوپال سے
۱۹۴۸ء : لکھنؤ اردو کانفرنس نمبر (پہلی یادگار اشاعت)
۱۹۴۹ء : بھوپال اردو کانفرنس نمبر
۱۹۴۹ء : بھیمڑی ادبی کانفرنس نمبر

دوسرا دور
(پاکستان میں)

۱۹۵۱ء : پہلا خاص نمبر کراچی سے
۱۹۵۲ء : خاص نمبر
۱۹۵۳ء : افسانہ نمبر
۱۹۵۴ء : سالنامہ
۱۹۵۵ء : دس سالہ نمبر
۱۹۵۵ء : منٹو نمبر
۱۹۵۶ء : مجاز نمبر (دو ایڈیشن)
۱۹۵۸ء : سالگرہ نمبر
۱۹۵۸ء : آزادی نمبر
۱۹۵۹ء : رائٹرز کنونشن نمبر
۱۹۵۹ء : افسانہ نمبر
۱۹۵۹ء : انقلاب نمبر
۱۹۶۰ء : سالنامہ
۱۹۶۰ء : کہانی نمبر

۳ ر اگست ۱۹۶۰ء کو بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی صدارت میں افکار کی سولہویں سالگرہ منائی گئی۔

۱۹۶۱ء : جوش نمبر (پہلا ایڈیشن)
۱۹۶۱ء : انقلاب نمبر

۵ ر نومبر ۱۹۶۱ء کو جشن جوش منایا گیا، اور افکار نے ۱۵۰۰ ادیبوں کے اس یادگار اجتماع میں افکار کا "جوش نمبر" پیش کیا

۱۹۶۲ء : جوش نمبر (دوسرا ایڈیشن باضافہ)

چھپتے چھپتے یہ اطلاع ملی کہ کراچی یونیورسٹی نے افکار کے جوش نمبر کو بی اے (آنرز) اور ایم اے اردو کے نصاب میں شامل کر لیا ہے

۱۹۶۲ء : آزادی نمبر
۱۹۶۳ء : افسانہ نمبر
۱۹۶۳ء : حفیظ نمبر

۲۷ ر ستمبر ۱۹۶۳ء کو زیر اہتمام پاکستان رائٹرز گلڈ جشن حفیظ منایا گیا اور کراچی کے نمائندہ ادیبوں کے اجتماع میں افکار نے "حفیظ نمبر" پیش کیا

۱۹۶۴ء : افسانہ نمبر
۱۹۶۴ء : نئی تخلیق نمبر

۱۳ ر مئی ۱۹۶۴ء کو جناب الطاف گوہر کی صدارت میں افکار کی بیسویں سالگرہ منائی گئی

ندر زیدی ۱۹۸۹ء

۱۹۶۵ء : فیض نمبر
۱۹۶۵ء : جنگ اور ادب نمبر
۱۹۶۶ء : غالب نمبر
۱۹۶۶ء : نئی تخلیق نمبر
۱۹۶۸ء : سالنامہ

۲۲ ر فروری ۱۹۶۸ء کو جناب حکیم محمد سعید دہلوی کی صدارت میں افکار کی تیئسویں سالگرہ منائی گئی

بیاد جوش ۱۹۸۲ء

بیاد فیض ۱۹۸۵ء

ندر اختر حسین رائے پوری ۱۹۸۶ء

۱۹۶۸ء : ڈراما نمبر
۱۹۶۸ء : انقلاب نمبر
۱۹۶۹ء : غالب نمبر
۱۹۶۹ء : اقبال نمبر
۱۹۷۰ء : جوبلی نمبر (۱۹۴۵-۷۰ء)
۱۹۷۵ء : ندیم نمبر
۱۹۷۵ء : امیر خسرو ایڈیشن
۱۹۷۷ء : کرشن چندر ایڈیشن
۱۹۷۷ء : نذر اقبال
۱۹۷۸ء : رومی ایڈیشن
۱۹۸۱ء : برطانیہ میں اردو ایڈیشن

• مدیر و ناشر صہبا لکھنوی • طابع مشہور آفسٹ پریس کراچی • دفتر رابسن روڈ کراچی -

آجکل ڈنٹونک کا بول بالا ہے
بڑوں کا آزمودہ
بچوں کا پسندیدہ

Hoechst research- that they may have a future worth living.

Hoechst research scientists are constantly seeking new drugs, new diagnostic and therapeutic advances. So that many a disease won't even be in our children's vocabulary.

We're developing new crop protection agents, fertilizers and pioneering Drip irrigation systems to help secure bigger and better harvests. So that our children will always have enough to eat.

Hoechst research teams are finding new, more efficient ways of building our homes.

Hoechst research is also playing an important role in improving present information and communication techniques — and developing new ones. So that our children may come to know the world in all its color and diversity.

That's why in recent years, Hoechst has invested more money in research worldwide than any other chemical company. On each and every working day a total of more than 50 Million Rupees.

Research - for our children's future

Hoechst Pakistan Ltd
P. O. Box No. 4962
Karachi.

Hoechst
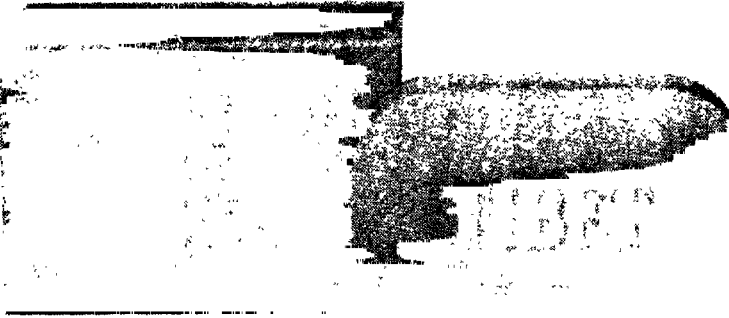
جاری شدہ —— ۱۹۴۵ء
ٹیلیفون نمبر —— ۲۱۴۰۷۹

افکار

سال —— ۴۵ • شمارہ —— ۲۳۸

—— : مدیر : ——

صہبا لکھنوی

—— نمائندہ اعزازی ——

راشد نور

—— : زرِ سالانہ : ——

پاکستان میں	بیرونی ملکوں سے
۱۰۰/- روپے معمولی ڈاک سے	۱۵ پونڈ —— ۲۰ ڈالر
۱۶۰/- روپے رجسٹری سے	ہوائی جہاز سے ۲۰ پونڈ ۴۰ ڈالر

فی شمارہ : دس روپے

زیر اہتمام

کراچی

رابسن روڈ نزد اردو بازار

ترتیب

جنوری ۱۹۹۰ء کی تخلیقات

سرورق: قمر عباس

تیسری دنیا کے دانشوروں کے لیے لمحۂ فکریہ!

سنہ ۱۹۴۰ء عیسوی کی دہائی اصل میں جنگ کی ابتدا یعنی ستمبر ۱۹۳۹ء سے شروع ہوتی ہے اور اس کے اثرات برنارڈ شا کی وفات یعنی سنہ ۱۹۵۰ء کے تقریباً اواخر تک رہتے ہیں۔

اس دہائی کے بارے میں ادیبوں نے بہت کچھ لکھا ہے، لیکن تقریباً تمام تحریروں کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا ایک بڑی جنگ میں مبتلا ہوگئی۔ نازیت اور فسطائیت کا عروج ہوا جس کے مقابل جمہوریت پسند طاقتیں (بشمول سوویت یونین) صف آرا ہوئیں۔ فسطائیت کی شکست ہوئی اور جمہوریت کا فروغ ہوا اور اس عظیم تر مقصد کی کامیابی میں ادب کے باوا لوگوں یعنی سی۔ ڈے لوئس رلوئی میکنیز رائے فلر، کیتھ ڈگلس، ایلن لوئس اور جان ہیتھ اسٹب وغیرہ نے بڑے زبردست کارنامے انجام دیے۔ پھر جنگ کے خاتمے پر ادب کے تھکے ہوئے قافلے کو ایلیٹ۔ ایذرا پاؤنڈ اور آڈن وغیرہ نے نیا سہارا دیا اور دنیا ایک بار پھر امن و آشتی ہی نہیں بلکہ تہذیب و تمدن کے ارتفاع کی طرف چل دی۔

ایک اچھے ادیب اور ممتاز نقاد ایڈ لرلوسنکر نے دو کتابیں لکھیں ایک کا نام ہے جنگی کیڑا WAR LIKE A WASP اور دوسری کا نام ہے جنگ کی دہائی THE WAR DECADE۔ اور ان دونوں میں مرکز کائنات انگلستان کے ترقی پسند اور امامان ادب قسم کے دانشور ہیں۔ یہ وہی ادیب و شاعر اور دانشور ہیں جن کے نام لے کر ہمارے بزرگوں نے جو اسی دہائی میں یا تو یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم تھے یا تازہ تازہ جامعات سے باہر آئے تھے، ہم کو اس طرح احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا کہ ہم عربی۔ فارسی اور اردو سے منہ موڑ کر صرف انگریزی کے ہو کر رہ گئے تھے۔

لطف یہ ہے کہ وہ تمام ترقی پسند جو سوویت یونین کی فردوس ارضی کے تقریباً واعظ
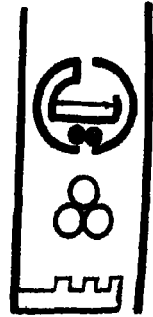
اور مولوی بن چکے تھے اور راسٹالن کی سفاکانہ تطہیر سے معصوم کمذاریوں کی طرح بے خبر تھے وہ بھی کرسٹوفر کاڈویل ہی کے حوالے سے ادب کا تذکرہ کرتے تھے۔

آج یہ سوچ کر تعجب ہوتا ہے کہ جنگ کے بعد جب چاروں طرف بین المستعمراتی مفادات کے خلاف آزادی کی تحریکیں اپنی انتہا پر تھیں تب بھی اردو کے باشعور ادیب و نقاد مغرب اور صرف مغرب ہی کے مقلد اور قصیدہ خواں کیوں بنے رہے؟ حسن عسکری صاحب الجیریا میں جبر و استبداد کے روح فرسا واقعات سے بے خبر فرانس کے ادیبوں کے بارے میں دھواں دھار "علمیت" برسا رہے تھے اور ان کے مقابل سبط حسن کے قبیل کے لوگ سوویت یونین کے فلموں میں رنگ کی نئی تکنیک کے بارے میں مضامین لکھ رہے تھے اور لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں منٹو کے خلاف فحاشی کے الزام لگائے جارہے تھے گو کہ آزادی اور اس کے بعد۔ فسادات کی دہشت کے بارے میں بعض اردو ادیبوں نے بڑی بے باک حقیقت پسندی سے کام لیا تھا مگر ترقی پسندوں کی فکر کے سوتے اس وقت بھی کریملن کی دیواروں کے سائے میں رکھے ہوئے تابوتوں کے نیچے سے پھوٹتے تھے۔ دوسری طرف قرۃ العین حیدر رتے لندن لیٹر میں ہم کو تلقین کی کہ "بس ہو چکا اب آسکر وائلڈ وغیرہ کا مطالعہ۔ چلو سب بھیّن اور بٹیا لوگ اب شا کے مزار پر چادر چڑھاؤ"۔ ہمارے ان تمام بزرگوں کو جنھوں نے پیروی مغرب کے چکر میں اپنی فکر و تخیل کے شہپر کاٹ کر پھینک دیے تھے اور صرف یورپ یا سوویٹ یونین کے ادب کو ہی معیار فن قرار دیا تھا اب یہ دیکھ کر تعجب ہو رہا ہوگا کہ مغربی ادیبوں کی جدّت طبع اور دانایان مغرب کی "ادب پاشیاں" بھی کچھ "ولے مستعجل بود" ہی کی آئینہ داری کر رہی ہیں۔ اصل میں یہ عمل انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے شروع ہو گیا تھا جب سامراجی دانشوروں نے مشرقی تہذیب و تمدن کے باغات اجاڑ کر کچھ ایسی ملی جلی شراب کشید کی جس کو ہم نے بادہ صافی سمجھ کر آنکھ بند کر کے گلوں سے اتار لیا اور اس کے مزے نے بڑے بڑے اللہ والوں کی متاع عقل و دانش لوٹ لی۔ اصل میں جس چیز کو مغربی ادب و تہذیب کہا جاتا ہے اس کا منبع خواہ مسیحیت ہو یا فسانہ نگاری۔ داستانیں ہوں یا سانیٹ مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ سے ہی منسلک ہے داستان در داستان کی روایت مغرب میں ہندوستان قدیم سے براہ عربی ادب پہنچی، حتیٰ کہ یونان قدیم کے المیہ نگاروں اور اساطیری ادیبوں نے بھی استفادہ "مشرقی ہواؤں کے رُخ پہچانتے" کے عمل سے کیا (ملاحظہ فرمایئے ایلیڈ۔ ہومر۔ ترجمہ والٹر شیورنگ)

ان باتوں کے ذکر کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اب نئی صدی کی دہائی بھی ختم ہو گئی ہے۔ اس دہائی کے واضح رجحانات کیا رہے ہیں یہ تیسری دنیا کے ادیبوں کے لیے فلسے

لائق توجہ ہیں۔ ادب و شعر کا مرکز اب امریکی، روسی یا انگریزی ادب نہیں بلکہ تیسری دنیا ہے اور اس تیسری دنیا میں بول بالا فی الحال پچھلے تین چار برسوں سے جنوبی امریکا کے ادیبوں کا رہا ہے۔ آج انگلستان اور امریکا کے اشاعتی اداروں میں زیادہ تر ادبی مواد میکسیکو، برازیل، نکاراگوا، یوروگوئے اور گواٹے مالا وغیرہ سے آرہا ہے۔ لندن اور نیویارک کے ادبی حلقوں میں مغربی افریقہ کے ادیب و دانش ور سرگرم تگ و تاز ہیں۔ عبرانی (اسرائیلی) اور عربی شعر و ادب کا بھی ذکر گاہ گاہ ذکر آنے لگا ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے صرف ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ نیویارک ریویو آف بکس اور لندن ریویو آف بکس وغیرہ کی فہرستیں ہی دیکھ لینا کافی ہیں۔ خود انگریزی میں بھی نمایاں کناڈا اور آسٹریلیا کے ادیب ہیں جو اپنے زمین و زماں اور اپنے دکھ سکھ کو غم کائنات بنا کر پیش کر رہے ہیں۔

یہاں پر سوال یہ اٹھتا ہے کہ اردو کے ادیب کیا کر رہے ہیں۔ کیا ہر وہ اپنی صرف غیروں کے فکر و عمل کی دہائی ہی رہے گی؟

احمد ندیم قاسمی کو چھوڑ کر اردو افسانے کی دنیا میں دو بہت بڑے نام ہیں۔ دونوں خواتین کے ہیں اور دونوں بنیادی طور پر اردو اور صرف اردو میں لکھتی ہیں، میرا مطلب عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر سے ہے۔ دونوں کا سرمایۂ تخلیق موجودہ عالمی ادب کے کھرے سکّوں سے زیادہ دقیع ہے۔ خاص طور پر قرۃ العین حیدر جو کچھ لکھ رہی ہیں وہ "بکر پرائز" یا ادبی "آسکر" حاصل کرنے والوں کے لیے اچھے خاصے نصاب ادب اور معیار کا کام دے سکتا ہے۔ ثابت یہ ہوا کہ کمی ہمارے یہاں بھی کچھ نہیں ہے مگر.....

کیا ہم اپنے ادب اور ادیبوں پر فخر کرنے اور ان کا حوالہ دینے کی جرأت پیدا کر سکتے ہیں۔ کیا ہم اردو رسالے اور کتابیں خرید کر پڑھنے کا اخلاق پیدا کر سکتے ہیں۔ کیا آنے والی دہائی اور آنے والی صدی میں بھی ہمارے مقدّر میں اردو کے مستقبل پر بحث کرنا اور پیروی و تقلید کرنا ہی رہے گا؟

——— قیصر تمکین

(مہمان مدیر)
(لندن سے)

امجد اسلام امجد

رفعت مرتضیٰ

مظہر امام

اظہر جاوید

اعجاز اعظمی

سہیل غازی پوری

آ۔ب۔حمیدی — حفیظ شاہد — منور بلوچ

بزم "فن و ادب" نیویارک کے چند رفیق و معاون

دائیں سے: ڈاکٹر عبدالحیٔ۔ انور قادری۔ اعجاز خاں۔ سلطان محمود خاں (صدر بزم فن و ادب) بزرگ شاعر ڈاکٹر مظفر شکوہ ڈاکٹر صبیحہ صبا۔ راشدہ نثار اور ان کے بھائی جمال قادری۔ یہ بزم کئی سال سے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں سرگرم عمل ہے

ادا جعفری

خودنوشت

(نویں قسط)

مسافتوں کے درمیان

زندگی کے میلے میں شرکت کا احساس مجھے ترقی پسند ادب نے عطا کیا اور یہ بڑا دل نواز اور رجاں پرور احساس تھا - فرسودہ
روایات میں جکڑی ہوئی ناقابلِ شناخت تمناؤں کو جیسے اپنے خدوخال نظر آنے لگے تھے - جیسے صدیوں سے منجمد آنکھوں کو اچانک
بینائی مل گئی ہو -

نثر اور نظم دونوں میں تازہ کاریوں کا دور تھا - میرے لیے آزاد اور معرّیٰ نظم لکھنا بھی لگے بندھے اور گلے پڑے ہوئے
ضوابط اور روایات سے بغاوت کے اعلان کی طرح تھا اور زندگی سے اپنا حق حاصل کرنے کے لیے یہی ایک بغاوت میرے بس میں تھی -
وزنِ دیوار سے ستاروں کو گننے والی آنکھیں کھلے آسمان پر رہ گزارِ مہر و ماہ کے نظاروں کا اپنا قرض طلب کر رہی تھیں - انھیں دنوں
میں نے اپنی نظم "میں ساز ڈھونڈتی رہی"، لکھی تھی ؎

"میں ساز ڈھونڈتی رہی

جنوں نواز اودی اودی بدلیوں کی چھاؤں میں

میں محوِ جستجو رہی

یہ ایک طویل نظم ہے جس کا آخری مصرعہ ہے -

؏ نظام تو بھی مجھ کو ساز دے سکے گا یا نہیں ؟

زمانہ تھا - ترقی پسند تحریک ۱۹۳۵ء
برصغیر میں سیاسی انقلاب کا زمانہ اور اردو ادب میں بھی نئے اور تاریخ ساز رجحانات کا
، لندن میں وجود میں آئی تھی اور اس کا ایک منشور بھی تحریر کیا گیا تھا - ابتدا میں اس کو ایک باقاعدہ تنظیم کی شکل سجاد ظہیر کی مساعی نے
دی اور پھر برصغیر کے تمام بڑے شاعر، ادیب اور دانشور اس تحریک میں شریک ہو گئے جن میں فراق گورکھپوری، حسرت موہانی،

ٹیگور، پریم چند، مولوی عبدالحق اور قاضی عبدالغفار جیسی شخصیات بھی شامل تھیں۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی کل ہند کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ اگلے چند برسوں میں اس تحریک نے لاہور، بمبئی اور حیدرآباد دکن میں اپنے مراکز قائم کر لیے جن میں بمبئی نہایت اہم مرکز تھا۔ اس کے علاوہ مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر ترقی پسند مصنّفین کے اجلاس منعقد ہوتے رہے۔ ان اجتماعات نے اس تحریک کو برّصغیر کے اہلِ فکر اور اہلِ نظر تک پہنچانے کا بنیادی فریضہ انجام دیا۔ اس تحریک کو عام لکھنے والوں اور نئی نسل تک پہنچانے کے لیے رسائل کا اجرا بھی ہوا۔

اسی دوران میں مباحثے کے لیے ایک نیا موضوع "ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی" وجود میں آچکا تھا۔ اس بحث نے ترقی پسند تحریک کے لیے ملک گیر تعارف اور عام آدمی کے سامنے اس کی ترجمانی کا کام بھی کیا اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ترقی پسند تحریک کے برسرِ عمل آنے میں سجاد ظہیر کے سیاسی عقائد بھی شریکِ کار تھے۔ خود سجاد ظہیر کی ادب سے اتنی زیادہ وابستگی نہیں تھی جتنی سیاست سے۔

بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے اردو افسانہ، شاعری اور تنقید کی جوئے کم آب کو بحرِ زخّار میں تبدیل کر دیا۔ جن کے مزاج میں صدیوں پرانی روایت نے منفعل داخلیت پسندی اور خود رحمی کی خاصیت پیدا کر دی تھی وہ اب نہ صرف زندگی کے حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہے تھے بلکہ ان سے برسرِ پیکار ہونے کے لیے بھی آمادہ تھے۔ نئے انسان کو پرانے ڈھکے چھپے زخموں کے لیے بھی مرہم کی طلب تھی۔ نیا انسان خود اپنے اوپر اعتماد کرنا سیکھ رہا تھا اور پورے ملک کی سیاسی سماجی اور معاشی فضا اس کے لیے سازگار تھی۔

یہ تحریک اردو ادب کی حیاتِ نو کا بلاوا بھی تھی اور نوید بھی۔ یوں تو ہر زمانے میں ایک نیا زمانہ جنم لیتا رہا ہے۔ ہر عہد کے حوالے سے ہر عہد کا ادب بھی تغیّر آشنا ہوا ہے۔ اٹھارویں صدی میں دلی کی شاعری کو یہ منصب ملا کہ اس نے شاعروں کی سوچ کے زاویے اور اظہار کے انداز یکسر بدل دیے اور اردو شاعری نے زبان و بیان میں بڑی واضح تبدیلیاں قبول کیں۔ شمالی ہند کے شعرا میں شاہ حاتم جیسے استاد نے وقت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے ضخیم دیوان میں ردّ و بدل منظور کیا۔ اور "دیوان زادہ" ترتیب دیا۔ اردو ادب میں نئی تحریکیں وجود میں آتی اور ختم ہوتی رہی ہیں۔ پرانے وقتوں کی ایہام گوئی سے نئے زمانے کی ایہام گوئی تک اردو شاعری نے بہت سے لباس تبدیل کیے ہیں۔ یہ سب کچھ محدود پیمانے پر مختلف علاقوں اور مختلف ادوار کے ادب کی تاریخ کا حصّہ ہے۔ غالب جیسا روایت شکن ہر عہد میں پیدا نہیں ہوتا کہ اپنے وقت میں بھی جدید تھا اور ہر دور میں جدید فکر کا امام ہے۔

ترقی پسند تحریک منظّم تھی، ملک گیر تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ سماجی اور معاشی حالات اس کے طرف دار تھے۔ اس تحریک کے اندر سیاسی عوامل بھی کارفرما تھے اور اس کو زمانہ بھی سیاسی بیداری کا ملا تھا۔ جھکے ہوئے سر اٹھ رہے تھے۔ روایات کے بوجھ تلے کچلا ہوا انسان آدابِ زندگی سیکھ رہا تھا اور سکھا رہا تھا۔ عشق بلاخیز کا قافلہ سخت جان اس وقت ہر وادی اور ہر منزل میں تھا۔ سخت جانوں کے اس قافلے میں نئے جادہ پیما مسلسل شامل ہو رہے تھے۔ ترقی پسند ادب کے لیے وہ بڑا سازگار زمانہ تھا۔ تخلیقی ادب کے موضوعات میں تنوّع اور تازگی تھی۔ افسانہ اور تنقید کا دامن وسیع ہوا تھا اور شاعری میں ہیئت کے

تجربے ہو رہے تھے جو یقیناً پرانی شعری روایت سے ایک ناگزیر انحراف تھا۔ کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے۔ اور جیسا کہ وقت نے ثابت کیا یہ اسی روایت کی توسیع تھی اور ایک نہایت ضروری اور اہم اضافہ بھی۔

مخالفت بھی اس کی جی بھر کر ہوئی، لیکن اس صنفِ سخن کو برگ و بار لانے سے روکنے پر قادر نہیں ہو سکی۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو بہت قد آور شاعر اور ادیب عطا کیے۔ فیضؔ، بیدیؔ، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، اخترؔ الایمان، مخدومؔ محی الدین، غلامؔ عباس، شوکتؔ صدیقی، اوپندر ناتھ اشکؔ، کرشنؔ چندر، سردارؔ جعفری، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور بہت سے دوسرے نام۔ اور وہ بھی جو ابتدا میں اس جماعت میں شامل تھے، لیکن اس تحریک کے انتہا پسند سیاسی عقائد کی وجہ سے بعد میں علیحدہ ہوئے یا علیحدہ سمجھے گئے۔ ان میں بھی کچھ کم معتبر اور محترم نام نہیں ہیں۔ مثلاً ممتاز مفتی، ممتاز شیریں، اختر حسین رائے پوری، محمد حسن عسکری، پروفیسر احمد علی وغیرہ۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور پروفیسر احمد علی نے اس تحریک کے ابتدائی مرحلوں میں اس کے لیے بہت کام بھی کیا تھا۔

اس تحریک کا جو خالص سیاسی پہلو تھا اس سے اختلافات بھی اسی زمانے میں شروع ہو گئے تھے۔ ان اختلافات کی ایک بڑی وجہ خود اس تحریک کے سرپرستوں کا انتہا پسند رویّہ تھا۔ جنھوں نے اس کی والہانہ پذیرائی سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ اسے ایک ناقابلِ ترمیم دستور کی حیثیت سے دیکھا، جس میں سیاسی نظریات کو انسان کے بنیادی جذبات اور احساسات پر برتری حاصل تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک لکھا ہوا ضابطۂ فکر ہر تخلیقی ذہن کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ آئندہ برسوں میں یہی سخت گیر رویّہ اس عظیم الشان تحریک کے زوال کا باعث بنا۔ انحطاط اس وقت شروع ہوا جب ادیبوں اور شاعروں کو ترقی پسند اور رجعت پسند کے سرنامے دیے گئے۔ کچھ بہت بڑے نام اور کام ترقی پسندی کی فہرست سے خارج ہوئے، بغیر یہ سوچے ہوئے کہ کوئی بھی حسّاس انسان رجعت پسند ہو ہی نہیں سکتا۔ اگرچہ بعد میں اس فیصلے پر اظہارِ تاسّف بھی کیا گیا۔

میں نہیں جانتی منٹو کی دیو قامت ادبی شخصیت کو ناقدین نے آج کس خانے میں رکھا ہوا ہے۔ وہ بھی اسی دورِ مسعود سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک عرصے تک غیر ترقی پسند سمجھے جاتے رہے۔ بہرطور اردو ادب کی تاریخ کا یہ نہایت درخشاں دور تھا۔ بڑی بات تو یہ تھی کہ یہ سخن اور یہ ادب زندگی سے قریب تر تھا۔ جو مناظر تھے وہ اپنے آس پاس آنکھوں کے سامنے موجود تھے۔ محض پروازِ تخیّل کا کارنامہ نہیں تھے۔ جو خواب تھے وہ ایک عام آدمی کے خواب تھے۔ یہ شاعری صدیوں کے رویّوں کی صدائے بازگشت ہرگز نہیں تھی۔ یہاں اس انقلابی شاعری میں کہیں صرف للکار اور کہیں صرف جھنکار بھی سنائی دی اور افسانوی ادب میں کبھی کبھی صداقت نگاری کے نام پر بے باک جرأت آزمائی کے مظاہرے بھی ہوئے، مگر یہ سب کچھ تو انفرادی صلاحیتوں پر منحصر ہوتا ہے۔ کارواں میں ہر مسافر ایک ہی قد و قامت کا نہیں ہوتا اور یہ تو بہت بڑا کارواں تھا۔

ہماری شاعری میں آزاد نظم اور نظمِ معرّیٰ بڑی آن بان سے متعارف ہوئی تھی۔ تصدق حسین خالدؔ اور ن۔ م۔ راشدؔ آزاد نظم کے پیش رو کہے جاتے ہیں۔ غیر محسوس اور محسوس طریقے پر اب اردو شاعری قدیم فارسی غزل کے اثرات سے آزاد ہو کر انگریزی شاعری کا اثر قبول کر رہی تھی۔ سانیٹ بھی لکھے گئے، لیکن وہ اردو میں باقاعدہ ایک صنفِ سخن کی حیثیت حاصل نہ کرسکے۔

اس وقت اردو شاعری میں تین نام ایسے تھے جو اپنی الگ پہچان رکھتے تھے اور اپنے اپنے منفرد اسلوب کے سبب خاص

طور پر نمایاں نظر آرہے تھے ۔ ن۔م۔ راشد، میرا جی اور فیض ۔ تینوں رجحان ساز شاعر تھے ۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ کسی نہ کسی طور، کسی نہ کسی حد تک ایک پوری نسل ان تینوں سے متاثر رہی ہے ۔ پیروی کی شعوری کوششیں بھی کی گئیں اور غیر شعوری طور پر بھی شاعروں کی نوجوان نسل نے ان کا اثر قبول کیا ۔

اسی زمانے میں راشد کا پہلا مجموعۂ کلام "ماورا" کے نام سے شائع ہوا اور فیض کا پہلا شعری مجموعہ "نقش فریادی" بھی میرا جی کا ان دنوں اگر کوئی شعری مجموعہ طبع ہوا تھا تو مجھے اس کا نام یاد نہیں ۔

ن۔م۔ راشد کے اشعار میں فارسی زبان کی تمکنت ہے، لیکن ان کی نظموں کا ماحول عام آدمی کے لیے اجنبی اجنبی سا ہے ۔ یہ شاعری ایک تکلف کی فضا میں سانس لیتی ہے ۔ اس میں وقار بھی ہے اور شان و شکوہ بھی، لیکن عام قاری کو اس تک پہنچنے کے لیے کئی موڑ کاٹنا پڑتے ہیں، اسی وجہ سے راشد کو شاعروں کا شاعر کہا گیا ۔

میرا جی کے لہجے میں ہندی گیت کا رچاؤ ہے

مصرع: کبھی آپ ہنسے، کبھی نین ہنسے کبھی نین کے بیچ ہنسے کجرا

لیکن ان کے بھید تک پہنچنا بھی آسان نہیں تھا ۔ اس شاعری میں کچھ دھند کچھ پرچھائیوں کی سی کیفیت تھی ۔ عام قاری نے کچھ دیکھا کچھ نہیں دیکھا، مگر زبان آسان تھی، انداز بیان میں موہنی تھی، لہٰذا اس شاعری کا بھی چرچا ہوا ۔ جدید شاعری کو علامت نگاری مرغوب رہی ۔ خصوصاً میرا جی کی شاعری کے اجلے اجلے اندھیرے اور دھندلے دھندلے اجالے شعرا کی نئی نسل کے لیے بڑی کشش رکھتے تھے دیکھتے دیکھتے علامت نگاری نے ایک فیشن کی صورت اختیار کر لی اور بعد میں علامت کبھی ابہام تک جا پہنچی اور کبھی ایمائیت اور کنائے کے خوشنما پیکر میں سامنے آئی ۔

میرا جی اور ن۔م۔ راشد کا شمار بھی "نا ترقی پسندوں" میں کیا گیا تھا ۔ صرف فیض تھے جو ان تمام حد بندیوں سے بلند تھے ۔ جنھوں نے اپنے عشق اور اپنے وطن اور پورے عالمِ انسانیت کو ایک ہی لڑی میں گوندھنے کا کارنامہ سرانجام دیا ۔

فیض کے مزاج کا دھیما پن، ان کا لہجہ اور ان کی دردمند شخصیت کا پرتو اس وقت بھی ان کی شاعری میں عکس فگن تھا اور اس سخن کی دل آویزی اور جاذبیت کی ضمانت بن چکا تھا ۔ فیض، میرا جی اور راشد تینوں بہت بڑے شاعر تھے اور اپنا دائرۂ اثر بھی رکھتے تھے، لیکن عالمگیر سطح پر مقبولیت اور پذیرائی کا درجہ صرف فیض کو حاصل ہوا ۔ ان کی شاعری میں غمِ ذات اور غمِ کائنات کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں ہے ۔ وہ لوگ جو فیض کے سیاسی نظریات سے متفق نہیں تھے فیض کی شاعری کو رد کر دینے کا حوصلہ ان کو بھی نہیں تھا ۔

فیض کے نام کے ساتھ اس وقت مجھے جو دوسرا نام یاد آگیا وہ ترکی کے شہرۂ آفاق شاعر ناظم حکمت کا ہے کہ ان دونوں کی شاعری اور زندگی میں کچھ نہ کچھ مماثلت موجود ہے ۔ غمِ دوراں کو غمِ جاناں کی طرح دل سے لگائے ہوئے دونوں سر اٹھا کر چلے ۔ زنداں کے اندھیرے ان دونوں چراغوں سے روشن ہوئے ۔ قیدِ تنہائی میں دونوں نے اپنے آپ سے باتیں کیں ۔ اکتائے بھی، گھبرائے بھی، لیکن پچھتائے کبھی نہیں ۔ فیض کہہ رہے تھے ؎

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

اور ناظم حکمت سوچ رہے تھے۔

'قید و بند تو کوئی بات نہیں

اصل بات یہ ہے کہ انسان شکست خوردہ نہ ہو'

مشاہیر سے میری ملاقات زیادہ تر لکھے ہوئے لفظ کے وسیلے سے ہی ہو سکی ہے۔ ناظم حکمت کو میں نے شماع اور عزمی کے ساتھ ایمرسٹ میں تلاش کیا۔ میری بہو شماع کتابوں کی تلاش میں ہمیشہ بڑی جاں فشانی سے میری مدد کرتی ہے اور جب وہ ساتھ ہو تو اس تلاش میں کامیابی کا یقین بھی میرے ساتھ رہتا ہے۔

میں نے منتخب شعراء کے مجموعۂ اشعار میں اس شاعر کی کچھ نظمیں دیکھی تھیں اور تب مجھے فیض یاد آ گئے تھے۔ یہ ناظم حکمت کا تازہ ترین اور وقیع انتخاب کلام تھا جو میں خریدنا چاہتی تھی۔ یہ کتاب ایمرسٹ کی تمام لائبریریوں میں موجود تھی لیکن دوکانوں پر دست یاب نہیں تھی۔ وہاں یہ دستور ہے کہ تازہ تصانیف وصول ہوتے ہی جگہ کی کمی کے باعث پہلے سے موجود جن کتابوں کی تھوڑی جلدیں باقی ہوں وہ نصف اور کبھی نصف سے بھی کم قیمت پر لگا دی جاتی ہیں اور اس طرح فوراً ہی فروخت ہو جاتی ہیں۔ یہ کتاب مارکیٹ میں آئی، فروخت ہوئی اور نایاب ہو گئی ہے شک آرڈر دے کر ناشر سے منگوائی جا سکتی تھی۔ مگر اس میں وقت لگتا ہے اور مسافر کے پاس انتظار کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ اسے خوش قسمتی ہی کہنا چاہیے کہ کتابوں کی شیلف میں ایک جلد دکان دار کی نگاہ سے اوجھل رہ گئی تھی جو عزمی نے دریافت کر لی۔

ناظم حکمت (۱۹۰۲۔۱۹۶۳ء)، ترکی کا پہلا جدید شاعر تھا جس کا شمار عالم گیر سطح پر بیسویں صدی کے عظیم شعرا میں کیا جاتا ہے آزادی اور مساوات کے خواب دیکھنے والے اس شاعر نے کم و بیش اٹھارہ سال اپنے وطن کی مختلف جیلوں میں بسر کیے کئی سال قید تنہائی کی اذیت بھی برداشت کی اور پھر تیرہ سال ماسکو میں جلاوطنی کے کاٹے وہیں اس کا انتقال ہوا۔

ناظم حکمت کے کلام کا ترجمہ اب تک پچاس سے زیادہ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کی نظمیں اور کتابیں جو دوسرے ممالک میں مسلسل طبع ہو رہی تھیں اس کے اپنے وطن میں ممنوع تھیں۔ یہ کتابیں ترکی میں اس کی موت کے بعد شائع ہوئیں۔

اس کی فرد جرم میں ایک خطا یہ بھی تھی کہ فوجی جوان اس کا کلام ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

ایک منظوم خط میں وہ اپنی بیوی کو لکھتا ہے۔

" انھوں نے ہم دونوں کو قیدی بنا لیا ہے

بند کر دیا ہے

مجھے دیواروں کے اندر

اور تمہیں دیواروں کے باہر

مگر یہ تو کچھ بھی نہیں ہے

بدترین صورت حال تو وہ ہوتی ہے

کہ جب لوگ جانتے بوجھتے یا ان جانے

جیل اپنے اندر لیے پھرتے ہیں

بہت سے لوگ ایسا کرنے پر مجبور کیے گئے ہیں
ایمان دار، محنتی اور اچھے لوگ
جن کا حق تھا کہ ان سے محبت کی جاتی
اتنی ہی جتنی میں تم سے کرتا ہوں"

ایک اور منظوم خط میں تحریر کیا ہے۔

"جانِ من
رسن و دار کے موسم میں
میں نے کئی بار اپنی آزادی کو کھویا ہے
اپنے رزق کو بھی اور تمہیں بھی
لیکن آنے والے دنوں پر اپنے یقین کو کبھی نہیں کھویا،

(وہ دن جو)
ظلمتوں، چیخوں اور بھوک کے کرب سے طلوع ہو کر
ہمارے دروازے پر دستک دیں گے
جن کے دونوں ہاتھوں میں آفتاب ہو گا"

فیض بہرحال ناظم حکمت سے زیادہ خوش نصیب رہے۔ وطن سے دوری کا دکھ بھی انھوں نے برداشت کیا، لیکن ان پر کبھی ان کے دیس، ان کے گھر کے دروازے اس طرح بند نہیں ہوئے۔ فیض نے خود بھی پرائے دیس میں اپنے قیام کے لیے جلاوطنی کا سنگین لفظ استعمال نہیں کیا۔ اگرچہ اپنے پیاروں کے قرب اور اپنی مٹی کی خوشبو کے لیے ترستے وہ بھی رہے تھے۔

وقت اپنے حسابوں چلتا رہتا ہے۔ میں جن دنوں کو سوچ رہی تھی وہ ترقی پسند تحریک کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور میں خاندانی بوسیدہ روایات کے بوجھ سے ہراساں، زندگی کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ ابھی زندگی سے میری جان پہچان کہاں تھی لیکن یہ تحریک تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح دلکش اور دل پذیر تھی اور ہوا کے جھونکے ہی کی طرح اونچی دیواروں والے گھر کے محدود آنگن دالان تک پہنچنے پر بھی قادر تھی۔ ابھی رکتے جھجکتے پہلا قدم ادب کی وادی میں رکھا تھا اور جیسے آنکھوں کو نیا منظر میسر آ گیا ہو۔ حویلی میں کوئی نیا دریچہ کھل گیا ہو۔

ترقی پسند تحریک کا منشور موجود تھا، لیکن میں رسمی طور پر اس کی رکن کبھی نہیں رہی۔ نہ اس کے انتہا پسند سیاسی نظریات کی پیروی کی۔ میری نگاہ میں تو اس تحریک کا ادبی منظر نامہ تھا۔ میں اس جدید ادب کی دل دادہ تھی جس کا اسلوب نو بہ نو تھا۔ یہ شاعری جو سچائیوں کی ترجمان تھی، جو مظلوم کی طرف دار تھی اور خود اعتمادی بخش رہی تھی۔ یہ آواز وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھی۔ ترقی پسند تحریک کے جلسوں یا کسی بھی مشاعرے میں شریک ہونا میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ میں اس وقت شعر و ادب کے بڑے ناموں کو صرف حرف و قلم کے ذریعے ہی جانتی پہچانتی تھی۔ یہ محرومی ایسی تھی جو ایک عرصے تک میرے ساتھ رہی۔ کئی محترم شخصیات جن سے ملاقات کی خواہش رہی انھیں کبھی دیکھا بھی نہیں، روبرو سنا بھی نہیں جن میں پہلا نام فراق

گورکھپوری کا ہے اور یہ فہرست طویل ہے۔

میرے اشعار ترقی پسند ادیبوں کے رسائل میں باقاعدگی سے شائع ہو رہے تھے اور ترقی پسند ادب کے جو انتخاب شائع ہوتے ان میں بھی میری نظمیں شریک اشاعت ہوتیں۔ "نئے زاویے" کا نام مجھے یاد ہے جسے کرشن چندر مرتب کر رہے تھے ابھی پچھلے دنوں رسالہ "نگار" کا شمارہ (اکتوبر ۱۹۸۶ء) دیکھا تو خوش گوار حیرت سی ہوئی جیسے اچانک ماضی کے کسی آوارہ خرام جھونکے سے ملاقات ہو گئی ہو۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری "نگار" کے صفحات پر اکثر اہم اور نایاب کتابوں اور مضامین کی اشاعتِ مکرر کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء کے شمارے میں انھوں نے "نئی امنگیں" نامی کتاب دوبارہ شائع کی ہے۔ یہ مختصر سی کتاب ۱۹۴۲ء میں نیا کتاب گھر دہلی سے شائع ہوئی تھی جس کو پرشوتم سنگھ سیٹھی (جنرل سکریٹری انجمن ترقی پسند مصنّفین) نے مرتّب کیا تھا۔ میں اس انتخاب کو قطعی بھول چکی تھی۔ اس میں فیض، فراق، جذبی، جوش، ندیم قاسمی، اختر الایمان، علی جواد زیدی اور دوسرے شعرا کی نظمیں شریکِ اشاعت ہیں اور میری نظم جس کا عنوان ہے "یہ جیون یوں ہی بیتے گا"۔

میں نے اپنی کسی کتاب کے پیش لفظ میں ایک جگہ لکھا ہے۔

"یہ حقیقت ہے کہ آج سے تقریباً چالیس سال پہلے رہروانِ شوق کا ایک کارواں جدید شاعری کا پرچم ہاتھ میں لے کر چلا تھا اور ایک لڑکی تھی جو بڑے اعتماد اور حوصلے کے ساتھ اس کارواں میں شریک ہوئی تھی۔ مجھے اپنی روایات جتنی عزیز ہیں روایتوں سے بغاوت بھی اتنی ہی عزیز رہی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بعد میں اکثر تنقید نگاروں نے اس قافلۂ شوق کے رہ نوردوں میں اس کا نام لینا الفاظ کا زیاں جانا اور ایک طرح اس پر احسان کیا۔ وہ جو ایک جوئے آہستہ خرام تھی ان ننھے منے سنگ ریزوں نے اس کی راہ میں آکر اسے رازِ سرشاریٔ رفتار سے آگاہ کیا۔"

اب سوچ رہی ہوں کہ جن تنقید نگاروں کا ذکر اس میں آگیا ہے ان کی طرف داری کا فریضہ بھی ادا کر دوں۔ ہوا یہ تھا کہ اس لڑکی نے جب عورت کا روپ دھارا تو اپنے آپ سے بچھڑ گئی —— گیت لتے، ہار سنگھار اور گود میں چاند سورج —— بارہ تیرہ سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا، لیکن وہ لڑکی مری نہیں تھی۔ بس ہجوم میں کھو گئی تھی۔ بات یہ ہے کہ عورت موت کا استقبال تو ایک ہی بار کرتی ہے، لیکن جنم بار بار لیتی ہے۔

(خود نوشت کی نئی قسط بہ عنوان۔ دشت میں سامنے تھا خیمۂ گل۔ ملاحظہ کیجیے)

آئندہ شمارے میں ——

فروری ۱۹۹۱ء میں فیض احمد فیض کے یوم پیدائش پر افکار —— فیض کے چند غیر مطبوعہ خطوط شائع کر رہا ہے اپنی کاپی مقامی ایجنسی پر محفوظ کرا لیجیے۔

عارف لکھنوی

دلچسپ ادبی حقائق

شاعری کے فن میں تین باتوں کا خصوصیت سے خیال رکھا جاتا ہے۔

سرقہ:۔ کسی شاعر کے شعر میں مضمون بھی وہی ہو اور الفاظ کی ترتیب یا بحر بدل دی جائے (ناجائز ہے)

توارد:۔ کسی کے شعر میں آدھا مصرعہ یا کوئی ترکیب ایک ہی طریقے سے کہی گئی ہو۔ (جائز ہے)

استفادہ:۔ کسی کا شعر پڑھ کر اور اس سے متاثر ہو کر اس مضمون سے کوئی اور نئی بات نکالنا۔ (مستحسن)

اب میں چند اشعار باکمال استادوں کے پیش کر رہا ہوں فیصلہ آپ خود کیجیے ؎

اب نہ فرہاد ہے نہ مجنوں ہے — زمانہ
رہ گیا عاشقوں کا افسانہ (مصحفی ۱۷۴۱ء تا ۱۸۲۱ء)

باقی جہاں میں قیس نہ فرہاد رہ گیا
افسانہ عاشقوں کا فقط یاد رہ گیا (داغ ۱۸۳۱ء تا ۱۹۰۴ء)

وعدہ کی شب جو کل تھی گیا بیقرار تھے ہم
سو بار گھر سے نکلے سو بار گھر میں آئے (مصحفی " " ")

شب وعدہ نہ ہوا ایک جگہ مجھ کو قرار
صبح تک میں کبھی گھر میں کبھی باہر آیا (داغ " " ")

اوّل تو مجھے خط میں سنائی ہیں ہزاروں۔
آخر میں یہ لکھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا (مصحفی " " ")

خط میں مجھے اوّل تو سنائی ہیں ہزاروں
آخر یہی لکھتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا! (داغ " " ")

نہ گیا اس پری کو خط لکھنا
ہاتھ جب تک، مرے قلم نہ ہوئے (مصحفی ۱۷۴۱ء تا ۱۸۲۱ء)

لکھتے رہے جنوں میں حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے (غالب ۱۷۹۹ء تا ۱۸۶۹ء)

بے کسی پر رحم آتا ہے اگر میں مر گیا
پھر کہاں اس کا ٹھکانہ دربدر ہو جائے گی (مصحفی " " ")

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد (غالب " " ")

دیتے نہیں جو داد تو بے داد کیجیے
یعنی کسی طرح تو ہمیں یاد کیجیے (مصحفی " " ")

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا (غالب " " ")

جو ذکر کو را ہیں سے کرتا ہے کوئی غم خوار رونے کا
تو کہتا ہے کہ چپ رہ بے اُسے آزار رونے کا (سودا ۱۷۱۳ء تا ۱۷۸۱ء)

معالج ہو سکے اب کیا کوئی غمخوار رونے کا کہ ان آنکھوں کو اک مدت سے ہے آزار رونے کا (مصحفی ۱۷۴۲ء تا ۱۸۲۴ء)
اے شمع دل گداز کسی کا نہ ہو کہ شب پروانہ داغ تجھے ہوا ہم جلے گئے (سودا " " ")
آتش میں عشق وشرق کی مانند چوب خشک جب تک کسی نے ہم کو جلایا جلے گئے (مصحفی " " ")

● —— یہ شاعر کی خوش نسمتی ہے کہ اس کا کوئی شعر اس قدر مشہور ہو کر زبان زد خاص وعام ہو جائے جو اس کو شاعر کی حیثیت سے زندہ رکھنے کو کافی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد اس دور میں اب تک چند اشعار بہت مشہور ہیں اور زبان زد ہیں۔

چند اشعار پیش خدمت ہیں۔ یہ صرف پاکستانی شعراء کے ہیں اور پاکستان بننے کے بعد کہے گئے ہیں۔

نیرنگیٔ سیاست دوراں تو دیکھیے منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

یہ شعر اس دور کے ممتاز شاعر محسن بھوپالی کا ہے۔

اب کے بچھڑے ہیں تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

یہ شعر اس دور کے ممتاز شاعر احمد فراز کا ہے۔

اک ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

یہ شعر بھی اسی عہد کے مشہور شاعر خاطر غزنوی کا ہے۔

فضائے کنج چمن میں نہ کر تلاش ہمیں مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں

یہ شعر بھی مشہور شاعر سیف الدین سیف کا ہے عمر انشاءاللہ سال کے قریب ہوگی، لاہور میں قیام ہے۔

ویسے اچھے اشعار بہت ہیں، لیکن ہم نے زبان زد خاص وعام کی حیثیت سے یہ چند اشعار منتخب کیے ہیں۔

● —— شیخ غلام ہمدانی مصحفی جن کو (میرثانی کا خطاب بھی دیا گیا ہے) میرتقی میر کے آخر دور میں مصحفی تھے ان کو میر ثانی اس لیے کہا جاتا ہے کہ شعر کے ساتھ ان کا نام نہ لکھا جائے تو عام طور سے لوگ میر کا شعر سمجھیں گے۔ بہت قابل شاعر تھے عربی، فارسی اور عروض پر مکمل عبور رکھتا۔ مصحفی کی بہ حیثیت شاعر جتنی شہرت ہونا چاہیے تھی، نہیں ہوئی۔ ان کو شعرا کے اعتبار سے بڑا اچھا زمانہ ملا تھا۔ انھوں نے اپنے سے پرانے شعراء میر تقی میر، مرزا سودا، میر سوز، جرأت، وغیرہ کا زمانہ دیکھا۔ ہم عصر شعراء میں مرزا مظہر جان جاناں، میر انشا، قائم چاندپوری، میر حسن، مرزا حضرت علی حسرت وغیرہ تھے۔

مصحفی کے شاگردوں کی بہت طویل فہرست ہے۔ ان کے مشہور شاگرد خواجہ حیدر علی آتش تھے۔ میر خلیق (میر انیس کے والد) میر ضمیر وغیرہ شاگرد تھے۔ ایک واسطے سے ناسخ بھی شاگرد تھے کیوں کہ محمد عیسیٰ تنہا ناسخ کے ہم عمر دوست شاعر تھے۔ ناسخ نے ابتدائی کلام ان کو دکھلایا۔ تنہا سے ناسخ کے تعلقات بہت زیادہ تھے تقریباً پینتالیس سال کی عمر میں ۱۸۰۲ء میں تنہا کا انتقال ہو گیا تو ناسخ نے بہت اچھی تاریخ نکالی۔

ع آج تنہا گیا دنیا سے عدم کو تنہا

لیکن بعد کو ناسخ نے یہی کہا کہ جب ان کی شہرت کی ابتدا ہوئی کہ میں کسی کا شاگرد نہیں ہوں۔ بہرحال مصحفی کے

چند اشعار لکھتا ہوں جس پر ان کو میر ثانی کا خطاب، دیا گیا:

میرے آگے نہ دیکھ آئینہ ۔۔۔ میری حسرت، بکری نظر کو دیکھ
ایک دن ہوا تھا وہ گل، عارض عرق فشاں ۔۔۔ اب تک ہمارے گھر کی معطر زمیں ہے
میں وہ بے کس ہوں کہ مانند چراغ سرِ راہ ۔۔۔ مر بھی جاؤں تو کوئی آکے نہ روئے مجھ کو
ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا ۔۔۔ کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا
فلک کی تو نہیں ایسوں کی پرورش ورنہ ۔۔۔ شکستہ حال، غریب و فقیر ہم بھی ہیں
شبنم کا قطرہ ہی نہ فقط آب دیدہ تھا ۔۔۔ تربت پہ میری گل بھی گریباں دریدہ تھا
میں نے باندا حسنِ خوباں سے ۔۔۔ مول اک حسرت نظر لی ہے
آیا نہ وہ تو صورتِ پروانہ جل گیا ۔۔۔ میں دیکھ کر چراغِ سرِ شام کی طرف
نزاکت عاشق و معشوق کی یکساں نہیں ہوتی ۔۔۔ مری گفتار نازک ہے تری رفتار نازک ہے
یہ بھی نیا جنوں ہے کہ کانٹوں سے چھیڑ کر ۔۔۔ روئے ہم آبلے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر
کبھو تک کے درکو کھڑے رہے کبھو آہ بھر کے چلے گئے ۔۔۔ ترے کوچے میں جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

مصحفی کی پیدائش ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۷ء وفات ۱۸۲۱ء

افکار کی قیمت میں صرف دو روپے کا اضافہ

ہماری بدنصیبی ہے کہ پاکستان میں نیوز پرنٹ کا کوئی کارخانہ نہیں لہٰذا ملک بھر کے اخبارات اور رسائل بیرونی ملکوں سے درآمد کردہ نیوز پرنٹ سے اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں۔

گزشتہ سال سے نیوز پرنٹ کی قیمت تقریباً دوگنی ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ پریس کے نرخ، فلم میکنگ اور ڈاک خرچ میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے اس لیے مجبوراً ہم افکار کی قیمت میں جنوری ۱۹۹۰ء سے صرف دو روپے کا اضافہ کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ رفیقانِ افکار اور محبان اردو اس ناگزیر اضافے کو قبول فرماکر افکار کی سرپرستی فرماتے رہیں گے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

- فی شمارہ : دس روپے
- زرِ رفاقت سالانہ (رجسٹری سے) : ایک سو اکسٹھ روپے
- زرِ رفاقت سالانہ (عام ڈاک سے) : سو روپے

بیرونی ملکوں کی شرح حسب سابق رہے گی۔

مینیجر افکار۔ کراچی

خاطر غزنوی

ٹسٹ ٹیوب بے بی

ماہ و خورشید میں بُعد پیدا ہوا
ہو گیا ان میں حائل وجودِ زمیں
چاند محرومِ خورشید کی ضو سے ہونے لگا
حسرتیں دل میں ہر لحظہ بونے لگا
چاندنی مٹ گئی
روشنی لٹ گئی
بانجھ پن آ گیا
جب گہن آ گیا
تب کوئی مانگ کر جگمگاتے ستاروں سے لایا
ذرا بھیک ذرّوں کی
جو ہو سکیں روشنی چاندیں

قمر ساحری

آزاد رباعیات

(ایک تجربہ)

ہر راہِ قدم خوردہ[1] پہ چلنے والو
گر گر کے سنبھلنے والو
کچھ اپنی بھی محنت کا کوئی لقمۂ تر
اسلاف کے کشکول پہ پلنے والو

جب زخم صدا دیتے ہیں
حالات کی دیوار گرا دیتے ہیں
سہمے ہوئے خاموش عوام
اٹھتے ہیں تو پھر آگ لگا دیتے ہیں

عالم تھا مگر طاق رسیدہ[2] نکلا
ہر لفظ شنیدہ نکلا
جس شخص کو سمجھا تھا نئے دور کا ذہن
وہ شخص بھی اقوال گزیدہ نکلا

خوابیدہ خیالوں کو جھنجھوڑا میں نے
ویرانۂ اسلاف کو چھوڑا میں نے
بحروں میں مقید تھی رباعی کل تک
اس قید کو توڑا میں نے

وہ مرحلۂ ذوقِ سفر تو آئے
گلزار سا گھر تو آئے
پی اور ابھی خونِ مرادشتِ سفید
رستہ مگر گلنار نظر تو آئے

---

[1] پامال رہگذار [2] صرف کتابیں پڑھنے والا (قمر ساحری)

امجد اسلام امجد

اب تم میرے نہیں رہے

میں جس شہر میں رہتا ہوں
وہ کہتا ہے
"اب تم میرے نہیں رہے"

سانس جو اب تک میری ہوا میں تم نے لیے ہیں
لوٹا دو
خواب جو میری مٹّی کی خوشبو میں جیے ہیں
دلنا دو
میرے رزق کا اک اک لقمہ
میرے جل کا ایک ایک گھونٹ
میری فضا میں اُڑنے والے پنکھ بکھیرو
اور اُن کی خوش رنگ صدائیں
ان سب سے اب ہاتھ اٹھاؤ اور سنو
تیز ہوا کی سائیں سائیں
میرے اوپر تنی ہوئی افلاک کی چادر
ابر کے سائے، چاند کی کرنیں، روشن تارے
نہیں تمھارے!
میں جس شہر میں رہتا ہوں
وہ کہتا ہے

"اب تم میرے نہیں رہے"

میں جب شہر کی دل دہلانے، خون جلانے، ہاتھ چھڑانے
والی باتیں سنتا ہوں تو سوچتا ہوں
کل تک تو یہ شہر ہمارے دل کے ساتھ دھڑکتا تھا
اس کے سارے خواب ہماری آنکھوں میں تابندہ تھے
اس کے نام پہ مر جانے کی خواہش میں ہم زندہ تھے
آج یہ اس کی آنکھوں میں کیوں نفرت اور ویرانی ہے
ہر منظر، ہر راہگزر نے شکست کی چادر تانی ہے
اس چادر کی بُنت میں لاگے ـــــ جتنے دھاگے
وہ تو سب اک یک رنگی کے رنگ تھے سارے
ان رنگوں کے نام کہاں تھے
"میرے ـــــ اُس کے ـــــ اور تمہارے"
میرے شہر، اے میرے پیارے
اتنے کڑوے بول یہ تو نے کیسے سوچے، کیسے کہے!
"اب تم میرے نہیں رہے"

○

اظہر جاوید

ایک لمحہ

عجیب لڑکی! تمھیں خبر ہے
میں کتنی صدیوں کی منزلوں سے گزر کے پہنچا ہوں اس نگر تک
بچا کے رستوں کے پیچ و خم سے میں خود کو لایا ہوں اس ڈگر تک
کہاں کہاں سے بھٹک بھٹک کر میں آج آیا تمہارے در تک
مگر یہ تم نے جتا دیا ہے
بڑی ادا سے بتا دیا ہے
تمہارے دل تک پہنچنے والی تمام راہیں سمٹ چکی ہیں
ادھر یہ عالم کہ میرے اشکوں میں ساری آہیں سمٹ چکی ہیں
حسین لڑکی! میں جانتا ہوں
تمہاری دنیا میں چاہتیں ہیں، مسرّتوں کا سرور بھی ہے
تمہیں سراہا گیا ہے اتنا کہ اس پہ تم کو غرور بھی ہے
میں ایک سائل، غموں سے گھائل
کہاں کہاں سے بھٹک بھٹک کر میں آج آیا تمہارے در تک

جو ہو سکے تو کرم یہ کر دو
تم اپنے لمحوں سے ایک لمحہ بچا کے دامن میں میرے بھر دو
○

محمد فیروز شاہ

سفر وسیلۂ ظفر

سفر بھی کیا عجب شے ہے
کہ در قلب و نظر اور فکر کے سب کھول دیتا ہے
بصارت کو بصیرت کے گہر انمول دیتا ہے!

ابھی کل میں نے دیکھا ہے
کہ جب محو سفر تھا
تو میری رہگذاروں پر
ہرے پیڑوں کی دو رویہ قطاریں بھی
عجب منظر دکھاتی تھیں
کہ جو نزدیک تھے وہ تو
مخالف سمت کی راہوں کے راہی تھے
مگر وہ جو شجر دوری پہ تھے
وہ ساتھ چلتے تھے!

مجھے اس لمحے اپنی زندگانی کا
ہر اک لمحہ بھی یاد آیا
سفر اپنی حیاتِ مختصر کا بھی کٹا ایسے
کہ جو میرے قریبی تھے
وہی میرے مخالف تھے
مگر جو دور تھے مجھ سے

وہ میرے ساتھ چلتے تھے
وہی تو میرے حامی تھے!

تو یوں فطرت نے اک رازِ حیات ظاہری کھولا
جنھیں اپنا سمجھتا تھا وہی غیروں کے ساتھی تھے
مرے ہمراہ تو وہ تھے جنھیں میں غیر سمجھا تھا!

یہ رازِ زندگی مجھ پر
کھلا تو میں نے سوچا ہے
سفر بھی کیا عجب شے ہے!

O

اعجاز اعظمی

ربڑ کے باغ میں

ربڑ کے باغ میں الھڑ سی لڑکی
کنوارا سا پن بلاؤز میں چھپائے
پُھدکتی، ڈولتی پھرتی ہے جیسے
کسی جنگل میں اک بیاکل سی ہرنی
کلیلیں بھر رہی ہو بے خبر سی

نہ چادر ہے، نہ آنچل ہے، نہ دامن
نہ حائل درمیاں پلکوں کی چلمن
لباسِ مختصر لپٹا بدن سے
بڑھاتا ہے نظر کی اشتہا کو
بڑھاتا ہے دلِ مضطر کی دھڑکن

ربڑ کے دودھ کے پیالے اٹھانے
وہ جھکتی ہے تو رک جاتے ہیں لمحے
یہی لمحے نشاطِ جاوداں ہیں
انھیں لمحوں کو اپنانے کی خاطر
نگاہیں ڈھونڈتی ہیں سو بہانے
لگاتے ہیں تبسم کے خزانے

قُلی بھی، وائزر[1] بھی اور منیجر[2] بھی
کہ جو بھی آشنا ہے مہرباں ہے
یہ سارے مہرباں راہوں میں اس کی
بچھاتے ہیں ہوس کے دام و دانے

پدر کی خصلتِ بسیار نوشی
ہے وجہِ انتشارِ اہلِ خانہ
ربڑ کے باغ کی الھڑ سی لڑکی
یہ تنہائی میں اکثر سوچتی ہے
کمائی بھائی بہنوں اور ماں کی
مقامی میکدے کی آگ بن کر
گھر آنگن کو جلائے گی کہاں تک
کوئی ہمدم کوئی غم خوار ہوتا
اندھیرے میں مری انگلی پکڑ کر
کسی روشن ڈگر پر ڈال دیتا
جہاں ہوتی نہ یہ ارزاں فروشی

---

[1] سپروائزر
[2] منیجر

نوٹ:- ملیشیا کے ربڑ کے باغات میں زیادہ تر مدراسی قلی کام کرتے ہیں۔ مدراسی گھر لٹا کر شراب پیتے ہیں۔

آسی خانپوری

سوچ رہا ہوں

سوچ رہا ہوں
آج کوئی پھر نظم لکھوں
اور اس کے ہر اک شعر میں تیرا رنگ بھروں
روپ سروپ سجاؤں تیرا
ہر اک انگ نکھاروں
شوخ دمکتے رخساروں پر
مسکانوں کے دیپ جلیں
اور لمحوں کی پہچان بنیں
سوچ رہا ہوں
آج کوئی پھر نظم لکھوں
جس میں خدّ و خال ترے سب
لفظوں میں ڈھل جائیں
میرے خوابوں کو مہکائیں

احمد صغیر صدیقی

اہنسا

اُسے چیونٹیوں سے محبّت تھی
کہتا تھا وہ
"ان کو مت مارنا
فرش پر رینگتی چیونٹیاں قابلِ رحم ہیں
اتنی ننھی سی مخلوق پر پاؤں رکھنا شرافت نہیں
رزق کے واسطے
ان کی محنت ـــــ تگ و دو ـــــ لگن
اک سبق ہیں ہمارے لیے
ان کو چینی کے برتن، مٹھائی کے ڈبّوں میں، درزوں میں۔
ریخوں میں دیکھو ـــــ
تو ان کو مسلنے سے پرہیز کرنا
خدا کی زمیں پر
ہماری طرح
ان کو بھی زندہ رہنے کا حق ہے"۔

اُسے چیونٹیوں سے محبّت تھی
لیکن ہوا یوں
پھر اک روز اس کو بھی چیونٹیاں کھا گئیں۔

احمد منیر

قطعات

ترکِ تعلّق

یُونہی سی کوئی بات تھی دل میں اُتر گئی
بَرسوں کی رسم و راہ نجانے کدھر گئی
ترکِ تعلّقات کا عالم، خدا گواہ
دیکھا کیئے ہم اُس کو جہاں تک نظر گئی!

پائے ثبات

ذوقِ نظر کو منظرِ صد رنگ و بُو ملے
اپنی طرف جُھکے ہوئے جام و سبُو ملے
لغزش نہ آسکی مِرے پائے ثبات میں
ہر چند راستے میں بہت خوبرُو ملے

اپنی زمیں

اپنوں کو چھوڑ کر کوئی چاہے کہیں رہا
ہنگامۂ حیات میں عُزلت نشیں رہا
حاصِل ہوئیں زمانے کی آسائشیں تو کیا
اپنی زمیں سے کَٹ کے کوئی خوش نہیں رہا

تشخّص

جس سرزمین کے تھے وہیں کے نہیں رہے
پہچان کھو گئی تو کہیں کے نہیں رہے
بے باق کر دیا غمِ ہجرت نے ہر حساب
مقروض ہم کسی بھی زمیں کے نہیں رہے

دُنیا طلبی

اعجاز ہے فِطرت کا بہر رنگِ بہاراں
ہر پھُول کو پھر نازِ گُلستاں نسبی کیوں؟
دُنیا سے بہرحال چلے جانا ہے سَب کو
یہ سچ ہے تو پھر خواہشِ دُنیا طلبی کیوں؟

(لندن سے)

افکار فاؤنڈیشن۔ کراچی

"ایک فلاحی ٹرسٹ"

اردو رسالوں کی تاریخ میں پہلی بار اپنی نوعیت کے پہلے افکار فاؤنڈیشن نے بطور فلاحی ٹرسٹ یکم جنوری ۱۹۸۶ء سے اس کے بانی چیرمین صہبا لکھنوی اور سرپرست اعلیٰ جناب حکیم محمد سعید اور ملک کے اٹھارہ ممتاز دانشوروں، اہل قلم حضرات اور صاحبانِ علم و فن کی نگرانی میں اپنے نئے سفر کا آغاز کر دیا ہے۔

افکار فاؤنڈیشن کے کثیر المقاصد اور تعمیری منصوبوں میں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا فروغ، تحقیق اور نادر دستاویزات کی تلاش و ترتیب اور اشاعت، مستحق ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کے لیے بہبود فنڈ کا قیام، نونہالانِ قوم، خواتین اور نئی نسل کے تعمیری منصوبوں میں اشتراک و تعاون شامل ہے۔ اس فاؤنڈیشن کی تمام تر کامیابی رفیقانِ افکار، محبانِ اردو اور علم و فن کی ترویج و ترقی میں گہری دلچسپی رکھنے والوں کے پُرخلوص تعاون پر منحصر ہے۔ یہ بات زور دے کر کہنے کی نہیں کہ کوئی ادارہ مالی استحکام کے بغیر اپنے تعمیری منصوبوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا لہٰذا افکار فاؤنڈیشن کے ٹرسٹیوں نے جو تجاویز منظور کی ہیں ان کی تفصیلات "تعارف نامہ" میں شائع کر دی گئی ہیں جو آپ ایک کارڈ لکھ کر منگوا سکتے ہیں۔

ان تجاویز کی رو سے "افکار فاؤنڈیشن" کے سرپرستوں کے لیے کم سے کم دس ہزار روپے، معاونینِ خصوصی کے لیے پانچ ہزار روپے مقرر کیے گئے ہیں جو دو قسطوں میں بھی ادا کیے جا سکتے ہیں۔ رفیقانِ افکار جو عطیہ بھی سہولت سے ادا فرما دیں گے قبول کر لیا جائے گا۔ ذیل کا فارم پُر کر کے بھی بھیجا جا سکتا ہے۔

میں افکار کی خدمات کا معترف ہوں اور مجھے افکار فاؤنڈیشن کے مقاصد سے اتفاق ہے اس لیے بطور تعاون مبلغ ______ روپے بذریعہ کراس چیک / بنک ڈرافٹ ارسال ہیں۔
مجھے افکار کے سرپرستوں / معاونینِ خصوصی / رفیقانِ افکار میں شامل فرما لیجیے۔

نام ______________________

مکمل پتا ______________________

____

تاریخ ______________

دستخط ______________

فون: گھر ________ فون: دفتر ________

شاعر لکھنوی

شاعر لکھنوی۔ افکار کے دیرینہ رفیق اور ادارے کے معتبر شاعر تھے۔ افسوس کہ گزشتہ دنوں ہارٹ اٹیک جان لیوا ثابت ہوا اور وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ ان کی ایک غیر مطبوعہ غزل نذرِ قارئین ہے۔ (صہبا)

جدا ہو کر وہ ہم سے ہے جدا کیا؟ — سماعت کا صدا سے فاصلا کیا؟

خود اپنے عالمِ حیرت کو دیکھے — ترا منھ تک رہا ہے آئنا کیا؟

اندھیرا ہو گیا ہے شہر بھر میں — کوئی دل سب جلتے جلتے بجھ گیا کیا؟

میسّر اشک بھی ہیں، آہ بھی ہے — غمِ ناسازیٔ آب و ہوا کیا؟

لہو کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے — ترے رنگِ حنا کا خوں بہا کیا؟

چراغوں کی صفیں سونی پڑی ہیں — ہمارے بعد محفل میں رہا کیا؟

پرکھ پائے نہ جو اپنے لہو کو — وہ سمجھے گا مقامِ کربلا کیا؟

دلوں میں بھی اتارو کوئی مہتاب — زمیں پر کھینچتے ہو دائرا کیا؟

دیا اپنا بجھا دو خود ہی شاعر
ہوائے نیم شب کا آسرا کیا؟

○

مظہر امام

تم سے نہ ہم ملے تو زمانے سے کب ملے
جو لوگ بھی ملے وہ تمہارے سبب ملے

اب اتنا رابطہ بھی نصیبوں کی بات ہے
اس سے کہوں، بخیر ہوں، وہ چاہے جب ملے

میری گزارشوں پہ تو ہو گا ہی نرم دل
لیکن یہ آرزو ہے کہ وہ بے طلب ملے

تیرا ہی ایک رنگ سبھی سے الگ نہ تھا
اس راستے میں سارے مناظر عجب ملے

کل وہ ملا تھا راہ میں یوں مجھ سے ٹوٹ کر
جیسے ہوائے درد سے شاخِ طرب ملے

لیکن وہ فاصلہ جو انا سے انا میں تھا
یوں تو بدن بدن سے ملا، لب سے لب ملے

ہم تھے کہ آنسوؤں کے سفر پر رواں رہے
ورنہ بہت سے غم ہمیں ساغر بلب ملے

اک میں شکست و فتح مرا مسئلہ نہ تھا
ورنہ اسی محاذ پہ جتنے تھے، سب ملے

میں بھی گدائے بارگہِ ہجر ہوں امام
مجھ سے کنیزِ غم جو ملے، با ادب ملے

O

عطا جالندھری

موسم نکھر گیا تو ہواؤں میں دیکھنا
پھیلے گا رنگ و نور فضاؤں میں دیکھنا

منظر کی بے حسی میں بھی پنہاں ہے ایک کرب
سہما سا اک سکوت صداؤں میں دیکھنا

طے ہوں گے خود بخود رہِ منزل کے فاصلے
کیا ہے اثر یہ ماں کی دعاؤں میں دیکھنا

سیتحانِ باہنر مرے خوں کو چھپائیں گے
تو دے اٹھیں گے داغ قباؤں میں دیکھنا

ہم نے کچھ ایسے وقت میں ہجرت کی اختیار
گردش رہے گی دوستو پاؤں میں دیکھنا

شعلہ بدست جائیں گے گلشن میں جس طرف
آتش بھڑک اٹھے گی ہواؤں میں دیکھنا

ہم اکتسابِ نور بھی کس سے کریں عطا
راس آگیا ہے ہم کو خلاؤں میں دیکھنا

(برمنگھم سے)

ڈاکٹر راشد فضلی

وہی تیز و تند ہوا کا رخ، مری جاں کے پیچھے لگا ہوا
جسے سطحِ آب پہ چھوڑ کر میں سکوتِ بحرِ بلا ہوا

یہ عجیب خواہشِ جست تھی کہ کہیں مقام نہ مل سکا
نہ زمیں پہ اپنے قدم رکے، نہ ہوا سے میرا بھلا ہوا

وہی روز و شب کی مسافتیں، کسی جستجو، کسی درد کی
وہی پھیلتے ہوئے راستے، وہی پاؤں میرا تھکا ہوا

اسی مستعار سے لفظ میں یہ وجود میرا دبا دبا
میں شعورِ ذات لیے ہوئے پسِ آئینہ تھا پڑا ہوا

اسی انتظار کی راہ پر وہ ہجومِ شوق گذر گیا
تجھے سوچتا کوئی رہ گیا ترے راستے پہ کھڑا ہوا

جو قریب ہے وہی زندگی، جو بعید ہے وہ خیال ہے
تو قریب آ مری آرزو مری جاں کا در ہے کھلا ہوا

جو محال ہے وہ کمال ہے جو کمال ہے وہ مثال ہے
میں عروجِ فن کی تلاش میں رہا حیرتوں سے جڑا ہوا

(ریاض سے)

اظہار اثر

دل کے زخموں کو مہک، درد کو لذّت دی ہے
میرے خوابوں نے ہر اک شے کو حقیقت دی ہے

ورنہ محدود دشاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں
آسماں کو مری نظروں نے یہ وسعت دی ہے

عمر بھر زہر پیا تیرے لبوں کو چھو کر
ہم نے چھوٹی سی خوشی کی بڑی قیمت دی ہے

پھر مہکتی ہوئی آئی ہیں روپہلی کرنیں
چاندنی نے ترے آنے کی بشارت دی ہے

زندگی شہرِ حوادث ہے تو کیا غم ہے اثر
دن نکلنے کی ہر اک شب نے شہادت دی ہے

○

تصوّر کرتپوری

بھر گیا ہے جسم میں زہرِ تمنّا کس قدر
آنکھ بھر کر آج اس نے مجھ کو دیکھا کس قدر

شہر میں جیسے کوئی اپنا شناسا ہی نہیں
کر گیا مجھ کو شریکِ راہ تنہا کس قدر

مانگتے ہیں خیر اپنی کشتیوں کی ناخدا
موج میں آیا ہوا ہے آج دریا کس قدر

ایک چشمک کی طرح وہ سامنے آ کر چھپا
کیا بتاؤں میں نے اس منظر کو دیکھا کس قدر

ڈھل رہا ہے رفتہ رفتہ میرا خورشیدِ حیات
بڑھ رہا ہے میرے قد سے میرا سایہ کس قدر

○

واصل عثمانی

گلیوں گلیوں شور مچا ہے اک فتنہ بیدار ہوا
صبر و سکوں کے لمحے غارت زیست سے جی بیزار ہوا
ظلم و ستم معیارِ سیاست کذب و ریا اقدارِ حیات
حرفِ صداقت کم ظرفوں میں کتنا ذلیل و خوار ہوا
جن کے لبوں پر حرفِ وفا تھا جن کی زباں پر صدق و صفا
ان کی اک اک طرزِ ادا پر اہلِ خرد کا وار ہوا
جبر کے عہدِ سلطانی میں بے شک مرنا مشکل تھا
لیکن اس دورِ جمہور میں جینا بھی دشوار ہوا
پہلے بھی کب گھر میں سکوں تھا کس کو فراغت حاصل تھی
لیکن اب تو لمحہ لمحہ خنجر اور تلوار ہوا
ہم بھی مدح سرائی کرتے ہم بھی قصیدہ گو ہوتے
شکر ہے خواہشِ جاہ میں حائل شاعر کا پندار ہوا
ترکِ تعلّق کرنے پر میں کیا کیا قہر سے گزرا ہوں
واصلؔ زیست کا لمحہ لمحہ خود مجھ سے بیزار ہوا

سہیل غازیپوری

تیرے جمال کے جب عکس پڑنے لگتے ہیں
تو آئینوں کے بھی بخیے اُدھڑنے لگتے ہیں
یقین ہے کہ نہ بانٹو گے درد آپس میں
کہ ظلمتوں میں تو سائے بچھڑنے لگتے ہیں
جہاں کے لوگ شکاری ہوں فاختاؤں کے
وہ شہر بسنے سے پہلے اُجڑنے لگتے ہیں
دلوں کے کرب کو آنکھوں میں جذب کرنے سے
بہادروں کے بھی چہرے بگڑنے لگتے ہیں
زمیں پہ ایک ہی دستک ہوا جو دیتی ہے
گھنے درخت جڑوں سے اکھڑنے لگتے ہیں
ہم اس لیے بھی کوئی بات سچ نہیں کہتے
وہ ایسی بات پہ اکثر بگڑنے لگتے ہیں
متاعِ جاں نہ سنبھلتی ہو جن سے وہ بھی سہیلؔ
نکل کے ذات سے باہر اکڑنے لگتے ہیں

زاہد سعید زاہد

اپنے خیال و فکر کے مدّ و جزر میں ہے
ہر شخص بحرِ زیست کے اندھے سفر میں ہے

سوچیں حدودِ ذہن میں محصور کب تلک
خوشبو سکوں پذیر کبھی ایک گھر میں ہے

گولی چلی تو فاختہ گم ہو گئی، مگر
قصّہ ستم کا بکھرے ہوئے بال و پر میں ہے

وہ شخص کس طرح سے بنے گا مکینِ دل
مہماں جو بن کے ٹھہرا ہوا چشمِ تر میں ہے

جھکنے لگا تو کاٹ کے تن سے جدا کیا
ہر گھر کا سانحہ ہی تو بوڑھے شجر میں ہے

رُک جائے یہ تو کس طرح پانی رواں رہے
دریا کا سارا زور ہی زاہد سفر میں ہے

○

منوّر بلوچ

لوگو مجھ کو کریاں والا کیسے موڑ پہ لایا ہے
میں جس کی ایک دید کو ترسوں، وہ میرا ہمسایہ ہے

اللہ ہی باقی رہنے والا، اس کے ہی آگے جھک آ بندے
حشمت، عزت، یہ سب کچھ تو چار دنوں کی مایا ہے

شعلے اگلتی یادیں تیری، زیست کا گہرا سخت مزاج
اور اس پر جذبات نے مجھ پر کیا کیا ظلم نہ ڈھایا ہے

گُل بدنوں کے ساتھ گزارے دن ہی تو اپنی پونجی ہیں
شعروں کا یہ مجموعہ ہی اپنا کُل سرمایہ ہے

گہرے پانیوں جیسی آنکھیں، سُرخ اناروں جیسے گال
جب بھی وہ یاد آیا منوّر، ٹوٹ کر ہی یاد آیا ہے

○

حفیظ شاہد

دل کے ارمان خوبصورت ہیں
غم کے عنوان خوبصورت ہیں
میں ہوں انساں، مری نگاہوں میں
سارے انسان خوبصورت ہیں
زر اگلتی ہوئی مری فصلیں
میرے کھلیان خوبصورت ہیں
حسرتیں، آرزوئیں، امیدیں
دل کے مہمان خوبصورت ہیں
مجھ کو اپنا بنا لیا تو نے
تیرے احسان خوبصورت ہیں
پڑھ رہا ہوں کتاب چہروں کی
سارے عنوان خوبصورت ہیں
شاہدؔ، اس کے حسین رُخ کی طرح
اس کے پیمان خوب صورت ہیں

جان کاشمیری

دل جلانے کا اسے کیا کیا ہنر آتا نہیں
شہر میں آتا ہے لیکن میرے گھر آتا نہیں
فرق یہ ہے زخمِ تن اور زخمِ دل کے درمیاں
اک نظر آتا ہے سب کو اک نظر آتا نہیں
اگلی دنیا تیرے جوبن کی طرح ہے پُرکشش
کوئی بھی انساں اُدھر جا کر اِدھر آتا نہیں
اس کو کہتے ہیں وفا میں عالمِ وارفتگی
آنکھ کو تیرے علاوہ کچھ نظر آتا نہیں
حلقۂ یاراں سے ہی کرنا پڑے گا انتخاب
آسماں سے بھول کر بھی راہبر آتا نہیں
روزِ اوّل سے جہاں میں حکمرانی اس کی ہے
دل کبھی انسان کے زیرِ اثر آتا نہیں
جانؔ یہ ہے نامکمل سی محبّت کا ثبوت
وعدہ کرتا ہے وہ آنے کا مگر آتا نہیں

اکبر حمیدی

لکھے تو لکھ نہیں پائے جو ہم پہ گذرے ہیں
وہ کاغذوں سے زیادہ قلم پہ گذرے ہیں

مثالِ زخم ترے دل کو بھی لگے ہیں کبھی
جو آئینے ترے سنگِ ستم پہ گذرے ہیں

خدا کے نام پہ کی ہے خدائی لوگوں نے
عرب کے سانحے اہلِ عجم پہ گذرے ہیں

پہاڑ پر بھی وہ گذریں تو ریزہ ریزہ ہو
وہ جبر و صبر کے عالم جو ہم پہ گذرے ہیں

کبھی یہ سوچنا اکبرؔ کہ دہر میں تم نے
جو حادثات سُنے تھے وہ ہم پہ گذرے ہیں

○

احمد فاخر

پھول پلکوں پہ کھلا دیتا ہے
درد آنکھوں کو سجا دیتا ہے

سرد ہوتے نہیں یادیں یا دیں
کون شعلوں کو ہوا دیتا ہے

میرے ویران مکاں میں شب کو
کوئی اک شمع جلا دیتا ہے

وہ بھی ملتا ہے صبا کی مانند
پھول سا دل میں کھلا دیتا ہے

شہرت چھوڑ کے جانا فاخرؔ
کوئی چپکے سے صدا دیتا ہے

○

محمود واجد

واجبات = اثاثہ

جب وہ چلنے لگے تو انھوں نے کہا۔
"ان کا خیال رکھنا"
اور تب سے میں واجبات کو اثاثہ سمجھ رہا ہوں۔
حسابیات کی کتابوں میں مساوی کی تعریف اس طرح لکھی گئی ہے۔

اثاثہ = دعویٰ
= واجبات + سرمایہ
∴ سرمایہ = دعویٰ - واجبات

مسئلہ یہ ہے کہ اب میں سرمایہ کسے کہوں - واجبات کو دعویٰ سے منہا کرتا ہوں تو میرے پاس کچھ نہیں بچتا۔ اب کاروبار کس طرح ہو۔

دوسری بار جب میں سمندری جہاز سے شہر پناہ میں داخل ہوا تھا تو دونوں وقت مل رہے تھے - جہاز سے اترتے اترتے رات ہوگئی۔ قدیم سڑک سے آتے ہوئے ایک ٹیلے پر ایک روشن ٹوپی نظر آئی - اس کی چمک نے میری آنکھوں میں اتنی بینائی پیدا کی کہ اگر سر برہنہ بھی ہوتی تو مجھے احساس ہوتا کہ میں وہ ٹوپی پہنے ہوئے ہوں - برسوں بیتے - نئی روشنی نے پرانے چلن کی جگہ لی۔ میں ہوں کہ اپنی وضع پر قائم ہوں - کم از کم چالیس بیالیس برسوں سے میرا یہی رویّہ ہے - میری عمر سے اگر یہ برس نکال دیے جائیں تو اسکول کا ایک بچہ رہ جاتا ہے جو فوٹ بال کے میدان سے بھاگ کر سڑک پر آ گیا ہے اور بھیڑ کے اس نعرے میں شریک ہو گیا ہے جس میں کتنا اور مرنا شامل ہے اور اسی لیے اب تک یہی کچھ ہو رہا ہے کہ اس میں معصوم دعاؤں کا آہنگ مل گیا ہے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار بس سے سفر کرتے ہوئے ایک بزرگ نے اس نوجوان کو ٹوکا تھا جو انقلاب انقلاب کا نعرہ لگاتے ہوئے بس پر سوار ہو گیا تھا کہ اس لفظ میں وہ سحر ہے جس کو سن کر قلوب منتقل ہو جاتے ہیں - بھائی بھائی نہیں رہتا، دوست دوست نہیں رہتے، سارے رشتے تاش کے پتوں کی طرح بکھر جاتے ہیں اور صرف کھیل رہ جاتا ہے۔

میرے والد کہا کرتے تھے کہ حق کی گواہی دینا حق کا تقاضا ہے، لیکن حق جتانا اور حق لینا ایک ہی بات نہیں، اور اسی لیے

ان کی کھلی آنکھوں کے سامنے مجھے فیصلہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ لیکن جب میں نے فیصلہ کرلیا تو کوئی نہ تھا جو یہ کہتا کہ یہ اس روٹی کا فیصلہ ہے جو آج میرے ہاتھ میں نہیں اور کل اس کا فیصلہ وہ کریں گے جن کے ہاتھوں میں یہ نہیں ہوگی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جو لوگ میری زبان میں لکھے ہوئے مقدس زبان کی مقدس تحریر سمجھتے تھے انھوں نے مقدس مقامات کی بھی پروا نہیں کی کہ یہ ان کا اثاثہ نہیں تھا۔

میرے سامنے میرے صحافی دوست نے جو ٹیک ایکشن کے بعد ان مقامات کے پہلے گواہ بن کر گئے تھے چند تصویریں بکھیر دی تھیں میں نے اس دن کھانا نہیں کھایا تھا۔ ساری رات بستر پر کروٹ بدلتے گزر گئی تھی۔ مجھے ان کے گریبان پر پڑا ہوا وہ ہاتھ بھی نہیں بھولتا جو نشریاتی ادارے سے نکلتے ہوئے سرزنش کے طور پر اٹھا تھا کہ انھوں نے وہ ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔

پھر تو سب کچھ بدل گیا تھا۔ مشترکہ فاتح جب اس شہر میں داخل ہوئے تھے تو میرے ایک دانشور دوست نے کہا تھا کہ اب گھر جاؤ اور بیوی بچوں سے اچھی اچھی باتیں کرو۔ میں چلا تو آیا تھا مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ اب ہم چند لمحوں کے مہمان ہیں۔ چنانچہ سڑک پر چلتے ہوئے پچھلے دنوں کی طرح مجھے ڈر نہیں لگا تھا بلکہ معاون ملک کے جوان محافظ مجھ سے کھل کر باتیں کرنے لگے کہ وہ میری زبان بول رہے تھے۔ کئی روز تک یہ سلسلہ رہا۔ وہ ہمیں محفوظ مقامات تک منتقل کر رہے تھے۔ وہ ہمیں کھیل ختم ہونے کی خبر دے رہے تھے۔ وہ ہمیں اپنی زمین پر چلنے کو کہہ رہے تھے کہ زبان اور زمین اس زمانے کی سب سے بڑی حقیقتیں ہیں۔ ہمیں وہ اپنا نقصان بھی بتا رہے تھے، مگر ہمیں اپنے طور پر اس سے بڑے نقصان کی فکر تھی۔ ہم نے سب کچھ دیکھا سب کچھ سنا مگر کیا وہی جو ٹوپی کی موجودگی میں ممکن تھا۔ گو ہم نے وہ روشن ٹوپی ابھی خود نہیں دیکھی تھی، لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم ٹوپی لے کر پیدا ہوئے تھے یا ٹوپی ہمارے اندر کہیں موجود تھی۔

مجھے وہ صبح نہیں بھولتی۔ چند ہی روز بعد بقرعید آگئی تھی۔ اس سے دو دن قبل میری طرح پناہ لیے ہوئے ایک نوجوان لڑکے نے کہا تھا کہ اب کے ہماری قربانی ہوگی اور دوسرے دن سچ مچ روزانہ کے معمول کی طرح چند نوجوانوں کے ساتھ وہ بھی اٹھا لیا گیا اور مذبح خانے کی زینت بنا (بھیڑ بکریوں کو بھی اٹھاتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ ان کا مالک کون ہے) یہ مقدس عقیدے کے لوگ تھے۔
بقرعید کی صبح عجیب تھی۔ ہم بڑی مسجد کے میدان میں جمع تھے۔ سنگین بردار معاون محافظ پہرے پر متعین تھے۔ امام نے نماز عید کے بعد جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو سارے ہاتھوں میں آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی" یا رب العلا! ہم تیرے حضور میں حاضر ہیں اور تیرا کرم دیکھ رہے ہیں۔ کل جن کی بمباری سے ہم محفوظ مقامات کی تلاش میں بھاگتے پھرتے تھے آج تو ان سے ہماری حفاظت کرا رہا ہے۔ کل جو ہماری نمازوں میں شریک تھے آج عقوبت خانوں میں ہمارے منتظر ہیں۔ یہ کیسا کرم ہے میرے مولا ـــــ کیسا کرم!"

عجیب وقت تھا۔ ہم نے سنگینوں کے سامنے سنگینیں تنی ہوئی دیکھی ہیں۔ پہلے طعنے سنے!" احسان فراموش! ہم نے تمہیں یہ دن دکھلائے۔ ہم نے تمہیں بار برداری کے لیے استعمال کیا۔ کیسی فوج اور کیا تمہاری طاقت!" پھر انھیں جانا پڑا کہ وہ مجبوسوں سے وہ چیزیں خرید رہے تھے جن کے سہارے وہ جسم و جاں کے رشتے کچھ روز اور قائم رکھنے کے قابل ہو سکے تھے۔ پھر دن بھر شہر یا گاؤں کے سڑک کے بچے ہیں عارضی یا مستقل، بنے ہوئے کیمپوں تک ڈھکیلتے تھے۔ ٹوپی ان کے ہاتھ سے گر گئی تھی اور وہ اٹھانے کے لیے دوڑ رہے تھے۔
اور اب کہ پھر کچھ لوگ اثاثے کے لیے دوڑ رہے ہیں واجبات کی شرط کو سمجھے بغیر تو میں سوچ رہا ہوں ـــ کاش ٹوپی ان کے سروں پر رہ جائے اور یہ دیکھ سکیں ـــ دور بہت دور!

رفعت مرتضیٰ

تعارف

"میرا دل بہت کھٹا ہو گیا ہے ـــــ بہت ـــــ اتنا کہ میں اب اکثر خود سے پوچھتی ہوں۔ کیا انسانیت پر میرا بھروسہ قائم ہے یا اٹھ گیا؟"

"پھر کبھی میں سوچتی ہوں قصور شاید انسانیت کا نہیں ہے۔ انسان بھی اپنی جگہ پر بس ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ قصور اصل میں میرے ہارمون کا ہے۔ یہ میرے ہی ہارمون ہیں جو گڑبڑ کر رہے ہیں"

"کبھی یوں ہوا ہے تمہارے ساتھ کہ بلا وجہ ہی رونے کو جی چاہنے لگے یا بغیر کسی وجہ کے طبیعت جھگڑالو ہو جائے؟"

"یا جی چاہے کہ کمرے میں بند ہو کے بس بیٹھے ہی رہیں۔ نہ بولیں، نہ بات کریں، نہ ہی کچھ سوچیں؟"

"کیوں؟ ایسا ہوا ہے کبھی تمہارے ساتھ؟"

وقفے وقفے سے اس نے کتنی ہی اسٹیٹ منٹس جاری کیں، مگر وہاں خاموشی ہی رہی جیسے مخاطب دیوار ہو۔

"میں نے اخبار پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ طبیعت اور بھی الجھ جاتی ہے۔ صبح سویرے مرنے مارنے کی خبریں۔ کس کا دل چاہتا ہے اپنی صبح یوں شروع کرنے کو، اور جب دیکھو کوئی نہ کوئی بچہ اپنی طبعی زندگی کا سارا راستہ، چلتا، کھیلتا یا بسورتا، کامیاب یا ناکام، معمولی یا غیر معمولی، طے کیے بغیر ہی غیر طبعی موت مر جاتا ہے۔ مجھ میں اب ہمت نہیں رہی ایسی باتوں کے لیے ـــــ"

سامنے بڑے اسکرین پر ٹام نے چوہے دان میں پنیر کا ٹکڑا لگایا اور اسے جیری کے بل میں دھکیل کر خود تاکا پکڑ کر دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ اندھیرے میں جینی کی ہنسی ایک گول دائرے کی صورت اوپر کو اٹھی، پھیلی کہیں اندھیرے میں غائب ہو گئی ـــــ "اور تم کو پتہ ہے قاتل کون ہوتے ہیں؟"

اس نے جینی کی ہنسی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

"پوچھو ـــــ پوچھو کون؟ اگر میں بتاؤں کہ کبھی ماں اور کبھی باپ تو تم شاید کہو گی کہ رشتے تو قاتل نہیں ہوتے اور میں تم سے پوچھوں کہ پھر یہ کیا ہے، کیا ہے یہ؟ تو تمہارا جواب کیا ہوگا تمہارا جواب؟"

"تم کو ہائی پر ٹینشن (HYPERTENSION) ہو گیا ہے" خاموشی کی دیوار سے جواب آیا۔ وہ چپ ہو گئی۔

"اور یہ کس نے کہا کہ خون کے رشتے محبت کے رشتے بھی ہوتے ہیں۔ یہ ضروری تو نہیں!" دلیا رنے پھر خود ہی بات شروع کی۔ "نئے زمانے نے رشتوں سے محبتوں کو منہا کر دیا ہے۔ یہ زمانہ آگے نکلنے، سب کو مات دے کر آگے جانے، جیتنے کے اسٹریس کا ہے۔ اخبار اگر تمہارے ہاتھوں سے گر جاتا ہے تو قصور تمہارے ہاتھ کی کمزوری کا ہے ——— زمانے کا نہیں، یہ دوڑ کا دور ہے اور دوڑنے والے کا اور دوڑ کا ——— ایک ہی شریک ہوتا ہے ——— سمجھیں؟ مگر تم کو چپ نہیں رہنا ہے کیا؟"

"جینی میں بہت ڈس ٹریسڈ (DISTRESSED) ہوں۔"

"سن لی ہے تمہاری ڈس ٹریس کال ——— مگر اس سے ہوتا کچھ نہیں۔ یہ میں اس لیے نہیں کہتی کہ میں کے لس (CALLOUS) ہوں۔ اس لیے کہتی ہوں کہ میں نے اس ڈوبتھ لیس (RUTHLASS) دنیا سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اس کو اس کے راستے پر جانے دیتی ہوں اور خود اپنے راستے پر رہتی ہوں۔ نہ خود اس کے راستے میں آتی ہوں نہ اسے اپنی پگ ڈنڈی کو کاٹنے دیتی ہوں۔"

"یہ تو ممکن ہی نہیں۔"

"یہ تمہاری سوچ ہے ———" جینی نے پیر آگے کر کے کرسی کھینچ کر ٹکٹ بوتھ کے دروازے کے پاس کی اور پھر اس پہ بیٹھ کر دونوں پیر سامنے پھیلا دیے ——— خاموشی ———

بل میں چھپے بیٹھے جیری نے چوہے دان میں ڈائنامیٹ پھنسا کر تلگے کو جھٹکا دیا اور خود منہ سے لے کر پنیر کھانے لگا۔ دوسری طرف ٹام کی مونچھیں اپنے منصوبے کی کامیابی پر خوشی سے پھڑپھڑائیں اور دروازے کے پیچھے چھپے چھپے اس نے تاگا کھینچنا شروع کیا۔

"سنک کر کہیں کا ——— اس کو کبھی تو عقل آئے گی ———" جینی پھر زور سے ہنس دی۔ اس کے ساتھ ہی اسکرین پر ڈائنامائٹ پھٹا اور اس کی پھلجھڑیوں میں ٹام کا بچا کھچا جلا ہوا سراپا نظر آیا۔

"تم روز یہ کارٹون دیکھتی ہو، پھر روز تمہیں ہنسی بھی آتی ہے کیسے؟ تم نے خود کو کسی روبوٹ کی طرح کنڈیشن کر لیا ہے کیا؟"

"تمہاری پرابلم کیا ہے؟"

"میری پرابلم، بس میرا دل گھٹا ہو گیا ہے۔"

تو ہو جانے دو۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ عادت ہو جائے تو کھٹے پن کا احساس ہی نہیں رہتا ———" خاموشی۔ ٹام اور جیری کی جگہ اب چارلی براؤن اور پیپرمنٹ پیٹی آگئے۔ کسی نے بوتھ کی کھڑکی بجائی۔

"لو ——— یہ اب آ رہے ہیں ٹکٹ لینے ———" وہ اٹھی اور مشین کی طرف چلی گئی۔

"بات صرف اتنی تھی ———" اس نے واپس آتے ہی یوں بات شروع کی جیسے سلسلہ ٹوٹا ہی نہ تھا۔

"بات صرف اتنی تھی کہ اس کی بیوی نے پورا دن بچے کی ذمے داری، دیکھ بھال، سب کام کیا۔ شام آئی تو اس نے بچے کو باپ کے حوالے کیا کہ اب وہ اس کی دیکھ بھال کرے اور خود پرس اٹھا کر باہر نکل گئی۔ کھیلتے کھیلتے بچے کو ماں کی یاد آئی تو روتے روتے اس نے باپ کے پاس جا کر اس کا ہاتھ پکڑنے، اس سے لپٹنے، کچھ تھوڑی محبت اور توجہ کی گرمی پانے کی کوشش کی ——— جب کہ سارے دوست مل کر فرائیڈے نائٹ منا رہے تھے۔ پول کھیل رہے تھے۔ بیئر پی رہے تھے ——— اور بچہ تھا کہ چپ ہی نہیں ہو رہا تھا!"

"فکر نہیں کرو ——— وہ چھٹ جائے گا۔" جینی نے آہستہ سے کہا۔

"وہ چھٹ جائے گا ——— اور بچہ؟ بچہ جینی بچہ؟ ماہر نفسیات بھی یہی کہہ رہا ہے کہ اس کو چھوڑ دو، دن بھر کے کام کے

آخر وہ بھی انسان ہے۔
بعد اس کو بھی تفریح کی ضرورت ہے۔ دن میں کام کا بوجھ، شام میں بچوں کی دیکھ بھال کا اسٹریس ـــــ
اس کے کچھ حقوق بھی ہیں بحیثیت انسان کے ـــــ ایسی سچویشن میں کوئی بھی سوچ سمجھ کی صلاحیت کھو سکتا ہے ـــــ وہ قصوروار نہیں۔
اس کو چھوڑ دو ـــــ ماہر نفسیات سے کوئی تو پوچھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟
"تصویر کا صرف ایک ہی رخ نہیں ہوتا ـــــ اور ٹکٹ دے دیے تم نے؟"
"ٹکٹ؟ اس نے یوں کہا جیسے کچھ سمجھی نہ ہو۔ پھر وہ جھنجھلا گئی ـــــ "کس قدر بے حس ہو تم"
"پتّہ مر گیا ہے میرا ـــــ" جینی نے اطمینان سے جواب دیا۔
"سبھی کے پتّے مر گئے ہیں۔ واقعی مر گئے ہیں یا مار دیا ہے خود ہی؟"
"تو تمہیں کیا مل رہا ہے جل کڑھ کر؟"
بہت وائلنٹ
وہ چپ ہوگئی۔ اسکرین اندھیرے میں چلی گئی مگر پل بھر بعد ہی پھر روشن ہوئی اور اس کے ساتھ فلم شروع ہوگئی۔
قسم کے سین سے۔ دو آدمیوں نے ایک عورت کو اس کے ہاتھ پیروں سے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ ان کے چہروں پر درندگی تھی۔
آنکھوں میں سفّاکی اور ہونٹوں پر شہوت، اور تیسرا آدمی ـــــ عورت کی آنکھیں حلقوں سے نکلی پڑ رہی تھیں اور منہ سے کف۔
پلنگ کے نیچے چھپی بچی فرش پر ہونے والے اس ٹیبلو کو پتھرائی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔
"یہاں اس
"ساری برائی یہاں سے شروع ہوتی ہے ـــــ یہاں!" اس نے ہاتھ پھیلا کر اندھیرے کی سطح پر پھرایا ـــــ
وقت اس ڈرائیو اِن میں کتنے لوگ ـــــ کتنے تماشائی ـــــ لڑکے لڑکیاں اس کو دیکھ رہے ہیں۔ کیا اس سے کوئی اثر نہیں لے
رہے ہوں گے؟ شاید پُرہیجان ہو رہے ہوں گے ـــــ کیا پتہ۔ یہ تو خود سے بحث دینے والی بات ہے"
"دیکھو ـــــ کیا ہونا چاہیے کیا نہیں ـــــ یا یہ طے کرنا کہ کیا اچھا ہے کیا برا ـــــ اس کا تمہیں اختیار نہیں۔ تمہاری رائے
میں کیا وزن ہے۔ اس کا فیصلہ بھی میں نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ یہ کام اس میدان کے ماہرین کی ذمّے داری ہے۔ اگر معاملات کو تم نے
یا میں نے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی ـــــ یا کسی نے بھی ـــــ تو وہ کیا کریں گے؟ اس فلم کی وجہ سے کچھ ہوا بھی تو اس کی دیکھ بھال
کے لیے بھی موجود ہیں ـــــ تم میں، کیوں پریشان ہوں؟"
"تو پھر شاید یہ میرے ہارمون ہی قصوروار ہیں۔ انھیں میں اونچ نیچ ہوگئی ہوگی" اس نے دبے لہجے میں کہا۔
"ہم سبھوں کے ہارمون خراب ہوگئے ہیں" جینی نے اسے تسلّی دی۔
سامنے پردے پر چلتی فلم میں متحرک سایوں کا کھیل جاری تھا، خاموش کھیل، اسکرین سے نکلنے والی روشنی کے عمودی مینار
میں کہیں کہیں دھوئیں کی لکیریں اندھیرے غار سے اٹھ کر اوپر کو جاتی نظر آتیں۔ کبھی کوئی مچھر، کوئی پتنگا جان ہارنے کو روشنی کی اس
دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتا۔
کبھی کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ یہ دھواں کیسا ہے، کچھ دیر بعد اس نے کہا۔
"شش شش" ـــــ اندھیرے کے اس طرف سے آواز آئی۔
"کون ہے یہ" ـــــ وہ ایک دم ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔
"لوگ یہاں تفریح کے لیے آتے ہیں" جینی نے اسے تنبیہہ کی۔ ان کی آزادی، ان کی پرائیویسی، تمہیں کچھ خیال بھی ہے کہ نہیں؟"

"تو مجھے کس نے بتایا ہے کہ آزادی کا مفہوم وقت، حالات اور ذاتی مفاد کے تحت بدلتا رہتا ہے۔"

"ذاتی مفاد ——" جینی ہنس دی۔" یہ پہلی بات تم نے سمجھ داری کی کی ہے۔"

"میرا تو دل کھٹا ہو گیا ہے —— میں تو واپس چلی ہی جاؤں گی ——" اس نے پھر آہستہ سے کہا۔

"جیسے ضرورہی —— !" جینی ہنس دی۔

اسکرین پر بے آواز ہنگامے جاری تھے۔ کہانی آگے جا چکی تھی، مگر پھر پلٹ پلٹ کر واپس آتی تھی۔ بار بار وہی ایک سین پردے پر جھلک دکھا کر غائب ہو جاتا اور بچی کی بے جان آنکھیں جیسے بند ہونا بھول گئی تھیں۔ کبھی رات کو تکیے پر سر رکھے۔ چت لیٹی چھت کی طرف دیکھتی رہتی۔ کبھی گھاس پر لیٹی آسمان کو تکتی ہوئی۔ نظر کے سامنے کوئی تصویر جامد تھی جس نے پلک جھپکنا بھلا دیا تھا، جیسے نظریں اس تصویر سے پیوست پلٹ کر واپس آنا بھول گئی تھیں۔ ڈاکٹر، ماہر نفسیات، کاؤنسلرز سب ہار رہے تھے۔ مگر باپ ہار ماننے کو تیار نہیں۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم مذہب سے دور چلے گئے ہیں؟" اس نے پھر بات شروع کی۔

"اُفوہ —— اب کیا ہے بھئی۔" جینی نے اکتاہٹ سے کہا۔

"یونہی ایک بات ذہن میں آئی تھی۔ اصل میں قبلہ نما زندگی میں بہت اہم رول ادا کرتے ہیں —— قطب نما —— قبلہ نما —— راستہ بھٹک جانے کا ڈر ہو جاتا ہے بھئی ——" جینی پھر خاموشی کی دیوار کے پیچھے چلی گئی۔

"ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے —— فضا میں، ہوا میں کھانے پینے کی اشیا میں ملاوٹ ہو گئی ہے —— کثافت بڑھ گئی ہے۔ شاید اس نے ہماری طبیعتوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہم ہم نہیں رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہماری سوچ، ہمارے اعمال، افعال انارکی کا شکار ہو گئے ہیں۔"

"پھر کچھ دوسرے خوف بھی ہیں۔ جیسے ساتھ نہ دے سکنے کا خوف —— پیچھے رہ جانے کا خوف —— اس لیے کہ جو پیچھے رہ جاتا ہے پھر اس کا کوئی ساتھی نہیں ہوتا —— تو کوئی ساتھی نہ ہونے کا خوف —— رد کر دیے جانے کا خوف ——"

"یہ خوف —— وہ خوف" جینی نے اس کی بات اُچک لی۔

"تم کو میرا مذاق اڑانے کی ضرورت نہیں —— میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ انسان کے دکھ، غم، خوشیاں، ناکامی اور کامیابی —— وہ پیدا ہوا تو اس کے ساتھ پیدا ہوئے —— ہم یہ کیوں یاد نہیں رکھتے —— کیوں گھبراتے ہیں؟"

"تم کو اچھی طرح معلوم ہے میں یہ فلم دیکھ رہی ہوں۔"

اور تم کو بھی معلوم ہے کہ پچھلے ایک ہفتے سے تم یہ فلم دیکھ رہی ہو۔ مجھے تو یہ دیکھ کر بھی منظر یہ منظر یاد ہو گیا ہے۔ تم اس میں کیا ڈھونڈتی ہو؟"

"تم کیوں گرد و پیش سے سمجھوتہ نہیں کر لیتیں؟ وقت سے نبٹنا بھی آ جائے گا۔"

"اور تم نے کیوں راہِ فرار اختیار کی ہے؟ کیا کچھ کرنا، کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتیں؟"

یہ تم نے دوسری بات کہی جو بالکل صحیح ہے۔ مجھے کچھ بھی کرنا نہیں ہے۔"

"بے حس —— خاموشی"

کسی نے گاڑی اسٹارٹ کی، پھر بند کر دی۔ کسی لڑکی کے ہنسنے کی آواز بلند ہوئی اور فوراً ہی ڈوب گئی۔

"آخر وہ بھی تو لوگ تھے جو ڈرامے کے کرداروں کے ساتھ روتے تھے، ساتھ ہنستے تھے۔ وہ غصّے میں آتے تو ان کو غصّہ آتا۔ وہ جھنجلاتے تو یہ جھنجلاتے۔ بے بسی کا احساس بوجھ کی طرح دبانے لگے تو زمین پر لوٹ لگاتے، بال نوچتے، سینہ کوبی کرتے اور ڈراما ختم ہونے تک اپنے اندر کی کثافتوں سے پاک، دھلے دھلائے، نئے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹا جاتے تھے۔ اس وقت تو ایسے گھناؤنے اور شرمناک جرائم نہیں ہوتے تھے۔ اب ہم انسانے بھی ہیں اور تہذیب و تمدّن کے نام پر کھل کر ہنسنے اور رونے بھی نہیں دیتے۔ انا اور امیج کے بھرم کو بنائے رکھنے میں خود کو تہہ در تہہ چھپائے رکھتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں، اعصاب کو تھپکنے بہلانے کے لیے گولیاں کھاتے ہیں، فرسٹریشن کے بھوت سے بچنے کے لیے منشیات کی طرف بھاگتے ہیں۔ ہم مہذب ہیں تو پھر جب یہ نشہ، یہ شراب، گولیاں، دوائیاں، ہماری سوچ سمجھ کے دروازے بند کر کے ہمیں نہتّا کر دیں تو ہمارا کیا قصور؟ کسی کی عزّت لٹ جائے، کسی بچّی کی آنکھوں کے سامنے اس کی سجی سجائی دنیا دنیا اجڑ جائے، فرائیڈے نائٹ کو دوستوں کے ساتھ پول روم میں بیئر نہ پی سکنے کی سزا میں ایک معصوم بچّے کی جان چلی جائے تو ہمارا کیا قصور؟ ماہر نفسیات ٹھیک ہی تو کہتا ہے کہ ارتکاب جرم کے وقت ذہنی حالت درست نہیں تھی، پھر سزا کیوں؟ کیا ہے یہ سب؟"

"تمہاری اس لمبی تقریر کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ تم بھی یونہی خود کو اذیت دے رہے ہو۔" جینی نے نرم لہجے میں کہا۔ "تمہارے احساس کے تاویے ابھی کند نہیں ہوئے اسی لیے تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔ مگر یقین کرو —— یہ کیفیت گزر جائے گی ——"

"دنیا میں آخر اور ملک بھی تو ہیں ——" اس نے جینی کی بات سنے بنا اپنی بات جاری رکھی۔ "پسماندہ —— غیر ترقی یافتہ ——!"

"ہاں کیوں نہیں —— ہیں اور بھی ملک" جینی نے اس کی بات اُچک لی۔

"وہاں ایسے ہوتا ہے کیا۔ تم ہی بتاؤ —— ہوتا ہے ایسے کیا؟"

"تمہارا خیال ہی ہے —— اب تم نے اور ملکوں کا ذکر چھیڑا ہے تو میں ان کی بھی بات کر لیتی ہوں تم سے۔ فکر نہیں کرو۔" جینی نے تیزی سے کہا۔ "میرے کان پک گئے ہیں ایسی باتوں سے —— ایسے سوالوں سے —— تم کو جواب کی تلاش ہے۔ سبھوں کو یہاں پہنچ کر سوال سوجھنے لگتے ہیں۔ جواب کی تلاش رہنے لگتی ہے —— اور آج میں دوں گی تمہیں جواب ——" جینی کی نرم آواز میں غصّہ ابھر آیا۔

"تم کس لیے غصّے میں آ رہی ہو۔ تمہارا تو کوئی ملک نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں —— تھا میرا بھی ایک ملک۔ میرے اجداد نے اسے ترک کیا اور جلا وطنی اپنے لیے تجویز کی تو کیا ہوا؟" جینی نے تیز لہجے سے کہا۔

"وہ تعلق جو ان کے اور ان کے وطن کے درمیان تھا کیا ٹوٹ گیا۔ کیا یہ وجہ ہے تمہاری ناراضی کی؟"

"دیکھو —— ایک بات سنو، اگر کوئی کام کرو تو پورے دل کے ساتھ کام کرو، ورنہ نہیں۔ آزادی کچھ ہم نے دے دی، کچھ دوسروں نے ہم سے لے لی، مگر پھر بھی کچھ فیصلے اب بھی ہمارے ہی اختیار میں ہیں، فیصلے اچھے ہوں یا بُرے —— مگر جب ایک بار ہم کر ہی لیتے ہیں تو پھر اور کسی کو الزام نہیں دیتے۔ ذمّے داری قبول کرتے ہیں۔ میرے اجداد نے بھی یہی کیا۔ ذمّے داری قبول کی اور آج تک نبھا رہے ہیں —— خوش ہیں —— ناخوش ہیں اس سے غرض نہیں، مگر کسی کو الزام نہیں دیتے۔ کسی کو بُرا نہیں کہتے۔ اور یہ جو تم اخبار کی خبروں کا ذکر کر رہی تھیں تو وہ بھی ایک بڑا سبق ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ چائلڈ ابیوز کے قصّے۔ سزائیں۔ بہت سے ماہر قتل کو راہ پر رکھتے ہیں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ جانتی ہوں۔ مگر تم بھی مجھے ایک بات کا جواب دو —— تم جن ملکوں کو گلوری فائی کرتا

چلی تھیں کیا وہاں بچوں کو ابیوز نہیں کیا جاتا ؟ بہنیں بھائیوں کے ہاتھوں بیٹیاں باپوں کے ہاتھوں خراب ہوتی رہتی ہیں، مگر وہاں ایسے جرم شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ مائیں، بہنیں، بیٹیاں پردہ ڈال دیتی ہیں۔ ڈھک دیتی ہیں۔ جرم کے کیڑوں کو اندر ہی اندر پلنے دیتی ہیں۔ کیمرے کالیبس، لیزر بیم، الٹرا وائیلٹ ریز، ایکس ریز۔ یہ سب بڑے کام کی چیزیں ہیں، مگر افسوس —— اور شاید تمہارے لیے اچھا ہی ہے کہ وہ جگہیں ابھی ان سے کام لینا نہیں جانتیں، فائدہ اٹھانا نہیں جانتیں —— اچھا ہی ہے —— ورنہ بڑے بڑوں کی، سفید پوشوں کی —— پگڑیاں اچھل جائیں گی اور بہت سے بھولے بھالے اس سچ کے جھٹکے ہی سے مر جائیں گے۔ اچھا ہے کہ جانتے نہیں، رہنے دو ان کو ان کی جنتوں میں —— اور اب چپ ہو جاؤ اور جو کچھ فلم باقی رہ گئی ہے وہ ذرا اطمینان سے دیکھ لینے دو ——"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سچ کے بھی کیا کیا رنگ نہیں ہوتے! جینی کی اس لمبی گفتگو کا ایک ایک لفظ اس نے توجہ اور دھیان سے سنا تھا اور جو بھی اس نے کہا کچھ غلط تو نہیں کہا —— یہ بھی جانتی تھی وہ۔ اس نے کچھ کہنا چاہا، مگر اندر ہی اندر ایک عجیب طرح کی اداسی اور غم تھا کہ امنڈتا ہی چلا آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر ہاتھ بڑھا کر اندھیرے کی سطح کو چھوا اور اس لڑکی کو دیکھنے کی کوشش کی جو لال رنگ کی کنورٹ ایبل میں بھرے سولہ سولہ، سترہ سترہ برس کے لڑکے لڑکیوں میں چٹکنی میٹھی بیٹھی چلے جا رہی تھی۔ سانولی سلونی سی لڑکی جس نے اپنی ہنستی ہوئی سی سیاہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بڑے شوخ لہجے میں نمستے کیا تھا اور جب اس نے پوچھا "ہندوستانی ؟" تو وہ چٹاخ سے بولی تھی "نو وے مین !" (NO WAY MAN) اور کھلکھلا کر ہنس دی تھی جس کے ساتھ ہی اس کے برابر میں بیٹھا سفید فام لڑکا اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اس کے چہرے پر جھک گیا تھا۔ وہ مشین سے ٹکٹ نکال کر بھولی کر حیران صورت انہیں کی طرف دیکھنے لگی تھی تو کاؤنٹر کے پیچھے سے جینی نے اس کے پیر کو ٹھوکر لگائی اور زیر لب کہا تھا۔ "بے وقوف مت بنو —— ٹکٹ دو ان کو ——" مگر یہ تو کوئی وجہ نہیں اس غم اور اداسی کی پھر یہ دل بھاری بھاری سا کیوں ہوا جا رہا تھا۔

"بس یہ آج کا آخری شو ہے۔ کل یہ فلم اتر جائے گی۔" بہت دیر وہ یونہی چپ رہی تو جینی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگلی فلم کون سی ہے ؟" اس نے بے دلی سے پوچھا۔

"کیا معلوم کون سی ہے۔ تم کو کھوج ہے تو پروگرام دیکھ لو ——"

"تمہیں کسی چیز میں دلچسپی بھی ہے کہ نہیں ؟" وہ جھنجھلا گئی۔

"شاید نہیں —— اور ویسے بھی زندگی کا نیا پن اور ایکسائٹمنٹ کتنے دن رہ سکتا ہے۔ زندگی کا بنیادی نقشہ بے سک پیٹرن (BASIC PATTERN) تصویر، چوکھٹا، فریم —— بس ایک ہی ہے۔ باقی سب نقل —— کاپی رپی ٹیشن (REPETETION) کبھی نام بدل گئے، کبھی مقام، سی کوئنس (SEQUENCE) آگے یا پیچھے —— تھوڑی جمع تھوڑی تفریق —— کرداروں کی ادلا بدلی، مگر کہانی ایک ہی ہے —— صرف ایک! ہاں یاد آیا۔ ایک بات اور بھی ہے۔ کرنسی بھی بدل جاتی ہے ——"

"کرنسی —— ؟" اس نے بے اعتباری سے کہا جیسے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔ پھر ہنس دی "پتہ نہیں میں تم سے بات کیوں کرتی ہوں ——"

"تو ـــ !" جینی نے زور دے کر کہا، "ثابت کر دیں غلط کہتی ہوں!"

"تو یہ کہ ـــ" مگر اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی جینی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا "چپ" ـــ اور اسکرین کی طرف دیکھنے لگی۔

دس گیارہ برس کی بچی نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ پھر رکتی، جھجکتی، آہستہ چلتی کمرے کے اندر آ گئی جہاں ایک تھکا ہارا شکستہ دم باپ کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھے تھے۔ بچی کچھ اور آگے بڑھی اور قریب آ کر اس کا کندھا چھو لیا۔

"ڈیڈی ـــ" جینی نے اسکرین پر بولنے والی بچی کو زبان دی۔ باپ نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور بے اعتباری سے بچی کی طرف دیکھا۔

"ڈیڈی ـــ" لڑکی کے لب ہلے، آواز جینی کی تھی۔ باپ نے ایک دم ہی لپک کر بچی کو باہوں میں لے کر سینے سے بھینچ لیا۔ آہستہ آہستہ وہ چہرہ قریب آتا پوری اسکرین پر چھا گیا۔ جذبات کی شدت سے کانپتا چہرہ جس کی بند آنکھوں سے ایک آنسو ڈھلک کر رخسار پر پھسلتا بچی کے بالوں میں گر گیا۔ علاج، توجہ، محبت اور محنت اور آخر میں ہار کے اعتراف کے بعد یہ پہلا لفظ تھا جو خوف اور صدمے سے بند ہوئی زبان سے ادا ہوا۔ اب دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کے سینے سے لگے رو رہے تھے۔ جینی نے ایک آہ بھری اور سر اٹھا کر سیاہ آسمان کی طرف دیکھا جہاں تاریک خلا میں الٹے لٹکے ہوئے تارے بیوقوفوں کی طرح پلکیں جھپک رہے تھے۔

"کل یہ فلم اتر جائے گی ـــ" جینی نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ "اور اس کو شاید میرے سوا اور کسی نے دیکھا بھی نہ ہو گا ـــ"

"وہ کیوں؟ اتنے تو لوگ آتے ہیں ہر روز!"

"ڈرائیو اِن میں فلم دیکھنے کون آتا ہے ـــ اتنا تو جانتی ہی ہو گی تم؟"

"وہ کیوں؟ میرا مطلب ہے کیا جانتی ہوں گی میں؟"

اندھیرے میں جینی کے دونوں ہاتھ اس کے سر سے اوپر اٹھ گئے جیسے اس کوتاہ علمی اور نا سمجھی کا ماتم ہو تو کیسے؟

"اور کیا ـــ نہیں معلوم تو سنو، ایک ہی بار بتاؤں گی، بار بار نہیں۔ جو فلمیں ناکام رہتی ہیں وہ ڈرائیو اِن میں آ جاتی ہیں اور خوب چلتی ہیں۔ اس لیے کہ فلم دیکھنے جاتا ہی کون رہا ہے؟ مگر پھر بھی فلم بنانے والوں کو کوئی فکر نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ فلم دیکھنے کے لیے لوگ آتے ہیں اور بار بار آتے ہیں ـــ"

"مگر ابھی تو تم کہہ رہی تھیں ـــ" اس نے الجھ کر کہا۔ جینی نے پھر حلق سے ایک بے معنی آواز نکالی۔ چند لمحے خاموش رہی پھر جینی نے اپنے پیر جوتوں سے نکال کر پیر کے نیچے گول گول گھمانا شروع کر دیے۔

"اوہ میرے خدا ـــ" اس خاموشی میں اس کی چھوٹی سی آواز یوں تھرتھرا کر ابھری جیسے جینی کی بات نے اس کے اندر اتر کر اسے جھنجھوڑ دیا ہو۔ "اوہ میرے خدا ـــ" لفظ لفظ، آہستہ آہستہ، جدا جدا ـــ پھر سر اٹھا کر سامنے اندھیرے میں ڈوبے پنڈال کی طرف دیکھا۔ اسکرین سے نکلنے والی ہلکی روشنی میں یہاں سے وہاں تک محض گاڑیوں کی چھتیں ہی

چھپتی تھیں۔ خاموشی، چپ چاپ لوہے اور اسٹیل کا جنگل، گاڑیوں کی پچھلی سیٹیں اور اسکرین کے بے آواز ہنگامے ——— فلم دیکھنے آتا ہی کون ہے۔ اس کی نظروں کے سامنے وہ نازک سی، سانولی سلونی لڑکی آئی اور کالی کالی آنکھوں سے مسکراتی ہاتھ جوڑ کر نمستے نمستے کہتی دور چلی گئی۔

"سردی ہو رہی ہے جینی ———" اس نے جھرجھری لیتے ہوئے چھوٹی سی آواز میں کہا۔ جینی نے ہاتھ بڑھا کر اس کا گھٹنا تھپتھپا دیا ——— "سردی اور گرمی اضافی اور وقتی قدریں ہیں۔ ایک بار تعارف کی رسم ادا ہو جائے تو طبیعت میں اعتدال آجاتا ہے۔"

"زندگی تو تمھارے لیے آسان ہو گئی ہے ———" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ جینی نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا پھر ہنس دی "آسان"

"اچھا چلو چھوڑو۔ اس بار میں تمھیں ایک قصہ سناتی ہوں۔ طبیعت بہل جائے گی تمھاری۔" جینی نے کہا ——— "کل کیا ہوا کہ محمد کا ایک دوست شام کے وقت کسی کام سے ہمارے گھر آیا۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی بابا لپک کر اپنے کمرے سے نکلے تو محمد نے مجھے دروازہ کھولنے کے لیے کہا اور خود بابا کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں واپس لے گیا اور کہا، وہ ہرگز بھی بیٹھنے کے کمرے میں نہیں آئیں گے۔ محمد اور ڈان دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر جب محمد کاغذات لینے اپنے کمرے میں گیا تو بابا جو چپکے چپکے گھات لگائے بیٹھے تھے فوراً دوسرے دروازے سے کمرے میں آئے اور جلدی سے جا کر ڈان کے پاس گھس کر بیٹھ گئے۔ محمد کمرے میں واپس آیا تو ان کو یوں ایٹ ہوم دیکھ کر پریشان "

"کیوں بھلا؟"

اصل میں بابا کی اوٹ پٹانگ باتوں کی وجہ سے ان کا محمد کے دوستوں کے سامنے آنا جانا بند ہے۔ پہلے تو محمد نے بابا کو بہلا کر واپس بھیجنے کی کوشش کی، پھر جب دیکھا کہ وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے تو میری مدد چاہی۔ انھوں نے مجھے آتے دیکھا تو ڈان کے ساتھ اور بھی جڑ گئے اور جلدی سے بولے "تم کو معلوم ہے جب تم مر جاؤ گے تو تمھارے دُم نکل آئے گی، واٹ؟" غریب ڈان سمجھا کہ شاید بابا مذاق کر رہے ہیں۔ اب کے بابا اور بھی زور سے بولے ——— دیکھو موقع ہے ——— اب بھی موقع ہے ——— مسلمان ہو جاؤ ورنہ یہی ہوگا تمھارے ساتھ۔ محمد، ڈان، میں سب دم بخود۔ پھر میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں اٹھایا، مگر جیسے ہی وہ دروازے کے پاس پہنچے انھوں نے میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور مڑ کر بہت غصے سے ڈان کی طرف دیکھ کر انگلی ہلائی ——— بے دین اب بھی ہے موقع ——— سن لو میری بات ورنہ پچھتاؤ گے۔ جو مسلمان نہیں وہ مر جائے تو دم نکل آتی ہے اس کی ——— شیطان کے جیسی ——— سیدھے راستے پر آجاؤ ——— یہ کہا اور تیز تیز چلتے کمرے سے نکل گئے۔"

"پھر ———؟"

"پھر کیا۔ محمد نے بات بنانے کی کوشش تو بہت کی، مگر توبہ کرو ——— ڈان کا رنگ جو بابا کی بات سن کر پہلے تو سفید ہوا تھا، رفتہ رفتہ لال ہونا شروع ہوا۔ کچھ دیر تو وہ ساکت بیٹھا اس دروازے کی طرف دیکھتا رہا جہاں بابا غائب ہوئے تھے، پھر اٹھا اور بنا کچھ کہے گھر سے نکل گیا۔ محمد کا غصے سے برا حال ——— بول بول کر اس کے منہ سے بھی کف اڑنے لگا اور بابا یوں اپنے بستر میں دبک کر سوتے بن گئے جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو کہ کس کی وجہ سے یہ سارا ہنگامہ ہو رہا ہے ———"

"پھر ــــ ؟"

"یہ تم نے کیا پھر ــــ پھر لگا رکھی ہے ــــ بہرحال۔ اچھا ہوا کہ ڈان خود ہی آدھ گھنٹے کے بعد واپس آگیا۔ محمد نے دروازہ کھولا تو کہنے لگا تمہارا باپ پاگل ہے کیا۔ محمد نے کہا ہاں کچھ کچھ ہے تو سہی، مگر اب وہ اس طرف نہیں آئیں گے۔ اندر آجاؤ۔ مگر ڈان جتنی دیر بیٹھا بار بار سر ہلاتا تھا اور اوہ بولائے، اوہ بولائے کہتا رہا۔ جاتے جاتے کہنے لگا اچھا ہوا کر واپس آگیا ورنہ ساری رات نیند نہیں آتی۔ اس کے جانے کے بعد جب محمد اندر آیا تو بابا اپنے پلنگ پر ہوشیار بیٹھے تھے۔ محمد کو دیکھتے ہی دیوار کی طرف منہ کر کے کہنے لگے ــــ دیکھا ــــ آیا نہ واپس! اب جلد ہی راستے پر بھی آجائے گا ــــ دیکھنا تم ــــ دیکھتے رہنا تم ــــ ایک ایک کر کے تمہارے سارے کافر دوستوں کو مسلمان بنا دوں گا۔ محمد نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر مارے اور بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا ــــ" جینی ہنس دی "۔ یہ فلمیں کیا ہیں۔ اس کے سامنے جو ہنگامہ ہمارے گھر میں رہتا ہے"۔

"تمہیں تکلیف تو ہوتی ہوگی ؟"

"تکلیف ــــ" وہ چپ ہوگئی جیسے اس لفظ کے اطلاق کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو ــــ "نہیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی"۔ اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔

"غلط ــــ تم نے یہ واقعہ اپنے اور اس واقعے کے درمیان ایک فاصلہ رکھ کر سنایا ہے اور یہی فاصلہ تمہارا راز کھول رہا ہے ــــ کہو ــــ صاف صاف کہو کہ اس واقعے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ــــ یہ فاصلہ تمہاری کوشش نہیں ــــ تکلیف سے بچنے کی آڑ نہیں ــــ کیا ہو تم جینی ؟"

"تم نہیں سمجھو گی ــــ" جینی نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا "اور یہ بار بار تم مجھ سے یہی کیوں پوچھتی ہو ــــ کون ہو تم جینی ــــ کون ہو تم ؟ تمہیں اور کوئی کام نہیں ؟" اسکرین سے نکلنے والی روشنی اب اس کے پیچھے تھی جس سے اس کے سر کے گرد روشنی کا ایک ہالا سا بن گیا تھا۔ اس کے دبلے پتلے نقوش اس کے چہرے پر کہیں اندر دھنستے ہوئے لگ رہے تھے۔ پھر وہ واپس مڑ گئی اور اسکرین کی طرف چہرہ اٹھا دیا۔

"تمہیں یاد ہے ــــ وہاں انٹرویو دینے جہاں تم آئی تھیں وہیں لابی میں تمہیں دیکھ کر میں نے پوچھا تھا "ہندوستانی ؟" تو تم نے بڑے فخر سے سر اٹھا کر کہا تھا نہیں ــــ پاکستانی ــــ تو تمہیں بھی کوئی ایسا سوال مجھ سے وہیں پوچھنا تھا ــــ اب بے محل ہے ــــ"

"وہاں چپ چاپ بیٹھی تم مجھے بہت اچھی لگی تھیں" وہ ہنس دی "میں نے تمہیں ہسپانوی عورت سمجھا تھا"۔

"غلط"

"تو پھر کیا ہو ؟ تعارف کی رسم ادا کرو جینی!"

"بے وطن، بے دیار ــــ گمشدہ قبیلے کے لوگ! مگر تمہیں اتنی کھوج کیوں ہے ؟"

کسی نے کھڑکی بجائی "تم ٹھہرو ــــ میں دیکھتی ہوں۔ جینی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وینڈنگ مشین سے اس نے دو ڈبے کوکا کولا کے نکالے اور کھڑکی کے سامنے کھڑے لڑکے کے ہاتھ میں دے دیے۔

"تعارف بھی ایک بے معنی سی رسم ہے۔ کھڑکی بند کرتے ہوئے اس نے کہا "اور میرا شسر راتوں کو اٹھ کر روتا ہے ــــ"

واپس آتے آتے اس نے یوں کہا جیسے کوئی اسٹیٹ منٹ (STATEMENT) دے رہی ہو۔ کھڑکی پر پھر دستک ہوئی ——

"اب کیا ہے بھئی؟" اس نے جھنجھلا کر کہا —— "آج میں بات کرنا چاہتی ہوں تو کرنے بھی دے گا کوئی کہ نہیں؟"

"تم بیٹھو جینی —— میں دیکھ لوں گی"۔ کھڑکی بند کر کے پھر وہ بھی واپس آگئی —— "بیمار ہے کیا؟" آتے آتے اس نے پوچھا ——

"بیمار تو نہیں، یا شاید بیمار بھی ہے۔ تنہائی بھی تو ایک روگ ہی ہے —— اور بڑھاپے کی تنہائی! شاید اسی لیے روتا ہے کہ بوڑھا بھی ہے اور تنہا بھی! نہیں۔ اس عمر کی تنہائی میرے سسر کی بھی ہمت سے زیادہ ہے۔ اس کے خاندان کے لوگ جن کے ساتھ کھیل کر وہ بڑا ہوا، اپنے اپنے راستوں پر جا چکے ہیں۔ تتر بتر ہو چکے ہیں۔ بہن بھائی کچھ بچھڑ گئے، کچھ ختم ہو گئے، اب وہ بے اور اس کی تنہائی جس کو اس کے دو بیٹے بھی ختم نہیں کر سکتے، اور دو بیٹے بھی شاید نام ہی کے ہیں۔ حقیقت میں تو ایک ہی ہوا —— محمد۔ عبداللہ کے پاس وہ آج دن تک بھی ایک دن سے زیادہ نہیں رہ پائے۔ اس لیے کہ عبداللہ ان کو اپنے پاس رکھ نہیں سکتا۔ اس کی بیوی کو ایک ستر برس کے بیمار اور خبطی بوڑھے کو دیکھ کر ٹینشن (TENSION) ہونے لگتا ہے۔ ایک بیٹے کی خود غرضی نے دوسرے بیٹے کے پاس رہنے کو سزا بنا دیا ہے ——"

"تمہارے پاس بھی خوش نہیں؟"

"پتہ نہیں —— کبھی کہا تو نہیں، مگر ہم ہمیشہ اس چیز کے لیے آزردہ رہتے ہیں جو حاصل نہیں ہوتی۔ محمد کام کرتا ہے، میں کام کرتی ہوں۔ بچے اسکولوں کو۔ ڈے کیئر سینٹرز (DAY CARE CENTERS) میں چلے جاتے ہیں ہمارے لیے تو دن بھی اور رات بھی پلک جھپکتے میں گزر جاتے ہیں ان کے لیے دن بھی طویل ہیں اور راتیں بھی بوجھل اور آہستہ رو —— اب تم ہی بتاؤ کہ وہ روئے نہیں تو کیا کرے۔ وہ اپنے ساتھ کے لوگوں کو —— اپنی عمر کے لوگوں کو ڈھونڈتا ہے۔ اور وہ یا تو جا چکے ہیں یا جانے کو تیار بیٹھے ہیں —— شاید وہ بھی —— جہاں کہیں بھی وہ ہیں راتوں کو سو نہیں سکتے اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتے ہیں۔ تنہائی سے ڈرے ہوئے، سہمے ہوئے رنجیدہ اور رنجور رہتے ہیں —— کیا پتہ!" "تمہاری ساس کا ساتھ تو ہے ان کو"

"ان کے بارے میں بھی جاننا چاہتی ہو۔ ان کو بھی راتوں کو نیند نہیں آتی اور وہ اٹھ کر پورے گھر میں بھوت کی طرح چکر لگاتی پھرتی ہیں۔ باورچی خانے کی الماریاں ٹٹول ٹٹول کر کھانے کی چیزیں ڈھونڈ ڈھونڈ نکالتی ہیں اور پھر بستر پر بیٹھی ساری رات کھاتی رہتی ہیں ——" وہ بات کرتے کرتے اچانک چپ ہو گئی۔ پھر آہستہ سے کہا "اور تم کہتی ہو تمہارا دل کھٹا ہو گیا ہے ——"

"جینی ——" اندھیرے میں ایک ڈری ہوئی سہمی ہوئی آواز ابھری "جینی تم زندہ ہو؟"

"تمہارے سامنے ہوں"۔ وہ ہنس دی۔ "یہاں ہوں۔ تمہارے پاس!"

"اور کچھ بھی سنو گی؟" لمحے بھر کے بعد اس نے کہا "تم تعارف چاہتی تھیں نا؟ تو سنو —— پرسوں انہوں نے میرے زیور الماری سے نکال کر ایک عورت کو دے دیے، شکر گزاری کے اظہار کے طور پر، کہ وہ ہمارے پاس آ کر رہی اور اس کے آ جانے سے میری ساس کے کچھ دن مصروف، کچھ دلچسپ ہما ہمی میں گزر گئے۔ ایک طرح کا یہ نذرانہ تھا شاید!"

"پھر وہ زیور کیا ہوئے؟"

جینی چپ ہوگئی۔ پھر جھنجھلا گئی۔ "یو اونلی تھنک اباؤٹ دی ٹرنکٹس مین! (YOU ONLY THINKE ABOUT THE TRINKETS-MAN!) اس عورت بیچاری کی سائیکی خراب ہو رہی ہے اس بڑھاپے میں ــــ تمہیں کچھ خیال نہیں۔ پھر تم کیسے کہتی ہو کہ تمہارا دل کتنا ہو گیا ہے؟"

جینی کی آواز کی تیزی سے ڈر کر وہ کچھ پیچھے کو ہٹ گئی "کہہ لو ــــ تم کچھ بھی کہہ لو ــــ" کچھ دیر کے بعد اندھیرے غار سے کھوکھلی آواز ابھر کر اوپر آئی ــــ پھر دونوں یوں خاموش ہوگئیں جیسے کہنے کو کچھ بھی نہ رہا ہو۔ اچانک چاروں طرف اندھیرا ــــ مدھم روشنی کے بعد کا گہرا اور مکمل اندھیرا چھا گیا۔ مگر کچھ ہی دیر بعد اس اندھیرے کو کاروں کی روشنیوں نے نگل لیا۔ پہلے جہاں روشن اسکرین تھی اب وہاں اندھیرا تھا اور کبھی کبھی کسی کار کی روشنی اس پر پڑتی تو وہ بے نور آنکھوں کی سفیدی کی طرح نمایاں ہو جاتی۔ جینی نے چابیاں مینیجر کے حوالے کیں اور بوتھ سے نکلتے ہوئے کہا ــــ "اب جلدی جلدی چلو ــــ کہیں کل کے جیسے بس نکل گئی تو مشکل ہوگی۔"

وہاں بوتھ میں وہ سارا وقت یوں بیٹھی رہی تھی جیسے دنیا بھر میں اسے کسی چیز کی نہ پروا ہو نہ خیال، مگر اب گھر کا راستہ پکڑتے ہی جیسے اس میں ایک بے چینی سی بھر گئی تھی۔ بس میں بھی سیٹ پر وہ یوں چوکس ہو کر بیٹھی جیسے ابھی اٹھ کر چل دے گی۔ "پتہ نہیں، اب وقت پر ایئرپورٹ پہنچ بھی سکوں گی یا نہیں ــــ" گود میں رکھے پرس کا اسٹریپ (STRAP) کندھے پر ٹھیک سے جماتے ہوئے اس نے کہا۔

"کون آ رہا ہے؟"

"محمد آ رہا ہے نیویارک سے ــــ ایک بجے اس کا جہاز پہنچ رہا ہے"

"عبداللہ نہیں جائے گا اسے لینے کو؟"

"عبداللہ نہیں۔ اس کی بیوی رات میں گھر پر تنہا نہیں رہ سکتی اور ویسے بھی آج اس کے گھر پر دعوت ہے ــــ بیس پچیس لوگوں کا گھر پر کھانا رکھا ہے اس نے ــــ وہ کیسے جائے گا ــــ" اس نے جلدی جلدی بات ختم کی۔

"دعوت کسی اور دن بھی رکھی جا سکتی تھی؟"

"وہ کیوں؟ یہ میری زندگی ہے۔ مجھے ہی بوجھ اٹھانا ہے اس کا، اور ویسے بھی بچوں کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دوں گی، آرام سے سوتے رہیں گے۔ ساس سسر دونوں بیمار و ضعیف ہیں۔ ان کے بھروسے بھی نہیں چھوڑ سکتی، اور ویسے بھی ــــ ہمیں عادت ہے اس زندگی کی، ایسی باتوں کی؟"

"جبھی تو کہتی ہوں ــــ" مگر اس نے بات مکمل نہیں کی۔

جینی نے بھی ہنسنے کی کوشش کی پھر وہ بھی خاموش ہوگئی۔

"اچھا ہوا کہ ان کو دوہی کی ضرورت تھی، اور ہم بھی وہاں دو ہی تھیں" کچھ دیر بعد اس نے آہستہ سے کہا جیسے جینی کا دھیان کسی دوسرے ہلکے پھلکے موضوع کی طرف پلٹانا چاہ رہی ہو۔ "ورنہ میرا کسی دوسرے کے ساتھ کام کرنا مشکل ہی ہوتا ــــ" اس نے نرمی سے اضافہ کیا۔

"اتنے یقین سے مت کہو ــــ وقت ہم سے سب کروا لیتا ہے" جینی نے دکھی آواز میں کہا۔

بس کو ایک جھٹکا لگا اور وہ رک گئی۔ اترنے والے اتر گئے تو کچھ اور لوگ اوپر چڑھ کر اندر آ گئے اور خالی سیٹیں ڈھونڈنے لگے۔ بس پھر ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ جینی نے کلائی پر بندھی گھڑی سامنے کرکے وقت دیکھا۔ وہاں لابی میں بھی جینی نے اسی —— طرح کلائی کی گھڑی سامنے کرکے وقت دیکھ کر کہا تھا —— "دیر ہو جائے گی ——" اچھا ہوا کہ وہاں اس نے پوچھنے کی کوشش نہیں کی کہ دیر کے خیال سے وہ پریشان کیوں ہے —— بھلا اب پوچھ کر کیا ملا؟

"ہم اپنے کو کتنا ہی موڈی فائی (MODIFY) کرلیں بنیادی طور پر وہی رہتے ہیں جو ہوتے ہیں۔ منظر پس منظر سے میل نہ کھائے تو بے میل ہم ہوتے ہیں ان کی اکائی باقی رہتی ہے۔ ایک آب و ہوا کا پودا لگانے کو تو دوسری زمین میں بھی لگ جاتا ہے، مگر وہ پھل پھول اس میں نہیں آتے جو اس کی اصل پہچان ہوتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ یوں چھوٹے چھوٹے جملے کہتی رہی جیسے خود اپنی ہی سوچ کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہو، جیسے اس کے بھی کچھ سوال ایسے ہوں جن کا جواب اسے نہ ملا ہو —— بس کی مسلسل گھوں گھوں، گھر گھر کے پس منظر میں اس کی آواز ہر طرح کے جذبات سے عاری اور بے جان تھی۔

"میرا نام —— تم کیا سمجھتی ہو کہ جینی ہی ہے؟ میں زینب ہوں اور دوسری بہت سی ترک کی ہوئی باتوں، عادتوں، شہریتوں کی طرح مجھے ایک دوسرے نام کی بھی ضرورت تھی مگر اتنا کچھ کرنے پر بھی مجھے کچھ ملا نہیں ہے بلکہ اس ادلا بدلی میں شاید اور بھی کھنک گیا ہے۔ کبھی لگتا ہے کہ میں اندر سے وہی ہوں جو اب سے چند نسلیں پہلے میرے پرکھے، میرے اجداد تھے۔ جنھوں نے وقت اور زمانہ تنگ ہو جانے پر ترکِ وطن کیا، مگر آج تک کوئی کونہ ٹکڑا زمین کا، کوئی گمنامی —— ایک عام شخص کا وقت اور مقام سے رشتہ، تعلق —— جس میں کھو کر زندگی کو پاسکیں۔ نہ انھیں ملا ہے اور نہ ہی مجھے —— خدا نے زمین انسان کے لیے بنائی —— کیا واقعی؟ پھر یہ ہر کسی نے اپنی اپنی دیوار، اپنی حد کیوں کھڑی کرلی؟ کیوں ایک دوسرے کے پیر نہیں جمنے دیتا۔ اس کے نزدیک سب انسان برابر ہیں —— کیا واقعی؟ پھر اس نے کچھ کو سفید اور کچھ کو کالا کیوں بنایا؟ رنگ اور نسل کے امتیاز کی گنجائش کیوں رکھی؟ کسی کو بہادر، کسی کو بزدل، کسی کو نیک اور شریف اور کسی کو بد اور بدطینت کیوں بنایا؟ کیا کھیل رہا تھا —— ؟" بولتے بولتے اس کی آواز کچھ بلند ہوگئی۔ سامنے کی سیٹ پر بیٹھے آدمی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا پھر مسکرا کر سر ہلایا اور پھر سے سیدھا ہو بیٹھا۔ جینی کچھ دیر چپ بیٹھی رہی۔ پھر سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا ——

"میں کیا ہوں —— اب کیا ہوں —— میری طرف دیکھو اور مجھے بتاؤ۔ میں نے اجنبیت کی دیوار کو ڈھانے کے لیے کیوں یہ سب جتن کیے ہیں۔ ملک میرے اجداد نے چھوڑا مگر روایتیں اپنے ساتھ لیتے آئے کیوں؟ وہ بھی چھوڑ آتے۔ میں اب وہ روایتیں، وہ طریقے، وہ پہناوے کر باہر جاؤں تو مجھ پر تیسری دنیا کا ٹھپہ لگا کر لائن میں پیچھے کی طرف بھیج دیا جاتا ہے۔ یہاں کے انداز، طریقے، طور اپناؤں تو اپنے لوگ مجھے غدار سمجھتے ہیں، مگر مجھے —— مجھے کوئی وجہ وفاداری کی دیتے بھی تو نہیں۔ میں انگریزی مادری زبان کی طرح بولتی ہوں اس لیے کہ باہر کی دنیا سے رابطے کے لیے کسی دوسری زبان کی نہ ضرورت نہ موقع —— آیا ہی نہیں کبھی۔ بچوں کے سامنے اپنی زبان میں بات نہیں کرتی۔ ایک لفظ بھی —— کوشش کرتی ہوں کہ وہ سیکھنے نہ پائیں اپنی زبان کو —— یہ سب کس لیے؟ اس لیے کہ ارتقا مکمل ہو جائے۔ کسی طرح ان کو ایک اکائی، ایک پہچان مل جائے —— مگر نہیں ملتی، اور شاید کبھی ملے بھی نہیں کہ اس کو گھن لگانے کو اس صدی کی پہلی دہائی کے چند لوگ ابھی باقی ہیں جو جلدی جلدی اس امانت کو اپنے پیچھے آنے والوں تک منتقل کر رہے ہیں۔ کتنا ظلم کر رہے ہیں اس نسل پر —— ان کو اندازہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے وقت کی پیداوار ہیں اور سوچ سکتے ہی نہیں کہ حالات

اب وہ نہیں ہیں اور اگر نہیں ہیں تو کسی اور کی وجہ سے نہیں ہیں! مگر میں کیا جیت سکتی ہوں؟ نہیں۔ جینی کتنا ہی دوڑتی رہے زینب سے جیت نہیں سکتی۔ بے گھری میں نے مانگی تو نہیں تھی، مگر پھر بھی اپنا مقدر سمجھ کر قبول کرتی ہوں۔"

"ہار مانتی ہو؟"

"ہار کا یہاں کیا ذکر؟ جینی نے الجھ کر کہا۔ میں تو ہجرت کی بات کرتی ہوں!"

"اجداد کے ایکٹ کو گلوری فائی کرتی ہو۔ یہ مشرقی ذہنیت کا ثبوت ہے۔ اگر تم چاہو تو واپس بھی جا سکتی ہو"

"واپس ــــــ مگر کہاں؟" اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنی ہتھیلیوں پر بچھے لکیروں کے جال کو غور سے دیکھا۔ بس کی کھڑکی کے شیشے میں اس کے عکس کا منہ جھکا ہوا تھا اور دوسری طرف بالکل سیاہ اندھیرا۔

"کچھ جلاوطنیاں وقت، حالات اور سیاست کا پس منظر لیے ہوتی ہیں انسان کا ایک راستہ واپسی کا بھی ہوتا ہے، مگر جو جلاوطنی ہم خود اپنے لیے تجویز کرتے ہیں۔ اس کے آنے جانے کے دونوں ہی راستے بند گلی تک جاتے ہیں۔ تم مجھے واپس جانے کے لیے کہتی ہو مگر واپس اب تم بھی نہیں جاؤ گی۔ اس لیے نہیں کہ جا نہیں سکوگی۔ اس لیے کہ محفل سے اٹھ کے جو خلا تم نے محفل میں چھوڑا وہ اب وہاں باقی نہیں ہوگا۔ محفل میں کبھی کوئی جگہ خالی نہیں چھٹتی۔ کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی مرحلے پہ اسے پُر کر دیتا ہے۔ وہاں جا کر ایک کونے میں کھڑے تماشائی کی حیثیت سے تم محفل کا تماشا تو کر لوگی، مگر محفل کا ایک حصّہ نہیں بن سکوگی! حصّہ نہیں لے سکوگی! کون سا سرا کہاں سے پکڑوگی؟ تم بہت پیچھے رہ گئی ہو!"

خاموشی ــــــ کہنے سننے کے لیے اور رہ بھی کیا گیا تھا۔ بس جب کے۔مارٹ کے پلازا کے سامنے رکی تو جینی اپنی جگہ سے اٹھی۔

"آج ہم نے بہت بے کار باتیں کی ہیں۔ بے ربط اور بے کار!" جینی نے لمحے بھر کے لیے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا۔ پھر اس کے سامنے سے گزر کر بس سے اتری اور چلی گئی۔ بس کے سامنے سے گزری تو اس کی روشنی میں اس کا مختصر سا خاکہ لمحے بھر کو ابھرا پھر اندھیرے نے اسے نگل لیا۔ بس نے واپسی کے لیے موڑ کاٹا تو ایک بار پھر اس کی بتیاں سرچ لائٹ کی طرح جینی کے اوپر سے گزر گئیں۔ وہ کے۔مارٹ کا موڑ کاٹ کر جھیل کے پاس بنے گھروں کی طرف جا رہی تھی جہاں ایک گھر میں ایک ستّر برس کا بوڑھا اور ایک اتنی ہی سن رسیدہ عورت کھڑکی کے اس طرف بیٹھے رات کے گزرنے کے انتظار میں تھے۔ وہی رات جب ایک بھائی کے گھر پہ بیس لوگوں کی دعوت تھی۔ وہی رات جب دوسرا بھائی نیویارک سے آ رہا تھا اور اس کی بیوی تین چھوٹے چھوٹے سوتے ہوئے بچّوں کو گاڑی میں لیے ایئرپورٹ کی طرف جا رہی تھی۔ مگر رات ہے کہ گزرتی ہی نہیں!

(فلوریڈا سے) ▬▬

سیّد معین اشرف

نثار میں تری گلیوں کے.....

امریکہ میں ڈاکٹر سید علی نقوی بڑے کامیاب ڈاکٹر ہیں۔ ان کی آمدنی لاکھوں روپے ماہوار کی ہے۔ یہ تقریباً سولہ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں۔ محنت و مشقت کر کے، تھکے ہارے کوئی آدھی رات گئے یہ اپنے عالی شان محل کے عالی شان باورچی خانے میں داخل ہوتے ہیں اور سیکنڈوں میں مہینوں کے باسی اور برف آلود کھانے کو تازہ بنا کر کھڑے کھڑے کھا لیتے ہیں۔ پھر اپنے عالی شان بیڈ روم میں جا کر بہت بڑے گول بستر پر دھم سے گر جاتے ہیں۔ لاکھ کروٹیں بدلتے ہیں، لیکن ان کو نیند نہیں آتی ہے اور اب تو سکون بخش گولیوں نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا ہے اور سکون ہو بھی کیسے؟ جب کہ ان کا اپنا لونڈا کبھی ٹنگ ٹنگ کر رات دن گٹار بجا بجا کر ان کا دماغ چاٹتا رہتا ہے۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب اپنے صاحبزادے کو چمن میں الگ لے گئے اور انگریزی انداز سے آواز کو باریک بنا کر بولے۔ "دیکھو بیٹا! اس دنیا میں ایسا کوئی نہیں ہے جو مجھ سے زیادہ تمہارا بہی خواہ ہو۔ میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اوّل تو تم اپنی یہ زلفیں کٹواؤ تاکہ تمہاری موہنی سی شکل اور زیادہ نکھر آئے۔ دوئم یہ پھٹی، پتھر پر گھسی ہوئی چست کبری جین کے بجائے تم اچھے سوٹ اور پتلون پہنا کرو۔ خدا کا دیا ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے۔ اس کے بعد بیچ بیچ کر گٹار بجاؤ اور فرید بجاؤ! ہاں! مگر اس وقت جب گھر میں کوئی موجود نہ ہو۔ یعنی میں اور تمہاری ماں باہر ہوں اور تمہاری بہنیں اسکول جا چکی ہوں۔

لڑکا زیرِ لب مسکراتا رہا اور پھر ٹھہر ٹھہر کر نرم لہجے میں بولا۔ "ڈیڈ! میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آپ کو میوزک سے اتنی نفرت کیوں ہے۔ جب میں گٹار بجاتا ہوں تو آپ منہ بناتے ہیں اور جب میں آپ کو خوش کرنے کے لیے ٹپ لا (طبلہ) بجاتا ہوں تو آپ کان میں انگلی ڈال لیتے ہیں۔ آپ کو میوزک سے اتنی نفرت کیوں ہے؟ اگر ایسا ہی تھا تو آپ یہاں آئے کیوں؟ ہم اگر وہاں پاکستان میں پیدا ہوتے تو یہ سب پرابلم کبھی نہیں ہوتا۔ ہم آپ کے غلام ہوتے اور آپ ہمارے آقا۔

"دیکھو بیٹے،" ڈاکٹر صاحب لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

تم اپنی پڑھائی پر دھیان دو اور جلدی سے پڑھ لکھ کر اچھے ڈاکٹر یا انجینئر بن جاؤ۔ زندگی میں مقدم چیز اپنا کریر بنانا ہوتا ہے۔ اب مجھے ہی دیکھو۔ کتنے پاپڑ بیلے ہیں میں نے، اور کتنی جد و جہد کے بعد کمائی کے اس درجے تک پہنچا ہوں۔ اور کتنے شہروں اور ملکوں کی خاک چھانتا ہوا اس نئی دنیا میں آیا ہوں۔ یہ سب تمہیں لوگوں کے لیے تو کیا ہے۔ آخر تم ہماری

اولاد ہو اور ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تمہاری دیکھ بھال کرنا، تمہاری زندگی سنوارنا ہمارا فرض ہے۔

"اوڈیڈی!" لڑکا بولا۔ "مجھے آپ کے پیسے نہیں چاہئیں۔ ہم اپنی کمائی باعزت طریقے سے خود کریں گے اور اپنی زندگی اپنے طور سے خود گزاریں گے۔ آپ بلاوجہ پریشان ہوتے ہیں۔ آپ کو نہیں معلوم ہے کہ ابھی چند دن ہوئے کہ جان، جیک اور میں نے چوراہے پر کھڑے ہو کر بڑی مستی سے گٹار بجایا اور ایک مجمع لگ گیا۔ لوگوں نے ہمارے ہیٹ میں پیسے پھینکنا شروع کر دیا اور اتنا پھینکا کہ جب بعد میں بٹائی ہوئی تو رقم میرے حصے میں ایک سو دس ڈالر اور ۱۲ سینٹ آئے۔ اب اتنا روزانہ میری گرل فرینڈ اور میرے لیے اچھی زندگی گزارنے کے لیے کافی ہے۔ اب رہا ہمیں پیدا کرنا تو اس کا احسان مجھ پر نہ جتایئے اور اس کو ایسے سمجھیے کہ ہم لوگ آپ کے لطف اور عیاشی کا نتیجہ ہیں، اور ویسے بھی آپ بہت بڑے خیالات کے آدمی ہیں آپ کے لیے نئے دور، نئے زمانے اور گٹار بجانے کے آرٹ کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ گٹار دل و دماغ کو تازگی اور روح کو سکون پہنچاتا ہے اور یہ آپ ڈاکٹروں کے لیے سمجھنا بہت مشکل ہے۔

باپ گرج دار آواز میں بولے "چھچھوری اور چھچھوری کا شوربہ۔ ابھی سولہ سال کا بھی نہیں ہوا ہے اور مجھے سمجھانے آیا ہے۔ دیکھو! آج رات جب میں گھر میں آؤں تو گٹار کی آواز میرے کانوں میں نہ پڑے اور اگر میں نے تمہیں گٹار بجاتے، الٹے پلٹتے اور ناچتے گاتے دیکھا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ یاد رکھنا۔

دوسری رات جب والد صاحب گھر تشریف لائے تو وہاں ایک قیامت صغرا بپا پائی۔ ایک طرف لونڈا مٹک مٹک کر زلفیں جھٹک جھٹک کر، کود کود کر گٹار بجا رہا تھا اور دوسری طرف ماں اور بیٹیاں ڈری سہمی ایک صوفے پر بیٹھی اپنے مقدر کو کوس رہی تھیں۔ ٹی وی اور ریڈیو بھی باآواز بلند چیخ رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب غصے میں بھرے ہوئے لڑکے کے کمرے میں پہنچے۔ نہ آؤ دیکھا اور نہ تاؤ۔ لپک کر اس کی گردن دابی اور ایک چانٹا رسید کیا۔ چانٹا کھا کر لڑکا چونکا اور پھر مسکراتا ہوا خاموشی کے ساتھ بیس منٹ غسل خانے میں چلا گیا اور وہیں سے پولیس کو فون کیا اور رپورٹ درج کرائی کہ میرے والد نے مجھے مارا ہے۔

ابھی کوئی پانچ منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ پولیس کی کار سائرن بجاتی ہوئی بہت تیزی سے آ کر ڈاکٹر صاحب کے دروازے کے سامنے رکی اور اس میں سے دو بڑے لمبے لمبے تگڑے سپاہی برآمد ہوئے اور آتے ہی ڈاکٹر صاحب سے پوچھا "کیا آپ ہی اس گھر کے سربراہ ہیں؟"

"جی! میں ہی ہوں۔ کہیے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" ڈاکٹر صاحب سینہ تان کر بولے۔

پولیس سارجنٹ نے ڈاکٹر صاحب کو گھورا اور لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کیا آپ نے اس معصوم اور نادان بچے کو مارا ہے اور اس پر ظلم ڈھائے ہیں؟"

"ایک ہلکا سا چپت رسید کیا ہے۔ کیوں کیا ہوا؟ یہ میرا ہی لڑکا تو ہے۔ اس کو راہ راست پر لانا میرا فرض ہے!" ڈاکٹر صاحب بولے۔

"دیکھو اولڈ مین! اب ہم آپ کو حراست میں لیتے ہیں اور آپ ہمارے ساتھ چلیے اور جو کچھ کہنا ہے جج کے سامنے کہیے گا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ CHILD ABUSE امریکہ میں جرم ہے۔ یہ لڑکا آپ پر مقدمہ بھی کر سکتا ہے اگر آپ اس سے

ٹھیک سے وہ پیش آئیں گے یا اس کو پھل یا دودھ وغیرہ دینے میں بخل کریں گے۔ چلیے! آگے بڑھیے اور چل کر کار میں بیٹھیے۔"

ڈاکٹر صاحب پولیس والوں اور اپنے ماجزا دے کے ساتھ کورٹ ہاؤس میں آئے اور جج صاحب کے سامنے پیش کیے گئے۔ جج صاحب نے سب کا بیان بغور سنا اور پھر بڑی متانت سے گلا دن کھنکارتے ہوئے بولے "سلڈنی ایلی نیک وی۔ (سید علی نقوی) کو بارہ گھنٹے کی جیل کی سزا CHILD ABUSE کے جرم میں دی جاتی ہے اور ان کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ اگر پھر دوبارہ انھوں نے کسی بچے کو مارا پیٹا، ڈرایا دھمکایا یا ان سے بے جا کام لیا تو ان کو سائیکارٹسٹ کے پاس معائنے کے لیے بھیجا جائے گا اور ان کی پریکٹس کا لائسنس تین مہینے کے لیے ضبط کر لیا جائے گا اور پولیس کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ نابالغ الگزینڈر ایلی نیک وی (سکندر علی نقوی) کو با عزت طریقے سے اس کے گھر پہنچا دے اور اس کے تمام تر جسمانی اور دماغی آرام کا مکمل بندوبست کرے۔ بچے کو گٹار بجانے کا پورا حق حاصل ہے اور تاوان کے طور پر اس کے والد اس کو ایک عمدہ اور نئے ماڈل کا گٹار خرید کر دیں گے اور اس کے لیے ایک ٹیوٹر بھی رکھیں گے جو معصوم کو روزانہ آکر گٹار سکھائے گا۔ ٹیوٹر کی تنخواہ والد صاحب ادا کریں گے۔ عدالت یہ بھی کہہ دینا چاہتی ہے کہ بچے کی پورے طور سے نشو و نما کو روکنے والا قانونی طور سے اس سے بھی زیادہ سزا کا مستحق ہو سکتا ہے۔ شکریہ! اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔

والد صاحب رات بھر جیل کاٹ کر دوسرے دن گھر واپس آئے اور بغیر کسی کی طرف دیکھے ہوئے انھوں نے اپنے عالی شان باورچی خانے میں جا کر اپنے لیے کھیرے اور ٹماٹر کی ایک سینڈوچ بنائی اور لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے اپنے دوست ہیری سنگا (ہریال سنگھ) کو فون کیا اور کہا کہ "مجھے آج پہلی فلائٹ سے پانچ سیٹ کراچی کے لیے دلوا دو۔ کچھ ضروری معاملہ پیش آگیا ہے اس لیے ہم سب جلد از جلد کراچی پہنچنا چاہتے ہیں۔

ہیری سنگا نے اپنے کمپیوٹر کے ذریعے فوراً رات کی فلائٹ سے پانچ سیٹ ریزرو کروا دیں اور فون کر کے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ٹکٹ ہوائی اڈے کے ڈسک نمبر ۲ سے لے لیجیے گا وہاں رکھا ہوگا۔

یہ نیک خبر سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی باچھیں کھل گئیں اور مرجھائے ہوئے زرد چہرے پر پھر سے رونق آگئی۔ فرطِ مسرت سے چلا کر اپنے بال بچوں کو اپنے پاس بلایا اور اعلان کیا کہ "تبدیلی آب و ہوا کی خاطر آج رات ہی کو ہم سب کراچی جا رہے ہیں۔ بس تم لوگ فوراً تیاری شروع کر دو اور زیادہ کپڑے وغیرہ لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" پھر اپنے ماجزادے کو بڑے پیار سے اپنے پاس بلایا اور بولے "دیکھو! میرے پیارے بیٹے الیگزینڈر تم بھی جلدی سے تیاری شروع کر دو۔ تمھیں بہت کچھ دکھانا، بتانا اور سمجھانا ہے۔

"سچ مچ ڈیڈی! ہم لوگ جا رہے ہیں؟ ڈیڈی! آپ کتنے اچھے ہیں؟" لڑکا خوش ہو کر بولا۔ "اور ڈیڈی! ہم کو ٹاج ماہال (تاج محل) دکھانا نہ بھولیے گا۔ وہیں کراچی کے پاس ہی تو ہے۔ میں اپنا چھوٹا پورٹ ایبل گٹار کاندھے پر لٹکا لوں گا اور پھر وہاں ٹاج ماہال (تاج محل) کے سامنے، دریا کے کنارے چاندنی رات میں خوب خوب گٹار بجاؤں گا بڑا مزہ آئے گا۔"

"بڑا یا چھوٹا جو بھی گٹار چاہے نکالو، سب چلے گا۔" والد صاحب بڑی متانت سے بولے۔

۲۲ گھنٹے کے سفر کے بعد امریکن طیارہ کراچی کے ہوائی اڈے پر اترا۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی اردو میں کراچی ہوائی اڈا لکھا دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور پھر ڈاکٹر صاحب اپنے کنبے والوں سے مخاطب ہوئے اور کہا "پہلے سب مسافروں کو اتر جانے دو،

پھر ہم سب اتریں گے۔ دھکم دھکا سے کیا فائدہ۔ آخر گھر ہی تو جا رہے ہیں۔ مسافر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے اور اترتے گئے۔
ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی بچیاں اپنا اپنا جھولا جھکڑ سنبھالے ہوئے اور صاحبزادے اپنی کاکل کے بال جھٹکتے ہوئے خلائے
پر گٹار لٹکائے خراماں خراماں بڑھتے گئے اور جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے سرزمین پاکستان پر رات کے تین بجے قدم رکھا۔
ڈاکٹر صاحب نے جھٹ سے اپنا کیمرہ، ٹیپ ریکارڈ، کوٹ اور جھولے مادرِ وطن کے چرنوں میں ڈالے اور تیزی سے لپک کر
اپنے لونڈے کی گردن دابی اور اس کو دونوں ہاتھ اور گٹار سے پیٹنا شروع کیا۔ اس کی پیٹھ، اس کے پینڈے اور اس کے بازو
پر گٹار کی اتنی ضربیں لگائیں کہ گٹار ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور لونڈا زمین پہ گر گیا۔ پھر بھی ڈاکٹر صاحب نہ مانے اور گٹار کے
بقیہ ڈنڈے سے اس کی دھنائی جاری رکھی اور چلا چلا کر کہتے رہے "جا! جا جا! پولیس والوں کے پاس جا! سب کو
دیکھ لوں گا۔

لڑکے نے ہوائی جہاز کے ارد گرد دو تین وردی والوں کو دیکھا اور ان کی طرف بھاگا اور انگریزی میں چلا کر کہا
"پولیس! پولیس! مجھے بچاؤ۔ میرا باپ مجھے مارے ڈال رہا ہے۔ آناً فاناً ایک لمبی، تاؤ دار مونچھوں والے کانسٹبل، شرعی نیکر
پہنے ہوئے پان کی گلوری منہ میں دبائے، اپنی رائفل زمین پر چھوڑ کر لڑکے کی طرف لپکے اور اس کو ایک جھاپڑ رسید کرتے
ہوئے بولے "کیوں بے! انگریزی میں روتا ہے۔ جا! اور جا کے باپ کے قدموں پر گر کر معافی مانگ ورنہ بندوق سے کاٹ کر
رکھ دوں گا۔ چل بھاگ یہاں سے۔ الو کا پٹھا!"

پٹائی کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے گٹار کے ٹکڑوں کو ہوائی جہاز کے نیچے پھینکا، اپنا سامان اٹھایا اور آ کر ٹرانزٹ
لاؤنج میں منہ پھلا کر بیٹھ گئے۔ لڑکا بھی صوفے کے ایک کونے میں بیٹھا سسکتا رہا۔ جب ذرا ڈاکٹر صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو
وہ اپنی بیوی سے بولے "جس مقصد کے لیے یہاں آئے تھے وہ تو پورا ہو چکا ہے۔ اب چلو پہلی فلائٹ لے کر امریکہ واپس چلے چلتے
ہیں ورنہ مالی نقصان بہت زیادہ ہو جائے گا۔ اس کمبخت کی وجہ سے بیس ہزار ڈالر کا نقصان تو اب تک ہو چکا ہے۔ رہے عزیز
واقارب تو ان سے ملنے پھر کبھی آ جائیں گے۔

"ارے! ذرا اماں وغیرہ سے تھوڑی دیر کو ہی مل لیتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ اب اتنی دور آئے ہیں۔ نہ جانے پھر کب
ملاقات ہو گی؟" بیوی تھکی ہوئی آواز میں بولیں "ویسے یہ ضرور ہے کہ یہاں کی گرمی اور پانی سے بچوں کا پیٹ خراب ہو سکتا ہے
اور پھر ایک کمرے میں جا کر سب کو رہنا ہو گا اور اس میں کمبخت ایر کنڈیشنڈ بھی تو نہیں ہو گا۔ پریشانی بڑھ سکتی ہے۔ ٹھیک ہے
اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو چلیے پھر واپس ہی چلے چلتے ہیں۔ آپ کے اپنے کام کے علاوہ بچوں کا اسکول بھی تو ہے!"
اچھا! پھر اٹھیے اور چلیے، سامنے کے ریسٹوران میں چل کر کچھ کھا پی لیتے ہیں اور پھر لندن یا پیرس کے راستے نیویارک نکل
لیتے ہیں۔ ویسے گھر کی ایر کنڈیشنر مشین اور سوئمنگ پول کا درجۂ حرارت بھی تو کم کر کے نہیں آئے ہیں۔ سیکڑوں ڈالر کی انرجی ضائع
ہو رہی ہو گی۔ جب کہ پوری دنیا میں انرجی کرائسس ہے۔"
ڈاکٹر صاحب نے اپنی بیگم سے فرمایا۔ "اور دیکھیے! بچوں کو کچھ الم غلم بلا بلا نہ کھانے دیجیے گا۔ ہم چاکلیٹ اور چیونگ گم
جو بھی اپنے ساتھ لائے ہیں وہی کھا کر چائے پی لیں گے۔ بس ہوائی جہاز پر بیٹھ کر ہی کھانا کھایا جائے گا۔"
ڈاکٹر صاحب واپسی کی بکنگ کرا کر آئے اور اپنے کنبے کے ساتھ بھوک ہڑتال میں شامل ہو گئے۔ ۲۴ گھنٹے بعد جب ہوائی جہاز

امریکہ کے لیے روانہ ہوا تب ان کے منہ میں دانہ گیا۔ کھانا کھاتے، اونگھتے، سینما دیکھتے دو دن بعد پورا کنبہ نیویارک پہنچا اور وہاں سے بذریعہ بس اپنے دولت کدے پر وارد ہوا۔ سب تھک کر چور ہو گئے تھے۔ جلتے ہی سو گئے۔

کراچی کے پانی (جائے) اور پٹائی نے لڑکے کی شخصیت ایسی بدلی کہ دوسرے دن صبح اٹھتے ہی اس نے چائے بنا کر اپنے ڈیڈی اور ممی کو آداب اور امی کہہ کر پیش کی۔ پڑھائی وہ اب دل لگا کر کرنے لگا تھا اور گٹار بازی بالکل ترک کر دی۔ ڈاکٹر صاحب لڑکے کی یہ سعادت مندی دیکھ کر مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے تھے۔ پھر کیا تھا اپنے صاحبزادے کے نئے گُن دکھانے اور سنانے کے لیے انھوں نے جھٹ بہت سے دوستوں کو اپنے گھر پارٹی پر بلایا اور ان کو چائلڈ سائیکالوجی کے داؤں پیچ تفصیل سے سمجھاتے رہے۔ لیکن ہائے! جب وہ بیس ہزار ڈالر کے خرچ تک پہنچے تو ان کی آواز بھرا گئی۔

"دیکھو، ڈاکٹر نقوی" سیڈ سیڈ کی (صغیر صدیقی) اکاؤنٹنٹ بولے "پیسے کے معاملے میں گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ آپ کی پچاس فی صدی تلافی اخراجات تو انکم ٹیکس سے ہو جائے گی۔ آپ اپنی پوری ٹرپ کو کراچی میڈیکل کانفرنس برائے عقلانِ صحت اطفال میں ڈال دیجیے۔ باقی پچاس فی صدی کسی ریسٹورنٹ میں پارٹ ٹائم خانساماں کا کام کر کے پوری کر لیجیے۔ سبھی کرتے ہیں۔"

(آٹوا، کینیڈا سے)

عرفان علی شاد

عزرائیل کی ریٹائرمنٹ!

ایک دن عزرائیل نے خدا کے سامنے ہاتھ جوڑے اور گڑگڑا کر کہا ——— "اے خدا تعالیٰ: میں اب بہت بوڑھا ہو گیا ہوں، میرے REFLAXES کمزور ہو چکے ہیں، بڑھاپے کی وجہ سے رقیق القلب بھی ہو گیا ہوں، میرے پَر بھی کئی جگہ سے جھڑ گئے ہیں، میں اس کام سے عاجز آ گیا ہوں۔ اس کے علاوہ انسان نے ایک دنیا کی تین دنیائیں بنا لی ہیں، ان تینوں دنیاؤں کو میں اکیلا نہیں سنبھال سکتا ——— اور خاص طور پر تیسری دنیا میں آپ نے اموات کی شرح اتنی زیادہ رکھی ہے کہ لوگوں کا دم نکالتے نکالتے میرا اپنا دم نکل جاتا ہے، مجھے پبلک اسکولوں کے اساتذہ کی طرح چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر رہنا پڑتا ہے جس کے عوض مجھے کوئی اوور ٹائم یا اسپیشل الاؤنس بھی نہیں ملتا اور تنخواہ بھی وہی ملتی ہے جو آپ دوسرے فرشتوں کو دیتے ہیں جب کہ دوسرے فرشتے اسرافیل کے ساتھ بیٹھ کر دن دن بھر حقہ پیتے ہیں اور گپیں لڑاتے ہیں ——— آپ رحیم ہیں، کریم ہیں، میرے حال پر رحم کیجیے اور یہ کام کسی دوسرے فرشتے کے سپرد کر دیجیے۔"

عزرائیل کی یہ التجا سن کر خدا سوچ میں پڑ گیا ——— پھر اس نے باری باری تمام فرشتوں کو اپنی بارگاہ میں طلب کیا اور سوال کیا کہ کیا وہ عزرائیل کے فرائض اپنے ذمے لینے کو تیار ہیں۔ مگر اتفاق سے ان میں سے کسی کو بھی باؤلے کتے نے نہیں کاٹا تھا، چنانچہ تمام فرشتوں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ——— "اے اللہ تعالیٰ! ہم آپ کے تابعدار ہیں، فرماں بردار ہیں، حقہ بردار ہیں، مگر اس مکروہ کام کے نا اہل ہیں، نہ تیار ہیں کیوں کہ ہم عزرائیل کی طرح پتھر دل نہیں ہیں۔"

خدا نے پوچھا ——— "پھر یہ کام آخر کون کرے گا؟"

فرشتے بولے ——— "اس کام کے لیے انسان بہترین مخلوق ہے۔"

خدا نے کہا ——— "وہ تو اشرف المخلوقات ہے۔"

فرشتے بولے ——— "حضور! ہم اسی لیے تو کہہ رہے ہیں کہ یہ کام اس سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔"

خدا ان کا اشارہ سمجھ کر زیر لب مسکرایا اور عزرائیل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ——— "بات معقول ہے، دل کو لگتی ہے ——— انسان کو میں نے جن چار عناصر سے تخلیق کیا ہے ان میں ایک عنصر "جلاّدی" بھی ہے۔"

یہ سن کر عزرائیل کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور اس نے تائید کرتے ہوئے کہا ——— "بالکل درست عالی جاہ! ——

بلکہ اب تو صرف جلاّدی ہی جلاّدی ہے۔"

خدا نے کہا ——— "لیکن میں تم کو مکمّل طور پر آزادی نہیں دوں گا ———

عزرائیل نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ——— "کیوں حضور ؟ کیا آپ نے روس اور امریکہ سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے ؟"

یہ سُن کر خدا کو تھوڑا سا طیش ضرور آیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے غصّے پر قابو پاتے ہوئے کہا ——— "عزرائیل ! یاد رکھو ہم اس کائنات کے خالق و مالک ہیں اس لیے ہمیں کسی گٹھ جوڑ کی ضرورت نہیں ہے ———"

عزرائیل کے دل میں آئی کہ وہ پوچھ لے کہ پھر آپ کا نائب آئے دن نت نئے گٹھ جوڑ کیوں کرتا رہتا ہے ——— لیکن خدا کے بدلے ہوئے موڈ کے پیشِ نظر وہ مصلحتاً خاموش رہا۔

خدا نے کہا ——— "عزرائیل ! ہمیں تمہاری تکلیف اور پریشانی کا اندازہ ہے، اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تیسری دنیا میں روحیں قبض کرنے کا کام انسانوں کے سپرد کر دیا جائے ، لیکن باقی کی دو دنیائیں تم ہی سنبھالو۔"

عزرائیل نے ادب سے سر جھکا کر کہا ——— "اے رحیم و کریم آقا ! میں حضور سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ بڑھاپے کی وجہ سے میری قوتِ پرواز اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ آپ جس روح کو قبض کرنے کا حکم آج دیتے ہیں اس کی روح میں بیس سال بعد قبض کر پاتا ہوں ، کیوں کہ سفر بہت لمبا ہے ، اسی لیے یورپ ، امریکہ ، روس ، فرانس ، کینیڈا اور آسٹریلیا وغیرہ میں جن لوگوں کو صرف سو سال تک جینا چاہیے وہ میری SLOW MOTION کی بدولت ایک سو بیس ، ایک سو پچیس سال تک نکال لیتے ہیں اور یوں میری کارکردگی خراب ہو رہی ہے اور میری ACR بڑی تیزی سے "ADVERSE REMARKS" سے بھرتی جا رہی ہے ۔ اس طرح تو میں قیامت کے بعد PENSION سے بھی محروم ہو جاؤں گا ، اور اے ۔ جی آفس والوں کا حال آپ کو معلوم ہی ہے حالی جاہ ! ——— وہاں تو سیدھے سادھے شریف پنشنروں کو بھی اتنا دوڑایا جاتا ہے کہ ان کی پتلونیں لنگوٹیوں میں بدل جاتی ہیں اور اس کے باوجود رشوت کے بغیر کیس سیدھا نہیں ہوتا ، کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں فرشتہ ہو کر بھی پنشن کے حصول کے لیے ——— "رشوت" ——— ؟ یہ کہتے ہوئے عزرائیل کا گلا رُندھ گیا ۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ خدا کو رحم آیا ۔ خدا نے کہا ——— "اچھا اس قصّے کو چھوڑو ۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تیسری دنیا میں جلاّدی کا کام کس کے سپرد کروں ؟"

عزرائیل نے ترنت جواب دیا ——— "حضور ! وہاں یہ کام مفلسی ، مہنگائی ، قحط ، سیلاب ، بیماری سے لیجیے ، جو باقی بچیں انھیں سڑکوں پر دندناتے ہوئے رکشہ ، کار ، ٹرک ، ویگن اور بس ڈرائیوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیجیے"

خدا نے کہا ——— "چلو ٹھیک ہے ، لیکن اس کے باوجود بھی کام مکمل نہ ہو سکا تو پھر ؟"

"پھر ایسا کیجیے کہ ہر دفتر اور ہر ادارے میں ایک جلاّد طبع افسر بٹھا دیجیے ——— وہ بڑے آرام سے اپنے ماتحتوں کو قسط وار مارتا رہے گا اور ایک دن سب ——— خلاص !"

خدا نے پھر کہا ——— "دیکھو عزرائیل تیسری دنیا کی آبادی بہت زیادہ ہے ، اگر یہ افسر بھی ناکافی ثابت ہوئے ——— تو ——— ؟"

عزرائیل نے کہا ——— "اس کا آسان نسخہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو شناختی کارڈ ، ویزا ، پاسپورٹ ، لائسنس ، گرین کارڈ اور اسی قسم کی دیگر تفصیلات میں پھنسا کر لمبی لمبی لائنوں میں کھڑا کر دیجیے ——— باری آتے آتے اپنے آپ ہی

ان کا "دھڑن تختہ" ہو جائے گا"

اور جو بچیں گے ــــ؟ ــــ انھیں ــــ" خدا نے پوچھا۔

"انھیں پاکستان ریلوے کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بٹھا دیجیے"

"چلو شہروں میں تو یہ کام ہو جائے گا، مگر دیہاتوں میں کیا بنے گا ــــ جہاں کی آبادی پچھتر سے اسی فی صد تک ہے؟" خدا نے بڑی تشویش سے پوچھا۔

عزرائیل نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ــــ "عالی جاہ! وہاں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے"

"کیوں ــــ؟" خدا نے حیرت سے پوچھا۔

عزرائیل نے کہا ــــ "وہاں زن، زر اور زمین تینوں چیزیں بڑی وافر مقدار میں موجود ہیں ــــ اور سبھی جانتے ہیں کہ یہ فساد کی جڑ ہیں ــــ چنانچہ اس فساد کو بڑھا کر خاندانی اور نسل در نسل دشمنیوں میں تبدیل کر دیجیے ــــ بڑی حیثیت کے لوگوں کو الیکشن لڑوا دیجیے اور باقی ماندہ کو ڈاکوؤں کے سپرد کر دیجیے، خس کم جہاں پاک!"

خدا نے ہنستے ہوئے کہا ــــ "تمہاری ذہانت سے خوشی ہوئی۔ اب یہ بتاؤ کہ پہلی اور دوسری دنیا میں تمہارا کام کس کے سپرد کیا جائے؟"

عزرائیل نے کہا ــــ "انھیں بالکل آزاد چھوڑ دیجیے۔ مادر پدر آزاد"

"اس سے کیا ہوگا ــــ؟" خدا نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"اس سے اخلاقی بے راہ روی بڑھے گی، شراب خانوں، نائٹ کلبوں، جوئے کے اڈوں اور قحبہ خانوں کی تعداد بڑھے گی، جس سے بے شمار نفسیاتی اور جسمانی امراض بڑھیں گے، طلاقوں اور خودکشیوں کی تعداد بڑھے گی ــــ ڈاکٹر بڑھیں گے، ہسپتال بڑھیں گے، بیمار بڑھیں گے، موت بڑھے گی ــــ" عزرائیل نے چہکتے ہوئے کہا۔

اللہ تعالیٰ نے کہا ــــ "نہیں کچھ اور بھی ہونا چاہیے!"

عزرائیل کھٹ سے بولے ــــ "اے اللہ تعالیٰ آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ یہ دونوں دنیائیں بہت ترقی یافتہ اور مہذب بھی جاتی ہیں اور دہشت اس لیے بھی جاتی ہیں کہ ان کے پاس ایٹم کا ڈنڈا ہے ــــ آپ کو ہیروشیما اور ناگاساکی والا واقعہ تو یاد ہوگا۔

"ہاں ہاں یاد ہے آگے چلو" اللہ تعالیٰ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"بس اللہ تعالیٰ آپ انھیں اسلحے کی دوڑ میں لگا دیجیے اور ان سے ایسے ایسے مہلک ہتھیار ایجاد کروائیے جن کا تصور کر کے شیطان کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور وہ بھی بدحواس ہو کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہو ــــ پھر آپ پہلی اور دوسری دنیا کو لڑوا دیجیے، اس لڑائی میں تیسری دنیا کے کچھ ممالک کو بھی بالکل اسی طرح پسوا دیجیے جیسے گیہوں کے ساتھ گھن پستے ہیں ــــ لیجیے آپ کا کام ہو گیا"

اللہ میاں نے اسی وقت خوشی سے گھنٹی بجائی اور اپنے پی اے کو بلا کر کہا ــــ "عزرائیل کے باعزت ریٹائرمنٹ کے کاغذات تیار کر کے لاؤ!"

بس اسی دن سے عزرائیل کو ریٹائر کر دیا گیا اور اس کے فرائض انسان نے سنبھال لیے اور اتنی خوش اسلوبی سے سنبھالے کہ خدا نے دانتوں تلے انگلی دبالی، خاص طور سے عزرائیل کی تیار کردہ برصغیر کی جائزہ رپورٹ دیکھ کر تو خدا اتنا خوش ہوا کہ اس نے عزرائیل کی پنشن میں سو فیصدی اضافہ کرنے کا حکم دے دیا ——— عزرائیل کے پُر زور اصرار پر قتلِ عام کی مختصر جائزہ رپورٹ آپ کے سامنے پیش کی جا رہی ہے، اس رپورٹ کی روشنی میں آپ اپنے قاتلوں کو آسانی سے پہچان کر حفاظتی تدابیر اختیار کر سکتے ہیں اور کچھ عرصے کے لیے ان سے بچ بچ کر یوں چل سکتے ہیں جیسے پل صراط پر چل رہے ہوں ورنہ راضی بہ رضا رہتے ہوئے غالب کے اس شعر کی روشنی میں ہنس کر جان دے ڈالیے ؎

کریں جو قتل تو قاتل کو خوں بہا دیجیے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

بہرحال اختصار کے ساتھ مقتولوں اور جلّادوں کی فہرست کچھ یوں ہے۔

عالموں کے جلّاد ——— جاہل
ادیبوں کے جلّاد ——— ایڈیٹر
شاعروں کے جلّاد ——— حسینائیں
ڈراما نگاروں کے جلّاد ——— پروڈیوسر
ماتحتوں کے جلّاد ——— افسر
استادوں کے جلّاد ——— شاگرد
کسانوں کے جلّاد ——— زمیندار
مزدوروں کے جلّاد ——— صنعت کار
گاہکوں کے جلّاد ——— دکان دار
ووٹروں کے جلّاد ——— سیاسی لیڈر
مسافروں کے جلّاد ——— ڈرائیور
مریضوں کے جلّاد ——— ڈاکٹر
بیویوں کے جلّاد ——— کم جہیز
بچوں کے جلّاد ——— بھاری بستے
شوہروں کے جلّاد ——— بیویاں

اس سرسری جائزے میں بہت سے نام رہ گئے ہیں۔ آپ کو اختیار ہے کہ اپنی طرف سے اضافہ کر کے اس لسٹ کو مکمل کر سکتے ہیں ——— اس کے باوجود بھی اگر کچھ "سخت جان" لوگ بچ گئے اور انھیں کوئی جلّاد قتل نہ کر سکا تو بے فکر رہیے۔ آخر اسرافیل صدیوں سے سرکاری ملازمین کی طرح کس بات کی تنخواہ لے رہے ہیں ——— کیا وہ صور بھی نہیں پھونکیں گے؟

شیخ سلیم احمد

تیرہواں نمبر

چرچ روڈ کے اُس چھوٹے سے سروس اسٹیشن پر جب وہ گاڑی لے کر پہنچا تھا تو یہ ایک معمول کی بات تھی۔ پھر بھی وہ محسوس کر رہا تھا کہ کچھ نیا ضرور تھا۔ حمید کو اس سڑک پر سے گزرتے ہوئے بیس سال بیت گئے تھے۔ یہ سروس اسٹیشن بھی اس کے لیے نئی چیز نہ تھا۔ سب کچھ مانوس اور جانا پہچانا۔ مانوسیت سے چیزیں بے رنگ اور بے جان ہو جاتی ہیں۔ جن چہروں اور چیزوں کو ہم روزانہ دیکھتے ہیں وہ بے معنی سے لگنے لگتے ہیں۔ حُسن تو اجنبیت میں ہے۔ نئی نئی چیزوں اور جگہوں کو دیکھنے کا کس قدر کریز ہوتا ہے۔ کس قدر سنسنی جسم میں دوڑتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے ان سے مانوس ہوتے جاتے ہیں تو کیسی بے جان ہو جاتی ہیں۔ اجنبی سا کوئی نرم و نازک چہرہ کیسے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ محبت کے لیے بھی تھوڑی سی اجنبیت ضروری ہے۔ آج اسے چرچ روڈ پر ایک نئے پن کا احساس ہو رہا تھا اور یہ نیا پن کیا تھا یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

حمید کو گھر سے نکلنے میں ذرا دیر ہو گئی تھی، مگر جب وہ سروس اسٹیشن پہنچا تو اسے بہت بھیڑ نظر آئی۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ صرف پندرہ منٹ کی دیر ہوئی تھی اور اتنے عرصے میں اتنے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ سنڈے کا دن ہے۔ کیسے جلدی ہو گی۔ اگر چند منٹ دیر سے بھی پہنچوں تو کیا ہو جائے گا۔ اس نے سوچا تھا۔ مگر یہاں کیا عالم تھا۔ ہماری سب سے بڑی مشکل آبادی ہے——— بھیڑ ——— بھیڑ ——— کیسے اعصاب چٹخنے لگتے ہیں۔ ایک حد تک تو اچھا لگتا ہے، لیکن جب دم گھٹنے لگے! گاڑی پارک کر کے وہ تیزی سے گیرج کے اندر گیا۔ وہی سردار جی رسید بک لیے گاڑیوں کا اندراج کر رہے تھے۔ اس نے اپنا نمبر لکھوایا۔ ایک ضعیف سی مسکراہٹ سردار کے چہرے پر پھیل گئی۔ آؤ تم بھی آؤ۔ رش کے باوجود ہم تمہارا خیر مقدم کرتے ہیں۔ سردار کی مسکراہٹ کا یہی مطلب تھا۔ بیچارا سردار کیسی تندہی سے گاڑی چیک کرتا تھا اور رسید بنا کر گاہک کے ہاتھ میں تھما دیتا تھا۔ بعض ڈاکٹر مریض کی صورت دیکھ کر نسخہ لکھ دیتا ہے۔ سردار بھی ایک ماہر معالج کی طرح گاڑی کو دیکھ کر ہی نسخہ لکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ ہاں یہ کہاں ٹکر مار لائے۔ بیک لائٹ بھی خراب ہے اور گیئر کو کیا ہو گیا، اور یہ آواز تو انجن کی خرابی کی ہے، اور وہ لونڈا، وہ تو سردار کا باپ تھا۔ وہ گاڑی کو چلا کر اندر گیرج میں لاتا تھا، اور پانچ سیکنڈ کی ڈرائیو میں ہی گاڑی کی طرح پیٹ کے اندر کا سارا حال جان لیتا تھا۔ وہ میکینک تھا جو سردار کی مدد کے لیے مقرر تھا۔ گاڑی کو اندر لانے، چیک کرنے اور اس کی خرابیاں نوٹ کرنے اور پھر رسید بنانے میں دس پندرہ منٹ لگ جاتے تھے۔

لیکن کیا اس کا نمبر آسکے گا۔ آج چند میکنیکس چھٹی پر تھے۔ چھٹی پر تھے یہ بھی معلوم نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے آہی جائیں۔ کوئی تہوار بھی تھا۔ یہاں تو یہی چکر لگا رہتا ہے۔ کبھی بھائیوں کا تہوار، کبھی بہنوں کا، کبھی بیویوں کا۔ زیادہ تر ہندوستانی ہر وقت کسی نہ کسی عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ عذاب تو ہندوستانیوں کا مقدر بن چکا ہے۔ نہ جانے کب ہمیں نجات ملے گی۔ میکینکوں کے غائب ہونے کی وجہ سے سروس اسٹیشن میں کھلبلی سی تھی۔ اسٹور کلرک کہہ رہا تھا۔ میں اتنے بل نہیں بناؤں گا۔ سردار بھی بہکی تھا۔ وہ لونڈا تو گاڑیوں کو لالا کر جیسے زمین پر پٹخ رہا تھا۔ گاڑیاں بھی تو کچھ زیادہ ہی آگئی تھیں۔ کمپنی کا اصول تھا کہ اتنی ہی گاڑیاں لیتے جن کی دن بھر میں مرمت کر سکتے۔ شام کو گاہک اپنی گاڑی واپس لے جا سکتا تھا۔ یہ بہت بڑا آرام تھا۔ شاید اسی لیے یہ سروس اسٹیشن ہردم مصروف رہتا تھا۔ ایمانداری اور معیار ٹکسالی سکتے ہیں جنھیں جہاں چاہے بھنا لو۔

حمید کی مشکل یہ تھی کہ وہ اپنی گاڑی کا خود ہی ڈرائیور تھا۔ کل اسے سورج کنڈ جانا تھا۔ جہاں ہنڈی کرافٹس کی بین الاقوامی نمائش کا افتتاح ہونے والا تھا۔ وہ بھی اس نمائش کا ایک اہم نمائندہ تھا۔ شرکت آدمی کو اہم بنا دیتی ہے۔ وہ محض تماشائی نہیں تھا۔ تماشے کا حصّہ تھا اور پھر سماجی اسٹیٹس ہو تو پھر کار سے چل کر جانا اسٹیٹس سمبل ہوا۔ اس لیے ہر صورت میں اسے آج کار درکار تھی۔ اگر نمبر کٹ گیا تو کل یا پھر کسی اور دن آنا ہی وقت لگ جائے گا۔ وقت جو ہم سب کا دوست بھی ہے اور دشمن بھی ـــــ ہم گھڑی کی دو سوئیوں کے بیچ جکڑے ہیں۔

کچھ لوگ نیم کے درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ کچھ شیڈ کے اندر بنچوں پر بیٹھے تھے۔ زیادہ تر وہی شناسا چہرے۔ وہ پروفیسر نما شخص بھی تھا جو پائپ کو منہ سے نکالنا گناہ تصور کرتا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر عورت بھی تھی جس نے جوانی کو خوب استعمال کیا تھا، اور اب وہ رس نچڑے گنے کی طرح تھی۔ لیکن وہ اگر، وہ سب نہ کرتی جو اس نے کیا ہوگا تو انجام تو یہی ہونا تھا۔ نیکر پہنے وہ بوڑھا جیسے گولف کلب سے آیا ہو۔ اس عمر میں بھی تن کر چلتا تھا۔ آرمی مین ہوگا۔ اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ بھیڑ دیکھ کر جا چکے تھے۔ چلو اچھا ہوا۔ شاید اب چانس بن جائے۔ وہ ٹہلتا ہوا سڑک پر آگیا۔ خلاف معمول سڑک ویران تھی۔ سروس اسٹیشن کے قریب چائے کا ڈھابہ تھا وہاں کچھ مزدور چائے پی رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں کام نہیں ملا تھا۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر مزدوروں کی ایک بستی تھی ـــــ جھگیاں ہی جھگیاں ـــــ کہتے ہیں یہاں زیادہ تر لوگ دربھنگا سے آئے ہوئے تھے۔ اس لیے اسے دربھنگا بستی کہتے تھے۔ وہ مزدور بھی دربھنگا کے تھے جو ڈھابے کے سامنے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ یہ دربھنگا میں ہی اتنی غربت کیوں ہے۔ اس علاقے میں ان لوگوں کی وجہ سے لیبر سب سے سستی تھی۔ جس طرح ہندوستان میں انسان سستا ہے۔ وہ چائے کی دوکان کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ مہابھارت سیریل چل رہا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ سڑک کیوں ویران تھی اور شاید گرد و پیش میں اسی لیے اسے نیاپن نظر آیا تھا۔ عام دنوں میں تو اس سڑک کو کراس کرنا مشکل تھا۔ وہ ڈھابے سے چل کر سنسان سڑک پر آگیا۔ کھلا کھلا پن۔ خاموشی۔ اکا دکا کوئی کار گزر جاتی۔ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہر روز تو یہاں قیامت برپا رہتی تھی۔ آج سب ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ہوا میں بھی اسے تازگی محسوس ہوئی۔ وہ آزادی سے چل سکتا تھا۔ اس کے دل میں ایک سنگدلانہ خیال نے انگڑائی لی۔ کاش گھروں میں جو لوگ ہیں وہ کبھی باہر نہ نکل سکیں۔ وہیں بیٹھے کے بیٹھے رہ جائیں۔ منجمد ہو جائیں ان کے بت بن جائیں۔ اسے اپنے اوپر غصہ آیا۔ کیسا خود غرضانہ خیال تھا۔ سڑک پر آزادی سے چلنے کے لیے وہ ایسا سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھا کہ اسے گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ سروس اسٹیشن کے سامنے بورڈ وہ رہا تھا۔ وہاں کسی نے

گھنٹیاں بجائی تھیں۔ اسے یہ مندر دیکھ کر حیرانی ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے تو اس نے یہ مندر نہیں دیکھا تھا۔ کیسا خوبصورت مندر ہے۔ کیا یہ مندر وہاں پہلے سے موجود تھا۔۔۔ ہوگا۔۔۔ لیکن اس پر اس کی نظر آج پڑی تھی۔ بودھ وہار کے قریب ایک عمارت تھی جس پر پالیٹکل سمیتی کا بورڈ لگا تھا۔ یہ ہریجنوں کا مندر تھا۔ نئے نئے بدھسٹ۔ روزی روٹی کے بعد انسان کا دوسرا بڑا مسئلہ سماج میں عزت کے ساتھ رہنے کا ہے۔ نفرتوں کے درمیان جینا بھی کتنا مشکل ہے۔ بودھ وہار سماج میں عزت و اطمینان سے رہنے کی انسان کی ازلی خواہش کے ایک استعارے کے طور پر کھڑا تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا پھر ڈھابے کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ کرشن جی کی شادی رکمنی سے ہو رہی تھی۔ ہستناپور کا راجہ دھرت راشٹر، یودھشٹر کو گدی کا جانشین بنانے پر تلا ہوا تھا جب کہ اس کا پتر دریودھن اپنے ماما کے ساتھ مل کر یودھشٹر کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ لڑائی تو ہر گھر میں آج بھی لڑی جا رہی ہے، مگر صرف ہندوستان میں۔ ہمارا پورا جیون رامائن اور مہابھارت ہی میں رنگا ہوا ہے۔ ہم اس کو جیتے رہتے ہیں۔ ہمارے پاس اپنا کچھ بھی نہیں۔ ہم دوسروں کی زندگی جیتے ہیں۔ اس لیے سب کچھ وہی ہے۔ مہابھارت کے یگ کا کوئی شخص زندہ ہو کر آئے اور ہندوستان کی سڑکوں پر کھڑا ہو تو وہ پہچان لے گا کہ یہ آریہ ورت ہے جس میں کھلشو گیروا کپڑے پہنے گھومتے تھے۔ وہی بھارت ہے جس میں وہ رہتا تھا۔

بہت سی گاڑیاں گیرج کے اندر لے جائی جا چکی تھیں۔ چند گاڑیاں باقی رہ گئی تھیں۔ حمید سڑک پر سے سروس اسٹیشن کے کمپاؤنڈ میں آ گیا۔ نیم کے پیڑ کے نیچے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ وہ شاید نیا کسٹمر تھا یا شاید باپ یا بڑے بھائی کی گاڑی لے کر آیا تھا۔ بالکل اجنبی اور روچہرہ۔ حمید نے اس سے پوچھا "کون سا نمبر گیا ہے؟"

نوجوان چونک کر بولا "ابھی ساتواں نمبر گیا ہے۔"

"تمہارا کتنا نمبر ہے؟" حمید نے پوچھا۔

"بارہواں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"اخ او بارہواں۔ میرا تیرہواں نمبر ہے۔" حمید نے تعجب سے کہا۔

"شاید ہم دونوں میں سے کسی کا بھی نمبر نہ آئے۔ آج ان کے یہاں میکینکس کم ہیں۔ میں تو سوچتا ہوں، کل آؤں۔" وہ بھی اس میکینک لونڈے کی بات دہرا رہا تھا۔

حمید یہ سن کر مزید پریشان ہوا۔ یقین کی موہوم سی کرن ناامیدی کی تاریکی میں بدلنے لگی۔ وہ لڑکا خوش باش قسم کا تھا۔۔۔ مسکراتا چہرہ۔۔۔ کھلنڈرا پن۔۔۔ بے غرض۔۔۔ بے نیاز۔۔۔ آزاد ہواؤں میں اڑان بھرتا ہوا پنچھی۔ ابھی تو اس کے سامنے ایک لمبی عمر پڑی تھی۔

نوجوانی بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ وقت نے ابھی اس کے چہرے پر اپنے بدنما داغ دھبے نہیں چھوڑے تھے۔ شاید وہ کسی کمپنی کا ایگزیکٹو ہوگا۔ اس نوجوان کے بارے میں جب سوچ رہا تھا تو اس نے ایک نظر باقی لوگوں پر بھی ڈالی۔ تب اسے خیال آیا کہ زیادہ لوگ تو یہاں اس نوجوان کے ہم عمر ہی تھے۔ ہاں، یہ نوجوانوں کا دور ہے۔ ہر دور نوجوانوں کا دور ہے۔ بوڑھے تو جاتی ہوئی بہار کی طرح ہوتے ہیں۔ اس مجمع میں وہ اب خود کو بھی اجنبی محسوس کر رہا تھا۔ اسی لیے تو تمام فضا بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ سب کچھ سوچنے پر مجبور ہے۔ ہر چیز اپنی منڈ سے پہچانی جاتی ہے۔ نوجوانوں کی اس بھیڑ میں اسے اپنے بڑھاپے کا

احساس شدید ہوگیا۔ وہ بڑھاپے کی منزلوں میں داخل ہو رہا تھا۔ بعض باتیں پہلے سے سمجھ میں نہیں آتیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ دولت، عزّت، شہرت سب فضول باتیں ہیں۔ بس جوانی ہو، صحت ہو۔ چھوڑیے۔ اب ان باتوں کو سوچنے سے کیا فائدہ؟ چلو دیکھیں گیرج کی کیا پوزیشن ہے؟

"معاف کیجیے گا سر!"۔۔۔ سر۔۔۔ سر۔۔۔ وہ نوجوان اسے سر کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ اسے بڑا اچھا لگا۔ عمر کے بھی اپنے فائدے ہیں۔

"ہاں کہو" وہ نہایت شفقت سے نوجوان کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں سگرٹ پی رہا ہوں۔ وہ سردار مجھے اندر گھسنے نہیں دے گا۔ ذرا آپ جا کر دیکھیے۔ اندر کیا ہو رہا ہے۔"

"ہاں، ہاں۔ ٹھیک ہے۔"

"وہ سردار تو شریف انسان ہے، مگر وہ لونڈا۔۔۔۔" گالی اس کی زبان پر آتے آتے رک گئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری تھی۔

"میں دیکھتا ہوں" میں بھی ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔ ماحول کی یکسانیت میں دراڑ پڑ رہی تھی۔ ہلکی سی کنکر ڈالیے تو پانی میں لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ اچھی بات سے فضا کی سنگلاخی کم ہوتی ہے۔ نوجوان سراپا زندگی معلوم ہوتا تھا۔

حمید گیرج کی طرف بڑھا۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ نوجوان بے فکری سے ہوا میں دھوئیں کے مرغولے چھوڑ رہا تھا۔

سردار اور لونڈے میں مکالمہ ہو رہا تھا۔ ابھی تک میکنیکس نہیں آئے تھے۔ جو تھے انہیں سے کام چلاتا تھا۔ سردار کہہ رہا تھا کہ کم از کم بارہ گاڑیاں تو لیتی ہی ہیں۔ لونڈا دس سے آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ کام کا بوجھ اس پر تھا۔ سردار کا کیا تھا۔ وہ تو رسید کاٹ کر چھٹی کرے گا۔ دس اور بارہ کے درمیان معاملہ لٹک رہا تھا۔ تیرھویں نمبر کا تو سوال ہی نہیں۔ حمید نے سوچا۔ اگر وہ لونڈا سردار کی بات مان بھی لیتا ہے تب بھی بارہ نمبر تک دے دیا جائے گا اور معاملہ ختم۔ وہ بہت مایوس ہوا۔ اس کا انتظار کرنا بھی بیکار ہی رہا۔ کل کی مصروفیات اس کے ذہن پر تھیں۔

اسے کتنا اہم سفر درپیش تھا۔ کار اس کے لیے اسٹیٹس سمبل ہی نہیں تھا بلکہ ضرورت بھی تھی۔ کانفرنس میں غیر ملکی مندوبین بھی آنے والے تھے اور اسے انھیں سائٹ سینگ کے لیے لے جانا تھا۔ رات کا ڈنر کسی ہوٹل میں تھا۔ کار کی سروس بھی ضروری تھی۔ کئی چیزیں بدلی جانی تھیں۔ جن کے بغیر کار چلانا رسکی تھا۔ اب کیا کیا جائے۔ اس نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ جو نیم کے پیڑ کے نیچے شانِ بے نیازی سے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔۔۔ اس کی گاڑی کا بارھواں نمبر تھا۔۔۔ اور خود اس کا تیرھواں نمبر۔

لونڈے نے سردار کی بات کو مان لیا تھا۔ اب بارہ نمبر تک ہی لیا جائے گا۔ حمید نے یہ سنا اور ایک بار پھر اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ نوجوان نے بھی اس کی طرف دیکھا۔

"کیا پوزیشن ہے؟" نوجوان کی آواز اس کے کانوں میں گونجی

"کوئی امید نہیں۔ دس سے زیادہ نمبر نہیں لے رہے ہیں۔" غیر شعوری طور پر حمید کی زبان سے نکلا۔ یا شاید اس نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔ اس لیے کہ وہ مجبور تھا۔ (باقی ص۷۲ پر)

محمد عاشق شیخ

شعروں کے انتخاب نے.....

(انشائیہ)

ہماری طبیعت شاعرانہ نہیں، صرف مزاج عاشقانہ ہے۔ آخر انسان کو اپنے نام کی تھوڑی بہت لاج بھی تو رکھنی چاہیے۔ طبیعت شاعرانہ نہ ہونے کے باوجود شعر سے ہمارا تعلق لڑکپن سے ہی قائم ہو گیا تھا۔ ہوا یوں کہ جب ہم ترقی کی منزلیں طے کرتے کرتے آٹھویں کلاس میں پہنچے تو ماہانہ بزم ادب میں تقریر کرنا ہمارے ذمے ٹھہرا۔ جب ہمیں سکریٹری بزم ادب نے بتایا کہ آئندہ ماہ تقریر ہم کو کرنا ہے تو ہمارے پسینے چھوٹ گئے کہ بار الٰہی یہ کیا افتاد آن پڑی ہے؟ ہم سے نادانستہ کون سا اتنا بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے جس کی سزا یوں سر محفل تجویز ہوئی ہے۔ ہم جو گھر میں بھی بے زبان مشہور تھے۔ کس طرح سیکڑوں طلبہ کے سامنے اسٹیج پر کھڑے ہو کر منھ کھولیں گے۔ یقین تھا کہ منھ کی کھائیں گے۔ بہت سوچ بچار کے بعد ابا حضور کی شفقت آزمانے کا ارادہ کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ ابا حضور تھے، ڈیڈ نہیں تھے۔ ورنہ ان کے پاس اپنے بچوں کا مسئلہ سننے کا وقت کہاں ہوتا۔ ان سے اپنے اوپر پڑنے والی یہ افتاد ناگہانی بیان کی۔ فرمانے لگے یہ کون سا مشکل کام ہے۔ آنکھیں بند کر کے دل میں آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے اسٹیج پر چڑھ جانا (جو ہمارے لیے سولی پر چڑھ جانے کے مترادف تھا) اپنے سامنے بیٹھے ہوئے سب لوگوں کو گونگا بہرا سمجھ کر تقریر کر کے خراماں خراماں واپس چلے آنا۔ یہ اسکول کے لڑکوں کی بزم ادب ہے۔ ادب سے کام لیں گے۔ کوئی سیاسی جلسہ تو نہیں کہ تم گندے انڈوں اور ٹماٹروں سے ڈرتے ہو۔ وہ ہمیں قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر جب انھیں یقین ہو گیا کہ لڑکے کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ عین اسٹیج پر کوئی حادثہ ہو جائے تو وہ قائل ہو گئے کہ فرزند ارجمند میں لیڈرانہ صلاحیتیں سرے سے مفقود ہیں۔ بادل نخواستہ بزم ادب کے انچارج ماسٹر صاحب سے ملے اور عرض کیا کہ جناب بچے پر اتنا ہی بوجھ ڈالیں جتنا وہ اٹھا سکے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بھی قوت برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتی۔ یہ سن کر ماسٹر صاحب نے ہمیں ایسی منتقمانہ نظروں سے گھورا کہ ہم اپنے انجام سے ڈر کر ابا حضور کے پیچھے چھپ گئے۔ خاصی بحث و تمحیص کے بعد تقریر سے ہماری جان چھوٹی، مگر تحت اللفظ اشعار پڑھنا ہمارا مقدر بنا۔ گویا ہم آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئے۔ خیر قہر درویش بر جان درویش، اشعار کی تلاش شروع ہوئی جو بزم ادب میں پڑھے جا سکیں۔ تو صاحبو وہ دن اور آج کا دن، شعروں کا انتخاب کرتے کرتے بال چاندی ہو گئے

ہیں کیسے کیسے معرکے کے شعر ہم نے منتخب کرکے سنائے ہیں۔ اگرچہ بعض اوقات بڑے بڑے حوصلہ شکن فقروں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ مثلاً کلام اچھا ہے۔ طرزِ کلام اچھا نہیں۔ ہم شعر سنیں گے، ڈائیلاگ نہیں وغیرہ وغیرہ

شعروں کا انتخاب کرتے کرتے ہمارا ذوق خاصا نکھر گیا۔ تجربے نے ہمیں شعر کو جانچنے پرکھنے کا گُر سکھا دیا۔ اب ہم شعر پر نظر ڈالتے ہی بتا سکتے ہیں کہ شعر کس قد و قامت اور وزن کا ہے۔ کاش ایسا بھی ہو سکتا کہ شعر پڑھ کر ہم شاعر کے قد کاٹھ اور وزن کا بھی اندازہ لگا سکتے۔ کسی بھاری بھرکم شعر کو پڑھ کر کہہ سکتے کہ یہ استاد ناسخ کا شعر ہے اور کسی دھان پان سے شعر کو دیکھ کر کہہ اٹھتے کہ یہاں حسرت موہانی جلوہ گر ہیں۔ ہم ایک اور نتیجے پر بھی یقیناً پہنچے ہیں کہ جو شعر پیچ در پیچ، گنجلک اور خوفناک صوتی آہنگ رکھتا ہو، اسے بلا تامل غالب کا کہہ دیجیے۔ کوئی کچھ نہ کہے گا۔ غالب کی شاعری نے دنیائے ادب کو کیا کچھ دیا، یہ تو ادب والے جانیں۔ مجھ بے ادب کو تو مرحوم کے ایک مصرعے نے آرمی کمیشن سے محروم رکھنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ کاش مرزا غالب نے وہ مصرعہ اگر کہہ ہی دیا تھا تو اپنے دیوان میں شامل نہ کیا ہوتا۔ ہماری داستانِ محرومی کچھ یوں ہے کہ مطلوبہ ڈگری حاصل کرنے کے بعد آرمی ایجوکیشن کور میں لیکچرار کے لیے درخواست دینے کی ہمت اپنے آپ میں پیدا ہوتی محسوس کی۔ کاغذات اس وقت کوئی گزیٹیڈ کلاس ون افسر تصدیق کر سکتا تھا۔ ہمارے ادارے کے سربراہ ایک ریٹائرڈ بریگیڈیر تھے۔ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔ ہم اپنے سرٹیفکیٹ اور فارم وغیرہ لے کر ان کے حضور پیش ہوئے۔ خواہش نا تمام بیان کی کہ اگر حضور کی جنبشِ قلم کی برکت سے اس ناچیز کو قوم کے جیالوں کو اردو پڑھانے کی سعادت نصیب ہو گئی تو رزمیہ شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ دور کی بات نہیں۔ انھوں نے مجھے سر سے پاؤں تک ایک مختصر سے لمحے میں دیکھا (سر سے پاؤں تک کا فاصلہ کافی مختصر ہے) گویا زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربہ۔ اپنی بارعب آواز میں فرمانے لگے "دیکھو برخوردار! میں نہیں جانتا تم کتنے پانی میں ہو؟ میں تمھارا امتحان لوں گا۔ آج کل غالب میرے زیرِ مطالعہ ہے۔ اس کا ایک مصرعہ پڑھتا ہوں، اگر تم نے اس کی تشریح خاطر خواہ کر دی تو نہ صرف کاغذات کی تصدیق کر دوں گا بلکہ ایک بند لفافہ بھی دوں گا جسے حرزِ جاں سمجھنا۔ انٹرویو کے اعصاب شکن لمحوں سے پہلے اگر یہ صحیح ہاتھوں میں پہنچا دو گے تو معجون مقوی ثابت ہو سکتا ہے۔" ہم دریائے حیرت میں غوطہ زن تھے کہ یا الٰہی کہاں یہ توپ و تفنگ کا ماہر جانباز سپاہی اور کہاں مطالعۂ غالب۔ کیا کبھی زمین و آسمان بھی یک جا ہوئے ہیں۔ یاد آیا کہ ہاں افق کے اس پار کہیں زمین و آسمان کا ملاپ ہوتے دیکھا ضرور ہے۔ پھر اسے غالب مرحوم کے حق میں فالِ نیک سمجھ کر خوش ہوئے کہ مرحوم زندگی میں استادِ شہ بن کر اقتدار کے ایوانوں تک رسائی نہ پا سکے، لیکن مرنے کے بعد کیسے کیسے مردِ آہن کے ذہنوں پر جو ایوانِ اقتدار کے مضبوط ستون ہیں، سوار ہو گئے ہیں۔ غالب کی اس خوش قسمتی پر رشک کرتے ہوئے بڑے پُر اعتماد لہجے میں عرض کیا۔

"ارشاد فرمائیے ـــــ!" گویا ہوئے ـــــ "شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا" موصوف نے اس طرح پڑھا جس طرح میدانِ جنگ میں سپاہی نے دشمن پر مشین گن کا برسٹ مارا ہو، جس کی زد میں دشمن سپاہی نہیں، روحِ غالب آ گئی ہو اور تڑپ کر فریاد کر رہی ہو ـــــ "نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا" ـــــ ہم نے لاکھ کوشش کی کہ موصوف کو قائل کر لیں کہ یہ لفظ "سبحہ" نہیں "سبحہ" ہے۔ یہ نکتہ "ج" کا نہیں "ب" کا ہے، مگر

وائے محرومی کہ ہم بزعمِ خود اپنی تمام تر علمیت اور غالب فہمی کے دعووں کے باوجود، انھیں یہ نکتہ باور کرانے سے قاصر رہے۔ ہماری آواز جو قدرتی طور پہ ذرا باریک واقع ہوئی ہے، نقارخانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی۔ ان کی نظر میں ہم نااہل، نافہم، سخن ناشناس ٹھہرے اور ہم ایسے کندۂ ناتراش کو قوم کے نونہالوں کا استاد بنانے کی سفارش کم از کم اس منصف مزاج شخص کے لیے ممکن نہ تھی۔ کاغذات وغیرہ کی تصدیق تو ہم نے کہیں نہ کہیں سے کروا لی مگر وہ جو تعویذ کامیابی ملنا تھا کہیں اور سے نہ ملا۔ نتیجے کے طور پہ ہم استاد محترم بننے کی بجائے آج بھی طفلِ مکتب ہیں۔

(مدینہ منورہ سعودی عربیہ)

محمد خالد اختر • نکہت بریلوی • ممتاز احمد خاں

نئی کتابیں

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

دریائے لطافت
(اردو لسانیات)

مصنف : سید انشاء اللہ خاں انشا
مترجم : پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی
صفحات : ۳۹۵ • قیمت : پچیس روپے
ناشر: انجمن ترقی اردو بابائے اردو روڈ کراچی

سید انشاء اللہ خاں انشا اردو شاعری کے استادوں میں سے تھے اور دلّی کی زبان کے بادشاہ (ان کا اصلی مولد و مسکن دلّی ہی تھا) بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ نثر کے میدان کے شہسوار بھی تھے۔ انھوں نے ایک داستان اردو نثر کی لکھی ہے جو خالص برج بھاشا ہے اور جس میں ایک بھی لفظ عربی اور فارسی کا نہیں آنے دیا۔ نثر میں ان کا بڑا یادگار کارنامہ "دریائے لطافت" ہے۔ جس میں اردو صرف و نحو، محاورات، معانی و بیان سے بڑے لطیف پیرائے میں بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے مرزا قتیل کے اشتراک سے فارسی زبان میں لکھی۔ پہلا حصہ یعنی اردو صرف و نحو وغیرہ سید انشا اللہ کی تصنیف ہے اور دوسرا حصہ منطق۔ عروض و قافیہ سے متعلق مرزا قتیل کا جو قطعی خشک اور بے رنگ ہے۔ یہ کتاب جو ۱۸۰۷ء میں تصنیف ہوئی پہلے پہل چھیالیس برس بعد نستعلیق ٹائپ میں مرشد آباد سے چھپی اور اس طرح زمانے کی دست برد سے تلف ہوتے سے بچ گئی۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے اس بھولے بسرے نسخے کا کھوج لگایا اور اسے ۱۹۱۶ء میں دوبارہ مرتب کر کے انجمن کی طرف سے طبع کیا (مولوی صاحب تب اورنگ آباد، بھارت میں انجمن کے آنریری سکریٹری تھے) بعد میں مولوی صاحب کے کہنے پر اردو زبان کے ایک مشہور ہندو ادیب و شاعر پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی نے فارسی کتاب کا نکھری ہوئی اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی طبع اول انجمن نے ۱۹۳۵ء میں کی۔ اب انجمن ترقی اردو پاکستان نے ۱۹۸۸ء میں اسے مولوی صاحب اور مترجم کے مقدموں کے ساتھ دوبارہ چھاپ کر ایک اہم ادبی کام سرانجام دیا ہے۔

لسانیات پر لکھی ہوئی یہ اردو کی پہلی کتاب ہے اور اس کی نثر کے لفظ لفظ سے انشاء اللہ خاں کی شوخی اور طباعی جھلکتی ہے وہ لوگ جو میری طرح کلاسیکی اردو ادب سے محبت کرتے ہیں اس کتاب کو حرز جان بنائیں گے اور مولوی عبدالحق کے مقدموں کے لطفِ بیان کا کیا کہنا۔

——— محمد خالد اختر

بلا کشانِ محبت
(شخصی خاکے)

مصنف : ڈاکٹر عبادت بریلوی
صفحات : ۱۳۱ • قیمت : ساٹھ روپے
ناشر : ادارہ ادب و تنقید - لاہور

ڈاکٹر عبادت بریلوی کو ہمارے ادب میں جو علمی اور ادبی مقام حاصل ہے اس سے سب واقف ہیں - وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو پڑھنے اور لکھنے کے لیے ہی اس دنیا میں آئے ہیں اور جنھوں نے اپنا ہر ادبی کام پوری محنت اور لگن سے عبادت جان کر کیا ہے - ان کی تصنیفات اور تالیفات (جن میں کئی سفرنامے، اپنی خود نوشت اور کئی شخصی خاکوں کے مجموعے بھی شامل ہیں) کی کل تعداد ساٹھ کے لگ بھگ ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کوئی سرسری نوعیت کی ہے - جن لوگوں نے ان کو پڑھا ہے جانتے ہیں کہ وہ کتنے ریڈیبل اور منجھے ہوئے ادیب ہیں -

زیر تبصرہ کتاب اس دور کی چند نامور اور یادگار شخصیات کے خاکوں پر مشتمل ہے - ان میں مولانا صلاح الدین احمد (ادبی دنیا والے) عبدالرحمن چغتائی، میاں محمد اسلم (جنھوں نے ڈیڑھ سو سے زائد رومانی ناول لکھے) پروفیسر عزیز احمد (جنھوں نے گرانقدر ناول لکھے اور پھر ایک ڈگر پر چل نکلے) حبیب جالب، پروفیسر سراج الدین (گورنمنٹ کالج لاہور والے) ڈاکٹر نذیر احمد (گورنمنٹ کالج لاہور کے لو ہمین - قلندر صفت پرنسپل) پروفیسر خواجہ صلاح الدین - مولانا امتیاز علی عرشی اور مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل کے نام ہیں - کتاب کا مواد اس لحاظ سے نیا اور اچھوتا ہے کہ ان میں کئی ایک دل آویز ہستیوں کے اتنے اچھے، جیتے جاگتے خاکے پہلے نہیں لکھے گئے -

ڈاکٹر صاحب نے یہ خاکے بڑی دل بستگی اور محبت سے تحریر کیے ہیں اور ان کا طرز بیان نہایت دلچسپ ہے - ان کی کتاب کو دوبارہ اور سہ بارہ پڑھا جا سکتا ہے - اکتائے بغیر -

———— محمد خالد اختر

سائنسی فکر اور ہم عصر زندگی
(مضامین)

مصنف : ثاقب رزمی
صفحات : ۲۵۶ • قیمت : پچاس روپے
ناشر : نگارشات - ۳ ٹمپل روڈ - لاہور

معروف شاعر و ادیب ثاقب رزمی کئی کتابوں کے مصنف ہیں - زیر تبصرہ کتاب "سائنسی فکر اور ہم عصر زندگی" مصنف کی نہایت اہم تصنیف ہے جس میں انھوں نے سائنسی فکر کے عناصر تفصیل سے بیان کیے ہیں اور ان کی روشنی میں کئی علوم اور مسائل حیات پر بحث کی ہے اور انھیں ایسے تناظر میں دکھایا ہے جس سے ذہنوں میں بیداری پیدا ہوتی ہے - مصنف کے نزدیک وہ فلسفہ بے سود ہے جو زندگی کے مسائل کو سائنسی خطوط پر حل نہیں کرتا - اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے معاشرتی اثرات، انسان کا ارتقا، سیاسیات اور جنس اور ثقافت جیسے فکر انگیز مضامین شامل ہیں جو قاری میں ایک نئی بصیرت پیدا کرتے ہیں، ثاقب رزمی کی یہ تصنیف ترقی پسند ادب میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے - کتاب دیدہ زیب گیٹ اپ میں پیش کی گئی ہے -

———— نکہت بریلوی

سایہ سایہ دھوپ
(افسانوں کا مجموعہ)

مصنف : سلطان جمیل نسیم
صفحات : ۲۲۴ • قیمت : پچاس روپے
ناشر : طارق اقبال گاہندری - نفیس اکیڈمی کراچی

اس مجموعے میں شامل بائیس کہانیاں ہیں جو سلطان جمیل نسیم کے نادر اور بے سکون کر دینے والے فن سے متعارف کراتی ہیں۔ وہ لفظ کے اصلی معنوں میں ایک داستان گو ہیں اور کہانی کو صفائی سے، اختیار سے، دلبستگی سے بیان کرنے کا ملکہ ان کو حاصل ہے۔ کہانی کی ابتدا ہی سے وہ پڑھنے والے کو کالرج کے قدیم THE ANCIENT MARINER کی طرح اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اس وقت تک اسے آزاد نہیں کرتے جب تک کہانی ختم نہ ہو جائے۔ ان کا ہاتھ بہت سبک ہے مگر بڑا کاریگر۔ وہ آراستی نثر نگاری یا ارغوانی عبارت کا سہارا لیے بغیر بڑے قدرتی ڈھنگ سے اپنی کہانی کا تانا بانا بنتے ہیں۔ جس میں کوئی جھول نہیں ہوتا۔ نہ ہی قاری کے لیے دھچکا۔ وہ تجریدی یا علامتی داستان گوئی کو حرام نہیں سمجھتے بشرطیکہ کہانی کا مفہوم ہی خبط ہو کر نہ رہ جائے مگر اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں روایتی ہیں۔ منشی پریم چند۔ راجندر سنگھ بیدی۔ سعادت حسن منٹو اور غلام عباس کی عظیم روایت میں لکھی ہوئی۔ ان کی اثر انگیزی اور فنی پختگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا عنوانی کہانی 'سایہ سایہ دھوپ'، دو پاگل عورتوں، ایک حرامی لڑکے اور ایک ڈسپلن قائم رکھنے والے وارڈن کی حیران کن کہانی ہے۔ اتنی اچھی، خالص، کہانی میں نے اردو میں ایک مدت کے بعد پڑھی ہے۔ اس مجموعے میں دوسری بھی بہت سی اور کہانیاں ہیں جو مجھے پسند آئیں سلطان جمیل نسیم میرے لیے ایک نئی دریافت ہیں۔ ایک نہایت خوشکن دریافت۔ وہ ایک اوریجنل (ORIGINAL) تیز نظر اور دلچسپ کہانی لکھنے والے ہیں اور میں انھیں سلام کرتا ہوں۔ "سایہ سایہ دھوپ" کی کتابت و طباعت ستھری اور معیاری ہے۔

———— محمد خالد اختر

آوازوں کا شہر
(شعری مجموعہ)

مصنف : اکبر حیدرآبادی
صفحات : ۱۷۶ • قیمت : پینتالیس روپے اور پانچ پونڈ
ناشر : سطور پرکاشن ۲۳۷۱ دہلی گیٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شعر و سخن کا ذوقِ سلیم رکھنے والے حلقوں میں اکبر حیدرآبادی کا نام عرصے سے معروف و مقبول ہے۔ گزشتہ چار دہائیوں سے اس دشت کی سیاحی میں مصروفِ سفر ہیں۔ برِ صغیر پاک و ہند کے مؤقر ادبی جرائد میں کلام کی اشاعت کے علاوہ ان کے دو شعری مجموعے "خطِ رہ گزر" (۱۹۷۱ء) اور "نمو کی آگ" (۱۹۸۰ء) شائع ہو چکے ہیں۔ اب سات سال کے وقفے کے بعد ان کا تیسرا مجموعہ "آوازوں کا شہر" منظرِ عام پر آیا ہے اس میں پینتیس[۳۵] نظمیں، تراسی[۸۳] غزلیں، بارہ[۱۲] رباعیات، بارہ[۱۲] قطعات اور چھبیس[۲۶] مفرد اشعار کے ساتھ شاید اپنے عہد کے جدید شعری رویے کی شہادت کے طور پر چار نثری نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔

یہ کہنا کہ اکبر حیدرآبادی ایک کہنہ مشق، جملہ شعری اصناف پر دسترس رکھنے والے صاحب صلاحیت اور باشعور شاعر ہیں اس لیے ضروری نہیں ہے کہ یہ سارے اوصاف خود ان کی شاعری میں نمایاں ہیں۔ ہاں بتلانے والی بات یہ ہے کہ ان کے ہاں اپنے کلاسک کے گہرے مطالعے اور جدید دور کے عالمی ادبی رویوں کے بیدار ادراک مشاہدے نے فکر و خیال اور اسلوب و بیان میں عام روش سے مختلف ایک نئی سی لذت پیدا کر دی ہے۔ یورپ میں مستقل قیام کی وجہ سے اکبر حیدرآبادی کی شاعری کی مجموعی فضا کو مشرق و مغرب کی ملی جلی خوبو کے اثرات نے منفرد بنا دیا ہے اور واقعی ان کی آواز بہت سی آوازوں کے شور میں بھی آسانی سے پہچانی جا سکتی ہے۔ کتاب بہت سلیقے اور نفاست کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔

———— نکہت بریلوی

نکہت بریلوی

زندانِ شہر
(شعری مجموعہ)

مصنف: بخش لائلپوری
صفحات: ۲۰۲ • قیمت (درج نہیں ہے)
پبلشر: انجمن ترقی پسند مصنفین برطانیہ ۲۳/۲۷۳۰ سٹینس روڈ ہانسلو مڈلسکس ٹی ڈبلیو ۴ ۵ اے پی (یو کے)

بخش لائلپوری کی شاعری انسانی دکھوں کے کرب کی شاعری ہے، لیکن یہ کرب ہمیں ملول کرتا ہے نہ قنوطی بناتا ہے بلکہ اس کے برخلاف زندہ رہنے اور انسانی زندگی کے لیے باطل طاقتوں کے خلاف نبرد آزمائی کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اس میں آمرانہ جبر، بے انصافی، حق تلفی، عدم مساوات، جنگ و جدل غرض یہ کہ ہر اس رویے کے خلاف شدید نفرت، احتجاج و مزاحمت کے برملا اظہار کی صورت کچھ اس طرح ملتی ہے کہ شاعری کے بنیادی تقاضے اور وہ جسے فنی جمالیات کہتے ہیں مجروح نہیں ہوتی۔

"زندانِ شہر" بخش لائلپوری کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس میں ان کی نظمیں اور قطعات شامل کیے گئے ہیں۔ ان تمام نظموں اور قطعات میں بخش لائلپوری اپنے انسان دوست نظریات، مثبت انقلابی فکر اور حب الوطنی کے والہانہ جذبے کے ساتھ اسی طمطراق سے موجود ہیں جوان کا طرۂ امتیاز ہے۔ کتاب کا انتساب اور سرورق خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ نوٹو آفسٹ ٹیکنیک سے عمدہ قسم کے آرٹ پیپر پر سفید روشنائی سے چھاپی گئی ہے۔ جو بہت دیدہ زیب ہے۔

———— نکہت بریلوی

لمحے لمحے
(جگن ناتھ آزاد نمبر)

مرتبین: حبیب سوز و خان فہیم
صفحات: ۶۰۰ • قیمت: اسّی روپے
ناشر: دفتر لمحے لمحے۔ اعلیٰ پور۔ بدایوں (انڈیا)

لمحے لمحے (سہ ماہی) بدایوں (انڈیا) سے شائع ہونے والا ایک ایسا ادبی جریدہ ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قریب قریب ہر شمارے میں کسی مشہور و معروف ادبی شخصیت اور اس کے فن کا احاطہ کرتا ہے۔ اس طرح ایک ہی شمارے میں کسی ادبی شخصیت کے بارے میں قاری مربوط معلومات حاصل کر لیتا ہے ایسی صورت میں اس قسم کا جریدہ کتاب کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ زیرِ تبصرہ شمارہ چھ سو صفحات پر محیط ہے اور علامہ اقبال کے حوالے سے معروف شخصیت جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور فن پر بھرپور معلومات فراہم کرتا ہے اس میں جگن ناتھ آزاد کا محض نقاد کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ شاعر کی حیثیت سے بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ جن جن اور شعبوں میں آزاد صاحب نے کام کیا ہے ان پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس شمارے کی ترتیب میں مرتبین کو کریڈٹ دینا پڑتا ہے کہ انھوں نے شخص و عکس، شعریات، نثریات، اقبالیات ملاقاتوں، منظومات، تصنیفات و تالیفات جگن ناتھ آزاد پر کتابیں، انگریزی تصانیف، توسیعی خطابات، انعامات و اعزازات اور دیگر کئی عنوانات کے تحت ان کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے۔ برِصغیر کے مشہور و معروف ادیبوں نے جگن ناتھ آزاد کی زندگی، شخصیت اور فن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس شمارے کو پڑھ کر جہاں "لمحے لمحے" کے ادارے کی تعریف کرنا پڑتی ہے وہاں اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ زندہ ادیبوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا بذاتِ خود ایک ایسی روایت ہے جس کو مستحکم کرنا چاہیے تاکہ مشہور و معروف ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی خدمات سب کے سامنے آ سکیں۔

لمحے لمحے کا یہ شمارہ بلاشبہ ایک اہم دستاویز ہے۔

———— ممتاز احمد خاں

ارمغانِ سیفیہ
(مجلہ)

مرتبین : عبدالقوی دسنوی و محمد لقمان
صفحات : ۲۸۰ ● قیمت ؟
ناشر : شعبۂ اردو سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج بھوپال (انڈیا)

ارمغانِ سیفیہ مشہور و معروف سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج بھوپال کے شعبۂ اردو کا کارنامہ ہے جس کے لیے عبدالقوی دسنوی اور محمد لقمان صاحبان مبارک باد کے حقدار ہیں۔ سیفیہ کالج ان اداروں میں سے ایک ہے جو کسی بھی قوم کی زندگی میں تہذیبی و ثقافتی اہمیت کے حامل بن جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ایسے اداروں سے نہ صرف علم و ادب کی خدمت ہوتی ہے بلکہ ان سے فارغ التحصیل ہونے والوں میں ایسی شخصیات سامنے آتی ہیں جو بذاتِ خود ایسے اداروں کی نیک نامی اور شہرت میں اضافہ کرتی ہیں۔

سیفیہ کالج کے بانی ملا سجاد حسین صاحب اور اس کے سکریٹری فخرالدین صاحب وہ لوگ ہیں جن کی زندگیاں علم و ادب کی خدمت کے لیے وقف ہیں۔ ان دو نور شخصیات کا تذکرہ اس رسالے کا اہم جزو ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ترتیب میں فخرالدین صاحب کے ساتھ ایک شام۔ بھوپال ہمارا شہر۔ قصر سلطانی میں ایک یادگار شام۔ فیض احمد فیض، کیفی اعظمی، مشفق خواجہ اور دیگر اہم شخصیات کا دورۂ سیفیہ کالج اور بھوپال گیس المیہ یا قیامتِ صغریٰ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس کالج سے متعلق علمی، ادبی اور سماجی تقریبات کا دلچسپ احوال بھی شامل ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس مجلّے کو پڑھ کر شاید ہی کوئی قاری جس نے بھوپال خصوصاً سیفیہ کالج نہ دیکھا ہو، دیکھنے کی خواہش کرتا ہے۔

مجلہ صاف ستھرا چھپا ہے اور تصاویر کی شمولیت نے اسے مزید باوقار بنا دیا ہے۔

ممتاز احمد خاں ــــ

تیرھواں نمبر

(صفحہ ۷۰ سے آگے)

"اور ۔ کے ۔ بس تو چلا" نوجوان گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ ایک ثانیہ میں وہ نظروں سے اوجھل تھا۔ بارھواں نمبر کس کا تھا۔ بارھواں نمبر کہاں گیا؟ بارہویں نمبر کی تلاش شروع ہوئی۔ حمید مجرموں کی طرح کھڑا تھا اس کی زبان پر جیسے تالا لگ گیا تھا۔ کہیں چلا گیا ہوگا۔ کچھ کام نکل آیا ہوگا۔ لوگ کہہ رہے تھے۔ لیکن بارہ گاڑیاں لینی تھیں۔ اس لیے تیرھواں نمبر بھی لے لیا گیا۔

حمید کی گاڑی سوروج کنڈ کی طرف تیزی سے چل جا رہی تھی۔ مگر اس کا دل بوجھل تھا۔ کانفرنس بہت شاندار رہی۔ لیکن اس کا دل بجھا بجھا سا رہا۔ اس نے تقریر بھی کوئی خاص نہیں کی۔ لوگوں کو تعجب تھا کہ ایک خوش بیان مقرر کیسی پھیکی تقریر کر گیا۔ کانفرنس سے زیادہ اس نوجوان کا معصوم سا مسکراتا چہرہ حمید کے اعصاب پر چھایا رہا۔

ـــ

یارانِ محفل

محفل

(چند خطوط)

نصراللہ خان

(کراچی)

بھائی صہبا لکھنوی افکار کے نمبر پہ نمبر نکالے جا رہے ہیں اور اردو ادب میں اپنے نمبر بڑھائے جا رہے ہیں اگر یہ ابھی ...
نمبر نکالتے رہے تو ان کا آخری نمبر حضرت خضر کے بارے میں ہوگا اور اس طرح وہ خود اپنا نمبر نکالنے کا کسی کو موقع نہیں دیں گے۔
دبلا پتلا آدمی جیسے پتنگ کے کاغذ کا بنا یا ہوا ہو مگر کیسی ہمت اور کیسا حوصلہ رکھتا ہے۔ یہ آدمی ہے یا اسمٰعیل میرٹھی
کی پن چکی ہے۔ بہت سی ایسی شخصیات جن کے نمبر صہبا صاحب نے نمبر نکالے ہیں۔ بکھرے بکھرے پڑے تھے تو صہبا صاحب نے
بڑے سلیقے سے افکار کے نمبروں میں سمیٹ لیا۔ جوش نمبر، حفیظ نمبر، فیض نمبر، ندیم نمبر، مجنوں گورکھپوری نمبر اور اختر حسین رائے
نمبر نکالنے کے بعد اب انھوں نے ایک ایسی شخصیت کا نمبر نکالا ہے جس کا نمبر نکالنا تو کیا معنی جس پر لکھنا بھی بہت مشکل ہے اور
واقعی ہر لحاظ اور ہر اعتبار سے قابل نمبر تھا۔ اگرچہ یہ کام بہت دشوار اور مشکل تھا۔ لیکن یہ کام بھی ہمارے فرہاد صفت مجنوں
ادب صہبا لکھنوی بڑے سلیقے سے کر گزرے اور یہ نمبر آذر زوبی کا نمبر ہے۔ کالم نویس بیس برس سے سوچ رہا ہے کہ وہ آذر
اور ان کے فن کے بارے میں کچھ لکھے۔ لیکن یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتا تھا کہ وہ کس آذر زوبی کے بارے میں لکھے۔ مجسمہ
آذر زوبی پر لکھے یا مجسمہ ساز آذر زوبی پر لکھے یا ادیبوں کے من پسند آذر زوبی پر لکھے جو خود ہی ادب کا گہرا شعور رکھتا
ہے یا اپنے خالی خولی دوست آذر زوبی پر لکھے۔ لیکن آذر زوبی کسی ایک خانے میں تو بند نہیں۔ وہ ایک دنیا بھی نہیں ہے اس کی
کئی جہتیں ہیں اور

ہر فن میں ہے وہ طاق اسے کیا نہیں آتا

صہبا لکھنوی نے افکار میں آذر زوبی کے فن پر ماہرین فن سے بھی مضمون لکھوائے ہیں۔ محمد علی صاحب ایسے نقاد نے ان کے
بڑا پرمغز مقالہ لکھا۔ احتشام الحق حقی، محشر بدایونی نے ان کی خدمت میں منظوم خراج تحسین پیش کیا اور راغب مراد آبادی نے
ان کے لیے دعائیہ لکھا۔

یارانِ محفل

اکرام بریلوی، سحر انصاری اور خود صہبا صاحب نے ان سے انٹرویو کیا اور اس انٹرویو میں ان سے ایسے ایسے سوالات پوچھے جو خفیہ پولیس بھی عادی مجرموں سے نہیں پوچھتی لیکن آزر زوبی بھی ان کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے رہے۔ افکار کے آزر زوبی نمبر میں بڑے قد آور ادیبوں اور مصوّروں کے مضامین بھی شامل ہیں اور یہ سب حضرات آزر زوبی کی پہلودار شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو سے متاثر تھے۔ ان میں چند خواتین و حضرات کے نام یہ ہیں۔ منٹو، پروفیسر عسکری، قرۃ العین حیدر، جی الانا، ممتاز مفتی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، مرزا ادیب، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انور عنایت اللہ، ڈاکٹر احسان رشید، ڈاکٹر اسمٰعیل سعید، جوگندر پال، ڈاکٹر انور سدید، حکیم محمد سعید، سید مظفر علی سید۔ ان تمام حضرات کے مضامین پڑھ کر یوں لگا کہ جیسے یہ سارے مضامین ہم نے لکھے ہیں اور اگر اب اس کے بعد ہم آزر زوبی پر کچھ لکھنا چاہیں گے تو نہیں لکھ سکیں گے۔ آپ کو کس طرح یہ یقین دلاؤں کہ میں اپنے دوست، اور کرم فرما آزر زوبی پر اپنے دھیان گیان میں بہت کچھ لکھتا رہا اور ایک دن مجھے یہ یقین آ گیا کہ آزر زوبی پر مجھے جو کچھ لکھنا تھا تو وہ میں لکھ کر صہبا لکھنوی صاحب کو پہنچا آیا تھا اور جب آزر زوبی نمبر مجھے ملا تو مجھے حیرت ہوئی کہ اس میں میرا مضمون نہیں تھا۔ میں نے صہبا صاحب سے پوچھا کہ میرا مضمون آپ نے کیوں نہیں چھاپا تو صہبا صاحب نے فرمایا، آپ نے یہ مضمون عالمِ خیال میں لکھا ہوگا، اور صہبا صاحب نے یہ صحیح کہا۔ بھلا میں اتنے عظیم آرٹسٹ پر کیا لکھتا۔ میں یہ سوچتا ہی رہا کہ میں کیا لکھوں اور افکار کا آزر زوبی نمبر چھپ گیا۔ لیکن جب میں نے اس نمبر کے سارے مضامین پڑھے تو مجھے یوں لگا کہ جیسے یہ سارے مضامین میں نے ہی لکھے تھے جنھیں صہبا صاحب نے مختلف ناموں سے شائع کر دیا آزر زوبی پر اس سے بہتر کام نہیں ہو سکتا چنانچہ اس سلسلے میں ہم صہبا صاحب اور ان کے رفقائے کار بلکہ رفقائے افکار اور جن صاحبان نے آزر زوبی پر اپنے خیالات قلمبند کیے ہیں تو ان سب کی تعریف و توصیف میں اگر ہم زندہ رہے تو افکار کا ایک علیٰحدہ نمبر نکالیں گے۔

صہبا صاحب اب تک آپ کتنے نمبر نکال چکے ہیں اور کتنے نمبر اور نکالنے کا ارادہ اور حوصلہ رکھتے ہیں اور آپ کو اب تک یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس ملک میں عزیزدل پذیر ہیں ایسے اور کتنے لوگ ہیں جو نمبر نکلوانے کے قابل ہیں۔ افکار کے ادارۂ تحریر اور صہبا لکھنوی کے قدر دانوں کو چاہیے کہ وہ ہمت کر کے ایک نمبر صہبا لکھنوی صاحب کا بھی نکال ڈالیں۔ اس کارِ خیر میں حصّہ لینے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ قابل نمبر یا لائق نمبر بنا دے گا۔

بات بھائی آزر زوبی کی ہو رہی تھی تو آزر زوبی درویش خدا مست ہیں۔ وہ نہ دولت کے بھوکے ہیں اور نہ شہرت کے بھوکے۔ صرف محبّت کے بھوکے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انھیں بہت سے چاہنے والے دیے ہیں۔ آپ کو افکار کے زوبی نمبر ہی سے اندازہ ہو گیا ہوگا۔ کتنا بڑا آرٹسٹ اور کیسا عجز و انکسار کا مجسمہ۔ ان سے ملتے ہی سارا تکدّر دور ہو جاتا ہے۔ جب آزر زوبی سے ملاقات ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے ریگستان سے نکل کر کسی نخلستان پہنچ گئے ہیں۔ آزر زوبی پر علامہ کا یہ شعر صادق آتا ہے

درونِ او دلِ درد آشنائے
چو جوئے بر کنارِ کہسارے

آزر زوبی کے آرٹ میں جہاں ان کا خونِ جگر شامل ہے تو وہاں اس میں ان کے مزاج کی نرمی بھی ہے۔ جب آزر زوبی

سے ملے مدت گزر جاتی ہے تو میں ان کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھ لیتا ہوں اور انہی تصویروں میں میری ملاقات آذر زوبی سے بھی ہو جاتی ہے۔

آذر زوبی کی اہلیہ بھی آرٹسٹ ہیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک ہی گھر خراب کیا ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی کینوس اور رنگوں پر جتنی توجہ دیتے ہیں تو اتنی توجہ یہ گھر بار کے کاموں پر نہیں دیتے۔ جب آذر زوبی کی شادی ہوئی تھی تو میں نے کہا تھا کہ یہ شادی آرٹسٹ کی آرٹسٹ سے نہیں ہوئی ہے بلکہ آرٹ کی آرٹ سے ہوئی ہے۔ اسی لیے ان کا آرٹ برائے آرٹ، نہیں ہے بلکہ برائے زندگی اور برائے آرٹسٹ ہے یعنی یہ آرٹ آنے والے دوسرے آرٹسٹوں کے لیے بھی ہے۔

اگر آپ کی آذر زوبی سے کبھی ملاقات ہو جائے تو بھولے سے بھی ان کی کسی تصویر کی تعریف نہ کیجیے۔ ورنہ یہ دل کے ایسے غنی ہیں کہ وہ یہ تصویر آپ کی خدمت میں پیش کر دیں گے اور اس تصویر کے چھٹکے کی قیمت بھی کسی تصویر کی قیمت سے کم نہیں ہوگی۔ میں نے ایک مرتبہ علامہ اقبال کی ایک تصویر کی تعریف کی تو آذر زوبی نے یہ تصویر میرے ساتھ کر دی۔ اور اب تو میں آذر زوبی کی بھی ان کے سامنے کبھی تعریف نہیں کروں گا ورنہ وہ میرے ساتھ ہو جائیں گے۔ آذر زوبی کا میرا ساتھ رہا تو میرے لیے فخر کا باعث ہوگا لیکن میں اپنے چھوٹے سے گھر میں ان کے اسٹوڈیو کی گنجائش کہاں سے نکالوں گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے اور ان کا فن زیادہ سے زیادہ اہل فن میں مقبول ہو۔

اور وہ صہبا لکھنوی کو بھی زندہ رکھے اور انھیں اتنی ہمت اور حوصلہ بھی دے کہ وہ حضرت خضر اور حضرت الیاس کے نمبر بھی ان کی زندگی ہی میں نکال جائیں (آمین) (بہ شکریہ روزنامہ حریت - کراچی)

محمد عالم خاں

(لاہور)

ادبی رسائل و جرائد ادب کی ترقی اور ترویج کے سلسلے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ ادب کو روایت سے مربوط رکھنے اور روشن مستقبل سے ہمکنار کرتے ہیں بہت سے ادبی رسائل نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ماہنامہ "افکار" بھی ایسا ہی ادبی جریدہ ہے جو گزشتہ چالیس سال سے ادب کی خدمات انجام دے رہا ہے۔ نئے پرانے ادیبوں کو جس قدر و منزلت کی نگاہ سے اس جریدے میں دیکھا گیا ہے اس کی مثال اس دور میں خال خال ہی ملتی ہے۔ ادب میں اگرچہ غیر جانب داری کوئی چیز نہیں ہوتی۔ لیکن ادیبوں اور دانش وروں کو مناسب جگہ پر شائع کرنے کے ضمن میں ایک توازن برقرار قائم کیا جا سکتا ہے یکسوئی یا معیار ایک مشکل ترین کام ہے جسے مدیر صہبا لکھنوی نے ہمیشہ برقرار رکھا۔ اسی طرح ماہنامہ "افکار" نے بہت سی اہم شخصیات، ادبی موضوعات اور دیگر اصناف ادب پر خصوصی نمبر شائع کر کے ادبی تاریخ کو مستند حوالے عطا کیے ہیں شاید ہی کوئی ایسا ادبی پہلو ہو گا جس کے بارے میں "افکار" نے لب کشائی نہ کی ہو اور یہ کہنا مناسب ہو گا کہ ماہنامہ افکار ایک ادبی تاریخ کے تسلسل کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ اپنی دیرینہ روایت کو دوام بخشنے کے لیے ایک بار پھر ایک خصوصی نمبر شائع کیا ہے۔ یہ نمبر ملک کے ممتاز مصور "آذر زوبی" کے فن اور شخصیت پر مبنی ہے۔

افکار کے زیر نظر شمارے میں مصور زوبی کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو اس کے فن کے حوالے سے پرکھنے کی بڑی ذمہ دارانہ کوشش کی گئی ہے۔ جریدے کے ابتدائی اوراق میں شان الحق حقی اور محشر بدایونی نے اشعار کی

صورت میں مصور کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ "مطالعہ، جائزہ" کے باب میں السیندور یوسانی کا مضمون بعنوان "زدبی
روحانی نظریہ فن کا نقیب" بڑی اہمیت کا حامل ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تحریر زدبی کے "نظریۂ فن" کو بڑے مدلل
انداز سے واضح کرتی ہے۔ اسی طرح دیگر عظیم دانش وروں اور ادیبوں نے زدبی کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل گفتگو
کی ہے۔ جن ممتاز دانش وروں کی تخلیقات سے اس جریدے کو مزین کیا گیا ہے ان میں سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری
قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، مرزا ادیب، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، محمد علی صدیقی کے نام خاص طور
پر قابل ذکر ہیں۔ فن و شخصیت پر مبنی مقالات کے دوسرے باب میں انور عنایت اللہ، ڈاکٹر احسان رشید، ڈاکٹر اسمٰعیل سعد
حفیظ رومانی، اکرام بریلوی، بشیر موجد، شبنم رومانی، جوگندر پال، ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر معین الدین احمد نے زدبی
کے فکر و فن پر روشنی ڈالی ہے۔

زیر نظر شمارے میں زدبی کی رنگین مصوری، پین ڈرائنگ، مختلف عنوانات دے کر شامل اشاعت کی گئی ہیں۔
اس کے علاوہ مصور کے بنائے ہوئے مجسموں کی تصویریں بھی اس جریدے کی زیب و زینت میں اضافہ کرتی ہیں۔ محترمہ
فاطمہ جناح، فیض احمد فیض، محمد حسن عسکری، پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی
اور رئیس امروہوی کے مجسموں کی تصویریں اس کاوش کو زیادہ معتبر اور مستند ثابت کرتی ہیں۔ انطارہیے میں حکیم
محمد سعید، مظفر علی سید، خاطر غزنوی، ڈاکٹر محمود الرحمٰن کی تحریریں بھی آزر زوبی کی شخصیت کے رنگوں کو نکھارتی اور
ابھرتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح "زدبی سے ایک گفتگو" میں اکرام بریلوی، سحر انصاری اور صہبا لکھنوی کے
لیے "انکشافات" کا درجہ رکھتی ہیں۔

ماہنامہ "افکار" کے اس خصوصی شمارے کے مطالعے کے بعد ہم دو طرح کا تاثر اخذ کر سکتے ہیں۔ پہلا تاثر تو یہی ہے کہ
ہمارے دانش وروں اور ادیبوں نے ایک معتبر مصور کو خراج تحسین پیش کیا اور اس کے فن کے بارے میں ناقدانہ رائے
کا اظہار کیا یہ ایک بہت ہی مثبت حقیقت پسندانہ کاوش ہے جو ماہنامہ "افکار" کی عظمت میں اضافے کا باعث
بنی کیوں کہ زدبی ہمارے دور کے ان مایۂ ناز مصوروں میں سے ہیں جنھوں نے مصورانہ بلکہ مجسمہ سازانہ اور
سہ ابعادی (THREE DIMENTIONAL) خلاقی کی ابتدا کی۔ وہ ہماری قومی ثقافت کا اہم عکاس ہے۔
ان کی تصویروں میں کسان بھنگڑا ڈالتے ہیں اور درویش بزرگ دھمال ڈالتے ہیں۔ الغرض وہ ملک کے تمام علاقوں کے روشن
کرداروں اور ماحول کی مدد سے ایک ہمہ گیر ثقافت کی نشان دہی کرتا ہے۔ وہ خالصتاً سیاسی اور معاشی حوالے سے
فن کو اجاگر کرتا ہے۔ لہٰذا ایسے فن کار کو وقت کی دبیز تہوں سے نکال کر منظر عام پر لانا اور اس کی فنی خدمات کا اعتراف
کا بجائے خود ایک تخلیقی اور دیانت دارانہ جرأت کا اظہار ہے اور صہبا لکھنوی نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔
اسی وجہ سے انھوں نے اپنے مداحوں میں اور زیادہ اضافہ کر لیا ہے۔

آزر زوبی کے بارے میں جو کچھ سامنے آیا وہ اس جریدے کی ایک سطح ہے، لیکن اس بات کا دوسرا سنجیدہ اور اہم
پہلو یہ ہے کہ اس مصور کے توسط سے فن مصوری کے بارے میں مختلف نظریات اور اس کے کردار کے بارے میں بہت تحقیقی
اور علمی باتیں کہی گئی ہیں جو دراصل اس شمارے کا حقیقی حسن ہے اور اگر یہ کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ ایک

محفل

مصوّری کے موضوع پر جامع اور مربوط کتاب ہے جس میں آزر زوبی کا حوالہ استعمال کیا گیا ہے۔ فی الواقع کہا اور بہت کچھ کہا گیا ہے۔ یقیناً اس جریدے کے بارے میں دوسرا تاثر اس کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے اور یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ماہنامہ "افکار" کا یہ خصوصی شمارہ مصوّری کی تاریخ میں ایک معتبر حوالے کے طور پر استعمال ہوگا اور اس کمی کو پورا بھی کرے گا جو مصوّری کے علم کے بارے میں عام طور پر کہی جاتی ہے۔ گرچہ اس امر کا فقدان اس قدر زیادہ ہے کہ مصوّری پر ابھی اور بہت کچھ لکھا جانا چاہیے، لیکن یہ شمارہ کسی حد تک اس ضرورت کو ضرور پورا کرے گا۔ فنِ مصوّری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ شمارہ خاصے کی چیز ہے اور اسے برسوں تک سراہا جائے گا۔

(بہ شکریہ ماہنامہ "تخلیق" لاہور)

ماہ طلعت زاہدی

(ملتان)

افکار برابر ملتا رہتا ہے اور ہمیشہ امید، مسرت اور حیرت میں اضافہ کرتا ہے۔ "ذربا نمبر" میں رنگ و حرف کا دل کش امتزاج بھی اسی تسلسل کی ایک کڑی ہے۔ خدا آپ کو صحت اور طویل ترین زندگی عطا کرے۔ آمین

اکتوبر کے شمارے میں مجتبیٰ صاحب کا اشاریہ اور ادیب سہیل صاحب کی نظم کلا شنکوف کلچر خاص چیزیں ہیں۔ دونوں نے ہی معاشرے سے انصاف طلب کیا ہے اور فن اور تہذیب کے حسن کو ہر صورت میں باقی رکھنے کی بات اٹھائی ہے۔ تاہم اصل چیز دونوں کے ہاں "فراموش شدہ" کی "بازیافت" بازیافت کی خواہش ہے۔ مجتبیٰ صاحب کے الفاظ ہیں۔

"میری آواز ـــ غالب کی ہے نہ اقبال کی اور نہ فیض کی۔ ان کے اسلوب میں کچھ پرانا پن بھی ہے ـــ مگر!! اس مگر، پر انتہائی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے" ادھر ادیب سہیل صاحب کو فضاؤں میں دھان کی خوشبو کی بجائے بارود کی بو محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے خیال آتا ہے کہ ہمارے ماحول میں بے حسی جس طرح پروان چڑھ رہی ہے۔ اس کا، تمام تر تو نہیں لیکن کچھ نہ کچھ تعلق مجتبیٰ صاحب کے "مگر" پر توجہ کرنے سے بھی جڑتا ہے۔ اس عہد میں یہ یاد رکھنا نہایت اہم ہے کہ ہم کیا کیا بھول رہے ہیں ورنہ چاولوں کے نام "باسمتی" کے بجائے "ڈمرنیل دھماکہ" اور "کلاشنکوف" رکھنے پر بھی تعجب نہ ہوگا۔

جاوید دانش

(ٹورنٹو)

اکتوبر کا تازہ شمارہ چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے نظر نواز ہوا۔ دراصل میں اور خالد سہیل ایک ہفت روزہ "ایشین رائٹرز" ورکشاپ ۹۸ء کے لیے اسٹاک ہوم جا رہے تھے۔ ورکشاپ بڑی کامیاب رہی۔ خیر ایک ہی نشست میں پرچہ پڑھ ڈالا بیشتر قلمکاروں کی تحریریں افکار کے معیار کی آئینہ دار ہیں۔ ایک عرصے کے بعد اعزاز افضل صاحب کی غزل پڑھ کر کلکتے کے شب و روز کی یاد آ گئی۔ خاص کر ان کا شعر

موقع سے جھوٹ بول کے وہ داد لے گیا
میری زباں پہ سچ تھا مگر برمحل نہ تھا

بہت پسند آیا۔ میرے جواں فکر بزرگ علیگ دوست پروفیسر ضیا کی غزل اور عابد جعفری و اشفاق حسین کی نظم بھی بہت پسند آئی مگر اس شمارے کا حاصل (مرحوم) مجتبیٰ حسین کا اشاریہ "آج عظیم شاعروں کی ایک لمبی لائن لگی ہوئی ہے"

افکار کی خاص اشاعتیں

ایک نظر میں

پہلا دور

۱۹۴۵ء : افکار کا اجراء، بھوپال سے
۱۹۴۸ء : لکھنؤ اردو کانفرنس نمبر (پہلی یادگار اشاعت)
۱۹۴۹ء : بھوپال اردو کانفرنس نمبر
۱۹۴۹ء : بھیمڑی ادبی کانفرنس نمبر

دوسرا دور
(پاکستان میں)

۱۹۵۱ء : پہلا خاص نمبر کراچی سے
۱۹۵۲ء : خاص نمبر
۱۹۵۳ء : افسانہ نمبر
۱۹۵۴ء : سالنامہ
۱۹۵۵ء : دس سالہ نمبر
۱۹۵۵ء : منٹو نمبر
۱۹۵۶ء : مجاز نمبر (دو ایڈیشن)
۱۹۵۸ء : سالگرہ نمبر
۱۹۵۸ء : آزادی نمبر
۱۹۵۹ء : رائٹرز کنونشن نمبر
۱۹۵۹ء : افسانہ نمبر
۱۹۵۹ء : انقلاب نمبر
۱۹۶۰ء : سالنامہ
۱۹۶۰ء : کہانی نمبر

۳ اگست ۱۹۶۰ء کو بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی صدارت میں افکار کی سولہویں سالگرہ منائی گئی۔

۱۹۶۱ء : جوش نمبر (پہلا ایڈیشن)
۱۹۶۱ء : انقلاب نمبر

۵ نومبر ۱۹۶۱ء کو جشن جوش منایا گیا، اور افکار نے ۱۵۰۰ ادیبوں کے اس یادگار اجتماع میں، افکار کا "جوش نمبر" پیش کیا

۱۹۶۲ء : جوش نمبر (دوسرا ایڈیشن باضافہ)

چھپتے چھپتے یہ اطلاع ملی کہ کراچی یونیورسٹی نے افکار کے "جوش نمبر" کو بی اے (آنرز) اور ایم اے اردو کے نصاب میں شامل کر لیا ہے

۱۹۶۲ء : آزادی نمبر
۱۹۶۳ء : افسانہ نمبر
۱۹۶۳ء : حفیظ نمبر

۲۷ ستمبر ۱۹۶۳ء کو زیر اہتمام پاکستان رائٹرز گلڈ جشن حفیظ منایا گیا اور کراچی کے نمائندہ ادیبوں کے اجتماع میں افکار نے "حفیظ نمبر" پیش کیا

۱۹۶۴ء : افسانہ نمبر
۱۹۶۴ء : نئی تخلیق نمبر

۱۳ مئی ۱۹۶۴ء کو جناب الطاف گوہر کی صدارت میں افکار کی بیسویں سالگرہ منائی گئی

ندیم نمبر ۱۹۸۹ء

۱۹۶۵ء : فیض نمبر
۱۹۶۵ء : جنگ اور ادب نمبر
۱۹۶۶ء : غالب نمبر
۱۹۶۶ء : نئی تخلیق نمبر
۱۹۶۸ء : سالنامہ

۲۲ فروری ۱۹۶۸ء کو جناب حکیم محمد سعید دہلوی کی صدارت میں افکار کی تیئسویں سالگرہ منائی گئی

بیاد جوش
۱۹۸۲ء

بیاد فیض
۱۹۸۵ء

نذر اختر حسین رائے پوری ۱۹۸۶ء

۱۹۶۸ء : ڈراما نمبر
۱۹۶۸ء : انقلاب نمبر
۱۹۶۹ء : غالب نمبر
۱۹۶۹ء : اقبال نمبر
۱۹۷۰ء : جوبلی نمبر (۱۹۴۵-۷۰ء)
۱۹۷۵ء : ندیم نمبر
۱۹۷۵ء : امیر خسرو ایڈیشن
۱۹۷۷ء : کرشن چندر ایڈیشن
۱۹۷۷ء : نذر اقبال
۱۹۷۸ء : روسی ایڈیشن
۱۹۸۱ء : برطانیہ میں اردو ایڈیشن

• مدیر و ناشر صہبا لکھنوی • طابع مشہور آفسٹ پریس کراچی • دفتر واسن روڈ کراچی

Head Office
MAKTABA-I-AFKAR
Rahson Road,
KARACHI.

AFKAR

Head Office
24, PARK HILL DRIVE,
BRADFORD-8,
(YORKS - U.K.)

UNIQUE LITERARY, CULTURAL AND FAMILY JOURNAL